Courtesy www.pdfbooksfree.pk
حصہ چہارم
عشق کا شین
PDFBOOKSFREE.PK
علیم الحق حقی

گہن کے اندھیرے کنویں سے جو نکلا
تو سورج ہوا اور بھی تاب ناک

فرحان آج بہت اُداس تھا۔

آج اس کا وہ کچا دھاگا بھی ٹوٹ گیا تھا، جسے وہ تقریباً تین برس سے تھامے ہوئے تھا۔ کتنی چاہت اور ارمان سے اس نے امی اور باجی کو وہاں بھیجا تھا۔ لیکن وہ ناکام رہیں۔

جو کچھ ہوا، وہ اس کے لئے خلافِ توقع نہیں تھا۔ پھر بھی اسے دکھ ہوا۔ شاید اس لئے کہ توقع اس کے بہت اندر، کہیں بہت نیچے تھی کہ وہ ناکام ہوگیا۔ لیکن اوپر تو امید تھی، آدمی امید کا دامن کہاں چھوڑتا ہے، چاہے وہ کچے دھاگے کی سی موہوم امید ہو۔

اسے اس پر حیرت تھی کہ امی اور باجی اس ناکامی پر اس سے کم اداس نہیں تھیں۔ اس احساس نے اس کی اداسی اور دکھ کو اور بڑھا دیا تھا۔ کیونکہ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ واقعی ایک بہت قیمتی چیز سے محروم ہوگیا ہے۔ وہ امی اور باجی کو بھی اچھی لگی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے اسے محبت کی نظر سے دیکھا اور جتنی اچھی وہ ہے، اسے اس سے بھی اچھا سمجھا۔

اس نے امی اور باجی سے کہا تھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جائیں۔
لیکن باجی کا دماغ بہت تیز کام کرتا تھا۔ انہوں نے کہا۔

"ڈرائیور کی ضرورت نہیں، تم ہمیں وہاں لے کر چلو۔"

"میں ...؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"یہ تو اچھا نہیں لگے گا۔"

"پاگل ہو تم تو ... ارے ... ! تم ہمیں وہاں لے کر جاؤ گے۔ تھوڑی دیر وہاں بیٹھنا اور ہم تمہارے سامنے تو بات نہیں کریں گے۔"

"اور پھر ...؟"

"پھر تم امی سے کہنا کہ تم جا رہے ہو۔ جب آنا ہو تو فون کر دیں تاکہ تم ہمیں لینے کے لئے آ جاؤ۔"

"اس کا فائدہ ...؟" اس نے اعتراض کیا۔

"بدھو ہو تم تو۔ ارے اس طرح اس کے گھر والے تمہیں دیکھ لیں گے۔ انہیں پتا تو چلے کہ تم بھی لاکھوں میں ایک ہو۔"

امی نے بھی باجی کی تائید کی۔ بات اس کی بھی سمجھ میں آ گئی۔

وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔ کچھ دیر وہ وہاں بیٹھا۔ وہاں اس کی دادی اور چچی تھی۔ چچا سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔ وہ بھی اسے جانتے تھے۔ وہ اس سے بڑے تپاک سے باتیں کرتے رہے اور جب وہ واپس آنے کے لئے اٹھا تو وہ اسے رخصت کرنے کے لئے پورچ تک آئے۔ اس بات نے اس کے دل میں امید کو اور توانا کر دیا۔

گھر واپس آ کر وہ مضطرب رہا۔ ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وقت کس طرح گزارے۔ آدھا گھنٹہ ہو گیا تو وہ فون کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

اب اسے امی یا باجی کے فون کا انتظار تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ فون کی گھنٹی نہیں بجی۔ اس نے اٹھ کر فون کو چیک کیا کہ کہیں وہ ڈیڈ تو نہیں ہے۔ لیکن فون بالکل ٹھیک تھا۔ اسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بغیر بلائے ہی چلا جائے۔ مگر اسی وقت امی اور باجی آ گئیں۔

"آپ نے مجھے بلایا ہی نہیں۔" اس نے آتے ہی باجی سے شکایت کی۔

"جواز ہی نہیں چھوڑا انہوں نے۔" امی نے جواب دیا۔

"آپ آئیں کیسے ...؟"

"انہوں نے کہا کہ اپنی گاڑی میں ہمیں بھجوا دیں گی۔ اب ہم منع تو نہیں کر سکتے۔"

"اس کے چچا آئے ہوں گے آپ کو چھوڑنے ...؟"

"نہیں! ڈرائیور تھا۔"

فرحان کو تھوڑی سی مایوسی ہوئی۔ یہ کوئی حوصلہ افزا علامت نہیں تھی۔

"اچھا! یہ تو بتائیں کہ کیا رہا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہوں نے ایک ہفتے بعد جواب دینے کو کہا ہے۔"

"کیوں ...؟"

"ان کی مرضی ... ! یہ ان کا حق ہے۔ ہم ان سے بحث تو نہیں کر سکتے تھے۔" باجی بولیں۔

"اچھا ... ! یہ بتائیں، وہ لوگ آپ کو کیسے لگے؟ اور لڑکی کیسی لگی آپ کو ...؟"

"سچ تو یہ ہے فرحان! کہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" امی نے کہا۔

فرحان کا دل بیٹھنے لگا۔

"کیا مطلب ...؟"

"اتنی اچھی لڑکی پسند کی ہے تم نے۔ ہم تو تمہیں ایسا ہی بونگا سا سمجھتے تھے۔" باجی نے شوخ لہجے میں کہا۔

"اور سب لوگ بہت اچھے ہیں۔" امی بولیں۔

"بھئی میں نے تو اسے اپنی بہو مان لیا۔ میرے دل میں اتر گئی ہے وہ۔"

فرحان کا خون سیروں بڑھ گیا۔ مگر فوراً ہی اسے خدشات ستانے لگے۔ اور وہ خدشات بے سبب بھی نہیں تھے۔

"لیکن یہ ایک ہفتہ ..."

امی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ طریقہ ہوتا ہے لڑکی والوں کا۔ فوراً ہی ہاں نہیں کی جاتی۔ پھر اس کی

دادی نے کہا کہ وہ تنہا فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ انہیں اپنے چھوٹے بیٹے سے بھی مشورہ کرنا ہوگا۔ اس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

مگر فرحان کے لئے تو یہ ایک گھنٹہ گزارنا دوبھر ہوگیا تھا۔ ایک ہفتہ تو اس کے لئے ایک عمر کے برابر تھا۔ لیکن وہ انتظار کے سوا کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

آج وہ یونیورسٹی سے گھر آیا تو سب سے پہلے اسے باجی کی صورت نظر آئی۔ اسے غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔ باجی کا سسرال سے یہاں آنا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہاں وہ اتنا مصروف رہتی تھیں کہ کبھی امی کے بلانے پر ہی آئیں تو آئیں۔ پھر باجی کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ امی بھی اداس نظر آ رہی تھیں۔۔ اس کا دل گھبرانے لگا، کہیں باجی کی سسرال میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوگئی۔

"خیریت تو ہے باجی؟" اس نے باجی سے پوچھا۔

"ہاں! سب ٹھیک ہے۔" امی نے جلدی سے کہا۔

"دیکھنے سے تو ایسا نہیں لگتا۔ آپ بھی پریشان لگ رہی ہیں اور باجی بھی۔"

باجی اور امی چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ ان کے درمیان جیسے خاموشی میں کوئی بات ہو رہی تھی۔ پھر باجی نے امی سے کہا۔

"کیا فائدہ امی! کب تک چھپا سکتی ہیں آپ اس بات کو؟"

امی بے بسی سے انہیں دیکھتی رہیں۔

"تو پھر تم ہی بتا دو اسے۔ میری تو ہمت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ اس سے نظریں ملائے بغیر کچن کی طرف چلی گئیں۔

وہ اور پریشان ہوگیا۔ یقیناً باجی کی سسرال میں ہی کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ اس نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

"بتائیں نا باجی! کیا بات ہے؟"

لیکن باجی نے جو کہا، وہ اس کے لئے خلافِ توقع تھا۔ بہت بڑا شاک تھا اس کے لئے۔

"آج ان کا فون آیا تھا۔" باجی نے کہا۔

"کن کا......؟"

"جن کے ہاں ہم تمہارا رشتہ لے کر گئے تھے۔ انہوں نے انکار کر دیا ہے۔"

فرحان کا دماغ بھک سے اُڑ گیا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟"

"دیکھو بھائی! زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جو نصیب میں نہ ہو، وہ تو نہیں ملتا نا آدمی کو......"

"لیکن انہوں نے کہا کیا......؟"

"انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے سے بات کی تھی۔ وہ شاید پہلے ہی کہیں اس لڑکی کا رشتہ طے کر چکا ہے۔ اس نے منع کر دیا۔ دادی بے چاری نے بہت معذرت کی امی سے۔ تمہاری بہت تعریف کی۔ کہہ رہی تھیں کہ انہیں افسوس ہے۔ اتنے اچھے لڑکے تو نصیب سے ملتے ہیں۔ تمہیں بہت دعائیں دیں انہوں نے۔"

فرحان سے بولا بھی نہیں گیا۔ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں تھا اس کے لئے۔

"اب دل چھوٹا نہ کرو میرے بھائی! ابھی تمہیں یہ بہت بڑی بات لگ رہی ہے۔ بعد میں کبھی اس سوچ پر ہنسو گے۔ زندگی میں سبھی کچھ من چاہا تو نہیں مل جاتا آدمی کو۔ انشاء اللہ تمہیں اس سے بھی اچھی لڑکی ملے گی۔"

فرحان نے دل میں سوچا۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں۔ لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔ اسے یقین تھا کہ اس ناکامی اور محرومی کا احساس اسے ہمیشہ ستاتا رہے گا۔

"اب چھوڑو نا! اتنا اداس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس بار اس سے رہا نہیں گیا۔

"میری بات چھوڑیں۔ اداس تو آپ بھی ہیں اور امی بھی۔"

"قدرتی بات ہے۔ ہمیں لڑکی بھی بہت اچھی لگی تھی، اور اس کے گھر والے بھی۔"

"تو پھر مجھے کیوں منع کرتی ہیں اداس ہونے سے۔ میرے لئے تو یہ اور زیادہ قدرتی بات ہے۔"

دن بھر اس نے مسکراتے رہنے کی کوشش کی۔ لیکن اداسی تو روح تک اتر گئی تھی۔ رات کو کمرے کی تنہائی میں وہ اداسی طوفان کی طرح امڈی اور اس پر چھا گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں، اور وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ جیتی جاگتی، سانس لیتی کہ بس ہاتھ بڑھاؤ اور چھولو۔ وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔

اسے اس کی پہلی دید یاد آ گئی۔

وہ تھرڈ ایئر میں تھا، اور وہ کالج کا پہلا دن تھا، جسے سینئر طلبا فرسٹ ایئر والوں کے لئے مشکل دن بنا دیتے ہیں۔ فرسٹ ایئر فول۔ اس کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں ہوتا، وہ تو بس بے ضرر سی دل لگی ہوتی ہے۔

وہ بے وقوف بنانے والوں کا سردار تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی وقت سے کافی پہلے کالج آ گئے تھے۔ اور انہوں نے دروازوں پر لگی دو الگ الگ تختیوں کو باہم تبدیل کر دیا تھا۔ لیڈیز ٹوائلٹ کی تختی XIA کے کلاس روم کے دروازے پر، اور XIA کی تختی لیڈیز ٹوائلٹ کے دروازے پر۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ فرسٹ ایئر والے جھجکتے، گھبراتے ہیں، اس لئے پہلے گراؤنڈ میں جمع ہوتے اور ایک دوسرے سے گھلتے ملتے ہیں، پھر گروہوں کی شکل میں کلاس کا رخ کرتے ہیں اور فرسٹ ایئر فول بنائے جانے کے ڈر سے وہ سینئر طلباء سے راستہ بھی نہیں پوچھتے۔ اس لئے انہوں نے فرسٹ ایئر کی کلاسز کا سائن لکھ کر اسے لیڈیز ٹوائلٹ کے رخ پر اٹکا کر اس پر تیر کا نشان بھی بنا دیا تھا۔

اب وہ لوگ گراؤنڈ میں کھڑے تھے۔ فرسٹ ایئر کے طلباء اور طالبات کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ لوگ اپنے گھبرائے ہوئے انداز سے الگ ہی پہچانے جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے۔۔۔ آپ فرسٹ ایئر میں ہیں۔۔۔ تعارف ہوتا اور ٹولیاں بن جاتیں۔ وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے۔ لیکن صاف نظر آتا کہ وہ بری طرح نروس ہو رہے ہیں۔

ایسے میں وہ لڑکی کالج کے گیٹ سے داخل ہوئی۔ فرحان اسے دیکھتے کا

دیکھتا رہ گیا۔ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر حسین اور سرو قد تھی۔ اس نے ایک بڑی سی چادر میں جس اہتمام سے خود کو لپیٹ رکھا تھا، وہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ ورنہ کالجوں سے تو فیشن کی شروعات ہوتی ہے۔ اسے دیکھ کر پاکیزگی کا غیر معمولی احساس ہوتا تھا۔ اور اس کے انداز میں بلا کا اعتماد تھا۔ اعتماد ہی نہیں، وقار اور تمکنت بھی۔

ایک اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ تین لڑکیاں اور تھیں۔ وہ عام سی لڑکیاں تھیں۔۔۔ بے نیازی سے گلوں میں دوپٹے ڈالے ہوئے۔ اور وہ جس طرح گھل مل کر بات کر رہی تھیں، اس سے لگتا تھا کہ وہ بہت عرصے سے ایک دوسرے کو جانتی ہیں۔

فرحان ٹکٹکی باندھے اسی لڑکی کو دیکھتا رہا۔ وہ ان لڑکیوں کے درمیان ایسی تھی، جیسے بجھے بجھے پھیکے ستاروں کے درمیان چودھویں کا چاند۔

ایک اور غیر معمولی بات یہ تھی کہ لڑکیوں کی وہ ٹولی عین وقت پر کالج آئی تھی۔ ورنہ پہلے دن فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹ وقت سے پہلے ہی کالج پہنچتے ہیں۔

وہ ٹولی آگے بڑھتی رہی۔ فرحان اور اس کے ساتھی اب برآمدے میں تیر کے اشارے والے سائن بورڈ سے کچھ فاصلے پر جا کھڑے ہوئے تھے۔

پھر پہلے پیریڈ کی گھنٹی بجی، اور ہلچل سی مچ گئی۔

تیر کے اشارے والا سائن بہت نمایاں تھا۔ بیشتر طلبا اور طالبات نے اس سے استفادہ کیا۔ لیکن کچھ اتنے نروس تھے کہ اسے بھی نہ دیکھ پائے۔ ان کی غلط راہنمائی کے لئے فرحان اور اس کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ وہ انہیں اس طرف بھیج رہے تھے۔

لیکن فرحان اب اپنے ساتھیوں میں شامل ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں تھا۔ وہ تو مبہوت سا اس لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا، جو اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے اعتماد سے آگے بڑھ رہی تھی۔

فرحان کے دل میں اچانک خیال آیا کہ اسے اس لڑکی کو فرسٹ ایئر فول بننے سے بچانا ہوگا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے کٹ کر تیر کے نشان والے سائن بورڈ کی

طرف چل دیا۔ لیکن اس کی نظریں اس لڑکی پر جمی تھیں۔

اسی لمحے لڑکی کی ایک ساتھی کی نظر تیر والے سائن بورڈ پر ٹھہری، اور اس نے منفرد لڑکی سے سائن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ منفرد لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک ثانیے کو اس کی نظریں فرحان سے ملیں، پھر وہ سائن بورڈ کو دیکھنے لگی۔ اگلے ہی لمحے اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی سہیلی سے کچھ کہا۔

فرحان کو حیرت ہوئی، کیونکہ لڑکیاں سائن بورڈ کی طرف نہیں آ رہی تھیں۔

ان لڑکیوں کا رخ اب اس طرف تھا، جہاں کلاس روم تھے۔ فرحان حیران تھا، لیکن مطمئن بھی تھا۔ وہ اپنی ٹولی کی طرف چل دیا۔ اس دوران اس نے سعید کو ان لڑکیوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ سعید کو آواز دے لے۔ لیکن موقع مناسب نہیں تھا۔

وہ اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ سعید اور ان لڑکیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو صاف سن سکتا تھا۔

''ایکسکیوزمی......!'' سعید نے ان لڑکیوں سے کہا۔

وہ چاروں رک گئیں۔ منفرد لڑکی نے بڑی شائستگی سے کہا۔

''جی فرمائیے......!''

اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی اور لہجہ نرم۔ لیکن سعید جیسا پُراعتماد اور بے باک لڑکا بھی مرعوب ہوگیا۔ وہ بولتے ہوئے یوں اٹک رہا تھا، جیسے جو کہنا چاہتا ہو، اسے ترتیب نہ دے پا رہا ہو۔

''آپ لوگوں نے شاید وہ بورڈ نہیں دیکھا؟'' اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی! دیکھا ہے۔'' منفرد لڑکی نے کہا۔

''تو پھر......؟'' اس سے زیادہ سعید سے کچھ نہیں کہا گیا۔

''اسی سے تو راہنمائی حاصل کی ہے ہم نے۔'' منفرد لڑکی کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

''لیکن کلاس روم تو اس طرف ہیں۔''

''ہم کلاس روم میں تو نہیں جا رہے ہیں۔''

''تو پھر آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''اصولاً آپ کو ہم سے یہ بات نہیں پوچھنی چاہئے۔'' منفرد لڑکی کے لہجے میں تحکم در آیا۔

''دیکھیں نا، ہمیں بتانا اچھا نہیں لگے گا اور آپ کو سننا۔'' تحکم کے باوجود اس کے لہجے میں وہی نرمی اور آواز میں وہی شیرینی تھی۔

سعید حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

ایک اور لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہم لیڈیز ٹوائلٹ جا رہے ہیں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض؟'' دوسری لڑکی بولی۔

منفرد لڑکی نے انہیں گھور کر دیکھا۔ لیکن بولی کچھ نہیں۔

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔'' سعید نے گڑبڑا کر کہا۔

''لیکن آپ کی کلاس نکل جائے گی۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔''

سعید پلٹ آیا، اور لڑکیاں آگے چلی گئیں۔ سعید کے چہرے پر کھسیاہٹ تھی۔

''مجھے تو تم فرسٹ ائیر کے لگ رہے ہو۔'' طارق نے اس پر چوٹ کی۔

سعید کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''یار...! یہ لڑکیاں تو بہت تیز ہیں۔ فرسٹ ائیر کی تو ہرگز نہیں لگتیں۔''

''تو پھر......؟''

''کسی اور کالج سے فیل ہو کر آئی ہیں۔ اسی لئے اتنی خرانٹ لگ رہی ہیں۔ تجربہ کار معلوم ہوتی ہیں۔''

''یہ ہمارا کالج ایسا گیا گزرا تو نہیں۔'' فرحان نے کہا۔

اتنی دیر میں فرسٹ ائیر فولز کی ٹولیاں، کلاس روم، کی زیارت کے بعد واپس آنے لگی تھیں۔ اب وہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ نروس تھے۔ اس بار فرحان اور

اس کے ساتھیوں نے ان کی صحیح راہنمائی کر دی۔

تو یہ تھا ان کا تعارف! اب تک لڑکیاں فرحان کے پیچھے بھاگتی رہی تھیں۔ مگر اس نے کبھی ان میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ اب یہ لڑکی اسے بھا گئی تھی۔ اور وہ عام لڑکوں کی طرح وقت گزاری کا قائل بھی نہیں تھا۔ اس لئے وہ اندھا دھند اس لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا۔ اس نے خود کو بہت وقت دیا۔ وہ خود کو اور اپنے جذبے کو اچھی طرح تولنا چاہتا تھا۔ کیونکہ یہاں یہ امکان تھا کہ وہ محض اپنے منفرد ہونے کی وجہ سے اچھی لگی ہو۔ ایسی پسندیدگی وقتی ہوتی ہے، اور وہ وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ وہ دور دور سے مشاہدہ کرتا رہا، اور اپنی پسندیدگی کا تجزیہ بھی کرتا رہا۔

درحقیقت اسے اس سے بہت فائدہ ہوا۔ اس عرصے میں وہ صرف خود کو ہی نہیں، اس لڑکی کو بھی سمجھتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پہلی نظر کی پسندیدگی کو اہمیت دینے کا قائل بھی نہیں تھا۔ اس نے عقل مند لڑکیاں بھی دیکھی تھیں، جو لڑکوں کے لئے جال کے طور پر انفرادیت اپناتی تھیں۔ بعد میں وہ عام لڑکیاں ہی ثابت ہوتی تھیں۔

اس کی توقع کے عین مطابق چند ہی روز میں کالج کا ہر لڑکا اس لڑکی کا دیوانہ ہوگیا۔ جو خود کو دکھانے کے بجائے چھپاتی تھی، بہت سنبھال کر رکھتی تھی۔ ہر سینئر لڑکے نے اس کی طرف بڑھنے، اور راہ و رسم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن پہلی کوشش کے بعد دوسری کوشش کسی نے بھی نہیں کی۔ یوں اس لڑکی کے ناکام عاشقوں کی انجمن بنتی گئی۔

اپنی ناکامی پر ہر لڑکا اپنے اپنے انداز میں تبصرہ کرتا تھا۔ مگر خلاصہ یہی تھا کہ انگور کھٹے ہیں۔ فرحان سب کی باتیں بہت غور سے، اور خاموشی سے سنتا تھا۔ اس نے کبھی کسی بیہودہ تبصرے پر کسی کو نہیں ٹوکا۔ وہ اپنی کہانی نہیں بنوانا چاہتا تھا۔ وہ تو بس اس لڑکی کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اسے غیرمعمولی تحمل سے کام لینا پڑا تھا۔ ورنہ بعض تبصروں نے تو اسے جارحیت پر اکسایا تھا۔ اور اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا تھا۔

''اس چادر کو تم کیا سمجھتے ہو؟'' ایک ناکام لڑکے نے سینہ پھلاتے ہوئے

کہا۔

''وہ اس میں خود کو چھپا کر رکھتی ہے۔'' دوسرے لڑکے نے جو اپنی واجبی شکل وصورت اور چھوٹے قد کی وجہ سے دوڑ میں شامل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، بڑے احترام سے کہا۔

''درست! لیکن یہ چادر حسن کا خزانہ چھپانے کے لئے نہیں، وہ چھپانے کے لئے ہے، جو اس کے پاس نہیں ہے۔''

''اس کا مطلب .....؟''

''مطلب یہ کہ اندر ایسا کچھ ہے ہی نہیں، جسے چھپایا جائے۔''

''ایگزیکٹلی!'' ایک سینئر ناکام عاشق نے اچھل کر کہا۔

''وہ چادر اتار دے تو کوئی اس پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالے گا۔''

''غلط! اس کا چہرہ اتنا خوب صورت ہے کہ کوئی بار بار دیکھے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔'' مستقبل قریب میں قسمت آزمائی کا ارادہ رکھنے والے ایک امیدوار نے کہا۔

لیکن تمام ناکام عاشقوں کو یہ تازہ ترین تھیوری پسند آئی تھی۔

''میں نے تو اسی لئے زیادہ وقت برباد نہیں کیا اس پر۔'' ان میں سے ایک بولا۔

مگر ایک بات تھی، جس پر وہ سب متفق تھے۔ وہ لڑکی مغرور تھی نہ بداخلاق۔ اس نے کبھی کسی کی ناشائستگی پر بھی جارحیت سے کام نہیں لیا تھا۔ وہ بہت مہذب تھی۔ سخت اور حتمی الفاظ بھی اتنے نرم لہجے میں بولتی کہ برا نہیں لگتا۔ اس نے کبھی کسی کی توہین نہیں کی تھی، کبھی کسی کو شرمندہ نہیں کیا تھا۔

''صرف اس لئے کہ وہ جانتی ہے کہ اس کے پاس غرور کرنے کو کچھ ہے بھی نہیں۔'' تازہ ترین ناکام عاشق نے کہا۔

اس پر ایک اعتراف سامنے آیا۔ ایک پرانے ناکام عاشق نے دھیرے سے کہا۔

''نہیں یار! وہ سچ مچ بہت اچھی ہے۔''

"کیسے......؟"

"میں نے مختلف اسٹریٹجی اپنائی تھی اس کے لئے۔ میں نے کہا ...... لڑکے آپ کے بارے میں بہت خراب باتیں کرتے ہیں۔ اس پر وہ بولی...... میرے غیاب میں اگر کوئی میرے بارے میں ایسی باتیں کرے، جو اللہ کو بری لگیں تو وہ اپنا نقصان ہی کر رہا ہے نا! مجھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے کہا ...... وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ میرا جی مرنے مارنے کو چاہنے لگتا ہے۔ کسی دن ...... اس نے میری بات کاٹ دی، کہنے لگی...... ایسا کچھ کریں گے تو آپ اپنی حد سے تجاوز کریں گے۔ میں نے پوچھا کیسے؟ بولی...... آپ میرے بھائی ہوتے تو آپ کو یہ حق ہوتا۔ اور میں تو پھر بھی آپ کو روکتی۔ برداشت بڑی چیز ہوتی ہے۔ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ لیکن میرا اور آپ کا کوئی رشتہ قائم بھی تو ہوسکتا ہے۔ اس پر اس نے کہا ...... دیکھیں، ہم یہاں علم حاصل کرنے کے لئے آئے ہیں، رشتے قائم کرنے نہیں۔ میں نے اسے اکسایا ...... آپ تصور بھی نہیں کرسکتیں کہ وہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ کے بارے میں۔ اس نے بے نیازی سے کہا...... اچھا ہی ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا، تب بھی میں انہیں برا نہیں سمجھتی۔ بلکہ میں ان کے لئے اللہ سے ہدایت کی دعا کرتی۔ ہم سب اس کالج کے اسٹوڈنٹ ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے لئے بہت محترم ہیں۔ اب کوئی میرا احترام کرے، نہ کرے، میں تو سب کا احترام کرتی ہوں۔ میں نہ زبان سے کسی کی برائی کرتی ہوں، نہ دل میں کسی کے لئے برائی رکھتی ہوں۔" وہ کہتے کہتے رکا، اور بڑی حسرت سے بولا۔

"اب تم ہی بتاؤ، ایسی لڑکی سے تو اظہارِ محبت بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"چھوڑو یار...... ! یہ سب دکھاوا ہے۔ اس کی چادر کی طرح......" تازہ ترین ناکام عاشق نے بلبلا کر کہا۔

"ابھی تو تم اس کی چادر کو پردہ قرار دے رہے تھے...... اس کے خالی پن کا۔" مستقبل قریب کے عاشق نے احتجاج کیا۔

"ارے یار...... ! یہ اپنے شہزادہ گلفام نے کچھ نہیں کیا اس سلسلے میں۔" سعید نے اچانک کہا۔ اشارہ فرحان کی طرف تھا۔

"اس کا تو معاملہ ہی الٹا ہے۔ ہمیشہ سے لڑکیاں اس کے پیچھے بھاگتی رہی ہیں اور یہ ان سے بھاگتا رہا ہے۔" طارق نے کہا۔

اب سب فرحان کی طرف متوجہ تھے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"مجھ سے کچھ سننا چاہتے ہو تم لوگ ......؟" فرحان نے پوچھا۔

"ارشاد......!" سعید نے مسخرے پن سے کہا۔

"اچھا نہیں لگے گا تم لوگوں کو۔"

"برداشت کرلیں گے۔" طارق بولا۔

"تو سچ یہ ہے کہ تم لوگ بڑی گھٹیا گفتگو کرتے ہو۔ اور یہ گفتگو ثابت کرتی ہے کہ تمہاری سوچ اور ذہنیت اس لے بھی بری ہے۔ ایک اچھی اور نیک لڑکی کے بارے میں اتنے گندے انداز میں سوچنا، اور ایسی رکیک گفتگو کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ ہم طالب علم ہیں۔ یہاں سے علم حاصل کر کے نکلنے کے بجائے ہم یہاں سے یہ سب سیکھ کر نکلیں گے۔ یہ تو اس درس گاہ کی بھی توہین ہے۔ میں اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا۔" فرحان نے نرم لہجے میں کہا۔

بیشتر لڑکے شرمندہ نظر آنے لگے۔ لیکن ان میں کچھ ڈھیٹ بھی تھے۔

چھ ماہ کے عرصے میں فرحان نے خود کو بھی اچھی طرح جانچ لیا اور اس لڑکی کو بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی۔ شاید کوئی خوبی ایسی نہیں تھی، جو اس میں موجود نہ ہو۔ برداشت اور تحمل ایسا کہ کبھی کسی سے اس نے سختی سے بات نہ کی۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک کم از کم چار پانچ لڑکے کالج سے نکالے جا چکے ہوتے۔ پڑھائی کے معاملے میں وہ بہت سنجیدہ تھی۔ خالی پیریڈ ہوتا تو زیادہ تر وہ لائبریری میں ہوتی۔ کینٹین وہ جاتی ضرور تھی۔ مگر اس کے ساتھ صرف لڑکیاں ہوتیں۔ ظاہری خوبیاں تو تھیں ہی، اس کی باطنی خوبیاں اور زیادہ تھیں۔

فرحان کے دل میں اس کے لئے گہری پسندیدگی تھی۔ وہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح وہ کبھی اس کی طرف نہیں لپکا۔ کبھی اس

کا دل بھی نہیں چاہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے ناپسند کرے۔

لیکن نہ جانے وہ پسندیدگی محبت میں تبدیل ہوگئی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ گہری ہوتی گئی۔ وہ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ خود پر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس سے بات کرنے کو، اس کے ساتھ مل بیٹھنے کو دل مچلنے لگا۔ وہ بچوں کی طرح بے تاب ہوگیا۔ لیکن اس کے لئے یہ بھی بہت اہم تھا کہ وہ اسے برا نہ سمجھے، عام لڑکوں جیسا نہ سمجھے۔ یعنی اسے خود پر قابو رکھنا تھا۔ اندھا دھند کچھ نہیں کرنا تھا۔

اس کی پڑھائی متاثر ہونے لگی۔ گھر میں بھی وہ کھویا کھویا رہتا۔ ہر وقت اس کا تصور اس کے دماغ پر چھایا رہتا۔ ہر لمحہ وہ اس کے بارے میں سوچتا۔ اس نے خود کو ٹٹولا اور جان لیا کہ وہ اس کے لئے کالج کی کوئی ایکٹی وٹی نہیں۔ وہ اس کے لئے نشانِ منزل ہے..... نشانِ مستقبل۔ اور یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔

وہ لائبریری جانے لگا۔ جاتا تو وہ پہلے بھی تھا، لیکن صرف کسی ضرورت کے تحت۔ لیکن اب وہ تواتر سے جانے لگا۔ لائبریری میں کبھی بہت زیادہ ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ لائبریری بہت بڑی تھی۔

دشواری یہ تھی کہ وہ سب کے سامنے اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے اس کا امیج خراب ہوتا۔ لڑکے سمجھتے کہ دوسروں کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے اب وہ اس پر جال ڈال رہا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ اسے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اسے غلط نہ سمجھ لے۔ یہ تو بہت بڑا نقصان ہوتا اس کے لئے۔

وہ سوچ سوچ کر تھک گیا کہ اس سے کہاں ملے، کیسے ملے اور کس طرح بات کرے۔ لیکن کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر قدرت نے اسے موقع فراہم کر دیا۔

اس روز صبح سے بارش ہو رہی تھی۔ کالج جانے کا موڈ نہیں بن رہا تھا۔ پھر بھی اس نے گاڑی نکالی اور کالج کی طرف چل دیا۔ بارش اس وقت بھی ہو رہی تھی۔

وہ کالج پہنچا تو وہاں حاضری برائے نام تھی۔ کلاسوں میں کوئی تھا ہی

نہیں۔ اسٹوڈنٹ تو کیا، لیکچرز بھی غائب تھے۔ کینٹین میں دو تین لڑکے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں اس کا شناسا کوئی نہیں تھا۔

وہ کامن رومز کی طرف گیا۔ گرلز کامن روم تو سنسان تھا۔ بوائز کامن روم میں لڑکے اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔ کچھ کیرم کھیل رہے تھے، کچھ شطرنج اور کچھ ٹیبل ٹینس۔

وہ وہاں سے پلٹ آیا۔ گھر واپس جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ موسم اتنا اچھا تھا۔ اس نے سوچا، لائبریری میں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ وہ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر ارجمند کے بارے میں سوچ سکے گا۔

راستے میں اسے خداداد مل گیا۔ وہ کالج کا چپڑاسی تھا، اور کالج کی حدود میں ہی بنے ایک کوارٹر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ فرحان اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ بھی فرحان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فرحان کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کا جنرل سیکرٹری بھی تھا۔

فرحان نے سلام کیا۔

"کیسے ہو بابا!"

"اللہ کا شکر ہے فرحان بابو! واپس جا رہے ہیں؟"

"نہیں بابا! سوچا ہے، کچھ دیر لائبریری میں بیٹھوں۔ لائبریری کھلی ہے نا؟"

خداداد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"وقت پہ کھول دی تھی فرحان بابو! پر مس صاحبہ نہیں آئی ہیں آج۔"

وہ لائبریرین کی بات کر رہا تھا۔ مگر فرحان کو اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے کوئی کتاب ایشو تو کرانی نہیں تھی۔

وہ لائبریری میں داخل ہوا اور کسی ایسی جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا، جہاں سے لائبریری میں داخل ہوتے ہی اسے نہ دیکھا جا سکے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے ڈسٹرب کرے۔

ایسا ایک گوشہ اسے نظر آیا۔ مگر ایک لمحے کو اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول

گیا۔ وہاں ارجمند بیٹھی تھی۔ وہ مطالعے میں ایسی منہمک تھی کہ اسے اس کی آمد کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے دل میں بس ایک ہی خیال آیا..... قدرت نے اسے بات کرنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔

اس نے دھیرے سے کھنکھار کر اسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ وہ ایک دم سے اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ تو بدتہذیبی ہوتی۔

ارجمند نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''السلام علیکم!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ وعلیکم السلام کہتا ہوا اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے پہنچ کر وہ رکا۔

''آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''اعتراض تو مجھے ہے۔'' ارجمند نے بڑی نرمی اور شائستگی سے کہا۔

''وجہ پوچھ سکتا ہوں میں؟''

''پوری لائبریری خالی پڑی ہے۔ آپ اور کہیں بھی بیٹھ سکتے ہیں۔''

''دیکھیے، مجھے یہاں آپ کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ میں تو سکون سے کچھ دیر یہاں بیٹھ کر سوچنے، اور کچھ مطالعہ کرنے کے لئے آیا تھا۔۔۔''

''وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ آپ کہیں بھی بیٹھ کر یہ سب کچھ کریں، میں آپ کو بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی۔''

''آپ کو اپنی ڈسٹرب کرنے کی بے پناہ صلاحیت کا علم ہی نہیں ہے۔'' فرحان نے بے ساختہ زیرِ لب کہا۔

اس نے کچھ سنا تو..... لیکن پوری بات سن نہیں سکی۔

''سوری.....! مجھ سے کچھ کہا آپ نے.....؟''

''جی نہیں.....! میں تو خود کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔'' فرحان نے کہا۔

''آپ نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ میں کہہ رہا تھا کہ آپ کو

بیٹھے دیکھا تو سوچا، آپ سے کچھ بات کر لوں۔ اس پر کوئی اعتراض ہے آپ کو.....؟''

''جی نہیں.....!''

''تو میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں.....؟'' فرحان بیٹھنے لگا۔

''اس پر مجھے اعتراض ہے۔'' ارجمند نے جلدی سے کہا۔

''میں دور..... وہاں بیٹھ کر آپ سے باتیں کروں.....؟'' فرحان نے افتادہ تر گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

''تو ہمیں چیخ چیخ کر باتیں کرنی ہوں گی۔ اور اگرچہ یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ کچھ عجیب سا نہیں لگے گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرا مطلب یہ ہے کہ یہ گوشہ تنہائی کے لئے ہے۔ کوئی لائبریری میں داخل ہوگا تو اس کی نظر براہِ راست اس طرف نہیں اٹھے گی۔ لیکن آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمارا دروازے کے سامنے بیٹھنا مناسب ہوگا۔''

''جو آپ کی مرضی.....!''

وہ نسبتاً سامنے کی میز پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''جی.....! فرمائیے.....!''

اچانک فرحان کو اپنا گلا خشک ہوتا محسوس ہوا۔ چند لمحے تو وہ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''

ارجمند نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کو میرا نام معلوم نہ ہو۔ آپ شاید نروس ہو رہے ہیں۔''

فرحان نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ارجمند! میں واقعی نروس ہو رہا ہوں۔ حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔'' اچانک ہی وہ پُراعتماد ہو گیا۔

"آپ نے وہاں بیٹھ کر بات کرنے سے احتراز کیا، تو کیا آپ لوگوں سے ڈرتی ہیں؟"

"جب تک میں کچھ غلط نہ کروں، اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔" ارجمند نے کہا۔

"لیکن احتیاط برتنا میرا فرض ہے کہ کوئی بلاوجہ میرے بارے میں کوئی برا گمان نہ کرے، غلط رائے قائم نہ کرے۔"

اس جواب نے فرحان کے اس پہلے تاثر کو اور مستحکم کر دیا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔

"مگر آپ مجھ سے یہ بات تو نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"جی نہیں......!" فرحان پھر نروس ہو گیا۔

"دراصل میں بہت متجسس ہوں آپ کے بارے میں۔"

"تجسس تو بس علمی ہی اچھا ہوتا ہے۔" ارجمند نے کہا۔

"پہلے میں ایک بات بتا دوں آپ کو۔ میں کسی کے بارے میں بھی بری رائے نہیں رکھتی۔ لیکن اپنے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے کا موقع کم ہی لوگ دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ یہ نہ بھولئے گا کہ ہمارا تعلق اس درس گاہ کے دم سے ہے، اور اس درس گاہ کے تقدس کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم دونوں طالب علم ہیں۔ آپ سینئر ہیں، اور میرے لئے محترم ہیں۔ میں آپ کو محترم ہی دیکھنا چاہتی ہوں۔"

فرحان کو حیرت ہونے لگی۔ اس نے کس عقل مندی اور شائستگی سے اسے بہت سی باتوں سے روک دیا تھا۔ پھر اسے تجسس کے حوالے سے ہی بات سوجھ گئی۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" اس نے کہا۔

"میں اپنے تجسس کی بات کر رہا تھا۔ چھ ماہ سے مجھے یہ تجسس ہے کہ آپ...... اور آپ کی وجہ سے آپ کی سہیلیاں کالج کے پہلے دن فرسٹ ایئر فول بننے سے کیسے بچ گئیں؟"

ارجمند کے چہرے سے تشویش کا وہ تاثر ڈھل گیا، جو تجسس پر فرحان کے

اصرار پر اس کے چہرے پر نمودار ہوا تھا۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔

"آپ نے اس پر سوچنے اور غور کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"بہت کی، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

"سیدھی سی بات تھی، میں دو دن پہلے اپنے چچا جان کے ساتھ آئی تھی، اور میں نے پورے کالج کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ہمارا کلاس روم کس طرح ہے۔ پھر میں نے پہلے دن کالج میں داخل ہوتے ہی آپ کا سیٹ اپ بھی سمجھ لیا۔ تیر کے نشان والا سائن بورڈ بہت مؤثر جال تھا۔ اور کوئی اس سے بھی بچ نکلے تو اصل راستے پر آپ کی ٹولی موجود تھی، راہنمائی کے لئے۔"

"کمال ہے!" فرحان نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"نہیں......! اس میں کمال کی کیا بات ہے؟"

"میرے نزدیک تو ہے۔"

"غلط تصور کی وجہ سے ہے۔"

"ذرا اس کی وضاحت بھی کر دیجئے۔"

"آپ کا تصور یہ ہے کہ فرسٹ ایئر والے سبھی گھبرائے ہوئے اور نروس ہوں گے۔"

"تو ہوتا بھی یہی ہے۔"

"لیکن آپ کو دوسرا امکان بھی ذہن میں رکھنا چاہئے۔ فرسٹ ایئر Fools کے درمیان فرسٹ ایئر Sages بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ آپ نے کمال کر دیا۔"

"دیکھیں، ایک تو میں پہلی بار کہیں جاؤں تو اس کے بارے میں جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہ میری فطرت ہے۔ دوسرے اسکول میں میری ایک کلاس سینئر ایک لڑکی سے بڑی دوستی تھی۔ اس نے مجھے فرسٹ ایئر فول کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ تو میں نے چچا جان کے ساتھ آ کر کالج کے محل وقوع کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا۔ بے وقوف بنائے جانے کا سب سے قوی امکان غلط راہنمائی کے ہی ذریعے تھا۔ اس کے باوجود میں چوکنا تھی، اور اندر سے اتنی زیادہ پُر اعتماد بھی نہیں

تھی۔'' اس نے توقف کیا، ایک گہری سانس لی اور بولی۔

''تو اس روز آپ کو میری وجہ سے مایوسی ہوئی؟''

''جی نہیں!''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب میں نے آپ کو کالج میں داخل ہوتے دیکھا تو اسی وقت سوچ لیا تھا کہ آپ کو بے وقوف نہیں بننے دوں گا۔''

وہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''آپ کو یقین نہیں آیا نا اس بات پر؟'' فرحان نے پوچھا۔

''آپ سمجھ رہی ہیں نا کہ میں انگور کھٹے ہیں، والی بات کر رہا ہوں۔''

''جی نہیں ....! میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

''تو آپ نے کوشش کی تھی مجھے بچانے کی۔ مگر کیسے؟ اس بارے میں کچھ بتائیں گے آپ۔''

''جی نہیں! جو بات ہوئی ہی نہیں، اسے بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''میں جانتی ہوں۔ الحمد للہ، میرا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ کالج میں داخل ہوتے ہی میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا تھا۔ تبھی تو آپ کا پورا سیٹ اَپ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ آپ ہی اپنی ٹولی کے سردار ہیں۔''

فرحان اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''مگر آپ نے میری کوشش کو کیسے سمجھا؟''

''اس وقت تو نہیں سمجھا تھا۔ اس وقت تو میرا ذہن الجھ گیا تھا۔'' ارجمند نے بڑی سچائی سے کہا۔

''سمجھ میں تو اب آیا ہے، آپ کی بات سننے کے بعد۔''

''مجھے تو اب بھی یقین نہیں ہے کہ آپ سمجھ پائی ہیں؟''

''سن لیں تو شاید یقین آ جائے۔'' وہ بولی۔

''جب ہم نے بڑھنا شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ آپ اپنی ٹولی سے

الگ ہو کر تیر کے نسان والے بورڈ کی طرف چلے گئے۔ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی۔ کیونکہ ہم تو صحیح سمت میں جا رہے تھے، اور آپ لوگ وہاں ہمیں بھٹکانے کے لئے کھڑے تھے۔ پھر آپ کو وہاں سے ہٹنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری سمجھ میں اس کی وجہ نہیں آئی۔''

''اور اب آپ سمجھ گئیں؟''

''ہاں! ہم آپ کی ٹولی کے پاس سے گزرنے والے تھے۔ آپ یہ سوچ کر تیر کے نشان والے بورڈ کی طرف چلے گئے کہ آپ کے ساتھی یقیناً ہمیں اس طرف بھیجیں گے۔ آپ نے سوچا کہ جب ہم وہاں آئیں گے تو آپ ہمیں صحیح راستہ دکھا کر ہمیں بے وقوف بننے سے بچا لیں۔ ہاں! یہی بات تھی۔ اب میں سمجھ سکتی ہوں۔''

فرحان نے سر جھکا لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کتنی عجیب لڑکی ہے۔ غیر معمولی طور پر ذہین اور سمجھدار۔

''آپ تو یوں شرمندہ ہو رہے ہیں، جیسے خدانخواستہ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔''

''میں نے کیا تو کچھ بھی نہیں۔''

''عمل کا خلوص ہی تو سب کچھ ہوتا ہے. فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے۔'' ارجمند نے کہا۔

''مجھے خوشی ہے کہ آپ میری قائم کی ہوئی رائے سے بہتر اور بلند ثابت ہوئے۔ میرے دل میں ہمیشہ آپ کی عزت رہی، اور اب اور بڑھ گئی ہے۔''

''یہ تو بتائیں کہ میں نے آپ کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟ جبکہ میں آپ کو جانتا بھی نہیں تھا۔''

''اس میں بتانے کی کیا بات ہے؟ یہ تو Under Stood ہے۔''

ایک لمحے کو فرحان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جیسے ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ مگر ارجمند کی آواز اسے پھر زمین پر لے آئی۔

''پسندیدگی تو فطری اور قدرتی چیز ہے۔'' ارجمند نے کہا۔

''کوئی کسی کو پہلی نظر میں اچھا لگتا ہے۔ لیکن اس پسندیدگی کو غلط رخ پر نہیں جانا چاہئے۔''

''پسندیدگی کے کچھ رُخ درست اور فطری بھی تو ہوتے ہیں۔''

''لیکن درس گاہوں میں آدمی کا بنیادی مقصد صرف حصولِ علم ہونا چاہئے۔ ہر جذبہ ہر مقام کے لئے نہیں ہوتا، چاہے اچھا ہو۔''

''ہمارے درمیان دوستی بھی تو ہوسکتی ہے۔'' فرحان نے تجویز پیش کی۔

''میں صرف لڑکیوں سے دوستی کی قائل ہوں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں نہیں چاہتی کہ میرے کسی بے ضرر اور صاف ستھرے ظاہری عمل کی بنیاد پر کوئی میرے متعلق غلط رائے قائم کرے، کوئی بدگمانی ہو۔''

''تو پھر میرے اور آپ کے درمیان تعلق ہی کیا رہ جاتا ہے؟'' فرحان نے مایوسی سے کہا۔

''تعلق تو ہے۔ آپ میرے کالج فیلو ہیں، میرے سینئر ہیں، اور میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ اور میں آپ سے بھی یہی اُمید رکھتی ہوں کہ آپ کبھی کسی بات سے میری عزت میں کمی نہیں ہونے دیں گے۔ نہ اپنی نظر میں اور نہ دوسروں کی نظر میں۔ اور نہ ہی درس گاہ کے تقدس کو مجروح ہونے دیں گے۔''

''میں آپ کی امید پر پورا اتروں گا۔'' فرحان اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن آپ کو کسی بھی وقت، کسی بھی طرح کی مدد درکار ہو تو مجھ سے ضرور کہیئے گا۔ میں طلبا کی یونین کا صدر بھی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے۔ شکریہ......!''

''خدا حافظ......! اب آپ اپنے گوشہ عافیت میں سکون سے بیٹھ سکتی ہیں۔''

فرحان لائبریری سے نکلنے والا تھا کہ خداداد لائبریری میں داخل ہوا۔

''میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ آپ کے لئے چائے لاؤں فرحان بابو!''

''میں تو جا رہا ہوں بابا! آپ ارجمند بی بی کے لئے چائے لے آئیں۔

اور ہاں! ان کا خیال رکھیئے گا۔''

یہ کہہ کر وہ لائبریری سے نکل آیا تھا۔

اس کے بعد ان کے درمیان اتفاقیہ طور پر سامنا ہوتا رہا۔ دونوں کے درمیان پرُتکلف علیک سلیک ہوتی۔ اور بس، ارجمند کو بھی اس سے کسی بھی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی، اور اپنی پڑھائی کے بارے میں بہت سنجیدہ تھی۔

فرحان بھی اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ یہ عام معاملہ نہیں ہے۔ اس نے اپنے لئے راستے کا تعین کرلیا تھا۔

بی اے کر کے اس نے سکون کا سانس لیا۔ ماسٹرز کے لئے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یوں وہ کالج سے رُخصت ہوگیا، یعنی ارجمند کی عائد کی ہوئی ایک پابندی سے آزاد ہوگیا۔

اب وہ اس سے بات کرنے کا حق رکھتا تھا۔ اب وہ کوئی عملی قدم بھی اٹھا سکتا تھا۔

پہلے تو اس نے سوچا کہ کسی دن کالج جائے، وہاں سے ارجمند کو پک کرے اور کسی مناسب جگہ پر سکون سے بیٹھ کر اس سے دل کی بات کہے، تاکہ اس کے بعد معاملات آگے بڑھائے جاسکیں۔ لیکن صرف چند لمحوں میں اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند کو اپنی عزت کا، دوسروں کی نظر میں اپنے امیج کا کتنا خیال رہتا ہے۔ وہ کالج سے، سب کی نظروں کے سامنے باہر آ کر اس کی گاڑی میں بیٹھنا کیسے گوارہ کرتی۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کالج میں اس کے متعلق کیسی کیسی چہ میگوئیاں ہوتیں۔ یہ تو وہ خود بھی پسند نہیں کرتا۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک فیصلہ کرلیا۔

ارجمند کے گھر کا فون نمبر اس کے پاس تھا۔ سہ پہر کے وقت اس نے نمبر ملایا۔ وہ یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ کسی اور نے فون ریسیو کیا تو وہ کس طرح بات کرے گا؟ کیسے کہے گا کہ ارجمند کو بلا دیجئے۔ اور کون جانے، ارجمند کو یہ بات بری لگے۔

لیکن اس کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔
قسمت بہرحال اس کے ساتھ تھی۔ فون ارجمند نے ہی ریسیو کیا۔
''ارجمند! میں فرحان بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔
''ارے آپ......! کہیئے......! میرا فون نمبر کیسے ملا آپ کو......؟'' وہ حیران تھی۔
''کالج میں آپ کے مکمل کوائف موجود ہیں۔''
''تو یہ زحمت کیسے کی آپ نے......؟'' اس کے لہجے میں اچانک بے رخی آ گئی۔
''اتنی اجنبیت سے بات نہ کریں ارجمند......! آپ کا کہنا تھا کہ آپ میری بہت عزت کرتی ہیں، اور آپ کا خیال تھا کہ میں اس عزت کا مستحق بھی ہوں۔''
''سوری فرحان!'' وہ فوراً ہی شرمندہ ہوگئی۔
''دراصل یہ اتنا اچانک...... میں حیران ہوں۔''
''یہ ایسی اَن ہونی تو نہیں۔''
''میرے لئے تو اَن ہونی ہی ہے، خیر...... کیسے یاد کیا آپ نے......؟''
''یاد تو میں کرتا ہی رہتا ہوں آپ کو۔ اس وقت ایک ضروری بات کے لئے فون کیا ہے۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''
چند لمحے خاموشی رہی۔ شاید یہ فرمائش اس کے لئے اس کے فون سے بھی زیادہ حیران کن تھی۔ پھر وہ بولی۔
''ملنا چاہتے ہیں......؟ کہاں......؟''
''کہیں بھی، جہاں ہم سکون سے بیٹھ کر بات کرسکیں۔''
''لیکن کیوں......؟''
''مجھے آپ سے ایک بہت ضروری اور اہم بات کرنی ہے۔''
''دیکھئے......! یہ مناسب نہیں، اور میں اسے اچھا بھی نہیں سمجھتی۔''
''بہت ضروری ہے ارجمند......!'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

''دیکھیں...... میں نے دو سال میں بھی آپ سے ایسا کچھ نہیں کہا۔ کالج میں بھی ہمیشہ خیال رکھا۔''
''تو ٹھیک ہے۔ آپ میرے گھر آ جائیں۔''
وہ بری طرح گڑبڑا گیا۔ یہ عجیب غیر رومانوی لڑکی ہے۔ اس نے سوچا۔ بھلا کوئی کسی سے اظہارِ محبت کرنے کے لئے اس کے گھر جاتا ہے؟
''یہ...... یہ کیسے ممکن ہیں......؟''
''اس میں حرج بھی کیا ہے......؟''
''عجیب سا لگے گا۔ میں آپ سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں۔''
''مگر یہ مجھے عجیب سا لگے گا۔'' وہ سرد لہجے میں بولی۔
''آپ جانتی ہیں کہ میں کوئی ایسا ویسا......''
''اگر میں آپ کو ایسا ویسا سمجھتی تو آپ سے بات ہی نہ کرتی۔''
''تو پھر میری بات مان جائیں۔''
وہ ہچکچاتی رہی۔
''دیکھیں...... ہمارے ہاں ایسا ہوتا نہیں، اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے۔ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ لیکن گھر کی عزت سے زیادہ تو نہیں کرسکتی۔ بس یہی ایک صورت ہے کہ آپ میرے گھر آ جائیں۔''
''مجھے آپ سے بہت ذاتی بات کرنی ہے۔ وہاں کیسے کرسکتا ہوں؟''
یہ سن کر وہ بدک گئی۔
''ذاتی بات......! ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں بے مہری تھی۔
''تعلق تو ہے۔ اور وہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ میں آپ کا کالج فیلو رہا ہوں۔''
''اور اب نہیں رہے۔ تعلق تو ختم ہوگیا۔''
اس کا بہت دل دکھا یہ سن کر۔
''یہ تو عجیب بات کی آپ نے۔ جب میں کالج میں آپ کے ساتھ تھا تو آپ نے درس گاہ کے تقدس کا واسطہ دے کر مجھے سمجھایا۔ میں اس کا احترام کرتا

رہا۔ اور اب درس گاہ کا تعلق ختم ہو گیا تو آپ ایسے بے رخی سے بات کر رہی ہیں۔''
اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

اس کا لہجہ شاید اثر کر گیا تھا۔ وہ نرم ہو گئی۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے آپ کو بہت شائستہ اور مہذب پایا۔ لیکن میرے لئے یہ بہت مشکل ہے۔ آپ فون پر بات کیوں نہیں کر لیتے؟''

''فون پر اتنی تفصیلی بات نہیں ہو سکتی۔ پلیز ارجمند! ایک بار میری بات مان لیں۔''

وہ پھر ہچکچائی۔

''چلیں ...... ٹھیک ہے۔ کہاں ملنا چاہتے ہیں آپ ......؟''

''کسی ریسٹورنٹ میں۔''

''نہیں! یہ تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔''

وہ بے بسی سے سوچتا رہا۔

''لارنس گارڈن ......!''

''چلیں ...... ٹھیک ہے۔''

''شکریہ ......!'' وہ خوش ہو گیا۔

''تو پانچ بجے۔ میں اندر گیٹ کے قریب ہی کھڑا ملوں گا۔ اور ہاں! میں اپنی گاڑی میں نہیں آؤں گا۔ میرا گھر درمیان میں ہے۔ واپسی میں آپ مجھے ڈراپ کر دیجئے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔''

اس ملاقات کے لئے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ تیار ہوا۔ وہ تو جیسے بردکھولے میں جا رہا تھا۔

وہ پونے پانچ بجے لارنس گارڈن پہنچ گیا۔ گیٹ کے اندر کی طرف کھڑے ہونے کی بات اس نے ارجمند کے خیال سے کی تھی کہ شاید اس کے ساتھ گارڈن میں داخل ہونا وہ پسند نہ کرے۔

ارجمند پورے پانچ بجے آئی۔ فرحان نے گاڑی باہر رکتے دیکھی تو جھنجلا

گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ گاڑی خود ہی ڈرائیو کر رہی ہو گی۔ لیکن نہیں، وہ تو ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ہاتھ میں باسکٹ لئے اتری۔ اس نے ڈرائیور سے کوئی بات کی۔ ڈرائیور گاڑی آگے لے گیا، اور وہ گیٹ کی طرف مڑی۔

اندر آتے ہی اس نے فرحان کو دیکھ لیا۔

''السلام علیکم!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فرحان نے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ وہ عام سے کپڑوں میں بھی خوب صورت لگ رہی تھی۔ چادر ہمیشہ کی طرح اس نے بڑے سلیقے سے اوڑھی ہوئی تھی۔

وہ اندر گئے۔

''کہاں بیٹھیں گی؟'' فرحان نے اس سے پوچھا۔

''کوئی پرسکون گوشہ ہو، جہاں ہجوم نہ ہو۔''

فرحان کو وہ جواب بہت حوصلہ افزا لگا۔

وہ دونوں سائے میں گھاس پر بیٹھ گئے۔ ارجمند نے باسکٹ سے تھرماس نکالا۔ پھر دو پیالیاں، اور ایک بڑی پلیٹ برآمد کی۔ پھر ایک نیپ کن نکالا۔ اس میں چھ سموسے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ اس نے پلیٹ میں رکھ دیئے۔ آخر میں اس نے کپڑے کے دو اور نیپ کن نکالے، ایک اس کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے آگے پھیلا لیا۔

''یہ لیجئے ...... چائے جب آپ کہیں گے، نکال دوں گی۔''

فرحان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے تو اچھی خاصی پکنک کر ڈالی۔'' اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں قرض رکھنا پسند نہیں کرتی۔ موقع ملتے ہی چکا دیتی ہوں۔'' اس نے جلدی سے وضاحت کر دی۔

''میں سمجھا نہیں ......!''

''آپ نے اس روز بارش کے موسم میں، لائبریری میں مجھے چائے پلائی تھی نا ......!''

"مگر سموسے تو نہیں کھلائے تھے میں نے۔"

"وہ چائے اس وقت میرے لئے نایاب تھی۔ ضرورت محسوس کر رہی تھی میں، لیکن کینٹین نہیں جا سکتی تھی۔ تو وہ آپ کا احسان تھا۔ اب ان سموسوں کو آپ اپنا منافع سمجھ لیں۔"

فرحان نے سموسہ اٹھایا۔ وہ اب بھی گرم تھا، یعنی بہت تازہ۔ اس نے کھا کر دیکھا۔ خستہ اور لذیذ۔

"بہت لذیذ منافع ہے۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"کہاں سے لئے ہیں؟"

"خود بنا کر لائی ہوں۔ بازار کے سموسے مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

فرحان کے لئے وہ بھی حوصلہ افزائی تھی۔

"کمال کر دیا آپ نے۔ بازار میں تو ایسے سموسے مل ہی نہیں سکتے۔"

"تو آپ طبیعت سے کھایئے۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

وہ خود ایک سموسہ لینے کے بعد رک گئی تھی۔ فرحان نے اسے ٹوکا تو وہ بولی۔

"میرے لئے بس ایک ہی کافی ہے۔"

"تو پھر اتنے سارے کیوں لے آئیں؟"

"یہ سوچ کر کہ شاید آپ کو اچھے لگیں تو کمی کا احساس نہ ہو۔"

اور واقعی فرحان نے سارے سموسے صاف کر ڈالے۔ ارجمند نے پیالیوں میں چائے انڈیلی۔ انہوں نے نیپ کن سے ہاتھ صاف کئے، اور ارجمند نے نیپ کن باسکٹ میں ڈال دیئے۔

فرحان نے چائے کا پہلا گھونٹ لے کر کہا۔

"چائے بھی بہت عمدہ ہے۔ آپ نے ہی بنائی ہوگی۔"

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

"سوا پانچ بجے ہیں۔ چھ بجے میری گاڑی آئے گی۔ ہمیں اس سے پانچ منٹ پہلے گیٹ پر پہنچ جانا چاہئے۔"

"اتنا کم وقت.....؟"

"کوئی بھی بات کرنے کے لئے چالیس منٹ ضرورت سے زیادہ ہی ہیں۔ یہ ایک گھنٹہ میں نے خاص طور پر آپ کے لئے نکالا ہے۔"

"میں شکر گزار ہوں۔"

کب سے وہ ان لمحوں کا انتظار کر رہا تھا... دو سال سے۔ اور اب وہ مل گئے تھے تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ وہ گنگ سا بیٹھا تھا۔ اور یہ احساس اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر رہا تھا کہ لمحے تیزی سے گزر رہے ہیں۔

ارجمند بھی خاموش بیٹھی تھی۔ وہ اس کی مشکل آسان کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ البتہ چائے پیالی خالی ہوئی تو اس نے پوچھا۔

"اور چائے دوں آپ کو...؟"

"جی ہاں! پلیز.....!"

چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ لے کر اس نے ارجمند کو دیکھا، جو گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ اور نروس ہوگیا۔ اتنے رکھ رکھاؤ والی، باوقار اور پاکیزہ لڑکی سے دل کی بات کہنا آسان نہیں تھا۔

اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

"ارجمند.....!"

وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"جی.....! میں سن رہی ہوں۔"

"میں نے ہمیشہ آپ کی ہر بات کا پاس رکھا۔" اس نے تمہید باندھی۔

"جیسے آپ چاہتی تھیں، اس طرح درس گاہ کا احترام کیا، اس کے تقدس کا، اور آپ کی عزت کا خیال رکھا۔ مگر اب میں اس پابندی سے آزاد ہوں۔ اب میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ مگر وہ بے تاثر تھا۔

"جب میں نے پہلے دن، پہلے لمحے آپ کو کالج میں داخل ہوتے دیکھا تھا، مجھے اسی لمحے آپ سے محبت ہوگئی تھی۔"

وہ خاموش بیٹھی رہی۔

''آپ کو بری لگی میری بات......؟''

ارجمند نے نفی میں سر ہلایا۔

''محبت کوئی بری چیز تو نہیں ہے۔ پھر آپ نے جس طرح سے دو سال خود پر قابو رکھا، میری نظر میں تو آپ کی عزت اور بڑھ گئی۔''

فرحان نے سکون کا سانس لیا۔

''اور آج میں ہلکا ہوگیا۔''

''میں سمجھ سکتی ہوں، دل پر رکھا ہوا بوجھ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ زیادہ بھاری ہوتا جاتا ہے۔''

فرحان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ کم عمر تھی لیکن اس کی سوچوں میں، باتوں میں گہرائی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی محبت کرتی ہے، اس سے؟ یہ وہ سوال تھا، جس کا جواب اسے معلوم کرنا تھا۔

وہ متوقع نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ لیکن اب وہ خاموش تھی۔

''آپ بھی کچھ کہیں نا......!'' چند لمحے بعد اس نے کہا۔

''میں یہاں کچھ کہنے تو نہیں آئی تھی۔''

لہجے میں تو نہیں، الفاظ میں بے رخی تھی۔

''لیکن بات کے جواب میں تو بات کی جاتی ہے۔''

''آپ کی بات کے جواب میں میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔''

وہ مایوس ہوا۔

''میں نے ایک بات آپ سے کی، جس سے آپ کا تعلق ہے۔ اب کچھ تو کہنا ہوگا آپ کو۔''

''اگر آپ میرا ردِعمل جاننا چاہتے ہیں تو میں یہی کہوں گی کہ آپ ہر اعتبار سے بہت اچھے انسان ہیں۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جذبوں پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی تو یہ آپ کا حق ہے۔ میں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کر سکتی۔''

''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا آپ بھی......''

ارجمند نے نرم لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''نہیں......! میں تو تعلیم کے دوران محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں۔'' فرحان کا انداز مدافعانہ ہوگیا۔ ہلکی سے بے اختیار مایوسی اس پر چھانے لگی۔

''یہ تو آپ شروع سے ہی جانتے ہیں کہ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔''

''تو آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔''

''بالکل کرتی ہوں۔ لیکن پسندیدگی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے...... زمین آسمان کا فرق۔''

''محبت کی بنیاد تو پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد......''

''اس کا موہوم سا امکان بھی نہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کے وقت کا زیاں ہو، آپ زندگی کے کسی معاملے میں بھی پیچھے رہ جائیں۔''

''آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں آپ کے بغیر نامکمل ہوں۔ آپ کے انکار سے نقصان تو مجھے ہونا ہی ہونا ہے۔''

''کسی دوسرے کی محبت کو کوئی کبھی نہیں جان سکتا۔'' نہ جانے کیوں ارجمند کا لہجہ اُداس ہوگیا۔

''مجھے افسوس ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے۔ ابھی آپ کا کچھ نقصان ضرور ہوگا۔ مگر تھوڑے وقت میں آپ سنبھل جائیں گے۔ میں آپ کے لئے بہت دعا کروں گی۔''

''مگر کوئی وجہ تو بتائیں......!''

''کوئی کسی سے پوچھے کہ اسے کسی سے محبت کیوں ہوگئی؟ تو اس کا جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ اسے کسی سے محبت کیوں نہیں ہوئی۔ اس کی تو کوئی وجہ ہوتی ہی نہیں۔ محبت بس ہوتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ خود بخود

ہو جاتی ہے۔لیکن محبت نہ ہونے کی کوئی اہمیت نہیں۔ ورنہ دنیا کے ننانوے فیصد لوگ دنیا کے ننانوے فیصد لوگوں سے یہی بات پوچھتے نظر آتے کہ تمہیں مجھ سے محبت کیوں نہیں ہے۔''

وہ دل کو کاٹ دینے والا جواب تھا۔فرحان نے آزردگی سے کہا۔

''مجھ میں کوئی کمی ہے.....؟''

''یہ کمی زیادتی کی بات نہیں، محبت میں حساب کتاب، اعداد و شمار کا کوئی دخل نہیں۔''

''آپ کسی اور سے محبت کرتی ہیں؟'' فرحان نے اس کے چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

ایک لمحے کو اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''یہ تو بہت ذاتی سوال ہے۔آپ کو مجھ سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس نے اضطراری طور پر کہا۔مگر فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

''دیکھیں ..... میں اگر کسی سے محبت کرتی ہوتی تو بھی میرے بارے میں حتمی فیصلہ میرے گھر والوں کا ہوتا اور میں اسے قبول کرتی ..... اور وہ بھی ہنسی خوشی۔ میں شادی کو محبت کا فطری، لازمی اور منطقی انجام نہیں سمجھتی۔''

فرحان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا پہلا ردعمل تو یہی بتاتا تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتی ہے۔لیکن بعد کی بات اس نے جس یقین سے کہی تھی، وہ اس تاثر کی نفی کرتی تھی۔فرحان کے لئے یہ بات بہت اہم تھی۔

''میں نے آپ سے ذاتی سوال اس لئے کیا تھا کہ اس سے میرے لئے آسانی ہو جاتی۔اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو یہ آپ کا حق ہے۔یہ معلوم کر کے میں ہمیشہ کے لئے اس خیال سے دست بردار ہو جاتا۔اگرچہ میرے نزدیک شادی کا انجام محبت ہی ہے۔''

وہ پھر ایک لمحے کو ہچکچائی۔

''جواب تو میں نے آپ کو دے دیا۔'' اس نے کہا، پھر وہ پیالیاں اور خالی پیٹ باسکٹ میں رکھنے لگی۔یہ اشارہ تھا کہ وقت ختم ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے

بعد شاید کبھی بات نہیں ہو سکے گی۔

''اس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر آپ کے گھر والے میرا رشتہ آپ کے لئے قبول کر لیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟''

''جی ہاں.....! بالکل یہی بات ہے۔'' ارجمند نے بے جھجک کہا۔

''تو میں اپنی امی کو آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں رشتے کے لئے .....؟''

''جی ..... بالکل .....!''

''تو میں یہ نیک کام کل ہی کروں گا۔''

ارجمند نے جواب دینے کی بجائے گھڑی میں وقت دیکھا۔

''ایک منٹ اوپر ہو گیا ہے۔اب چلیں .....؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''لائیے ..... باسکٹ مجھے دے دیجئے۔''

وہ مسکرائی۔

''اس کی ضرورت نہیں۔لائی بھی تو میں ہی تھی۔''

وہ باہر آ کر گیٹ سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ٹھیک چھ بجے ان کے سامنے گاڑی آ کر رکی۔فرحان نے بڑھ کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اسے بیٹھنے کا موقع دیا۔لیکن جب وہ بیٹھنے لگا تو ارجمند نے دروازہ بند کر لیا۔

''آپ اگلی سیٹ پر بیٹھئے۔''

وہ فرحان کے لئے بہت بڑا شاک تھا۔اسے توہین کا احساس ہوا۔

''ڈرائیور کے ساتھ .....؟'' اس نے ناراضی سے کہا۔

''سلی ..... ! یہ ڈرائیور نہیں، میرے چچا جان ہیں۔''

وہ تھا شاک پہ شاک ..... صرف چند سیکنڈ میں دو شاک۔ اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ارجمند پر اسے شدید غصہ آیا۔ چچا کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

''اب بیٹھ بھی جائیے۔'' ارجمند نے اسے چونکایا۔

دل تو چاہتا تھا کہ بیٹھنے سے انکار کر دے۔ اور رکشہ میں گھر چلا جائے۔

لیکن یہ بد اخلاقی ہوتی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ سہمے ہوئے کسی بچے کی طرح۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا کام شروع ہونے سے پہلے ہی خراب ہوگیا ہے۔ اس نے چچا کی طرف دیکھا اور شرمندگی سے کہا۔

''سوری چچا جان! مجھے معلوم نہیں تھا۔''

چچا نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے شفقت سے کہا۔

''کوئی بات نہیں بیٹے! غلط فہمی تو ہو جاتی ہے۔ کہاں اترنا ہے......؟ مجھے راستہ بتاتے رہو۔''

گھر کے سامنے اترتے ہوئے اس نے چچاجان سے ہاتھ ملایا۔ بڑے تپاک سے ان کا شکریہ ادا کیا، پھر پلٹ کر ارجمند کی طرف دیکھا۔

''خدا حافظ ارجمند......!''

''خدا حافظ فرحان......!''

اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر گھر کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے امی سے بات کی۔ امی نے باجی کو بلوایا۔ وہ نہیں ارجمند کے گھر لے کر گیا۔ وہاں اس کی دادی اور چچی سے ملا۔ پھر وہ واپس آگیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں اب وہ رات کو اپنے کمرے کی تنہائی میں اداس اور نیند سے محروم بیٹھا تھا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند کوئی بچی نہیں تھی۔ شروع ہی سے جانتی تھی کہ فرحان اس سے محبت کرتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ بہت اچھا ہے۔ لیکن وہ کیا کرسکتی تھی ہمدردی کے سوا۔ وہ خود بھی تو ایک ناممکن کی اسیر تھی۔ اسے تو اس وقت محبت ہوئی تھی، جب وہ محبت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتی تھی۔ بچپن میں، نادانی میں اس نے اس محبت کا اظہار بھی بڑے زور سے کیا تھا۔ پھپھو کے سامنے بھی، اور آغا جی کے سامنے بھی۔ مگر پھر دل میں موجود اللہ نے اسے محبت کے طور طریقے سکھائے، سو اس نے محبت کو دل میں کھلنے والی مہکتی کلی کی طرح چھپا لیا کہ خوشبو کو جتنا قید رکھو، وہ اتنی ہی توانا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ آغا جی بھی بھول گئے کہ وہ ان سے محبت کرتی ہے۔ اب وہ اس

محبت کو اس کا بچپنا سمجھ کر دل میں ہنستے ہوں گے۔

دل میں موجود راہنما نے اس کی بڑی مدد کی۔ اسے حوصلہ دیا۔ یقین اور اعتماد عطا کیا۔ مگر جب اس نے قرآن میں وہ آیت مبارکہ پڑھی ...... اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی ...... تو وہ ہر چیز کے لئے تیار ہوگئی۔ سب کچھ اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے تو بندہ بس دعا کر سکتا ہے اور انتظار۔

وہ فرحان کو فون پر بھی منع کر سکتی تھی۔ لیکن خود واقف حال تھی۔ اس لئے ایسا نہیں کیا۔ وہ اسے ٹال بھی سکتی تھی، لیکن یہ اخلاقی اعتبار سے اچھا نہیں تھا۔ تقریباً تین سال سے وہ اسے ٹال ہی تو رہی تھی ...... بہلا ہی تو رہی تھی ...... اور اس نے اس کی ہر بات مانی تھی۔ اب یہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی۔ ویسے تو اس کے ساتھ ہونی ہی زیادتی تھی۔ اس سے مفر ہی نہیں تھا۔

اس نے دادی اماں سے کہا۔

''مجھے شام کو کہیں جانا ہے دادی اماں!''

''تو اپنے چچا سے بات کرنا۔''

''نہیں دادی! پہلے تو آپ سے اجازت لینی ہے۔''

''اجازت کی تجھے کیا ضرورت؟'' حمیدہ نے بے پرواہی سے کہا۔

''ضرورت ہے دادی اماں! آپ نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟''

''کسی کام سے ہی جا رہی ہوگی میری بچی! پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں؟''

''وہ دادی اماں ...... کالج میں پچھلے سال تک ایک لڑکا پڑھتا تھا میرے ساتھ ......'' یہ کہتے کہتے اسے شرم آنے لگی۔

''ابھی اس کا فون آیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔'' وہ اچانک جلدی جلدی بولنے لگی۔

''میں نے اسے کہا کہ یہاں...... ہمارے گھر آجائے۔ لیکن وہ باہر ملنا چاہتا ہے۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا ہے دادی اماں! لیکن کالج میں میرے ساتھ

بہت بھلائی کی تھی اس نے، اس لئے میں منع نہیں کر پائی۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر ملنے کے لئے ہاں کر دی۔ اب مجھے تو اس کا فون نمبر بھی نہیں معلوم کہ اسے منع کر سکوں۔ لیکن آپ منع کریں گی تو میں ہرگز بھی نہیں جاؤں گی۔'' وہ نظریں جھکائے بولتی چلی گئی، احساس ہوا تو اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔ دادی اماں اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ ان کی نگاہوں میں تشویش کا تاثر بھی نہیں دیکھ سکی۔

''تو نے وعدہ کر لیا تکی! تو میں اجازت کیوں نہیں دوں گی؟'' دادی اماں نے کہا۔

''تیری بات خراب کرا سکتی ہوں میں؟''

''شکریہ دادی اماں! لیکن میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔''

''یہ تو بتا، تو اس سے ملنے کہاں جائے گی؟''

''لارنس گارڈن اماں! وہی بڑا باغ، جہاں ہم جاتے رہتے ہیں۔''

دادی سوچ میں پڑ گئیں۔ اس بار ان کی تشویش اس کو محسوس ہوگئی۔ مگر وہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔

''وہ ایسا ویسا لڑکا نہیں ہے دادی اماں! اور پھر گارڈن میں شام کے وقت سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو کسی کی عزت کرے تکی! تو وہ ایسا ویسا ہو ہی نہیں سکتا۔'' دادی اماں نے کہا۔ لیکن ان کی نگاہوں میں اب بھی تشویش تھی۔ پھر وہ بولیں۔

''میری طرف سے اجازت ہے۔ تو اپنے چچا سے جا کر بات کر لے۔''

ارجمند نے جا کر زبیر سے بات کر لی۔ وہ کب انکار کرنے والا تھا۔ اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ جانا کہاں ہے؟

وقت کافی تھا۔ اس نے باورچی خانے میں جا کر سموسے تلے اور چائے بنا کر تھرماس میں بھر لی۔ پھر وہ دادی اماں کو سلام کرنے کے لئے گئی۔ اس کی باسکٹ دیکھ کر دادی جان اور تشویش زدہ دکھائی دینے لگیں۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ چچا جان کے ساتھ باہر نکلی۔

''لارنس گارڈن چلنا ہے چچا جان!'' اس نے اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

چچا جان بھی عجیب آدمی تھے۔ سوال کرنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے چپ چاپ گاڑی آگے بڑھا دی۔

''ایک زحمت دینی ہے آپ کو چچا جان!'' راستے میں اس نے ان سے کہا۔

''بولو بیٹی.....!''

''آپ ٹھیک چھ بجے مجھے واپس لے جانے کے لئے آ جایئے گا۔''

''ٹھیک ہے بیٹی!''

اب بھی کوئی سوال نہیں۔ پہلے انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ انہیں لے کر لارنس گارڈن کیوں جا رہی ہے۔ اور اب یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ ایک گھنٹہ وہاں اکیلی کیا کرے گی، یا اسے کسی سے ملنا ہے۔ بس انہوں نے اس کی بات سنی اور مان لی۔

ٹھیک پانچ بجے وہ لارنس گارڈن کے گیٹ پر تھے۔ وہ باسکٹ لے کر اتری اور اس نے جھک کر انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک چھ بجے۔''

''تم بے فکر رہو بیٹی!'' انہوں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔ یہ دیکھنے کے لئے بھی نہیں رکے کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے، کس سے ملنے آئی ہے۔ کتنے اچھے تھے یہ سب لوگ۔ اللہ کی بہت بڑی نعمت۔ وہ اس پر کتنا مان، کتنا بھروسہ کرتے تھے۔

مگر اپنی بے پناہ خود اعتمادی اور اللہ پر بھروسے کے باوجود وہ نروس ہو رہی تھی۔ یہ بھی شکر کا مقام تھا کہ وہ جانتی تھی کہ کس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا ہے۔ لیکن بہر حال اس سے گزرنا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ فرحان کیا امید لے کر آیا ہے، اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس بے چارے کو دکھی ہونا ہے۔ یہی سب سے سخت

مرحلہ تھا۔اسے ایک اچھے آدمی کو مایوس کرنا تھا۔

پھر وہ مرحلہ بھی آ گیا، جس سے وہ خوفزدہ تھی۔فرحان نے اظہارِ محبت کیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ اس کا ردِعمل جاننا چاہتا تھا۔اس نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔کھل کر بات کرنا آسان نہیں تھا،اور وہ اسے غیر ضروری طور پر زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے بڑی مصلحت سے کام لیا۔ اس نے کہا کہ وہ تعلیم کے دوران محبت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

وہ تھوڑا سا مایوس ہوا۔

''میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے ناپسند تو نہیں کرتیں؟'' اس نے پوچھا۔

ارجمند کو اطمینان ہوا۔ ایک دم جھٹکے سے یہ بہتر تھا کہ بات بتدریج آگے بڑھے۔ یوں وہ آخری مرحلے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو چکا ہوگا۔ اس نے کہا۔

''یہ تو آپ شروع ہی سے جانتے ہیں کہ میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی۔''

''تو آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔''

وہ ایک قدم اور آگے بڑھی۔

''بالکل کرتی ہوں۔ لیکن پسندیدگی اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے......زمین آسمان کا فرق۔''

''محبت کی بنیاد تو پسندیدگی ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد......''

''اس کا موہوم سا امکان بھی نہیں۔ اور میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کے وقت کا زیاں ہو۔آپ زندگی کے کسی معاملے میں پیچھے رہ جائیں۔''

''آپ نہیں جانتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔میں آپ کے بغیر نامکمل ہوں۔آپ کے انکار سے نقصان تو مجھے ہونا ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں یاس تھی۔

ارجمند کے دل پر چوٹ لگی۔وہ اداس ہوگئی۔آغا جی کو بھی کب پتا ہے کہ وہ ان سے کتنی محبت کرتی ہے۔ وہ جان بھی جائیں،تو بھی پوری طرح تو نہیں جان

سکیں گے لیکن وہ تو یہ بات سوچتے بھی نہیں ہوں گے۔ اس اعتبار سے کتنی محروم ہے وہ۔

''کسی دوسرے کی محبت کو کوئی کبھی نہیں جان سکتا۔'' اس نے اداسی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے،لیکن بہتر یہی ہے۔ابھی آپ کا کچھ نقصان ضرور ہوگا۔ مگر تھوڑے وقت میں آپ سنبھل جائیں گے۔ میں آپ کے لئے بہت دعا کروں گی۔''

پھر اچانک ایک اور سخت مرحلہ آ گیا، جب فرحان نے اس سے پوچھا۔

''آپ کسی اور سے محبت کرتی ہیں؟''

وہ سچ بولنے والی تھی۔ جھوٹ بولنا اسے پسند نہیں تھا،لیکن پوچھنے والا کتنا ہی اچھا انسان سہی، اس کے لئے بہرحال اجنبی تھا۔ جبکہ اس راز میں تو اس نے کسی کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ وہ محبت کو ارزاں نہیں کرسکتی تھی۔ وہ بری طرح جھنجلا گئی۔

''یہ تو بہت ذاتی ہے۔آپ کو مجھ سے نہیں کرنا چاہئے تھا۔'' اس نے چڑ کر کہا۔ لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال بھی لیا۔ اس کے نتیجے میں اسے جھوٹ سے کو ہلکا کرنے کی ترکیب بھی سوجھ گئی۔

''دیکھیں، اگر میں کسی سے محبت بھی کرتی ہوتی تو بھی میرے بارے میں حتمی فیصلہ میرے گھر والوں کا ہوتا، اور میں اسے قبول کرتی...... اور وہ بھی ہنسی خوشی۔ میں شادی محبت کا فطری، لازمی اور منطقی انجام نہیں سمجھتی۔''

اس کے جواب نے فرحان کو بہرحال الجھا دیا۔ اس کے جواب کے پہلے حصے پر فرحان کا تاثر واضح تھا۔اسے گویا یقین ہوگیا تھا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ لیکن جواب کے دوسرے حصے نے اس کے چہرے سے اس پہلے تاثر کو مٹا ڈالا تھا۔اس نے بڑی شائستگی سے وضاحت کی کہ اس نے وہ ذاتی سوال کیوں کیا اور وہ وضاحت بڑی اہم تھی۔ اسے سن کر ارجمند کو ایک لمحے کے لئے افسوس ہوا کہ اس نے سچ کیوں نہیں بتا دیا۔ اگر بتا دیا ہوتا تو فرحان کے لئے آسانی ہوجاتا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

مگر اس کے منفی جواب نے ایک اور مشکل کھڑی کر دی۔ فرحان کے ذہن میں یہ خیال آ گیا کہ وہ اپنے گھر والوں کو اس کے گھر رشتہ مانگنے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ لیکن اس پیچیدگی کے باوجود خوشی کی بات یہ تھی کہ فرحان اس کی محبت سے بے خبر ہی رہا تھا۔ چنانچہ اس نے بے جھجک کہہ دیا کہ اسے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

اس کے بھی دو فائدے تھے۔ ایک اس کا اپنا کہ اس کی بات سچی ثابت ہوگئی تھی کہ وہ کسی سے محبت نہیں کرتی۔ دوسرا فائدہ، فرحان کا تھا کہ اب اس کا دکھ ہلکا ہو جاتا۔

واپس آتے ہوئے فرحان کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ چچا جان اس سے فرحان کے بارے میں پوچھیں گے۔ لیکن انہوں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ اس نے خود ہی انہیں چھیڑا۔

''چچا جان! آپ نے اس لڑکے کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھا؟''

''کیا ضرورت ہے بیٹی! بتانے والی بات ہوتی تو تم خود بتا دیتیں۔''

''تو آپ اپنا حق نہیں سمجھتے مجھ پر۔ میرے بڑے نہیں ہیں آپ!''

''کیوں نہیں! لیکن جتنا حق ہے، اس سے زیادہ بھروسہ ہے تم پر۔ اور تم چچا جان کہتی ہو تو بڑا تو میں ہوا۔''

''یہ لڑکا کالج میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔''

''یہ بات تو میں ویسے ہی سمجھ گیا تھا۔''

ارجمند خاموش ہوگئی۔ اب اسے ایک اور سخت مرحلے سے گزرنا تھا۔ اسے دادی اماں کو اس رشتے سے انکار پر قائل کرنا تھا۔ ورنہ فرحان ایسا لڑکا تھا کہ شاید دادی اماں کبھی انکار نہ کر پاتیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ دادی اماں کے کمرے میں چلی گئی۔

''آ گئی میری نکی!'' دادی اماں نے اسے دیکھتے ہی بڑے دلار سے کہا۔

''جی دادی اماں......!''

اب وہ منتظر تھی کہ دادی اماں اس سے پوچھیں کہ وہ لڑکا اس سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ لگتا تھا، گھر میں کوئی بھی اس کا کام آسان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

''کیسا لگا نکی؟ پر تو تو بڑی جلدی آ گئی؟''

وہ جھنجلا گئی۔

''آپ یہ کیوں نہیں پوچھتیں مجھ سے کہ اس لڑکے نے مجھے کیوں بلایا تھا؟ وہ کیوں ملنا چاہتا تھا مجھ سے؟''

''لے ... پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ضروری ہوا تو تو خود ہی بتا دے گی۔''

وہ اور جھنجلا گئی۔

''بات یہ ہے دادی اماں! کہ وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

دادی اماں تو ہکا بکا ہو گئیں۔

ارجمند کے لئے ان کا ردعمل بڑا حیران کن تھا۔ اسے خود پر شرم آنے لگی۔ دادی اماں یقیناً اسے غلط سمجھ رہی تھیں۔ برا سمجھ رہی تھیں۔ کتنا برا ہوا۔ اور یہ سب فرحان کی وجہ سے ہوا۔ اسے فرحان پر غصہ آنے لگا۔

دادی اماں کو خود کو سنبھالنے میں چند لمحے لگے پھر انہوں نے کہا۔

''تو پھر......؟ تو نے کیا کہا اسے......؟''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا دادی اماں! اس نے کہا کہ کل اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجے گا رشتے کے لئے۔'' اس نے جواب دیا۔ اب وہ دادی اماں کو وہ پوری تفصیل تو نہیں سنا سکتی تھی۔

اس بار تو دادی اماں کا چہرہ فق ہی ہو گیا۔

وہ اور شرمندہ ہو گئی۔

''اب میں کیا کرتی دادی اماں! اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔''

''چل نکی! تیری مرضی! لڑکیوں کو تو ایک دن رخصت کرنا ہی ہوتا ہے۔''

دادی اماں نے آہ بھر کے کہا۔

"تیری مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔"
اب حیران ہونے کی باری ارجمند کی تھی۔
"میری مرضی؟ میری خوشی؟ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں دادی اماں!" اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔
"تو یہی تو کہہ رہی ہے نا کہ تیری مرضی یہی ہے، اور میں ہاں [illegible]ں۔"
ارجمند سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ابھی یہ بات نہ کی ہوتی تو پورا معاملہ ہی الٹ جاتا۔
"کیا ہوگیا تجھے؟ میں نے کہا نا کہ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔"
"میرا یہ مطلب نہیں تھا دادی اماں! میں انکار کرتی تو اچھی بات نہیں تھی۔ یہ معاملات تو بڑوں کے ہوتے ہیں نا، میں تو آپ سے یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ لوگ آئیں تو چاہے وہ لڑکا آپ کو کتنا ہی اچھا لگے، اور چاہے وہ لوگ بھی اچھے لگیں، آپ انکار کر دیجئے گا۔"
یہ سن کر دادی اماں کے چہرے پر ایسی خوشی اور سکون نظر آیا کہ وہ دمکنے لگا۔
"تو تجھے وہ لڑکا پسند نہیں؟"
"مجھے تو کوئی لڑکا بھی پسند نہیں۔"
"پر یہ تو بتا کہ لڑکا ہے کیسا......؟"
"ہے تو بہت اچھا۔ لیکن دادی اماں! مجھے شادی وادی نہیں کرنی۔"
"یہ تو سبھی لڑکیاں کہتی ہیں۔ پر شادی تو ہوتی ہی ہے نا!"
ارجمند نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ جب تک وہ یہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ یہ چاہتی ہے تو پریشان تھیں۔ اب اس نے انکار کو کہا تو خوش ہوگئیں۔ اور اب لڑکے میں دلچسپی لے رہی ہیں۔
"ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ میری مرضی کی بڑی اہمیت ہے۔ اور آپ میری خوشی میں خوش ہیں۔"
"تو میں کب انکار کر رہی ہوں اس سے۔"

"تو بس آپ ان لوگوں کو منع کر دیجئے گا۔"
"پگلی! ایسے تو منع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر لڑکا مجھے اچھا لگا تو میں کیا کروں گی؟" دادی اماں کے لہجے میں شرارت تھی۔
"بس میں کچھ نہیں جانتی۔" ارجمند نے کہا۔
"آپ کو انکار کرنا ہوگا۔"
"چل ٹھیک ہے۔ لیکن اس کے بھی کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔"
ارجمند اس طرف سے تو مطمئن ہوگئی۔ یہ طے تھا کہ اب دادی اماں اس معاملے کو سنبھال لیں گی۔ وہ اسٹڈی میں چلی گئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکون سے سوچ سکتی تھی۔ دادی اماں کے رویے نے اسے الجھا دیا تھا۔ اب یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ ابتداء میں وہ پریشان بھی ہوگئی تھیں۔ بلکہ انہیں صدمہ بھی ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات تھی، جب ان کے خیال میں وہ اس رشتے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ لیکن جب اصل صورتِ حال ان پر واضح ہوگئی تو وہ ایسی خوش ہوئیں کہ خوشی ان سے چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ بلکہ وہ الٹا اسے ستانے لگیں۔ یہ کیا بات تھی، یہ کیا بھید تھا؟
اسے تشویش ہونے لگی۔ ابھی وہ ایک مسئلے سے پوری طرح نجات حاصل نہیں کر پائی کہ دوسری تشویش لاحق ہوگئی۔ دادی اماں کے انداز کی ایک ہی توضیح اس کی سمجھ میں آئی تھی، یہ کہ شاید وہ پہلے ہی سے اس کے لئے کسی کو پسند کئے بیٹھی تھیں اور کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ بہر حال یہ تو بعد کی بات تھی۔ فی الحال تو مسئلہ فرحان کا تھا۔ اس کی طرف سے بھی اب اسے اطمینان ہوگیا تھا کہ دادی اماں اسے سنبھال لیں گے۔
پر اس کے خیالات کی رو آغا جی کی طرف مڑ گئی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ آغا جی کو یاد نہ کرے۔ لیکن وہ ہر روز ان کی جلد از جلد واپسی کے لئے دعا کرتی تھی۔ وہ ان کی اور آپی کی خیریت اور بہتری کے لئے بھی باقاعدگی سے دعا کرتی تھی۔ اور آغا جی کے لئے اولاد کی دعا تو وہ کبھی بھولتی ہی نہیں تھی۔ لیکن آخر میں بس اس کے دل میں اسی آیت مبارکہ کی گونج رہ جاتی...... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی ...... واپسی تو

دور کی بات تھی، پچھلے چھ برسوں میں اسے آغا جی کی دید بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو عید پر بھی نہیں آسکے تھے۔ اس پر مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ ایسا آپی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ہوتا رہا تھا۔ کچھ ایسا تھا کہ کراچی جانے کے بعد آپی صحت کے مسائل میں بری طرح گھر گئی تھیں۔

چھ سال! اس نے سرد آہ بھر کے سوچا۔ چھ سال تو گزر گئے۔ اور نہ جانے کتنا انتظار باقی ہے۔

❁ ❁ ❁

اس میں کوئی شک نہیں کہ حمیدہ بڑے صبر والی تھی۔ دیکھا جائے تو اس کی زندگی کا عنوان ہی انتظار تھا۔ پہلے وہ اپنے وصال دین کے بڑے ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ اور جب ارمانوں سے سر اٹھانا شروع کیا تو وہ باپ کے ساتھ چلا گیا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔ اس نے ساری امیدیں عبدالحق سے جوڑ لیں۔ مگر جس دن اس نے شوہر اور بیٹے کو کھویا، اسی دن اسے عبدالحق کو بھی رخصت کرنا پڑا۔ پھر وہ آنکھوں سے محروم ہوئی، اور اس نے جانا کہ آنکھیں نہ رہیں تو پل دن کے برابر ہو جاتے ہیں۔ وہ اتنا طویل انتظار نہیں تھا، جتنا اس کے لئے ہو گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ امید ہی چھوڑ بیٹھی تھی۔ رب نے کرم فرمایا کہ نہ صرف اسے عبدالحق سے ملایا، بلکہ اس کی آنکھیں بھی اسے لوٹا دیں۔ اس کے بعد تو ایسی تلافی ہوئی کہ اللہ کی کریمی پر اس کا ایمان پختہ ہو گیا۔ جتنا کچھ کھویا تھا، اللہ نے عبدالحق کے ذریعے اس سے زیادہ عطا فرما دیا۔ رابعہ، زبیر، نور بانو، پھر زرینہ اور زرینہ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کا گھرانا، پھر مسعود صاحب اور ان کا گھرانا اور آخر میں نگی، اس کا تو گھر بھر گیا۔

عبدالحق کا کراچی تبادلہ ہوا تو وہ نہیں گھبرائی۔ وہ تو بڑی جدائی دیکھ چکی تھی۔ اس کے سامنے تو یہ جدائی ہی نہیں تھی۔ عبدالحق کی آواز تو وہ سنتی ہی رہتی تھی۔ لیکن جب پہلی عید آئی اور عبدالحق گھر نہیں آیا تو اسے صدمہ ہوا۔ اور وجہ تھی نور بانو۔ وہ وہاں بیمار ہو گئی تھی۔ بلکہ عبدالحق نے بتایا کہ وہ زیادہ تر بیمار ہی رہتی ہے۔ لیکن عید بقرعید پر اس کی بیماری بڑھ جاتی تھی۔

ابتداء میں تو حمیدہ نے بدگمانی نہیں کی۔ لیکن جب تیسری عید بھی بیٹے کی دید کے بغیر گزر گئی تو اس نے جان لیا کہ اس سے ڈری ہوئی نور بانو اب یہاں واپس آنا ہی نہیں چاہتی۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی، کیسے سمجھاتی کہ اس کا ڈر بے بنیاد ہے۔ اسے تو اللہ نے اطمینان دے دیا ہے، اور اس نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ اب کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔

تب اسے نور بانو پر غصہ آنے لگا۔ بدگمان لڑکی نے ہمیشہ اسے اپنا حریف، اپنا دشمن سمجھا۔ اب یہ جو وہ کر رہی تھی، یہ تو بدترین ظلم تھا۔

پھر بھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ نور بانو کی دل جوئی ہی کرتی رہی۔ عبدالحق شرمندہ ہوتا تھا، اس نے اسے بھی سمجھایا کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے۔ زندگی میں ایسی آزمائشیں آتی ہیں، اور ان کے بعد بڑی خوشیاں ملتی ہیں۔

اور اب اسے عبدالحق کی شکل دیکھے چھ سال ہو گئے تھے۔

لیکن نور بانو کی تھوپی ہوئی اس جدائی میں وہ اکیلی نہیں تھی۔ رابعہ، زبیر اور ساجد اس کے ساتھ تھے۔ مسعود صاحب بیوی بچوں کے ساتھ ہفتہ دس دن میں ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔ گاؤں سے زرینہ اپنے بچوں کے ساتھ آتی رہتی تھی۔ پھر کبھی وہ لوگ خود بھی گاؤں چلے جاتے تھے۔ تو وہ کوئی سخت جدائی نہیں تھی۔ لیکن عید سے دس پندرہ دن پہلے جو عبدالحق کے آنے کی آس بندھتی تھی، اور پھر اس آس کے ٹوٹنے کے بعد کتنے ہی دن تک اس کا دکھ رہتا تھا، وہ بہت بڑی سختی تھی۔ اب اس پر تو کسی کا اختیار ہوتا نہیں ہے۔ وہ تو امکان نہ ہوتے ہوئے بھی لگ جاتی ہے۔

لیکن اس دکھ کے باوجود حمیدہ کے لئے خوشیوں کی کمی نہیں تھی۔ بچوں کو اپنے سامنے بڑے ہوتے دیکھنا بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ زرینہ کے بچے تو خیر دور تھے، اور کبھی کبھی ہی آتے تھے، لیکن ساجد تو اس کی آنکھوں کے سامنے بڑا ہو رہا تھا۔ وہ بہت پیارا اور نیک لڑکا تھا۔ آیا تو چھوٹا سا تھا لیکن اب اس نے بڑی تیزی سے قد نکالا تھا۔

مگر سب سے بڑی خوشی تو نگی تھی۔ عبدالحق کے بعد اگر حمیدہ کو کسی سے ویسی محبت ہوئی تھی تو نگی سے ہوئی تھی۔ اور جب سے اس کے دل میں وہ خواہش

جاگی تھی تو نکی کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔ اور بابا کی خوش خبری کے بعد تو وہ اس کی آنکھوں کا تارا بن گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مرحوم ٹھاکر کی نسلوں کی امین ہے۔ وہ اسے دیکھ کر جیتی تھی۔

بچے آنکھوں کے سامنے بڑے ہوں تو اتنا پتا نہیں چلتا۔ چھ برس میں نکی اس کے سامنے بڑی ہوتی رہی، اور اسے پتا نہیں چلا۔ پھر کچھ دن پہلے وہ ایک صبح کالج جاتے ہوئے اسے سلام کرنے کے لئے آئی تو رابعہ اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ نکی کتنی بڑی ہوگئی ہے۔ رابعہ کا قد کم تو نہیں تھا، لیکن نکی اب اس سے ایک ہاتھ اونچی ہوگئی تھی۔

تب اس نے غور سے نکی کو دیکھا اور اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔

ارے... اتنی خوب صورت، اس نے حیرت سے سوچا۔ حالانکہ نکی شروع ہی سے غیر معمولی حسین تھی۔ لیکن اب تو... نظر تو اسے لگتی ہی رہتی ہوگی۔ اس نے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لیں، اور تصور میں اس کے ساتھ عبدالحق کو کھڑا کر کے دیکھا۔ کیا خوب صورت جوڑی تھی۔

اس دن سے نکی کو دیکھنا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بن گئی۔

پھر دو دن پہلے نکی نے اچانک اس کے دل کو اندیشوں سے بھر دیا۔ وہ اس سے کہیں جانے کی اجازت مانگنے آئی تھی۔ حمیدہ کو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔ اس نے بے پروائی سے اسے زبیر سے بات کرنے کو کہا۔ مگر وہ اس کی اجازت پر اصرار کر رہی تھی۔

''اجازت کی تجھے کیا ضرورت؟'' حمیدہ نے کہا۔

اس پر نکی نے اسے کالج میں اپنے ساتھ پڑھنے والے ایک لڑکے کے بارے میں بتایا۔ اور بات کرتے کرتے وہ شرمانے لگی۔

حمیدہ کے تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے ابھی کچھ ہی دن پہلے تو پہلی بار محسوس کیا تھا کہ نکی جوان ہوگئی ہے۔ جوانی کا اپنا ایک نکھار ہوتا ہے۔ لیکن نکی تو اتنی خوب صورت ہوگئی تھی کہ کروڑوں میں الگ نظر آئے۔ اور وہ اس پر خوش ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے وہ ہر روز اس کی نظر اتارنے لگی تھی۔

مگر اس لڑکے کے تذکرے پر اسے خیال ہوا کہ اس نے دیر کر دی۔ نکی کو تو پہلے ہی نظر لگ چکی ہے۔ اور اسے اپنی بے وقوفی پر غصہ آنے لگا۔ خوشی اپنی جگہ، وہ اتنی جہاں دیدہ عورت، اسے ڈر کیوں نہیں لگا۔ یہ تو عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ نکی تو ہر کسی کو اچھی لگتی ہوگی۔ لیکن نکی کو بھی تو کوئی اچھا لگ سکتا تھا۔ اور لگتا تھا کہ اسے کوئی بھا گیا ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اس نے ہراساں ہو کر سوچا۔

نکی اسے بتا رہی تھی کہ وہ لڑکا اس سے ملنا چاہتا ہے۔ نکی نے تو اسے گھر بلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ کہیں باہر ملنا چاہتا تھا۔ اور نکی نے اس کے لئے ہاں کر دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس لڑکے کو پسند کرتی ہے۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور وہ گھبرائی ہوئی تھی۔ پہلی پہلی بار ہے نا......

پھر حمیدہ نے سوچا، میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ اللہ کو جو منظور ہوگا، وہی ہوگا۔ بابا نے یہی کہا تھا۔ نہ وہ کچھ روک سکتی ہے، نہ اس کے چاہنے سے کچھ ہو سکتا ہے۔ اب یہ تو نکی کی اچھائی ہے کہ وہ ملنے کے لئے ہاں کرنے پر شرمندہ ہے، اس سے پوچھے بغیر ہاں کرنے پر۔ اور وہ کہہ رہی تھی کہ وہ منع کر دے گی تو وہ ہرگز نہیں جائے گی۔ اس کی اس ادا پر، اس دکھی کر دینے والی صورت حال کے باوجود حمیدہ کو اس پر پیار آنے لگا۔

اس نے نکی کو اجازت دے دی۔ پر اندر ہی اندر اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

نکی نے اس کا شکریہ ادا کیا، اور دوبارہ شرمندگی کا اظہار کیا۔

اچانک حمیدہ کو خیال آیا کہ اس نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ وہ اس سے ملنے کہاں جائے گی؟ سو اس نے پوچھ لیا۔ باغ کا سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ وہ خود بھی اکثر وہاں جاتی رہی تھی۔ شام کو وہاں بڑی رونق ہوتی تھی۔ لیکن وہ بہت بڑا باغ تھا۔ وہاں بہت سی جگہیں سنسان بھی ہوتی تھیں۔

نکی نے اسے اطمینان دلایا کہ وہاں سینکڑوں لوگ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے لڑکے کی تعریف بھی کر دی۔ اس سے حمیدہ کی تشویش اور بڑھ گئی۔

بہرحال اس نے اجازت دیتے ہوئے کہا کہ وہ زبیر سے بات کر لے اور اس کے ساتھ چلی جائے۔

اس لمحے سے اس نے نکی پر گہری نظر رکھی۔ مگر اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔ نکی باقاعدہ اہتمام کر رہی تھی۔ اس نے سموسے تیار کئے، چائے بنا کر تھرمس بھرا اور باسکٹ میں رکھ لی۔ حمیدہ کا جی چاہا کہ زبیر سے اس کا خیال رکھنے کو کہے۔ لیکن فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ زبیر بھی کیا سوچتا، اور اس کی نظروں میں نکی کی عزت بھی کم ہوتی۔

اسے پھر بابا کا خیال آ گیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ انہوں نے تو یہ بات نور بانو کے سلسلے میں کہی تھی کہ وہ خود ہی سب کچھ کر دے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔

بہر حال اللہ توکل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

نکی چلی گئی۔ ایک ایک لمحہ اسے برس لگ رہا تھا۔ وہ جو خیالوں میں تنکا تنکا کر کے آشیاں بنا رہی تھی، کہیں بکھر نہ جائے۔ اس دوران اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔ بس اللہ سے دعا کرتی رہی۔

بالآخر خدا خدا کر کے نکی واپس آ گئی اور وہ سیدھی اسی کے پاس آئی۔ حمیدہ نے بڑے غور سے اسے دیکھا۔ وہ گئی تھی کہ کچھ پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ مگر اب کافی بہتر لگ رہی تھی۔ حمیدہ کو اس سے بھی تشویش ہونے لگی۔

کہنا تو وہ چاہتی تھی کہ بڑی دیر لگا دی نکی! لیکن اس نے پوچھا۔
''تو تو بڑی جلدی آ گئی نکی!''
''آپ یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ اس لڑکے نے مجھے کیوں بلایا تھا؟'' نکی جھنجلا گئی۔

حمیدہ نے دل میں سوچا، کیونکہ میں جاننا ہی نہیں چاہتی۔ اس نے کہا۔
''پوچھنے کی کیا بات ہے؟''
''بات یہ ہے دادی اماں کہ وہ لڑکا مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''
حمیدہ کے لئے اندیشے کے باوجود وہ ایسا دھماکا تھا، جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی، وہی بات نکلی نا! بہت کوشش کر کے اس نے خود کو سنبھالا۔

''تو پھر.....! تو نے کیا کہا اس سے.....؟''
''میں نے تو کچھ بھی نہیں دادی اماں! اس نے کہا کہ کل اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر بھیجے گا رشتے کے لئے۔''
حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ بات اتنی تیزی سے آگے بڑھے گی، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب نکی لڑکی تھی، اور وہ بھی شرم و حیا والی۔ یہ کیسے بتاتی کہ اس نے لڑکے سے کیا کہا۔ لیکن دونوں کے درمیان یہ بات طے ہوئی ہوگی۔ اور اب وہ رشتہ مانگنے آئیں گے..... کل۔
نکی کو بھی شاید اس کا دکھ نظر آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔
''اب میں کیا کرتی دادی اماں! اسے منع تو نہیں کر سکتی تھی۔''
حمیدہ کے اندر امید کا ٹمٹماتا ہوا اکلوتا دیا بھی بجھ گیا۔ اب لڑکی اس سے زیادہ صاف طور پر اپنی مرضی کیسے بتا سکتی ہے۔ وہ کہہ تو رہی ہے کہ اسے منع نہیں کر سکتی تھی۔ گویا معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا اور بولی۔
''چل نکی! تیری مرضی! لڑکیوں کو تو ایک دن رخصت کرنا ہی پڑتا ہے۔ تیری مرضی ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم تو تیری خوشی میں خوش ہیں۔''
مگر اس بات کے جواب میں نکی نے جو کہا وہ سن کر حمیدہ پھر سے جی اٹھی۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ چاہے اسے لڑکا اچھا لگے، اس کے گھر والے بھی اچھے لگیں، اسے انکار کرنا ہوگا۔
حمیدہ کے لئے اپنی خوشی کو چھپانا ناممکن ہو گیا۔ تاہم اس نے موقع غنیمت جانا اور چہرہ پکا کر کے تفصیل سے پوچھ گچھ کر ڈالی۔ پتا یہ چلا کہ نکی کو تو کوئی لڑکا بھی پسند نہیں، اور نہ ہی وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ حمیدہ نے بظاہر کہا کہ لڑکا اچھا لگا تو وہ ہاں بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کی شادی تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ اس پر نکی خوشامدیں کرنے لگی۔
اگلے روز لڑکا اپنی ماں اور بہن کے ساتھ آیا۔ حمیدہ نے لڑکے کو بھی دیکھا۔ وہ اسے بہت اچھا لگا۔ اگر اس کے ذہن میں عبدالحق نہ ہوتا تو وہ اس لڑکے کو

انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی ماں اور بہن کو دیکھ کر بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ اچھے گھر کے ہیں۔

لڑکا تھوڑی دیر بیٹھا۔ وہ شاید ان دونوں کو لے کر آیا تھا۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ جب وہ فون کر دیں گی تو وہ انہیں لے جانے کے لئے آ جائے گا۔ یہ بھی اس کی شرافت کی دلیل تھی۔

لڑکے کے جانے کے بعد اس کی ماں نے جھجکتے جھجکتے رشتے کی بات شروع کی۔ ان کے انداز میں عاجزی اور شائستگی تھی۔

"مجھے آپ لوگ بھی اچھے لگے اور آپ کا بیٹا بھی۔" حمیدہ نے سچائی سے کہا۔

"لیکن ہمیں اس پر سوچنا اور مشورہ کرنا ہوگا۔"

"جی ضرور... !" لڑکے کی ماں نے کہا۔

"شادی تو زندگی بھر کا معاملہ ہوتا ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر نکی کو دے دیجئے۔"

انہوں نے بیٹے کو فون کرنا چاہا تو حمیدہ نے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے؟ گاڑی موجود ہے۔ ہمارا ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔"

ان کے جانے کے بعد نکی خوش خوش اس کے پاس آئی۔

"آپ نے انہیں منع کر دیا نا دادی اماں!"

"نہیں نکی! ابھی تو میں نے ان سے سوچنے کے لئے وقت مانگا ہے۔"

نکی ایک دم بجھ سی گئی۔

"یہ کیا کیا آپ نے دادی اماں! میں نے کہا تھا نا..."

"تو تو بچی ہے نکی! ان باتوں کو نہیں سمجھتی۔ ایسا منع تو نہیں کیا جاتا کہ دوسروں کو بے عزتی محسوس ہو۔" حمیدہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ تو یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ ہوگا وہی جو تو چاہے گی۔"

"ٹھیک ہے دادی اماں!" نکی نے کہا۔ لیکن وہ اب بھی بے چین تھی۔

حمیدہ کو اس کے انداز سے شبہ ہونے لگا کہ وہ ضرور کسی کو پسند کرتی ہے۔ ورنہ اس رشتے سے انکار کے لئے اتنی بے تاب نہ ہوتی۔ اس بات نے اسے پھر تشویش میں مبتلا کر دیا۔

"نکی...! مجھے سچ سچ بتا، تجھے کوئی اچھا لگتا ہے...؟" اس نے پوچھا۔

اس پر نکی نے ایسی شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا کہ اس کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"میں جھوٹ نہیں بولتی دادی اماں...!" اس نے کہا۔

"گھر سے باہر کالج میں یا کہیں بھی، میں کسی کو نظر اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں۔ تو مجھے کوئی اچھا کیسے لگے گا۔ اور مجھے کوئی شوق بھی نہیں ہے ایسی باتوں کا۔"

اس کے لہجے میں ایسی سچائی تھی کہ حمیدہ دل کی گہرائی تک مطمئن ہوگئی۔ لیکن یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آ گئی کہ گھر میں بیری کا درخت اونچا ہوگیا ہے۔ اور اب رشتوں کے پتھر آتے ہی رہیں گے۔ اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی کہ بس اب عبدالحق واپس آ جائے۔ جو ہونا ہے، ہو جائے۔

❁ ❁ ❁

کراچی میں انہیں چھ سال ہوگئے تھے۔ نور بانو کے لئے وہ بن باس تھا۔ لیکن وہی اس کا حفاظتی قلعہ بھی تھا۔ اس کے باوجود وہ یہاں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی۔ یہاں بس ایک عارف کا ہی گھر تھا اس کے لئے۔

آدمی کا کوئی نہ ہو تو اسے صبر آ جاتا ہے، جیسے امی اور بہنوں کو کھو کر اسے آیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اللہ نے اسے بہت نوازا تھا۔ اسے اتنی محبتیں ملی تھیں کہ شاید وہ ناقدری کرنے لگی تھی۔ اسے عبدالحق ملا، اماں ملیں۔ انہوں نے ہمیشہ اسے بیٹی سمجھا، ویسی ہی محبت کی۔ درمیان میں یہ پیچ نہ آ جاتا تو... مگر نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت بات اس پیچ کی نہیں ہے۔ چلو، اماں کو ہٹاؤ، اور بھی تو کتنے لوگ تھے، جو اس سے محبت کرتے تھے۔ زبیر اور رابعہ، پھر زرینہ اور ڈاکٹر صاحب کا گھرانہ، مسعود صاحب اور ان کا گھرانہ۔ لیکن اس نے کبھی کسی کی قدر نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ

اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی آئے۔ اور اسی کی وجہ سے اس نے شادی سے پہلے رمضان کی طاق راتوں میں وہ ناقص دعا کی، جو اس کے لئے بددعا بن گئی۔ جس پر اب وہ پچھتاتی تھی، توبہ کرتی تھی۔ لیکن لگتا تھا کہ نہ اس کی توبہ کبھی قبول ہوگی، اور نہ اس کی وہ مقبول جاہلانہ بددعا اب کبھی ساقط ہوگی۔

انہی خراب معاملات کی وجہ سے تو وہ اس تبادلے پر خوش ہوئی تھی۔ وہ جو اپنے اور عبدالحق کے درمیان اولاد کا وجود بھی گوارا نہیں کرتی تھی، اب اس کے سر پر سوکن کی تلوار لٹک رہی تھی۔ کسی کا اس کے اور عبدالحق کے بیچ میں آنا تو بہت چھوٹی بات تھی، یہاں تو عبدالحق کو بانٹنے کی نوبت آ رہی تھی۔ ایسے میں یہ تبادلہ اس کے لئے بڑی نعمت تھا۔ وہ ایک بڑی مشکل سے بچ کر یہاں چلی آئی تھی۔

لیکن یہاں کی تنہائی میں اس پر کھلا کہ وہ محبتیں کتنی بڑی نعمت تھیں، جن کی وہ ناقدری کرتی رہی تھی۔ وہ سب لوگ کتنی عزت کرتے تھے اس کی، کتنا خیال رکھتے تھے اس کا۔ اور اب یہاں عارف کی بیوی کے سوا کوئی اسے پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ اور وہ بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ ابھی خوش مزاج ہے، اور ابھی ایک پل میں بدمزاج اور بے مروت۔ بہرحال وہ پھر بھی غنیمت تھی۔

تو ایک بہت بڑے نقصان سے بچنے کے لئے یہ کالے پانی کی سزا اس نے گوارہ کر لی تھی۔ لیکن سب لوگ اسے یاد آتے تھے اور ارجمند کو تو وہ دن میں سینکڑوں بار یاد کرتی تھی۔ وہ تو اس کی بچھڑی ہوئی محبوب بہن تھی، جسے اللہ نے اپنی رحمت سے دوبارہ اس سے ملا دیا تھا۔ وہ تو وہاں بھی اسے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی۔

کاش وہ...... صرف وہ اس کے ساتھ کراچی آ گئی ہوتی۔ لیکن پھر اس کے ساتھ حمیدہ بھی ہوتی۔

نور بانو طبعاً دور اندیش تھی۔ یہ تبادلہ عین اس وقت ہوا تھا، جب حمیدہ اس کے گلے میں سوکن کا طوق ڈالنے ہی والی تھی۔ اس نے اس وقت سوچ لیا تھا کہ وہ جب بھی کراچی سے واپس آئے، چاہے عارضی طور پر ہی آئے ہوں، سوکن کا مرحلہ پھر سامنے آئے گا۔ اس سے بچنے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ لاہور واپس نہ جانا اور یہ آسان کام نہیں تھا۔ مگر اس نے اس کی ترکیب سوچ لی تھی۔

اور کراچی آتے ہی اس نے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

کراچی آئے انہیں دس دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے عبدالحق سے کہا۔

''یہاں آنے کے بعد سے مجھے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد رہنے لگا ہے۔''

''آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے تو ایسا ہو جاتا ہے۔'' عبدالحق نے بے پرواہی سے کہا۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں۔''

لیکن ایک مہینہ ہوا ہوگا کہ اس نے پیٹ کے شدید درد کا پہلا عملی مظاہرہ کر کے دکھایا۔ صرف پیٹ پکڑ کر تڑپنا ہی کافی نہیں تھا۔ چہرے پر شدید اذیت کا تاثر بھی لانا تھا۔ وہ بھی اس کے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے صرف اتنا تصور کرنا تھا کہ حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا رہی ہے۔ پھر وہ عبدالحق کی سہاگ رات کا تصور کرتی، اور اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔

عبدالحق دہل کر رہ گیا۔ وہ اسے اسپتال لے کر گیا۔ بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا۔ لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ ہوتا کیسے، مسئلہ تھا ہی نہیں۔

نور بانو نے ایک بات کا خیال رکھا تھا۔ پیٹ کا وہ درد روز کا معمول نہیں تھا۔ وہ تو مہینے میں ایک بار اٹھتا تھا، اور وہ چار پانچ دن شدید اذیت میں نظر آتی۔ اس کے بعد وہ کافی دنوں تک ٹھیک رہتی۔

فون پر ان کی لاہور بات ہوتی رہتی تھی۔ ابتداء میں تو اس نے عبدالحق کو اپنی صحت کے مسئلے پر بات کرنے ہی نہیں دی۔

''چھوڑیئے...... اب ایسا بھی نہیں، وہ لوگ سنیں گے تو بلاوجہ پریشان ہوں گے۔''

لیکن جب عید کی چھٹیوں پر لاہور جانے کا معاملہ سامنے آیا اور عین وقت پر اسے شدید درد اٹھا تو عبدالحق کو بتانا ہی پڑا۔

''اماں...... میں عید پر لاہور نہیں آ سکوں گا۔ نور بانو کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''کیا ہوا اسے......؟'' حمیدہ نے تشویش سے پوچھا۔

"یہاں آتے ہی پیٹ میں تکلیف کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ اسے دورے
سے پڑتے ہیں اماں!"

"ڈاکٹر کو دکھایا......؟"

"کوئی ڈاکٹر نہیں چھوڑا اماں! مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"ہوا پانی کی تبدیلی لگتی ہے۔"

"شاید یہی بات ہے۔ مگر اماں! مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اچھا تو فکر نہ کر۔ علاج کراتا رہ۔ سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ......!"

"مجھے تو بس یہ غم ہے اماں کہ عید تمہارے بغیر......"

"دور ہونے سے کیا ہوتا ہے پتر......! میں تو ہر وقت تجھے یاد کرتی ہوں۔
دعا کرتی ہوں تیرے لئے۔"

"پھر بھی اماں......!"

"تو غم نہ کر پتر......!"

عید کے بعد بقرعید بھی نکل گئی۔ علاج چلتا رہا۔ ڈاکٹر بدلتے رہے۔ افاقہ
نہ ہونا تھا، نہ ہوا۔ عبدالحق کی پریشانی بڑھتی رہی۔

اگلی عید پر پھر وہی صورتِ حال تھی۔ پھر وہی معذرت، پھر وہی دلاسے۔
وہی عید کی تنہائی، وہی اپنوں کی یادیں۔

"کراچی تمہیں راس نہیں آیا۔" عبدالحق نے اس سے کہا۔

"ہونے والی بات تو کہیں بھی ہوجاتی۔"

"کہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوا۔" عبدالحق مصر تھا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔"

"میں سوچتا ہوں، ہم واپس لاہور چلیں۔"

یہ سن کر نور بانو کی جان نکل گئی۔ لگتا تھا طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے۔

"تبادلہ ہوسکتا ہے آپ کا......؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"کیسے......؟"

"میں ملازمت چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں......! ایسا تو سوچئے گا بھی نہیں۔" نور بانو نے تڑپ کر کہا۔

"چچا جان کو کتنا دکھ ہوگا۔ اور یہ تو قومی خدمت ہے۔"

"مگر تمہاری زندگی سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔"

"کیسی بات کرتے ہو۔ آپ اماں کو چھوڑ کر آ گئے۔ آپ نے تو اس وقت
بھی نوکری چھوڑنے کو کہا تھا۔ لیکن اماں کا دل دیکھیں، انہوں نے آپ کو منع کر
دیا۔ میں تو اماں کے قدموں کی خاک بھی نہیں۔ میری وجہ سے آپ دو بڑوں کو دکھ
پہنچائیں، یہ میں گوارہ نہیں کرسکتی۔"

عبدالحق بہت متاثر ہوا اس کے ایثار سے۔

"لیکن نور بانو......!"

"کچھ نہیں جناب! جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ یہاں ہو یا وہاں
ہو۔ آپ ایسی باتیں کریں گے تو میں اپنی تکلیف آپ سے چھپانا شروع کر دوں
گی۔ کچھ بھی گزر جائے مجھ پر، بتاؤں گی ہی نہیں آپ کو۔"

"نہیں نور......! ایسا غضب کبھی نہ کرنا۔ تمہیں میری قسم......!" عبدالحق
گھبرا گیا۔

"بس تو آپ بھی میری وجہ سے نوکری چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ
لائیے گا۔"

یوں بات ختم ہوگئی۔ عبدالحق پر بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی۔

لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کب تک نبھائی جا سکے گی۔

اگلی عید پر بھی ظاہر ہے کہ وہی صورتِ حال تھی۔ لیکن نور بانو بہرحال تنوع
کی قائل تھی۔

"بت بہت ہوگئی۔" اس نے غصے سے کہا۔

"میں اب اور برداشت نہیں کرسکتی۔ اس بار کم از کم آپ تو چلے ہی
جائیں۔"

عبدالحق نے حیرت اور تاسف سے اسے دیکھا۔

"تمہیں اکیلا چھوڑ کر......؟"

"اکیلا کیوں......؟ عارف بھائی کا پورا گھرانہ موجود ہے۔"

"میں اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالنے کا عادی نہیں ہوں۔"

نور بانو کو موقع مل گیا۔ وہ رونے لگی۔

عبدالحق گھبرا گیا۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا اچانک......؟"

"اب میں بوجھ ہو گئی نا آپ کے لئے۔ اللہ دشمن کو بھی بیماری سے محفوظ رکھے۔ سچ ہے کہ تن درستی بڑی نعمت ہے۔"

عبدالحق کا جی چاہا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا نور......!"

نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بخدا مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ یہ تو مقدر کی بات ہے کہ پردیس میں مجھے یہ بیماری لاحق ہو گئی۔ وہاں ہوتی تو اماں، ارجمند اور سب لوگوں کا سہارا ہوتا۔ آپ پر اتنا بوجھ بھی نہ پڑتا۔ اب یہاں تو آپ اکیلے ہیں۔ بوجھ تو آپ کو بڑا ہی لگے گا نا! لیکن پھر بھی میں آپ کو ملازمت نہیں چھوڑنے دوں گی۔"

"ارے......! میری بات تو سن لو۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"بدقسمتی سے غلط لفظ نکل گیا زبان سے۔ میں ذمہ داری کہنا چاہتا تھا، بوجھ نہیں، کیا تم میری ذمہ داری نہیں ہو......؟"

"یہی تو رونا ہے کہ ذمہ داری بوجھ بن گئی ہے آپ کے لئے۔"

"میں کہہ رہا ہوں کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ایک تو میں سب سے بچھڑ کر رہ گئی۔" نور بانو نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"اس پر یہ بیماری، اب تہوار تو اپنے لوگوں کے درمیان ہی اچھے لگتے ہیں۔ پردیس میں کیا تہوار۔ کیسے میرا دل تڑپتا ہے اماں سے ملنے کو، لیکن نہیں جا

سکتی۔ اور جانتی ہوں کہ میرا یہ حال ہے ان کے بغیر، تو آپ کا کیا حال ہوگا۔ آپ تو مجھ سے بہت زیادہ چاہتے ہیں انہیں۔ آپ کی تو وہ ماں ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا کہ مجھے چھوڑیں، آپ اس بار عید پر گھر ضرور چلے جائیں۔ لیکن آپ نے تو بوجھ قرار دے کر دل ہی توڑ دیا میرا۔"

"میری بات سنتی سمجھتی ہی نہیں ہو۔ اپنی ہی کہے جاتی ہو۔" عبدالحق نے بڑی مشکل سے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو پایا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ عارف بھائی بہت اچھے ہیں، اپنوں جیسے ہیں، لیکن خدانخواستہ تمہاری طبیعت خراب......"

"رضوانہ بھابی بھی تو ہیں، بچے بھی تو ہیں۔"

"میں تمہیں کسی اور پر چھوڑ کر چلا جاؤں، یہ کیسے ممکن ہے......؟"

"تین دن ہی کی تو بات ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

نور بانو کو لگا کہ عبدالحق کے اندر اس خیال کی قبولیت سر اٹھا رہی ہے تو اس نے جلدی سے پینترا بدلا۔

"میں جانتی ہوں کہ رضوانہ بھابی بہت تنگ مزاج ہیں، پل میں ماشہ پل میں تولہ، کبھی کبھی ایسے ہو جاتی ہیں، جیسے جانتی ہی نہیں۔ لیکن بہرحال زیادہ وقت تو خیال ہی رکھتی ہیں میرا۔ اب یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ کبھی آپ کے پیچھے میری طبیعت خراب ہی نہیں ہوئی۔ پھر بھی بہت اچھی ہیں وہ......"

عبدالحق خود بھی اس طرف سے متردد تھا۔ جو عورت شوہر کا خیال نہ رکھے، جو اس کی ذمہ داری ہوتا ہے، وہ کسی اور کی کیا فکر کرے گی۔ وہ ایسی نہ ہوتیں تو عارف بھائی زیادہ وقت گھر سے دور گزارنے کی کوشش کیوں کرتے۔

سو اس نے دل میں حتمی فیصلہ کر لیا۔

"دیکھو نور بانو! یہ بچھڑنا اور ملنا بھی اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ مجھے اس کا بہت تجربہ ہے۔ سو میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ جب اللہ کی مرضی ہوتی، مل جائیں گے۔"

''لیکن وہاں لوگ یہ بھی تو سمجھ سکتے ہیں کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔''

''کیوں سمجھیں گے، بیماری پر کسی کا اختیار ہوتا ہے بھلا ....!''

''پھر بھی یہ تیسری عید ہوگی۔کوئی کہے نہیں،لیکن دل میں تو سوچ سکتا ہے۔''

''نہیں ....! میں نہیں مانتا۔''

''دیکھیں .... لوگ بدگمانی بھی تو کرتے ہیں، اور جبکہ وجہ بھی موجود ہو۔''

عبدالحق اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''وہاں کوئی بدگمان کرنے والا نہیں۔ وہ سب تو الٹا ہمارے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔'' اس نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

''بدگمانی کرتے ہوئے تو میں نے بس تمہیں ہی دیکھا ہے۔''

نور بانو کو احساس ہوا کہ وہ معقولیت کی لکیر سے آگے بڑھ گئی ہے۔

''جی ہاں! میں تو خیر بری ہوں ہی ....''

''میں نے یہ نہیں کہا۔اب کمزوریاں تو ہر آدمی میں ہوتی ہیں۔مجھ میں تم سے زیادہ ہیں۔ البتہ یہ میرا مشاہدہ ہے کہ تم بدگمانی بہت کرتی ہو۔تم دوسروں کی محبت اور خلوص پر بھی یقین نہیں کرتیں۔ ہمیشہ شک ہی کرتی ہو۔''

''بدگمانی تو سبھی کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کوئی منہ سے نہیں کہتا۔میں کہہ دیتی ہوں۔ مجھے منافقت نہیں آتی۔''

''اب یہ تو بہت برا لفظ ہے۔ اور سوچو تو، کن لوگوں کے لئے یہ لفظ استعمال کر رہی ہو تم۔'' اب عبدالحق کے لہجے میں برہمی تھی۔

نور بانو کو احساس ہوا کہ معاملات بگڑ رہے ہیں۔

''آپ خوامخواہ بات بڑھا رہے ہیں۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''میں آپ سے بس اتنا کہہ رہی ہوں کہ اس بار آپ عید پر گھر چلے جائیں۔''

''اور اب میں جو تم سے کہہ رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ تم اسے ہمیشہ یاد رکھو۔'' عبدالحق نے کہا۔

''آئندہ کبھی مجھ سے اس موضوع پر بات نہ کرنا۔ جب میں جانے کا فیصلہ کروں گا تو خود ہی تمہیں بتا دوں گا۔''

نور بانو کا دل خوش ہو گیا۔ اس کا تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ تاہم اس نے سہمے ہوئے لہجے میں عبدالحق سے کہا۔

''آپ مجھ سے ناراض ہو کر یہ بات کہہ رہے ہیں؟''

''نہیں ....! تم جانتی ہو کہ میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ میں تمہاری بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔اب اگر اس سلسلے میں کوئی بھی تم سے شکایت کرے تو تم اسے یہ بات بتا سکتی ہو کہ اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ہم کبھی لاہور نہیں گئے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔بس آپ مجھ سے خفا نہ ہوں۔''

اس کے بعد بھی عید کے عرصے میں ہمیشہ اس کی طبیعت خراب ہوتی رہی۔ ہر بار وہ عبدالحق سے یہی کہتی کہ میں کچھ کہوں گی تو آپ خفا ہو جائیں گے، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اس بار .... اور ہر بار عبدالحق اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا۔

''تم ایک بار کی بات سمجھتی کیوں نہیں ہو؟''

اور وہ چپ ہو جاتی۔

یوں چھ برس گزر گئے۔کراچی میں محفوظ تو تھی لیکن مطمئن نہیں تھی۔ اسے لگتا تھا کہ لاہور میں حمیدہ تیار بیٹھی ہوگی۔ادھر عبدالحق وہاں پہنچا اور ادھر اس کی دوسری شادی۔ بہتری اسی میں تھی کہ وہ کراچی ہی میں رہیں، لاہور نہ جائیں۔لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ مستقل حل نہیں ہے۔کبھی نہ کبھی تو انہیں لاہور جانا ہی ہوگا۔

اب یہ ہر سال ہر ماہ اسے اپنی طبیعت خراب کرنی ہوتی تھی۔اگر فرضی بیماری کو صرف عید بقرعید تک محدود کر دیا جاتا تو وہ مشتبہ قرار پا سکتی تھی۔ دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ طبیعت ٹھیک ہونے کی صورت میں عبدالحق اچانک کسی بھی وقت لاہور جانے کا پروگرام بنا سکتا تھا۔چھٹی لینا اس کے لئے کوئی مسئلہ نہ ہوتا، کیونکہ چھٹی وہ کبھی کرتا ہی نہیں تھا۔سو ہر ماہ پیٹ کے درد کا دورہ اس کی مجبوری تھی۔

علاج اس کا مسلسل ہو رہا تھا۔رضوانہ بھابی نے روحانی علاج کی تجویز

پیش کی تو وہ ڈر گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بیشتر جعلی بزرگ ہوتے ہیں، جن کا مقصد ضعیف الاعتقاد لوگوں کو لوٹنا ہوتا ہے۔ لیکن ان کے درمیان کہاں کوئی برگزیدہ ہستی موجود ہے، اس کا کسی کو کہاں پتا چلتا ہے۔ اس کا تجربہ اسے لاہور میں ہو گیا تھا، جہاں ایک بزرگ نے حمیدہ کے سامنے تقریباً اس کی پول کھول دی تھی۔ اس نے حمیدہ سے اسے ساتھ لانے کو کہا تھا، اور اس نے ڈر کے مارے صاف انکار کر دیا تھا۔ بات صحیح معنوں میں خراب ہی وہیں ہوئی تھی۔ اس کے نتیجے میں تو وہ یہاں جلاوطنی کی سزا بھگت رہی تھی۔

ایک دن رضوانہ بھابی نے عبدالحق کے سامنے یہ تذکرہ چھیڑ دیا۔

''ایک بابا ہیں، کیسا ہی مریض چلا جائے، شفایاب ہوتا ہے۔ لیکن نور بانو مانتی ہی نہیں۔''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس میں حرج ہی کیا ہے۔ چلی جاؤ نا ...!''

''آپ بھی اس ضعیف الاعتقادی پر یقین رکھتے ہیں'' نور بانو نے شکایتاً کہا۔

''فضول باتیں مت کرو۔ میں صرف اللہ پر یقین رکھتا ہوں۔ لیکن اللہ کے برگزیدہ بندوں کا انکار تو نہیں کر سکتا۔''

''پہچان بھی ہے آپ کو ان کی ...؟''

''اب چہرے پر تو کسی کے نہیں لکھا ہوتا۔''

''تو ان کی امید پر آدمی جعلی بزرگوں سے کیوں دھوکا کھائے۔''

رضوانہ کو یہ بات بہت بری لگی۔

''میں جو کہہ رہی ہوں کہ بابا صرف کچھ پڑھ کر دم کرتے ہیں، اور مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔''

''دیکھو نور بانو! اس شہر کا کوئی ایسا ڈاکٹر نہیں، جس کے پاس میں تمہیں لے کر نہیں گیا۔ مگر کوئی تمہارے مرض کی تشخیص بھی نہیں کر سکا۔ کوئی تمہارے مرض کی

نوعیت بھی نہیں سمجھ سکا۔''

''لیکن دوا سے مجھے آرام تو آتا ہے نا!''

''وقتی طور پر۔ بیماری ختم تو نہیں ہوتی۔ وہ بس تمہیں درد روکنے کی دوا دیتے ہیں، جو مسئلے کا حل نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اس کا ایک ہی مطلب ہے ... یہ کہ تمہاری بیماری روحانی ہے۔ تو اس کا علاج بھی روحانی ہونا چاہئے۔''

''نہیں بھئی ...! میں تو اسے شرک سمجھتی ہوں۔'' نور بانو نے کہا۔

اس کے بعد عبدالحق کے لئے کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن رضوانہ تین دن تک اس سے منہ پھلا کے رہی۔

دوا تو اسے مستقل طور پر کھانے کے لئے دی جاتی تھی۔ لیکن کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے کوئی بیماری ہے ہی نہیں۔ اس لئے عام دنوں میں وہ دوا کھانے کے بجائے اسے تلف کر دیتی تھی۔ لیکن جتنے دن وہ پیٹ میں درد کی اداکاری کرتی، اسے دوا کھانی پڑتی۔ کیونکہ اس عرصے میں عبدالحق خود اپنے ہاتھ سے اسے دوا کھلاتا۔ وہ طبعاً وہمی تو تھی ہی۔ جبکہ یہاں تو صورت حال یہ تھی کہ وہ بغیر کسی ضرورت کے دوا استعمال کر رہی تھی۔ اسے دھڑ کا لگا رہتا کہ کہیں اس کے نتیجے میں اسے سچ مچ کوئی بیماری لاحق نہ ہو جائے۔

کراچی میں رہتے ہوئے چھٹا سال شروع ہوا تھا کہ ایک دن اچانک سچ مچ اس کے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ وہ ماہی بے آب ہو گئی۔ اس وقت عبدالحق بھی دفتر گیا ہوا تھا۔ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن پڑوس میں رضوانہ اور اس کے بچوں تک آواز نہیں پہنچی۔ اس روز پہلی بار اس نے اپنی خوشی سے وہ دوا استعمال کی، جو وہ تلف کر دیا کرتی تھی۔

دوا کے استعمال کے آدھے گھنٹے بعد اس کا درد تھم گیا۔ لیکن اس وقت تک وہ پسینے میں نہا چکی تھی، اور کمزوری ایسی تھی کہ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے اٹھ کر بیٹھا بھی نہیں گیا۔ جسم سے جیسے جان نکل گئی تھی۔

دیر تک وہ بستر پر پڑی رہی۔ رضوانہ اتفاق سے کچھ لینے کے لئے آئی

تو اس نے دیکھا کہ نور بانو کا چہرہ پیلا پڑا ہے، اور وہ ملنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اس نے فون کر کے عبدالحق کو دفتر سے بلوا لیا۔

عبدالحق پریشان ہو گیا۔ کیونکہ شدید درد کے دوران بھی اس نے نور بانو کو کبھی اس حال میں نہیں دکھا تھا۔ وہ اسے اس ڈاکٹر کے پاس لے گیا جس کے وہ ان دنوں زیر علاج تھی۔

ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''یہ السر کا معاملہ ہے۔ معدے کے منہ میں واضح طور پر ورم ہے۔''

''تو پھر آپ کیا تجویز کرتے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''پہلے تو دواؤں سے علاج کریں گے۔ ٹھیک نہ ہوا تو پھر آپریشن کرانا ہوگا۔''

اس بار ڈاکٹر نے بڑی سختی سے پرہیز کی تاکید کی۔

لیکن نور بانو نے اسے اہمیت نہیں دی۔ اس کے نزدیک اسے کوئی بیماری تھی ہی نہیں۔ یہ تو ان دواؤں کا فساد تھا، جو وہ بے ضرورت استعمال کرنے پر مجبور تھی۔ اس لئے اس نے پرہیز پر مطلق توجہ نہیں دی۔

ڈاکٹر نے دوا تبدیل کر دی تھی۔ لیکن وہ اس دوا کے ساتھ بھی وہی سلوک کر رہی تھی۔ دوا وہ لیتی ہی نہیں تھی۔ البتہ چند ایک بار درد اٹھا تو اس نے دوا لے لی۔ اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس بار دوا اس کے لئے ضروری ہے، اور دوا اسے اس کے مرض کو پیچیدہ کر رہا ہے۔

اس بار عید آئی تو اس کی طبیعت سچ مچ اتنی خراب تھی کہ اداکاری کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہہ دیا کہ اب آپریشن ناگزیر ہو گیا ہے۔

آپریشن کا سن کر تو نور بانو کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا پیٹ کاٹا جائے گا، یہ تصور ہی اس کے لئے سوہان روح تھا۔ اس نے تو واویلا مچا دیا۔

''میں تو آپریشن نہیں کراؤں گی۔''

''معمولی سا آپریشن ہے۔ خوامخواہ گھبرا رہی ہو۔'' عبدالحق نے اسے

سمجھایا۔

''معمولی سا؟ ارے پیٹ کاٹا جائے گا میرا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوتا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''نہیں، میں نہیں کراؤں گی آپریشن۔''

''یوں تو بڑا نقصان ہو جائے گا خدانخواستہ۔''

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''مرنا ہی ہے تو اپنوں میں جا کر کیوں نہ مروں؟ بس آپ مجھے لاہور لے چلیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں چھٹی کی بات کرتا ہوں۔''

نور بانو بیٹھ کر سوچتی رہی۔ اب اسے لاہور جانا تھا۔ اور کون جانے کہ وہ زندہ بچے یا نہ بچے۔ اب حمیدہ تو اپنی مرضی کر کے رہے گی۔ تو کیا وہ ہار جائے گی۔ نہیں..... ہارنا تو نہیں ہے اسے۔

اور سوچ سوچ کر ایک حل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ حمیدہ کو کیوں کچھ کرنے دے۔ وہ سب کچھ خود ہی نہ کر لے۔ اور جب متاع جان لٹانی ہی ہے، تو کسی غیر پر کیوں لٹائی جائے؟

❁ ❁ ❁

عبدالحق کے لئے کراچی میں وہ چھ سال سزائے قید بامشقت کے تھے۔ لیکن طبعاً وہ قناعت پسند تھا۔ سمجھتا تھا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور ایمان رکھتا تھا کہ اس میں نہ صرف اس کی، بلکہ سبھی کی بہتری ہے۔ اور جب آدمی زندگی کو اللہ کی رضا سمجھ کر گزارے تو مشکل بھی مشکل نہیں رہتی، آسان ہو جاتی ہے۔ سو وہ عرصہ اس کے لئے اتنا ناخوش گوار بھی نہیں رہا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اماں کو اور سب لوگوں کو یاد کرتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ نور بانو کی بیماری کی وجہ سے وہ ان سے ملنے کے لئے ایک بار بھی لاہور نہ جا سکا۔

یہ نور بانو کی بیماری کا معاملہ بھی عجیب تھا۔ اس جیسا بدگمانی سے بچنے والا آدمی بھی بدگمانی کا شکار ہو گیا۔ بات ہی ایسی تھی، ویسے تو مہینے میں ایک بار وہ درد

ضرور اُٹھتا تھا، اور کئی دن تک رہتا تھا، لیکن عید بقر عید سے تو جیسے اس درد کو دشمنی تھی۔ وہ عید پر لاہور جانے کا پروگرام بناتا اور ادھر وہ درد نوربانو پر حملہ آور ہو جاتا۔ نتیجتاً لاہور جانے کا پروگرام دھرا رہ جاتا۔

عبدالحق کو حمیدہ اور نوربانو کی چپقلش کا علم تھا، اور وہ اس کے سبب سے بھی واقف تھا۔ ایسے میں بدگمانی تو فطری تھی۔ اسے افسوس ہوتا تھا کہ نوربانو اس پر بھی بھروسہ نہیں کرتی، اور اماں کو تو وہ سمجھتی ہی غلط ہے۔

لیکن تیسری عید پر جب نوربانو کی طبیعت خراب ہوئی تو وہ ضد کرنے لگی کہ وہ اسے اس حال میں چھوڑ کر ہی لاہور چلا جائے۔ اس دن اس کی بدگمانی دور ہوئی۔ وہ بہت شرمندہ ہوا اور نوربانو پر اسے بہت پیار آیا۔ اس روز اس نے رب کی مرضی کے سامنے پوری سرح سر جھکا دیا۔ اس نے نوربانو سے سختی سے کہہ دیا کہ یہ معاملہ اس کا ہے، اس میں وہ بھی اس سے ضد نہ کرے۔

اور اب چھ سال بعد آپریشن کی نوبت آئی تو اسے پتا چلا کہ وہ درد حقیقی تھا۔ اس کی بدگمانی بہت پیچھے کی بات تھی، مگر پھر بھی اس کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔

ان چھ برسوں میں اسے سب سے زیادہ فکر حمیدہ کی صحت کی طرف سے رہی۔ لیکن اللہ کے فضل وکرم سے اس معاملے میں خیر ہی رہی۔ موٹی بیماری کی بات الگ، ورنہ اسے کبھی پتا نہیں چلا کہ اماں بیمار ہوئی ہیں۔ وہ ہر روز ان کے لئے خاص طور پر دعا کرتا تھا۔

اس عرصے میں ٹیلی فون بہت بڑا سہارا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ لاہور فون ضرور کرتا تھا، اور سبھی سے بات ہو جاتی تھی۔ حمیدہ کو تو فون پر بات کرنا عجیب لگتا تھا، اس لئے وہ زیادہ تر بات نہیں کرتی تھی۔ ارجمند کا بھی یہی حال تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے پاس بات کرنے کے لئے کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔ البتہ زبیر تفصیل سے بات کرتا تھا۔ وہ زمینوں کے معاملات پر اس سے مشورے بھی لیتا تھا۔

دوسری طرف سے ارجمند بھی باقاعدگی سے فون کرتی تھی۔ لیکن وہ عام طور پر اس وقت فون کرتی تھی جب وہ دفتر میں ہوتا تھا۔ قدرتی طور پر اسے نوربانو

سے اور نوربانو کو اس سے بہنوں جیسی محبت تھی۔ جب بھی ارجمند کا فون آتا تو دفتر سے واپسی پر نوربانو اسے بتاتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ لاہور کی تفصیلی خیر خبر تو انہیں ارجمند سے ہی ملتی تھی۔

عبدالحق کبھی سوچتا کہ ارجمند اس سے جھجکتی ہے۔ شاید بچپن میں، نادانی میں اس کے بارے میں اپنی کی ہوئی باتیں اس میں جھجک پیدا کرتی ہیں۔ اب وہ بھی اسے نہیں سمجھا سکتا تھا کہ اس نے کبھی بھی اس کی اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔

لیکن اسے یاد تھا کہ وہ لاہور میں اسے پڑھاتا رہا تھا۔ پڑھائی کے دوران اس کے انداز میں حیاء تو ضرور ہوتی تھی، لیکن وہ اس سے جھجکتی بالکل نہیں تھی۔ شاید وہ بھی اپنے بچپن کی احمقانہ سوچ کو بھلا چکی تھی۔ تو پھر اب اس دوری پر یہ جھجک کیسی، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس کے تصور میں وہ اب بھی وہی چھوٹی سی بچی تھی۔ بہت سلیقے سے دوپٹہ اوڑھ کر بڑی بڑی باتیں کرنے والی سمجھ دار بچی۔ اور ان کے درمیان قرآنی آیات کے حوالے سے جو بھی گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔ بلکہ اس گفتگو کے حوالے سے تو وہ اسے اور عزیز ہوگئی تھی۔

اپنے محبوب لوگوں سے دوری کے وہ چھ برس اس کے لئے بے کار بہرحال نہیں تھے اس عرصے میں بہت کچھ ہوا اور اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اسے بڑے قیمتی تجربات اور مشاہدات بھی حاصل ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے بڑی خوشیاں بھی ملیں۔ ملکی اور قومی سطح پر بھی اس عرصے میں بہت کچھ ہوا۔ اس نے ایک اہم بات سیکھ لی۔ بظاہر منفی نظر آنے والے واقعات اور معاملات مثبت نتائج بھی لاتے ہیں۔ اور اس عرصے میں اس کا یہ ایمان بھی پختہ ہوا کہ پاکستان اللہ کی خاص رحمت ہے، اور انشاءاللہ پاکستان سے اللہ کو عالم اسلام کے لئے کچھ بڑے کام لینے ہیں۔

سیاسی عدم استحکام، نام نہاد جمہوریت اور آئے دن بدلتی حکومتوں کی وجہ سے ملک کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ قوم ایک اچھے آئین سے بھی محروم تھی۔ اختیارات

اور اقتدار کا سرچشمہ گورنر جنرل کا عہدہ تھا۔ عبدالحق کے خیال میں وہ قائداعظم محمد علی جناح کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی۔ قوم بظاہر آزاد ہو چکی تھی لیکن ذہنی آزادی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ گورنر جنرل کا عہدہ برقرار رکھنے کے نتیجے میں انگریزوں کی ذہنی غلامی سے نجات نہیں مل پا رہی تھی۔ تمام قوانین بھی انگریزوں کے زمانے کے چل رہے تھے۔ گورنر جنرل کا عہدہ تو غیر ملکی آقاؤں کے اقتدار کی علامت تھا۔ پہلے گورنر جنرل انگریز ہوتا تھا اور وہ مطلق انسان ہوتا تھا۔ کم از کم ہندوستان میں تو وہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ اس لئے تھا کہ انگریز اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر وہاں چیک اینڈ بیلنس کا کوئی نظام سرے سے موجود نہیں تھا، جو کہ جمہوریت میں بہت ضروری ہوتا ہے، تاکہ کوئی بھی پوری طرح من مانی کرنے کے قابل نہ رہے۔ دنیا بھر میں یہ اصول رائج ہے کہ ریاست تین ستونوں پر قائم ہوتی ہے، مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ۔ اور جہاں ایسا نہیں ہوتا، وہاں یا تو بادشاہت قائم ہوتی ہے یا آمریت۔ ایک جمہوری ملک میں ان تینوں ستونوں کے درمیان توازن کے ساتھ طاقت تقسیم کر دی جاتی ہے، پھر ایک مربوط نظام کے تحت وہ تینوں چیک اینڈ بیلنس کے ذریعے ایک دوسرے پر نظر رکھتے ہیں۔ یہاں سب کچھ گورنر جنرل کے پاس تھا۔ اور کسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس لئے سیاسی جوڑ توڑ، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، جس کے نتیجے میں مستحکم حکومت قائم ہی نہیں ہو پاتی تھی۔

پھر بدقسمتی سے ایک ذہنی مریض اور جسمانی طور پر معذور شخص گورنر جنرل کے عہدے پر مسلط ہو گیا۔ اس کے دور میں کسی کی بھی عزت نہیں رہی۔ امور مملکت کی باگیں بیمار انا کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔

عبدالحق سمجھتا تھا کہ اس مسلسل صورت حال کے نتیجے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں، وہ خود بھی بہت دیرپا ہیں اور ان کے اثرات بھی بہت دیرپا ہیں۔ قومی سطح کے معاملات کی اصلاح آسان نہیں ہوتی۔ اس کام میں برسوں کی نہیں دہائیاں لگتی ہیں۔ عبدالحق کا تجزیہ یہ تھا کہ اس صورت حال سے سیاسی اور جمہوری عمل کو نقصان پہنچ رہا ہے، ایسا نقصان جس کی تلافی میں سو سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس

کے علاوہ سیاست دانوں میں منفی سوچ اور رجحانات پیدا ہو رہے ہیں۔ ہر سیاست دان کا بنیادی ہدف حصول اقتدار ہوتا ہے۔ نارمل حالات میں اس کے لئے وہ عوام کو خوش کرنے اور خوش رہنے کی کوشش کرتا ہے، تبھی تو ملک اور قوم کی خدمت کا نظریہ ابھرتا ہے۔ لیکن یہاں دس برس ہونے کو آئے تھے، اور اس عرصے میں سیاست دانوں کی سیاسی تربیت غلط خطوط پر ہوتی رہی تھی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ عوام کے منتخب کرنے کی کوئی اہمیت نہیں۔ جو اقتدار پر کلی طور پر قابض ہے، اسے خوش کرنا ضروری ہے، خواہ اس میں ملک اور قوم کا نقصان ہو، خواہ وہ عوامی مفادات سے متصادم ہو، اقتدار کی بھیلی میں سے اقتدار کے ایک گڑ کی ڈلی حاصل کرنے کے لئے اس کی خوشامد کرنی ہوگی، جو بھیلی پر قابض ہے۔ وہ تو ایک طرح سے سیاسی نیلام گھر تھا، جو چاہے اونچی بولی دے کر چند روزہ عارضی اقتدار اپنے نام چڑھا لے۔ اور یہ احساس کہ یہ اقتدار کسی بھی لمحے چھن سکتا ہے، کرپشن کے فروغ کا سبب بن رہا تھا۔ صاحب اقتدار، اقتدار کے ہر لمحے کو کیش کرا لینا چاہتا تھا۔ ورنہ اپنے اردگرد کے لوگوں کو کیسے خوش رکھتا۔ ایسے میں سیاست کی اعلیٰ اقدار کا فروغ کیسے ممکن تھا۔ وہ تو ایک خاص اور یقینی عرصے کے لئے اقتدار ملے، اور اس کے بعد دوبارہ عوام کے پاس جانا ہو تو جواب دہی کا خوف ہوتا ہے۔ دوبارہ اقتدار کے لئے سیاست دان کارکردگی کی فکر کرتا ہے۔ یہاں تو ایسا کچھ تھا ہی نہیں۔ یہاں تو عارضی اور محدود اقتدار کے لئے فرد واحد کی گالیاں تک سننی پڑتی تھیں۔ تو سیاست دانوں میں عزت نفس تو رہی ہی نہیں تھی۔

1956ء میں آئین بنا۔ وہ اگرچہ بہت اچھا آئین نہیں تھا، لیکن بہرحال آئین تو تھا۔ آئین سے محروم قوم کی حیثیت تو افریقہ کے پس ماندہ علاقے میں پائے جانے والے جنگلیوں کے کسی قبیلے سے بھی حقیر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ آئین غنیمت تھا۔

لیکن 1958ء میں عجیب واقعہ ہوا۔ ملک میں پہلا مارشل لاء لگا اور جنرل محمد ایوب خان نے آئین معطل کر کے اقتدار سنبھال لیا۔ سیاست دانوں کی زباں بندی کا قانون بنا دیا گیا۔ یعنی آزادیٔ تقریر و تحریر پر قدغن لگا دیا گیا۔ یوں نام نہاد

جمہوریت بھی ختم ہوگئی۔اب ملک میں مکمل اور مسلم آمریت تھی۔ایک مہذب ملک اور قوم کے لئے یہ امر نہایت شرم ناک تھا۔

مگر کچھ عرصے کے بعد اس کے فوائد سامنے آنے لگے۔آمریت کے سائے میں ہی سہی، لیکن ایک مستحکم حکومت ملک میں پہلی بار قائم ہوئی تھی۔پھر اقتدار کیونکہ بہرحال غصب کیا گیا تھا تو غصب کرنے والے کو کچھ کر کے دکھانے کا خیال بھی تھا۔اور اکیلا آدمی کچھ کر نہیں سکتا، جبکہ یہاں تو ہر میدان میں کچھ کر کے دکھانا ضروری تھا۔چنانچہ ہر فیلڈ کے بہترین لوگوں کو جمع کیا گیا۔پہلی بار بہت غور وخوض کے بعد معاشی اور اقتصادی پالیسیاں بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔اس کے نتیجے میں ملک کے لئے ایک اقتصادی راہ کا تعین کیا گیا۔اس بات کی ضرورت سمجھ لی گئی کہ زراعت پر مکمل انحصار ترک کر کے صنعت کو فروغ دینا ہوگا۔یوں پہلا پنج سالہ منصوبہ سامنے آیا، جس کے اہداف ترقی لانے والے تھے۔

عبدالحق خوش تھا کہ پرانی دبی ہوئی فائلیں حرکت میں آئی ہیں۔اس کی اپنی بہت سی تجاویز پر عمل درآمد ہو رہا تھا اور کچھ کی اصلاح بھی کی گئی تھی۔پہلی بار ملک وقوم کے لئے کچھ سوچا جا رہا تھا۔اور صرف سوچا نہیں، اس پر عمل بھی کیا جا رہا تھا۔

اس کے نتیجے میں ملک میں معاشی استحکام بھی آیا۔بے روزگاری میں بھی کمی ہوئی اور روپے کی قیمت مستحکم ہوگئی۔درآمدات کے مقابلے میں برآمدات بڑھیں تو زرِمبادلہ کی صورتِ حال بھی بہتر ہوئی۔پہلی بار پاکستانی روپے کی قدر بھارتی روپے سے بڑھ گئی۔پاکستان خوش حالی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

مسعود صاحب سے بات ہوتی رہتی تھی۔وہ بھی اس بات سے خوش تھے کہ صحیح سمت میں قدم اٹھایا جا رہا ہے اور کام ہو رہا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ اسے واپس بلوانے کی کوشش کر رہے ہیں۔انہوں نے بتایا کہ اس کا کام بے کار نہیں گیا۔اب اس سے استفادہ ہو رہا ہے۔

چھ برس کم نہیں ہوتے۔چھ برس کی اس زندگی میں بے شمار یادگار واقعات پیش آئے۔لیکن تین واقعے ایسے تھے، جنہیں عبدالحق کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔تینوں کی

نوعیت بھی الگ تھی اور اختتامی تاثر بھی مختلف تھا۔

ان میں سے ایک شفیق صاحب سے ملاقات کا تھا۔

اسے کراچی آئے ایک سال ہوا تھا کہ ایک دن عارف نے کہا۔

''آج میرے ساتھ چلو عبدالحق!''

وہ اتوار کا دن تھا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''ایک بڑے صاحب علم آدمی ہیں، شفیق صاحب۔کب سے سوچ رہا تھا کہ تمہیں بھی ملوا دوں ان سے۔میں تو اکثر جاتا رہتا ہوں۔اس بار کچھ زیادہ ہی عرصہ ہوگیا ان سے ملے ہوئے۔''

''کرتے کیا ہیں....؟''

''کاروبار بچوں کے سپرد کر دیا ہے۔اب تو بس لوگوں کی روحانی امداد کرتے ہیں۔نجوم پر بڑی دسترس ہے ان کی۔لیکن بہت عرصے سے زائچہ بنانا چھوڑ رکھا ہے۔''

عبدالحق کو ان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔

''میں ضرور چلوں گا آپ کے ساتھ عارف بھائی!''

شفیق صاحب لالوکھیت میں رہتے تھے۔وہ عارف کی گاڑی میں وہاں پہنچے۔اٹھارہ بیس سال کے ایک لڑکے نے دروازہ کھولا۔عارف کو پہچان کر اس نے بڑے تپاک سے سلام کیا، ان دونوں سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

''میں بیٹھک کا دروازہ کھولتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد اس نے مرکزی دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک اور دروازہ کھولا۔

''تشریف لائیے۔'' اس نے کہا۔

وہ بہت سادہ سی بیٹھک تھی۔چند کرسیاں تھیں، ایک صوفہ تھا، اور سامنے ہی ایک چارپائی تھی، جس پر صاف ستھری چادر بچھی ہوئی تھی۔

''آپ بیٹھئے! بابا جان ابھی آ رہے ہیں۔'' لڑکے نے کہا۔

"پانی پیجئے گا۔"

"نہیں شکریہ ..... !"

وہ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے بعد شفیق صاحب کمرے میں آئے۔ عبدالحق نے اندازہ لگایا کہ ان کی عمر پینسٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ لیکن صحت اچھی تھی۔ وہ پچپن سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ چہرے پر خوش نما داڑھی تھی، جو پوری طرح سفید نہیں تھی۔

ان دونوں نے اٹھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ شفیق صاحب نے کہا۔

"اس بار آپ بہت عرصے کے بعد آئے ہیں عارف صاحب!"

"جی ..... ! مصروفیت کچھ زیادہ ہی رہی۔" عارف نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ وہ عبدالحق کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ بلکہ شاید انہوں نے اس کی بات سنی بھی نہیں تھی۔

عبدالحق کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ کچھ عجیب سا ہوگیا تھا۔

عارف نے جلدی سے متعارف کرایا۔

"حضرت! یہ میرے بہت اچھے دوست اور کولیگ ہیں ..... عبدالحق اور عبدالحق! یہ شفیق صاحب ہیں۔ میرے بہت محترم بزرگ اور راہنما۔"

شفیق صاحب نے جیسے اب بھی اس کی بات نہیں سنی۔

"ماشاء اللہ! کیسا روشن چہرہ ہے، اور کشادہ پیشانی۔" انہوں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"آپ بیٹھئے نا ..... !"

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ شفیق صاحب بھی چار پائی پر بیٹھ گئے۔

"اپنے دوست کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ نا!"

"ان کا تعلق لاہور سے ہے۔ پچھلے سال تبادلہ ہوکر یہاں آئے ہیں۔"

"پتا نہیں، دل کیوں ان کی طرف کھنچتا ہے۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"یہی تو کمال ہے حضرت! جو ملتا ہے، یہی بات کہتا ہے۔"

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔

"یہ تو اللہ کی عطا ہے، میری کوئی خوبی نہیں۔"

جس لڑکے نے اس کے لئے بیٹھک کا دروازہ کھولا تھا، وہ چائے لے آیا۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی تھے۔ شفیق صاحب اصرار کر کے انہیں کھلاتے رہے۔

پھر انہوں نے باتوں ہی باتوں میں عبدالحق سے پوچھا۔

"آپ کے بچے کتنے ہیں ..... ؟"

"ابھی تک تو محروم ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"شادی کو کتنے برس ہوگئے ..... ؟"

"شاید چھ سال ہونے والے ہیں۔" سچ تو یہ ہے کہ عبدالحق کو یاد ہی نہیں تھا۔ لگتا تھا، ہمیشہ سے وہ نور بانو کے ساتھ ہے۔

"اوہ ..... ! کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ آپ اس نعمت سے بھی نوازے جائیں گے۔ جس نے یہ پیشانی دی ہے آپ کو، وہ کوئی محرومی نہیں ہونے دے گا۔" شفیق صاحب کے لہجے میں خلوص تھا۔

"آپ عبدالحق کا زائچہ بنائیے نا حضرت ..... !" عارف نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

شفیق صاحب ہچکچائے۔

"آپ جانتے ہیں کہ یہ شوق چھوڑے برسوں ہوگئے مجھے۔ لیکن نہ جانے کیوں، ان کا زائچہ بنانے کو دل چاہتا ہے۔"

"نجوم سے تو آپ کی دلچسپی پرانی ہوگی۔ کہاں سے حاصل کیا آپ نے ..... ؟" عبدالحق نے بات ٹالنے کے لئے کہا۔ وہ زائچے وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ کچھ اس لئے کہ اس کے نزدیک یہ ایمان میں کمزوری لانے والی چیز تھی۔ اور کچھ اس لئے کہ اولاد کے معاملے میں وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پرانی ہی ہو سکتی ہے۔ اس دور کے بڑے گیانی استاد سے سیکھا تھا میں نے۔" شفیق صاحب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"تو آپ پروفیشنل بھی رہے ..... ؟"

"اللہ معاف کرے، گمراہی کے دور میں تو وسیلہ رزق ہی اس علم کو بنا رکھا تھا۔" شفیق صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"اللہ نے ہدایت سے نوازا تو پھر کبھی پیسے نہیں لئے زائچہ بنانے کے۔" وہ اٹھے۔

"میں معذرت چاہتا ہوں۔ ابھی حاضر ہوا۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے۔

"یہ کس چکر میں پھنسا دیا آپ نے ؟" عبدالحق نے سرگوشی میں عارف سے شکایت کی۔

"اسے اعزاز سمجھ بھائی ...! یہ تو اب ...."

عارف کی بات اُدھوری رہ گئی۔ شفیق صاحب واپس آ گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک بہت پرانی بوسیدہ سی کتاب تھی۔ ساتھ میں ایک کاپی اور پنسل بھی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ کتاب انہوں نے ایک طرف رکھی اور کاپی گود میں رکھ کر کھول لی۔

پھر کسی خیال نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے غور سے عبدالحق کو دیکھا۔

"میں بھی بچوں کی طرح بے تاب ہو گیا۔ یہ تو پوچھا ہی نہیں آپ سے کہ آپ کو اپنی پیدائش کے کوائف کا علم بھی ہے یا نہیں۔"

عبدالحق جھوٹ سے ہمیشہ بچتا تھا۔ ورنہ اس وقت یہ کہہ کر جان چھڑا سکتا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا اور بولا۔

"والد صاحب ہر اہم بات ڈائری میں لکھ لیتے تھے۔"

"چلیں، آسانی ہو گئی۔ ورنہ زائچہ تو اس کے بغیر بھی بن سکتا تھا۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"اگرچہ اس پر سو فیصد اعتماد میں نہیں کر سکتا تھا۔"

عبدالحق نے بھی سوچا کہ اچھا ہوا، جھوٹ سے بچ گیا۔

"تو مجھے اپنی پیدائش کا سال، ماہ، تاریخ اور وقت بتا دیجئے۔"

عبدالحق ہچکچایا۔

"چھوڑیئے! رہنے دیجئے نا! مجھے اس میں زیادہ دلچسپی نہیں۔"

شفیق صاحب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اپنے شوق کی بے تابی میں وہ یہ بات نوٹ نہیں کر سکتے تھے کہ عبدالحق کے انداز میں شروع سے ہی دلچسپی نہیں تھی۔ ورنہ جس کا زائچہ بنایا جا رہا ہو، وہ تو بہت بے تاب ہوتا ہے۔

"مجھے آپ میں کچھ کشش سی محسوس ہو رہی ہے۔ ورنہ اب تو میں کسی کا زائچہ بناتا ہی نہیں۔" ان کے لہجے میں شکایت بھی تھی اور شرمندگی بھی۔

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔ ایک بزرگ آدمی اس کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا۔

"تو چلیں، آپ بھی بچ گئے۔" اس نے کہا۔

"لیکن آپ کیوں بچتے ہیں اس سے ؟" شفیق صاحب نے پوچھا۔

"اللہ کے خوف کی وجہ سے۔" عبدالحق نے مختصراً کہا۔

شفیق صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔

"دیکھئے، اللہ سے ڈرنا تو ایمان کا حصہ ہے اور ایمان کو مستحکم کرنا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اگر میں غلطی پر ہوں، وہ نیت سے بھی واقف ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔ سب کچھ اللہ کا ہے۔ علم بھی اللہ کا ہے۔ اب وہ جسے جتنا چاہے دے، یہ اس کی مرضی۔ آپ سائنسی ایجادات کی بات کریں تو موجد تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ بدیع اس کا اسم ہے۔ بے مثال چیزوں کا بنانے والا۔ اور سائنس اللہ علم کی ایک بہت معمولی شاخ ہے۔ ذرا سوچیں تو کہ نیوٹن پر کشش ثقل کا راز کیسے کھلا ....؟"

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس مقام پر وہ چونکا۔ یہ سب کچھ تو اس نے اس وقت سوچا تھا، جب وہ بہت چھوٹا تھا۔

"اللہ کے دینے کے انداز بھی نرالے ہوتے ہیں۔" شفیق صاحب کی بات جاری تھی۔

"کسی کے سر پر سیب گرے اور وہ اتنا بڑا بھید پا لے۔ یہ اللہ کا کرم ہی تو ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کے لئے پوری کائنات کو مسخر کر دیا۔ لیکن اس سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ اللہ کی راہنمائی کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب جب اللہ نے

راہنمائی فرمائی، انسان آگے بڑھا۔ تو کسی علم کو برا کیسے کہہ سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں آپ؟''

''استغفر اللہ! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''ہاں! میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ ہر علم انسان کے لئے نہیں۔''

''کیوں نہیں! اللہ نے انسان کو اپنا نائب، اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اپنی تمام صفات کا ایک ذرے کا ذرہ بھی اسے سونپا ہے۔ اور علم بھی اللہ کی صفات میں سے ایک ہے۔ تو علم تو اللہ ہی کا دیا ہوا ہے نا!''

''شیطان معلم الملکوت تھا۔ اسے بھی تو اللہ نے علم دیا تھا۔ اس علم سے ہی اس کا مرتبہ تھا، اس کی فضیلت تھی اور اسی پر اسے غرور تھا۔ تو علم تو شیطان بھی دے سکتا ہے۔'' عبدالحق نے دلیل دی۔

''ہاروت ماروت کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ ان کے پاس بھی اللہ کا دیا ہوا ایک علم تھا، جو انسانوں کے لئے نہیں تھا۔ لیکن انسانوں نے ان سے سیکھا، اور انسانوں کو تباہی کا سامان کیا۔''

''دیکھیں عبدالحق صاحب! وہ تو اللہ کی طرف سے آزمائش تھی۔ وہ دونوں فرشتے اس بات کا اعلان بھی کرتے تھے۔'' شفیق صاحب نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''میں بحث نہیں کر رہا ہوں۔ صرف اپنا نکتہ نظر واضح کر رہا ہوں۔ اللہ سب جانتا ہے۔ اللہ جانتا تھا کہ لوگ تنبیہ کے باوجود ان فرشتوں سے وہ علم سیکھیں گے۔ وہ جو سورۃ ملک میں اللہ نے فرمایا اَلَا يَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ۔ کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا۔ تو یہ آزمائشیں ہیں جنت اور دوزخ کے لئے۔ اصل بات یہ ہے کہ علم جس ذریعے سے بھی پہنچا، ہے تو اللہ کا ہی۔ اور اللہ کی ہر نعمت کی طرح یہ بھی آزمائش ہے۔ نعمت پر آدمی پھول گیا، اترا گیا کہ یہ میرے علم، میری محنت یا میرے کسی کمال کی وجہ سے ہے تو گمراہ ہو گیا۔ اور سمجھا کہ یہ اللہ کی امانت ہے، اس کا فضل ہے اور اس سے دوسروں کو بھی فیض پہنچایا جائے، اسے انسانوں کے فائدے

کے لئے استعمال کیا جائے تو اس میں فلاح ہے۔

''اب ذرا سوچیں، اللہ اپنے عام بندوں کو بھی نوازتا ہے۔ ذہن میں کوئی خیال آتا ہے، کوئی بات سمجھ میں آتی ہے، جس کے بارے میں آپ کچھ بھی نہیں جانتے۔ کسی دستک پر آپ سوچتے ہیں کہ یہ فلاں شخص ہوگا۔ عقل تردید کرتی ہے، کیونکہ وہ شخص آپ سے ہزاروں میل دُور بیٹھا ہوگا۔ لیکن آپ دروازہ کھولتے ہیں تو وہیں شخص سامنے ہوتا ہے۔ کسی نے آپ کو یہ اطلاع دی؟ ہر شخص خواب دیکھتا ہے، جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ زیادہ تر وہ تعبیر سے بے خبر ہوتا ہے۔ لیکن کبھی علم تعبیر سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کوئی تعبیر اس پر واضح ہو جاتی ہے، اور درست بھی ثابت ہوتی ہے۔ کیسے؟ اور علم تعبیر کی بات کریں تو بنیادی طور پر اللہ نے یہ علم انبیاء کرام کو دیا۔ لیکن پھر یہ عام بندوں تک بھی پہنچا۔

یونانی محض آنکھ سے ستاروں کو دیکھتے، پہچانتے، مشاہدہ کرتے تھے۔ یہ صلاحیت انہیں کس نے دی تھی؟ نجوم پر تحقیق کی گئی، اصول ترتیب دیئے گئے۔ مختلف نشانیوں سے مختلف نتائج اخذ کئے گئے۔ یہ اخذ کرنے کی صلاحیت کس کی دی ہوئی تھی؟ کیا اللہ کی اجازت کے بغیر یہ ممکن تھا؟

عبدالحق صاحب! اللہ نے قرآن میں فرمایا کہ عزت ساری کی ساری اللہ کی ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جسے چاہے اور جتنی چاہے، عزت دیتا ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔ کسی بادشاہ کو بھی عزت نہیں ملتی اور کسی نادار کو اتنی عزت ملتی ہے، جس پر لوگ رشک کریں، اور سوچیں تو اس عزت کی کوئی وجہ بھی نظر نہ آئے، اس کے باوجود خود بھی اس کی عزت کریں۔ یہی حال اور تمام نعمتوں کا بھی ہے اور علم کا بھی۔

اب میں اپنی مثال دیتا ہوں۔ کبھی میں زائچے بناتا تھا تو اس علم کے اصولوں کے تحت اس کی تشریح و تعبیر بیان کرتا تھا۔ میرے ذہن میں دور دور تک اللہ کا تصور بھی نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو صرف مال سے غرض ہوتی تھی۔ میری کوئی پیش گوئی درست ثابت ہوتی تھی تو میں خود پر، اپنے علم پر اتراتا تھا۔ میں اپنے استاد کو اور خود کو صاحب کمال سمجھتا تھا۔ یہ گمراہی تھی۔ مگر اب اللہ نے مجھ پر فضل فرمایا ہے، اور مجھے شعور عطا فرما دیا ہے کہ یہ سب اللہ کی عطا ہے۔''

"آپ اپنے علم سے کوئی پیش گوئی کرتے ہیں، اور وہ کسی کو مایوسی میں مبتلا کرتی ہے یا کسی کو خوش فہمی میں مبتلا کرتی ہے۔ اور بعد میں غلط ثابت ہوتی ہے تو دونوں صورتوں میں اس شخص کا نقصان ہوا نا!" عبدالحق نے کہا۔

"اسی لئے ہم واللہ اعلم بالصواب کہہ کر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ حقیقت سے تو اللہ ہی باخبر ہے۔ ہم نے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور عبدالحق صاحب! ہم نے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا تو میرا ایمان ہے کہ اس میں اللہ کی طرف سے خیر ہی ہوگی۔ شر کا امکان بھی ہوگا تو انشاء اللہ رفع ہو جائے گا۔"

"لیکن مستقبل میں جھانکنے کی کوشش ہی کیوں کی جائے؟" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"یہ انسان کے لئے فطری ہے۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"ہر شخص کسی نہ کسی حد تک خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اس لئے مستقبل کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔"

"لیکن یہ تو ایمان کی کمی ہوئی نا!"

"کامل ایمان کا دعویٰ کون کر سکتا ہے عبدالحق صاحب! ایمان تو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اوّل تو اب میں زائچہ بناتا ہی نہیں۔ کسی کو بہت پریشان دیکھوں تو اس کی پرخلوص مدد کے خیال سے، اللہ کا نام لے کر بناتا ہوں۔ اللہ سے راہنمائی کی دعا کرتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ اسے مایوسی سے نکال کر امید کی طرف لے جاؤں۔ اور اسے اللہ کی طرف بڑھا دوں۔ میں اس سے کہتا ہوں، اللہ سے دعا کیا کرو۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ ہر پریشانی دور کر دے گا۔"

"جب آپ اسے درست سمجھتے ہیں تو آپ نے زائچہ بنانا چھوڑا کیوں؟"

"میں انسان ہوں، اور بہت کمزور انسان ہوں، اس لئے۔ خود کو آزمائش میں کیوں ڈالوں کہ کس وقت غرور میں مبتلا ہو کر خسارے میں پڑ جاؤں۔ یوں بھی میرے نزدیک یہ اچھا روزگار نہیں تھا۔"

"تو آپ میرا زائچہ کیوں بنانا چاہتے ہیں؟"

عارف خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ

مداخلت کرے، لیکن نامناسب سمجھ کر رک گیا۔

"پتا نہیں کیوں! بس دل چاہتا ہے میرا۔"

عبدالحق کے دل میں خاصی دیر سے ایک خیال بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ اسے حج کی بڑی آرزو تھی۔ اور وہ حمیدہ کے ساتھ حج پر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب یہاں کراچی میں آ پھنسا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ زائچہ بنوا کر اس سلسلے میں سوال کرے۔

شفیق صاحب نے اس توقف کو اس کا انکار سمجھا تو اسے قائل کرنے کے لئے ایک اور دلیل دی۔

"دیکھیں عبدالحق صاحب! نجوم صرف مستقبل کا حال بتانے کے لئے نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ تقریباً تمام لوگ زائچہ صرف اس لئے بنواتے ہیں۔ ورنہ زائچے میں بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہے۔ صاحب زائچہ کی شخصیت، اس کے عادات و اطوار، اس کی صلاحیتیں، اس کی خوبیاں، اس کی خامیاں اور کمزوریاں...... یہ سب چیزیں اس کی زندگی پر بہت مثبت اثر ڈال سکتی ہیں۔ کمزوریوں کا علم ہو تو آدمی ان سے لڑ کر، انہیں دور کر کے اپنی زندگی میں بہتری لا سکتا ہے، اپنی بیشتر صلاحیتوں سے آدمی ناواقف ہوتا ہے۔ واقف ہو جائے تو ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔"

عبدالحق اب بے تاب ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے! میں زائچہ بنواؤں گا آپ سے۔"

شفیق صاحب کھل اٹھے۔ عارف نے بھی سکون کی سانس لی۔

"اپنے پیدائش کے کوائف لکھوایئے مجھے۔" شفیق صاحب نے کاپی کھولی اور پنسل سنبھالی۔

عبدالحق نے اپنا وقت، تاریخ، ماہ اور سالِ پیدائش انہیں بتایا۔

شفیق صاحب نے کاپی میں لکھا، پھر غور سے اسے دیکھا۔ ان کے چہرے پر الجھن کے ساتھ ایسا تاثر بھی تھا، جیسے وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کئی بار انہوں نے ہلکے سے سر جھٹکا۔ جیسے کچھ فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں۔

"مقام بھی تو بتایئے۔" بالآخر انہوں نے کہا۔

"اب مقام آپ کو کیا بتاؤں؟" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"میں جس گاؤں میں پیدا ہوا تھا، وہ تو لال آندھی کی لپیٹ میں آ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گیا تھا۔" اس کو شفیق صاحب کی کیفیت کا بالکل علم نہیں تھا، جن کے چہرے پر اب شدید حیرت تھی۔

"اب اس جگہ ایک اور قصبہ آباد ہے۔"

"آپ مجھے اس گاؤں کا نام بتائیے، جہاں آپ پیدا ہوئے تھے۔" شفیق صاحب کے لہجے میں اضطراب تھا۔

"اسے ٹھاکروں کی گڑھی کہا جاتا تھا۔" عبدالحق نے افسردگی سے کہا۔

شفیق صاحب ایک دم سے اٹھے۔ کاپی ان کی گود میں لڑھک کر نیچے گر گئی، لیکن انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ پنسل ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گھر کے اندر جانے والے دروازے کی طرف لپکے۔

عارف نے سوالیہ نظروں سے عبدالحق کو دیکھا۔ عبدالحق نے کندھے جھٹک دیئے۔ خود اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ اس نے کاپی اٹھا کر پلنگ پر رکھ دی۔

چند منٹ بعد شفیق صاحب واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک پرانی سی پشتک تھی۔ پلنگ پر بیٹھ کر انہوں نے کاپی کا وہ صفحہ کھولا، جس پر انہوں نے عبدالحق کی تاریخ پیدائش وغیرہ لکھی تھی۔ اس صفحے کو سامنے پھیلانے کے بعد انہوں نے وہ پرانی پشتک کھولی، جو ابھی وہ گھر کے اندر سے لائے تھے، اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

ایک صفحے پر وہ رکے اور انہوں نے جیسے کاپی کے صفحے سے اس کا موازنہ کیا۔ پھر انہوں نے بے یقینی سے سر ہلایا۔

"یہ کیسے ممکن ہے......؟" وہ بڑبڑائے۔

عبدالحق تو خاموش بیٹھا رہا۔ لیکن عارف سے نہیں رہا گیا۔

"کیا بات ہے حضرت......!"

"اَن ہونی ہوگئی۔" شفیق صاحب نے کہا۔ پھر خود ہی نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن نہیں......! یہ ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیا نہیں ہو سکتا حضرت......!"

لیکن شفیق صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ وہ تو بار بار دونوں صفحوں کو

دیکھے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا اور بہت غور سے عبدالحق کو دیکھا۔

"میں آپ سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" وہ بولے۔

عارف نے جلدی سے کہا۔

"میں باہر چلا جاتا ہوں۔"

لیکن عبدالحق نے عارف کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔"

"میں آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں جناب!" شفیق صاحب نے بے حد لجاجت سے کہا۔ عبداحلق کے لئے ان کے لہجے میں عجیب سی تبدیلی آئی تھی۔ اس ان کے انداز میں اس کے لئے بے حد احترام تھا۔

"الحمد للہ! میری نجی زندگی میں کوئی ایسی بات نہیں، جسے میں کسی سے بھی چھپانا چاہوں۔" عبدالحق نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"اور عارف بھائی سچ مچ میرے لئے بھائی جیسے ہیں۔ آپ بے فکری سے ان کے سامنے بات کر سکتے ہیں۔"

شفیق صاحب اب بھی ہچکچا رہے تھے۔ بالآخر انہوں نے کہا۔

"میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، میری بات بری لگے تو معاف کر دیجئے گا۔" پھر انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"پوچھنا ضروری نہ ہوتا تو میں پوچھتا ہی نہیں۔"

"آپ جو چاہیں پوچھیں، مجھے برا نہیں لگے گا۔"

عارف متجسس بھی تھا اور کچھ خجالت سی بھی محسوس کر رہا تھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ......" شفیق صاحب کہتے کہتے رک گئے۔ پھر انہوں نے نظریں جھکاتے ہوئے بات پوری کی۔

"کیا آپ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے تھے......؟"

ایک لمحے کو عبدالحق حیران ہوا۔ زائچہ بنائے بغیر ہی یہ بات انہیں معلوم ہوگئی، یہ کیسا علم ہے۔ لیکن وہ بس ایک پل کی حیرت تھی۔ پھر اس نے بے حد پُرسکون لہجے میں کہا۔

"جی ہاں......!"

شفیق صاحب اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے اور انہوں نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"اور آپ کا نام اوتار سنگھ رکھا گیا تھا، آپ ٹھاکر تھے......؟" اس بار عبدالحق کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

"یہ سب کیسے جانتے ہیں آپ؟" اور اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ بھیگ رہا ہے۔ شفیق صاحب رو رہے تھے۔

"میں نہیں جانوں گا تو کون جانے گا؟ آپ کا وہ نام میں نے ہی تو رکھا تھا۔" شفیق صاحب بار بار اس کا ہاتھ چومنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

عبدالحق کے لئے وہ شدید ذہنی جھٹکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟

"آپ...... آپ کون ہیں......؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

"آپ کی رعیت......" شفیق صاحب نے عاجزی سے کہا۔

"میں نے عرض کیا نا کہ گمراہی کے عرصے میں نجوم میرا ذریعہ معاش تھا، اللہ مجھے معاف کرے۔ میں ٹھاکروں کی گڑھی میں رہتا تھا۔ پنڈت روپ سہائے نام تھا میرا۔ آپ کی پیدائش ہوئی تو میرے بھاگ جاگ اٹھے۔ آپ کے پتا جی نے مجھے بلوایا۔ میں نے آپ کی جنم کنڈلی بنائی۔ آپ کا وہ نام بھی میں نے تجویز کیا۔ آپ کے پتا جی نے مجھے اتنا دھن دیا کہ میں آج تک کھا رہا ہوں۔"

عبدالحق کی آنکھیں فرطِ حیرت سے پھیل گئی تھیں۔

"تو پھر آپ مسلمان کیسے ہوئے؟"

"یہ تو اللہ کا فضل ہے ٹھاکر صاحب!" شفیق صاحب انگشت شہادت اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ بہت بابرکت تھے۔ آپ کو اللہ نے ایسا بنایا تھا۔ آپ کی جنم کنڈلی بنا کر مجھے صرف دھن دولت نہیں ملا، دنیا کی سب سے بڑی دولت بھی مل گئی۔ جس

پر آپ کا سایہ پڑا، اللہ کی رحمت سے اسے ایمان کی دولت مل گئی۔"

عارف دم بخود بیٹھا تھا۔ کمرے میں موجود دونوں افراد کو اس کی موجودگی کا بھی احساس نہیں تھا۔ وہ چاہتا تو اٹھ کمرے سے چلا جاتا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔

عبدالحق کو شفیق صاحب کی بات سن کر زبیر اور رابعہ کا خیال آیا۔ اور بھی بہت کچھ یاد آنے لگا۔

"آپ مجھے تفصیل سے بتائیں نا!" اس نے کہا۔

"آپ کی جنم کنڈلی بنانے کے بعد میں نے ٹھاکر جی کو جو کچھ آپ کے بارے میں بتا سکتا تھا، بتا دیا۔ مگر پہلی بار مجھے بے بسی کا احساس ہوا۔ اس کنڈلی میں بہت کچھ ایسا تھا، جو میری سمجھ سے باہر تھا۔ میں نے ٹھاکر جی سے اس کا اعتراف کیا اور کہا کہ میں اپنے گرو کو ان کے پاس لے کر آؤں گا۔ کیونکہ اس کنڈلی کے لئے میرا علم چھوٹا ہے۔"

"پھر......؟"

"پھر میں اپنے گرو جی کے پاس گیا، جو بنارس میں ہوتے تھے۔ پنڈت رام دیال نام تھا ان کا۔ میں نے آپ کی کنڈلی انہیں دکھائی۔ وہ علم میں مجھ سے بہت آگے تھے۔ مگر آپ کی کنڈلی کے سامنے وہ بھی عاجز تھے۔ ہمارے درمیان کئی دن آپ کی کنڈلی پر بات ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف اس ایک کنڈلی سے میں نے گرو جی سے جتنا سیکھا، اس سے پہلے برسوں میں نہیں سیکھا تھا۔"

"کچھ مجھے بھی بتائیں۔" عبدالحق پر تجسس حاوی آ گیا۔

"بتا رہا ہوں۔ اصطلاحات کی تو ضرورت نہیں۔ گرو جی نے سب سے پہلی بات تو یہ کہی کہ آپ اس دھرم کے نہیں ہیں، جہاں پیدا ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب میں نے یہ لیا کہ آپ دھرم تبدیل کریں گے۔ اس پر گرو جی نے کہا کہ تبدیلی کیسی؟ تبدیلی تو جب ہوتی کہ آپ ہندو دھرم میں پیدا ہوتے۔ آپ ہندو دھرم والوں میں پیدا ہوئے ہیں، لیکن ہندو دھرم کے نہیں ہیں۔ پھر کنڈلی دیکھ کر وہ بات میری سمجھ میں آ گئی۔

گرو جی بچوں کی طرح خوش تھے۔ان کا کہنا تھا کہ زندگی میں ایک ایسی جنم کنڈلی بھی دیکھنے کو مل جائے تو بھاگیہ کی بات ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کس طرح گرو جی کو ٹھاکروں کی گڑھی چلنے پر راضی کروں گا۔ پر وہ تو خود مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے وہاں لے کر چلو، جہاں اس شکتی شالی بالک کا جنم ہوا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ وہ بڑے ٹھاکر اور ٹھاکرانی کی جنم کنڈلی دیکھنا چاہتے ہیں۔لیکن سچی بات یہ کہ ان کا اصل مقصد آپ کا دیدار کرنا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ اس وقت آپ سولہ سال کے ہو چکے تھے۔ اسی کو نصیب کہتے ہیں۔ میں پہلی بار گرو جی سے ملنے بنارس گیا تھا تو وہ دہلی گئے ہوئے تھے۔ میں واپس آ گیا۔ایسے ہی کئی بار کوشش کی۔لیکن ملنے کا موقع سولہ سال بعد ملا۔''

عبدالحق کو شفیق صاحب کی گفتگو میں بے ترتیبی محسوس ہوئی۔لیکن وہ ان کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اس لئے نظرانداز کر دیا۔اب اسے اشتیاق تھا، کیونکہ پتا جی کا تذکرہ آ رہا تھا۔

''انہوں نے آپ کو بتایا نہیں تو آپ کو ان کے اصل مقصد کا علم کیسے ہوا.....؟'' اس نے اعتراض کیا۔

''بعد میں خود ان کے منہ سے اصل بات نکل گئی تھی۔'' شفیق صاحب نے وضاحت کی۔

''میں قطع کلامی پر معذرت خواہ ہوں '' عبدالحق نے معذرت کی۔

''کوئی بات نہیں، خیر! میں گرو جی کو لے کر گڑھی گیا۔ پھر ہم دونوں حویلی چلے گئے۔آپ کے پتا جی اپنے کارندوں سے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھے ذرا خفگی سے دیکھا اور بولے۔

''روپ سہائے! تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمہاری صورت بھی بھول گیا، اب میں انہیں تفصیل کیا بتاتا؟ ان سے معافی مانگتے ہوئے میں نے کہا کہ دیر سے سہی، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ پھر میں نے گرو جی سے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا، یہ میرے گرو جی ہیں۔ بڑے گیانی ہیں۔مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔

ٹھاکر نے غور سے گرو جی کو دیکھا اور ان کا نام پوچھا۔گرو جی نے نام بتا دیا۔ٹھاکر جی نے آنے پر ان کا شکریہ ادا کیا۔گرو جی بولے۔ ٹھاکر جی! یہ تو میرا سو بھاگیہ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا۔ یہاں آنے کے لئے۔

ٹھاکر جی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے کہا..... میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی تو یہ یہاں آنے کو، آپ سے ملنے کو بے چین ہو گئے۔ یہ آپ کی جنم کنڈلی بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس وقت گرو جی نے لرزتی آواز میں کہا۔

''مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجئے ٹھاکر جی! اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے۔''

''اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔'' ٹھاکر جی نے کہا۔

''وہاں اسکول میں پڑھتا ہے۔بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے۔''

یہ سن کر گرو جی نراش نظر آنے لگے۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ تو بس آپ کی دید کے لئے وہاں گئے تھے۔انہوں نے اداسی سے کہا۔

''میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہو گی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتو مجھے سمجھنا چاہئے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ٹھیک ہے ٹھاکر جی! چلتے ہیں۔''

وہ اٹھنے لگے تو ٹھاکر جی نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں بٹھا لیا۔بولے۔اب ایسے تو میں نہیں جانے دوں گا آپ کو۔ یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آ رہے ہیں۔ گرو جی نے بتایا کہ بنارس سے۔تو ٹھاکر جی حیرت سے بولے۔ اتنی دور سے، اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے ہیں میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو آپ ایسے ہی واپس چلے جاتے؟ گرو جی نے کہا۔ ٹھاکر جی! میں بس اسی کی دید کے کارن تو آیا ہوں اتنی دور سے۔ پر اماوس کی لمبی رات ہے تو چاند کی دید تو نہیں ہوتی۔ پھر رکنا کیسا؟

میں حیران تھا۔ مجھے گرو جی نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ ٹھاکر جی نے ان کی بات سن کر کہا۔نہیں پنڈت جی! آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ ایسے تو آپ نہیں جا سکتے۔

ٹھاکر جی نے بہت اصرار کیا۔ میں نے بھی گرو جی کی خوشامد کی۔ گرو جی رکنا نہیں چاہتے تھے۔مگر بس مروت میں ایک رات کے لئے رکنے پر آمادہ ہوگئے۔ ٹھاکر جی نے ہمیں مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ رات کھانے میں بڑا اہتمام کیا۔کھانے کے بعد انہوں نے گرو جی سے آپ کے بارے میں بتانے کو کہا۔گرو جی عاجزی سے بولے...... میں کیا بتاؤں؟ میں کیا بتا سکتا ہوں؟ میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں۔ٹھاکر جی نے حیرت سے انہیں دیکھا اور بولے...... پر اس کی جنم کنڈلی تو آپ کے سامنے ہے۔ اس پر گرو جی نے جو کچھ کہا، وہ میں کبھی نہیں بھولتا۔ وہ بولے...... ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔جیون بھر میں ایک ایسی کنڈلی کسی کو مل جائے تو وہ گیانی بن جاتا ہے۔ سچ یہ ہے ٹھاکر جی کہ میں نے ایسی جنم کنڈلی کبھی نہیں دیکھی۔ میرے بہت سے چیلے ہیں ٹھاکر جی، اور میں روپ سہائے کو سب سے اچھا چیلا سمجھتا ہوں۔ پرنتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں، یا پھر جنم کے سمے میں کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔

اس پر ٹھاکر جی نے برا مان کر کہا کہ یہ تو ممکن ہی نہیں، وہ بھول ہی نہیں سکتے آپ کی پیدائش کا وقت۔ اور انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں تو پرکھوں سے یہ سلسلہ ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کی کنڈلی بنائی جاتی ہے۔گرو جی بولے...... میں آپ کی اور آپ کی سورگ باسی پتنی کی کنڈلی بھی بنانا چاہتا ہوں۔ ٹھاکر جی نے کہا کہ دونوں کی جنم کنڈلی موجود ہے۔، پھر وہ جا کر دونوں کنڈلیاں لے آئے۔

گرو جی دونوں کنڈلیوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ وہ پریشان لگ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی پشتک نکالی اور آپ کی اور آپ کے ماتا پتا کی جنم کنڈلیاں خود بنائیں۔ ان کو بنی ہوئی کنڈلیوں سے ملانے کے بعد انہوں نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔تیری بنائی ہوئی کنڈلی میں رتی بھر کھوٹ نہیں ہے روپ سہائے! یہ سولہ آنے سچی ہے۔ میں نے عاجزی سے کہا، جو بھی سیکھا، آپ ہی سے سیکھا ہے مہاراج!

گرو جی اب تینوں کنڈلیوں کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ وہ جیسے مجھے اور

ٹھاکر جی کو بھی بھول گئے تھے۔ ٹھاکر جی بھی پریشان لگ رہے تھے۔

پھر اچانک گرو جی نے بولنا شروع کیا۔مگر وہ جیسے خود سے باتیں کر رہے تھے...... عجیب...... بہت عجیب...... چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی میں راج یوگ ہے...... بہت شکتی والا راج یوگ...... میں نے ایسی ہزاروں کنڈلیاں دیکھی ہیں، جن میں یہ دونوں یوگ تھے۔ پرنتو ہوتا یوں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں۔ منشی نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔ بس عام سا منشی بن جاتا ہے۔ یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا فقیر۔ یا پھر جس یوگ کی شکتی زیادہ ہو، اس کا اثر رہتا ہے، پر کمزور۔ اس کنڈلی میں دونوں کی شکتی زبردست ہے، لیکن دونوں کی شکتی برابر بھی ہے۔

''یعنی دونوں نے ایک دوسرے کی کاٹ کر دی؟'' ٹھاکر جی نے کہا۔

''گرو جی بری طرح چونکے۔ انہیں سچ مچ ہماری موجودگی کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہ خود سے ہی باتیں کر رہے تھے۔ سنبھل کر انہوں نے ٹھاکر جی کو دیکھا اور بولے۔ ہونا تو یہی چاہئے تھا کہ ٹھاکر جی، پھر ہوا نہیں، کنڈلی میں دونوں کے لئے سنگی یوگ بھی ہیں۔ سہارا دینے والے یوگ، جنہوں نے کسی کو کٹنے نہیں دیا۔ سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال رہے ہیں۔دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔''

''مطلب کیا ہے؟'' ٹھاکر جی نے بے چینی سے پوچھا۔

''چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے، لیکن جیون غلامی کا گزاریں گے۔ اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔ اس کنڈلی میں روشنی اتنی زیادہ ہے کہ کچھ جھائی نہیں دیتا۔ کچھ ن ہیں آنے لگتا ہے تو روشنی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔''

''ٹھاکر جی نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا...... یہ تو روپ سہائے نے بھی بتا دیا تھا۔ کچھ اور نہیں بتائیں گے آپ؟ اس پر گرو جی بولے کہ روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے۔ پرنتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، اوش بتاؤں گا۔ چھوٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔مگر

خطرے ہار جائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گیاور چھوٹے ٹھاکر پریم کریں گے...... دوبار...... اور وہ سچا پریم ہوگا۔ دونوں میں وہ سچل ہوں گے۔ اور چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں ہے۔ مگران کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا۔ اس میں ٹھاکر جی جھنجلا گئے۔ بولے...... کیسی باتیں کرتے ہیں آپ...... جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟ گرو جی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، شما کیجئے ٹھاکر جی! جو دیکھ اور سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔ سمجھ میں تو یہ بات میری بھی نہیں آتی۔ پر کنڈلی یہی بتاتی ہے۔ اور ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر بڑے گیانی ہوں گے، پرنتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا۔ ہوتا یوں ہے ٹھاکر جی کہ منشی جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔ علم، دولت، عزت، شہرت، پر جب وہ مرتا ہے تو اوش راکھ رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ختم۔ چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے۔ صرف پریم کی تلاش میں۔ وہ ہر چیز کو ٹھوکر مار دیں گے۔ اور جب ان کا انتم سمے آئے گا کہ موت ہی انہیں سب کچھ دے گی۔ وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔'' شفیق صاحب نے گہری سانس لی۔ وہ جیسے کسی ٹرانس میں تھے۔

''گرو جی یہ سب کچھ کہے جا رہے تھے۔'ذ انہوں نے سلسلہ کلام پھر جوڑا۔

''اور میرا دم نکل رہا تھا۔ آپ کے مرنے کی بات ٹھاکر جی کو کیسے اچھی لگ سکتی تھی چھوٹے ٹھاکر! انہیں غصہ آ رہا تھا مگر وہ ضبط کر رہے تھے۔''

عبدالحق بھی سحرزدہ سا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہ وہ باتیں تھیں، جو اسے معلوم نہیں ہو سکتی تھیں۔ لیکن اللہ کا حکم تھا تو کیسے ناقابل یقین انداز میں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے تصور میں اپنے پتا جی کا چہرہ تھا۔

ادھر شفیق صاحب بھی ماضی میں بہہ گئے تھے۔ انہیں اچانک خیال آیا کہ بے ساختگی میں وہ اصطلاحات بھی بول رہے ہیں، جو یہاں کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں گی۔

'' آپ کو الجھن تو نہیں ہو رہی ہے چھوٹے ٹھاکر! میں پیچیدہ اصطلاحات

بھی بیان کر گیا۔''

''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں شفیق صاحب! لیکن اگر میں آپ کو پنڈت جی کہوں تو آپ کو کیسا لگے گا؟'' عبدالحق نے بے حد تحمل سے کہا۔

اور شفیق صاحب پر لرزہ چڑھ گیا۔

''معاف کر دیجئے عبدالحق صاحب! ماضی میں کھویا ہوا تھا، اس لئے بھول ہوگئی۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''مقصد آپ کی توہین تو نہیں ہو سکتا نا! دیکھئے تو میں آپ کے قدموں میں بیٹھ کر باتیں کر رہا ہوں۔''

پہلی بار عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ اب تک اس کے قدموں میں بیٹھے ہیں۔ اس نے جلدی سے ان کے ہاتھ تھامے۔

''پلیز...... ! ایسا نہ کریں۔ آپ وہاں بیٹھیں میرے سامنے۔''

''نہیں...... ! یہ میری حیثیت نہیں۔''

'' آپ میری بات نہیں مانیں گے؟'' عبدالحق کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔

اور شفیق صاحب بے بسی سے اٹھے اور پلنگ پر بیٹھ گئے۔

'' آپ نے میری بھول پر مجھے معاف تو کر دیا نا......؟'' وہ گڑگڑائے۔

''بھول پر معافی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ پلیز مجھے آگے کی بات بتائیں۔''

شفیق صاحب کی نظریں دیوار پر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ کھو سے گئے، جیسے پرانی یادوں کو ترتیب دے رہے ہوں۔ پھر وہ بولے۔

''اس کے بعد گرو جی نے آپ کے پتا جی سے کہا کہ اب وہ ان کی اور سورگ باشی ٹھکرائن کی کنڈلیوں کا جائزہ لیں گے۔ ٹھاکر جی نے کہا، اس کا کیا حاصل پنڈت جی، ٹھکرائن تو جا چکی اور میرا بھی کیا ہے...... گرو جی بولے، بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لئے ماتا پتا کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے۔ ان دونوں کنڈلیوں کی مدد سے میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو شاید زیادہ سمجھ سکوں۔''

''ٹھاکر جی چپ ہوگئے اور میرے گرو جی آپ کے ماتا پتا کی کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھتے رہے۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ٹھاکر جی کی نظریں بھی انہی پر جمی تھیں۔ گرو جی کا انہماک غضب کا تھا۔ مگر پھر انہوں نے ایک جھرجھری سی لی اور بری طرح چونکے۔ ان کے چہرے پر بے یقینی تھی۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھایا، مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں اور بولے...... شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی! پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ دونوں کنڈیوں میں کوئی بات انہوں نے دیکھی ہے، اور وہ کوئی ایسی بات ہے، جو ٹھاکر جی کو نہیں بتائی جا سکتی۔ ٹھاکر جی بھی کوئی بچے نہیں تھے۔ انہو نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔ انہوں نے کہا...... آپ کو بتانا ہوگا ٹھاکر جی! میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا۔

گرو جی نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی! جو بتانے لائق ہو۔''

''بتانے لائق نہیں، تب بھی بتائیں۔ میں اپنے پتر کے متعلق ہر بات جاننا چاہتا ہوں۔''

عبدالحق کی آنکھیں جلنے لگیں۔ پتا جی کیسی محبت کرتے تھے اس سے۔ بلکہ احترام کرتے تھے اس کا، اور وہ شرمندہ ہوتا تھا۔ وجہ اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

شفیق صاحب اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہتے رہے۔

''گرو جی نے عاجزی سے کہا۔ میرا وشواس کریں ٹھاکر جی! یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں نہیں ہے، اس پر ٹھاکر جی سمجھ گئے کہ بات ان کے اور ان کی پتنی کے متعلق ہے۔ وہ بولے...... تب تو ضرور بتائیں مہاراج!

گرو جی نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی!''

اب میں بھی اندر ہی اندر دہل رہا تھا۔ کوئی بہت ہی بڑی بات ہوگی۔ ٹھاکر جی اصرار کر رہے تھے کہ پنڈت جی انہیں وہ بات بتا دیں۔ لیکن گرو جی ہچکچاتے تھے۔ پر میں جانتا تھا کہ بات کرنے کو ان کا من کرتا ہے، تاکہ آگے کی

بات جان سکیں۔ کچھ اصرار کے بعد انہوں نے کہا کہ وہ بات ایسی ہے کہ ٹھاکر کو اچھی نہیں لگے گی۔ اس پر ٹھاکر جی نے وچن دے دیا کہ بات کیسی ہی ہو، وہ ناراض نہیں ہوں گے۔''

اب تو عبدالحق کا بھی تجسس سے برا حال تھا۔ لگتا تھا، کسی بڑے راز پر سے پردہ اٹھنے والا ہے۔

''گرو جی اب بھی ہچکچا رہے تھے، اور میں ڈر رہا تھا۔ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو......؟ ٹھاکر جی بہت نرم دل تھے، پر تھے تو راج پوت۔ آخر گرو جی نے ہمت کر کے کہا...... آپ سے ایک بات پوچھنی ہے ٹھاکر جی! ٹھاکر جی نے کہا...... پوچھو...... گرو جی بولے...... چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں نا......؟'' یہ کہہ کر شفیق صاحب خاموش ہوگئے۔

عبدالحق کے دل میں کچھ ٹوٹنے لگا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ پتا جی اس سے اتنی محبت کرتے تھے، اور خود وہ بھی...... نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔

''خوف سے میرا برا حال ہوگیا۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''میرا بس چلتا تو جادو کے زور پر وہاں سے غائب ہو جاتا۔ میں جانتا تھا کہ ٹھاکر جی کے لئے تو وہ گالی ہے، اور کوئی راج پوت گالی کبھی برداشت نہیں کرتا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ گرو جی نے اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دیا۔ میری ٹھاکر جی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی مجال نہیں تھی۔ مگر میں کن انکھیوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ غصے سے کھول رہے تھے۔

''مگر ٹھاکر جی بڑے آدمی تھے۔ وہ اپنے غصے کو پی گئے۔ انہوں نے گرو جی سے وضاحت چاہی۔ گرو جی نے کہا...... میں یہ پوچھ رہا ہوں ٹھاکر جی کہ چھوٹے ٹھاکر لے پالک تو نہیں؟ ایسا تو نہیں کہ آپ نے کسی کا بچہ لے کر پالا ہو، اور اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو۔

ٹھاکر صاحب آگ بگولا ہوگئے۔ مگر انہیں اپنے وچن کا بھی پاس تھا۔ انہوں نے بڑے تحمل سے کہا...... ہم راج پوت اپنے خون پر بہت مان کرتے ہیں مہاراج، اپنے خون میں ملاوٹ برداشت نہیں کرتے ہم۔ گرو جی بولے...... پر

ٹھاکر جی! اصل راج پوت بچہ بھی تو مل سکتا ہے۔ ٹھاکر نے کہا، یہ بتائیں مہاراج کہ یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟ اس پر گرو جی نے دھماکہ کر دیا...... آپ کے اور آپ کے سورگ باسی پتنی کے بھاگیہ میں اولاد ہے ہی نہیں ٹھاکر جی! آپ دونوں کی جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں۔ اور کنڈلیاں بنانے میں مجھ سے کوئی غلطی بھی نہیں ہوئی ہے ٹھاکر جی۔

ٹھاکر جی کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے...... اوتار سنگھ میرا ہی پتر ہے گرو جی......!''

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔ اس کے لئے اس بات کی بڑی اہمیت تھی۔

شفیق صاحب اپنی کہے جا رہے تھے۔

''ٹھاکر جی نے بتایا عبدالحق کہ آپ کی پیدائش سے پہلے انہوں نے اور آپ کی ماتا جی نے ایک ہی وقت میں ایک ہی سپنا دیکھا تھا۔ اس سپنے میں یہ خوش خبری دی گئی تھی۔ میرا پتر پورے نو ماہ میری پتنی کے پیٹ میں رہا۔ پورا گاؤں اس کا گواہ ہے۔ میں آپ کو اس کی پیدائش کا پورا ریکارڈ دکھا سکتا ہوں۔

گرو جی بولے...... میرے لئے آپ کا کہنا ہی کافی ہے۔ پر میں نے ایک نئی بات سمجھ لی۔ جو بھاگیہ لکھتا ہے، اس کا من چاہے تو وہ کبھی اسے بدل بھی دیتا ہے۔ اور ہم کنڈلی دیکھنے والوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔ اس سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی! میں اور دیکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پھر کنڈلیوں پر جھک گئے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا تو وہ مسکرا رہے تھے۔ آپ بھی بھاگوان ہیں ٹھاکر جی اور چھوٹے ٹھاکر بھی۔ آپ کی وجہ سے میرے گیان میں اضافہ ہوا۔ آپ سے بات نہیں ہوتی تو میں کبھی سمجھ نہیں پاتا۔ پر اب مجھے نظر آ رہا ہے...... اوش نظر آ رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کنڈلیوں کے حساب سے آپ کے بھاگیہ میں اولاد نہیں تھی۔ پر وہاں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی نشانیاں موجود ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے ساتھ آپ دونوں کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دِشا بدل گئی۔ آپ کا راستہ بدل گیا۔ آپ نے ہنسی خوشی اس

تبدیلی کو مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی اس نئے راستے پر چل پڑے۔ پر آپ کی پتنی کے لئے یہ آسان نہیں تھا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر جیسی نہیں بن سکیں۔ اس لئے...... گرو جی کہتے کہتے رکے اور کنڈلی کو دیکھتے ہوئے کچھ حساب لگایا، پھر بولے...... ان کا دیہانت تین دوش پہلے ہوا تھا نا......؟ انہوں نے تاریخ اور وقت تک بتا دیا۔ ٹھاکر جی نے تائید میں سر ہلایا۔ گرو جی بولے...... وہ چھوٹ ٹھاکر جیسی بن جاتیں تو ابھی جیوت ہوتیں، اور کچھ ورش جیتیں۔ آپ بھاگوان ہیں ٹھاکر جی کہ آپ نے خود کو بدل لیا۔ اب آپ چھوٹے ٹھاکر کے لئے اپنا جیون بھینٹ کریں گے، اور آپ کو اس کا بڑا پھل ملے گا۔

پھر جانے کیا ہوا کہ ٹھاکر جی ایک دم ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے...... آپ آرام کریں۔ اب صبح آپ کے درشن ہوں گے۔ پھر اگلی صبح ٹھاکر جی نے ہمیں بہت کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔''

کچھ دیر ایسی خاموشی رہی، جیسے کوئی بولنا ہی نہیں چاہ رہا ہو۔ پھر عبدالحق نے پوچھا۔

''میرے محترم! آپ مسلمان کب ہوئے؟''

شفیق صاحب بری طرح چونکے۔

''مجھے معاف کیجئے گا عبدالحق صاحب! دراصل آپ کا اس قدر اچانک ملنا اور یہ پتا چلنا کہ آپ کون ہیں، میرے لئے بہت بڑا دھماکہ تھا۔ پھر ایک دم ماضی میں جانا، میں ترتیب قائم نہیں رکھ سکا۔ کچھ باتیں رہ گئیں۔ وہ اب بتاتا ہوں۔ گرو جی نے آپ کی جنم کنڈلی دیکھی تو ایک بات کہی۔ وہ بولے...... اس بچے سے جو بھی جڑے گا، وہ خوش قسمت ہوگا۔ اس میں بدلام آئے گا۔ اور ان بھاگوانوں میں تم بھی ہو روپ سہائے اور میں بھی ہوں۔ میں نے پوچھا، بدلام کیسا گرو جی، کہنے لگے...... پہلے بالک کے درشن کر لیں، پھر بتاؤں گا۔

اور جب ہم گڑھی سے رخصت ہوئے تو گرو جی مجھے دہلی لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمیں مسلمان ہونا ہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ دھرم تبدیل کرنے کا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کبھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو وہ بولے۔ میں

نے کہا تھا نا کہ بدلام آئے گا۔ سو یہ ہے وہ بدلام۔ ٹھاکرائن نے خود کو نہیں بدلا تو دنیا چھوڑ گئی۔ بدقسمت تھی۔ اور ٹھاکر کا من بدل چکا ہے۔ اسے بس رسم پوری کرنی ہے۔ میں نے کہا، گرو جی! مجھے تو ٹھاکر جی میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ وہ بولے ... ابھی کچے ہو۔ ٹھاکر جی سمجھ گئے تھے کہ میں جان گیا ہوں۔ اسی لئے رات انہوں نے اچانک ہی بات ختم کر دی تھی۔ روپ سہائے، ٹھاکر جی اندر مسلمان ہیں۔ ہم پر یہ بھید نہیں کھولنا چاہتے تھے۔ پر یہ نہ سمجھ سکے کہ ہم تو اشاروں کو زیادہ سمجھنے والے ہیں۔ ہمیں تو اوپر والے نے گیان دیا ہے۔ اب دیکھو روپ سہائے، جن کے بھاگ میں اولاد نہیں تھی، انہیں اوپر والے نے سپنے میں خوش خبری دی، اور پھر ایسا بھاگیہ وان بچہ دیا، تو کیا ہم اسے ماننے سے انکار کریں گے۔ گیان سب اسی کا ہے۔ اس کا رائی برابر حصہ اس نے ہمیں دیا، اور جب چاہا، اسے ہماری آنکھوں سے چھپا لیا۔ تو اسے تو ماننا پڑے گا۔

میں ہچکچا رہا تھا۔ گرو جی تو سنیاسی تھے، پر عبدالحق صاحب! میرے تو بیوی بچے بھی تھے۔ گرو جی نے جب یہ بات سمجھی تو سارا مال مجھے سونپا اور بولے۔ تم میرے چیلے ہو روپ سہائے، تمہاری ہی وجہ سے مجھے یہ آخری گیان، یہ سچی روشنی ملی ہے۔ اسی لئے تم سے کہا۔ ورنہ میرا تم پر کوئی زور نہیں۔ پر اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ سب سے بڑی دولت تمہیں مل رہی ہے۔ آگے تمہاری مرضی۔ میں تو یہ آخری کام ضرور کروں گا۔ میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

گرو جی! میں یہاں بھی آپ کے پیچھے ہوں۔ سو ہم دونوں جامع مسجد گئے اور وہاں اسلام قبول کر لیا۔ گرو جی کا نام نورالدین رکھا گیا اور میرا محمد شفیق۔ گرو جی بہت خوش تھے۔ ہم نماز پڑھنے لگے۔ قرآن پڑھنا سیکھتے رہے۔ لیکن صرف چھ ماہ بعد گرو جی کا انتقال ہو گیا۔ ان کا کوئی تھا نہیں۔ میں نے ان کی تدفین کی، اور اس کے بعد گھر چلا گیا۔ میرا گھر مبیش پور میں تھا۔''

''لیکن مبیش پور تو لال آندھی میں دفن ہو گیا تھا شفیق صاحب!'' عبدالحق نے اسے یاد دلایا۔

''جی ہاں! اس قبولِ اسلام ہی نے تو مجھے بچا لیا۔ میں نے گھر پہنچ کر بیوی

بچوں سے بات کی۔ وہ تو بری طرح بھڑک گئے۔ بیٹے تو اتنے مشتعل ہو گئے کہ گاؤں والوں کو سب کچھ بتانے پر تُل گئے۔ مگر بیوی میری پتی ورتا عورت تھی۔ اس نے انہیں روکا۔ کیونکہ گاؤں والوں کو پتا چل جاتا تو وہ میری تکا بوٹی کر دیتے۔ ان لوگوں نے مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ڈانواں ڈول تھا۔ مگر تیسری رات میں نے اپنے گرو جی نورالدین مرحوم کو خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بہت خوب صورت باغ میں بیٹھے ہیں، جہاں انہیں دنیا جہان کی نعمتیں میسر ہیں۔ اور وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں..... خسارے کا سودا نہ کرنا شفیق! مجھے دیکھو، اسّی سال کی گمراہی کے باوجود صرف چھ مہینے کے انعام کا یہ صلہ مجھے ملا ہے۔ بیوی بچوں کی محبت میں دوبارہ گمراہی کی طرف نہ جانا۔ ورنہ یہ تمہیں جہنم میں لے جائیں گے۔ بس پھر میں نے فیصلہ کر لیا۔ سب سے چھوٹا بیٹا میرے ساتھ تھا۔ یہ اس وقت سات آٹھ سال کا تھا۔ ٹھاکر جی کا دیا ہوا مال میرے پاس تھا۔ میں نے چھوٹے بیٹے کو ساتھ لیا اور لاہور چلا گیا۔ یہ میرا وہ بیٹا ہے، جس نے آپ کے لئے دروازہ کھولا تھا۔ شکیل نام ہے اس کا۔''

''تو اب آپ اکیلے ہیں؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''نہیں .....! اللہ کی مہربانی سے گھر بس گیا۔ پاکستان بننے کے بعد میں لاہور میں مہاجروں کے ایک کیمپ میں گیا۔ وہاں ایک بے سہارا جوان عورت نظر آئی۔ اس کے گھر کا کوئی فرد نہیں بچا تھا۔ اس سے میری شادی ہو گئی۔ 1950ء میں میں کراچی چلا آیا۔ پیسہ پاس تھا۔ ایک دکان کر لی۔ اب الحمدللہ وہ بچے سنبھالتے ہیں۔ اور میں عیش کرتا ہوں۔'' وہ ہنسنے لگے۔

''کیسی عجیب کہانی ہے آپ کی۔''

''اللہ کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''اب یہی دیکھیں کہ اللہ نے میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو کیسے پوری کی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جناب.....!''

''آپ کو دیکھنے کی حسرت دل میں لئے میرے گرو جی دنیا سے رخصت

ہو گئے۔ اب تو میرے نزدیک بھی یہ حسرت ہی بن گئی تھی۔ ملنے کا کوئی امکان تھا ہی نہیں۔ میں آپ کو کیسے تلاش کر سکتا تھا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ آپ اب اوتار سنگھ نہیں ہیں، بلکہ گرو جی کے مطابق تو آپ اوتار سنگھ کبھی تھے ہی نہیں، یعنی میں آپ کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ آپ سے ملاقات ممکن ہی نہیں تھی۔ لیکن دیکھیں، اللہ آپ کو ملانے کے لئے میرے گھر لے آیا۔''

''اور مجھے دعا دیجئے۔'' عارف نے پہلی بار مداخلت کی۔

''میں زائچہ بنانے کا نہ کہتا تو آپ کو ملنے کے باوجود یہ پتا نہ چلتا کہ عبدالحق ہی وہ شخص ہے، جس سے ملنے کی آپ کو آرزو تھی۔''

''بے شک! اللہ نے ہم کو ہر طرح سے ملانے کا ذریعے بنایا۔ اللہ کا شکر ہے، اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' شفیق صاحب نے نہایت خلوص سے عارف کو شکریہ کہا۔

عبدالحق کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا، جس نے اس کا پہلا نام رکھا تھا۔ اور جس طرح سے وہ مسلمان ہوا، وہ اللہ کی بہت بڑی رحمت تھی۔ اور جس طرح سے وہ ملے تھے، وہ بھی چھوٹا سا ایک معجزہ ہی تھا۔

''عبدالحق صاحب! آپ مجھے ٹھاکر جی کے بارے میں بتایئے۔'' شفیق صاحب نے اسے چونکا دیا۔

''آپ کے گرو جی کی اللہ نے سچی راہنمائی کی تھی۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''پتا جی کی ڈائریوں سے پتا چلا کہ وہ برسوں قرآن کا، دینی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے تھے اور اللہ کی رحمت سے انہوں نے حق کو پا لیا تھا۔ جو مولوی صاحب مجھے عربی پڑھاتے تھے، انہوں نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، اور مولوی صاحب نے ان کا نام عبداللہ رکھا تھا۔ وہ اس کا اعلان کرنے سے پہلے مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لیکن ان کی یہ دونوں خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔ آپ کے گرو جی کی دوسری پیش گوئی بھی اللہ کے فضل سے درست ثابت ہوئی۔ پتا جی مجھ پر قربان ہو گئے۔

ہمارے گاؤں پر جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔ پتا جی اس لڑائی میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ میں پہنچا تو وہ آخری سانسیں لے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے سب کچھ بتانے کی کوشش کی، لیکن بات نہیں کی جا رہی تھی۔ سب کچھ مبہم رہ گیا۔ میرے سامنے ہی ان کی جان نکلی۔ ان کے ہونٹ ہلے تھے اس وقت۔ یہ تو میں نے بعد میں جانا کہ وہ کلمہ پڑھ رہے تھے۔''

''سبحان اللہ!'' شفیق صاحب نے بے ساختہ کہا۔

''اور انہوں نے مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا تھا، کیونکہ لال آندھی سر پر کھڑی تھی۔''

''اوہ......! تو یہ اس دن کی بات ہے......؟''

''جی ہاں! اور مجھے بھی اللہ نے بچا لیا۔ ورنہ لال آندھی کی لپیٹ میں میں بھی آیا تھا۔ مجھے آج تک یقین نہیں آتا کہ میں اس سے بچ گیا۔''

''اللہ کے حکم سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولے۔

''ایک بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے......؟''

''ضرور پوچھئے......!''

''عبداللہ صاحب آپ پر قربان کیسے ہوئے؟ جے پور والوں نے ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کیوں کیا تھا؟''

عبدالحق نے انہیں مختصراً جے پور میں اپنی کارروائی کے بارے میں بتایا۔ وہ اور عارف حیرت سے سب کچھ سن رہے تھے۔

''یہ میں نہیں سمجھ سکا کہ انہیں میرے بارے میں معلوم کیسے ہوا کہ میں ٹھاکروں کی گڑھی کا ٹھاکر اوتار سنگھ ہوں۔ بہرحال وہ پتا جی سے مجھے طلب کر رہے تھے، جبکہ میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔ میں تاج محل دیکھنے نہ جاتا تو وہیں موجود ہوتا۔''

''یہ سب اللہ کے حکم سے ہے۔''

عبدالحق کو اس بات کی بہت خوشی تھی کہ شفیق صاحب ہر بھلائی کو اللہ سے

منسوب کرتے ہیں۔ ہر بات پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور اللہ کا نام لیتے ہوئے ان کے انداز میں بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ وہ ان کا گرویدہ ہوگیا تھا۔

''آپ نے کہا تھا کہ میری کہانی کتنی عجیب ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''لیکن درحقیقت میری کہانی تو آپ کی کہانی کا ایک بہت چھوٹا سا بابا ہے۔ آپ کی کہانی تو واقعی حیران کر دینے والی ہے۔''

''الحمدللہ! جو کچھ بھی ہے، محض اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔''

''اب اجازت ہو تو میں آپ کا زائچہ دیکھ لوں.....؟''

''جی ضرور.....!'' اب عبدالحق انکار کیسے کرسکتا تھا۔ انکار تو وہ پہلے بھی نہیں کرسکا تھا۔ جبکہ اب صورتِ حال ہی مختلف تھی۔

شفیق صاحب زائچے پر جھک گئے۔ کچھ دیر حساب کتاب بھی کرتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' انہوں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں پریشان تھا کہ یہ کہانی ایسے ختم ہونے والی تو نہیں۔ مگر اللہ نے میری پریشانی دور کر دی۔'' ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ آپ کو اولاد نہ دے۔ انشاء اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ نعمت سے نوازیں گے۔ انشاء اللہ دو بیٹے ہوں گے آپ کے۔''

''الحمدللہ! انشاء اللہ!'' عبدالحق کے دل میں جیسے روشنی ہوگئی۔

''لیکن یہاں کراچی آتے ہی میری بیوی بیمار رہنے لگی ہے۔''

''آپ کے زائچے میں دو شادیاں ہیں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب نے کہا۔

''پہلی بیوی سے تو اولاد نہیں ملے گی آپ کو۔''

''میں تو دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' عبدالحق نے تڑپ کر کہا۔ اس کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو کیا آپ یہ فرما رہے ہیں.....؟''

''دیکھئے عبدالحق صاحب! آپ کا زائچہ میرے سامنے ہے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے بنایا ہے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ میں آپ کا پرانا زائچہ نہیں دیکھ رہا ہوں۔ جو میں نے اپنی گمراہی کے دنوں میں بنایا تھا۔'' شفیق صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہدایت پانے کے بعد میں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ لیکن اللہ کا دیا ہوا علم مجھے حاصل رہا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ کسی ایسے شخص مجھ سے مدد چاہی، جسے میں انکار نہیں کرسکتا تھا..... کسی بھی وجہ سے، تو میں نے اللہ کے خوف سے، اور اللہ کی رحمت اور ہدایت سے اس کے لئے ایک طریق کار طے کیا۔ تو میں اللہ کا نام لے کر، اس سے مدد چاہتے ہوئے زائچہ بناتا ہوں کہ زائچہ غلطی سے پاک ہو۔ پھر زائچے کا جائزہ لینے سے پہلے میں اللہ سے راہنمائی طلب کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ جو کچھ مناسب سمجھے، وہ مجھ پر روشن کر دے۔ اور عام طور پر یہ کام میں صاحب زائچہ کی پرخلوص امداد کے لئے، اس کی دل جوئی کے لئے، اس کا حوصلہ بڑھانے کے لئے کرتا ہوں۔ اور جو کچھ اسے بتا رہا ہوں، اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ جو کچھ اللہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے، وہ مجھ پر روشن نہیں ہوتا۔ لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں میری ذاتی غرض بھی شامل ہے۔ مجھے تجسس ہے آپ کے بارے میں، کیونکہ میں نے آپ کی پیدائش کے فوراً بعد آپ کا زائچہ بنایا تھا۔ اس لئے میں نے اللہ سے اور زیادہ گڑگڑا کر دعا کی۔ اب جو کچھ میں بتاؤں گا، اسے حتمی ہرگز نہ سمجھئے گا۔ میں انسان ہوں، مجھ سے حساب کتاب میں غلطی بھی ہوسکتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چھپانا چاہے گا، وہاں میرا علم بھی لڑکھڑا جائے گا۔ وہاں مجھے کچھ دکھائی نہیں دے گا۔''

اس طویل وضاحت نے عبدالحق کا شرک کا خوف دور کر دیا۔ علم کے بارے میں شفیق صاحب کا نظریہ اس کے دل کو لگتا تھا کہ علم سارے کا سارا اللہ کا ہے، اس میں سے وہ جب، جسے، جتنا چاہے، دے دے۔ شفیق صاحب کی شخصیت اس کے لئے حیران کن ثابت ہو رہی تھی۔

لیکن اس کی پریشانی اور وحشت اپنی جگہ تھی۔

''آپ اپنی دوسری شادی کا سن کر پریشان ہوگئے۔'' شفیق صاحب نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا۔

''زائچہ بتاتا ہے کہ آپ کو اپنی بیوی سے عشق ہے۔اور یہ بھی کہ آپ کی زندگی کا عنوان ہی عشق ہے۔ مسلسل عشق، ہر لحہ عشق۔ جب آپ اپنی بیوی سے عشق نہیں کر رہے ہوں گے تو آپ اپنے پیدا کرنے والے سے عشق کر رہے ہوں گے۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات......؟''

عبدالحق کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ شفیق صاحب نے اس کا پردہ رکھتے ہوئے اسے بڑی نزاکت سے یہ احساس دلایا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد عشق حقیقی ہے نہ کہ بیوی سے عشق۔اور جب سے وہ بیوی کے عشق میں مبتلا ہے، اپنے مقصد سے دور ہوگیا ہے۔اسے جو ہونا تھا، وہ نہیں بن سکا ہے۔ اس نے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''جی......! میں سمجھ رہا ہوں۔''

''اور آپ نے ٹھیک کہا کہ آپ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔'' شفیق صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

''لیکن آپ جانتے ہیں کہ بندوں کا اختیار کتنا سطحی ہے۔ جو ہم چاہتے ہیں، وہ سب تو نہیں ہوسکتا۔ اور بہت کچھ ہمیں ایسا کرنا پڑتا ہے جو ہم نہیں چاہتے۔''

عبدالحق کے ذہن میں آیت مبارکہ گونجی ...... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی۔

''جی......! میں جانتا ہوں۔آپ شاید میری بات سمجھ نہیں پائے۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ دوسری شادی میرے لئے ناقابل تصور ہے۔اس لئے دوسری شادی کا مطلب خدانخواستہ......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔

''میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ جب سے ہم کراچی آئے ہیں، میری بیوی بیمار رہنے لگی ہے۔'' اس نے کہا۔

''میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب

بولے۔

''دیکھئے، جب سے میں نے ہدایت پائی، زائچے میں موت کا کھوج لگانا چھوڑ دیا۔''

لفظ موت پر عبدالحق جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب کوئی بیمار میرے پاس آتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ زائچہ بنوانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ سے دعا کریں کہ وہ آپ کو اس طبیب تک پہنچا دے، جس کے ہاتھ میں اللہ نے آپ کے لئے شفاء رکھی ہو۔ میرے نزدیک موت اللہ کا وہ راز ہے، جس کے بارے میں تجسس کرنا ہی نہیں چاہئے۔''

عبدالحق حیران رہ گیا۔ وہ شرک سے ڈر رہا تھا، جبکہ اس کے سامنے بیٹھا ہوا تو مسلم اللہ کے سوا کسی حوالے سے بات کرتا ہی نہیں تھا۔ یہاں تو شرک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

''اب میں آپ کو بتا دوں کہ انشاء اللہ آپ کی دوسری شادی آپ کی بیوی کی موجودگی میں ہوگی۔زائچہ یہ نہیں ظاہر کرتا کہ آپ پہلی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کریں گے۔''

عبدالحق نے سکون کی سانس لی۔ نوربانو کی موجودگی میں وہ دوسری شادی کیسے کرسکتا تھا۔

شفیق صاحب نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''جس کی وجہ سے اولاد سے محرومی کے باوجود آپ دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے، عجب نہیں کہ اسی کی وجہ سے آپ کو دوسری شادی کرلنی پڑے۔''

عبدالحق نے سر جھٹکا۔ اس کے نزدیک یہ امر محال تھا۔وہ تو اس بات سے ڈرتا تھا کہ کسی دن اماں اسے دوسری شادی کا حکم دیں گی، اور وہ انکار نہیں کر سکے گا۔ نوربانو تو اس کے قریب کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔

''اب میں آپ کو اس دوسری لڑکی کے بارے میں بتاؤں، جو آپ کی

زندگی میں آئے گی۔'' شفیق صاحب نے زائچے سے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''وہ ہر اعتبار سے آپ کی پہلی بیوی کا الٹ ہوگی۔ مزاج اور فطرت کے اعتبار سے بھی اور قسمت کے اعتبار سے بھی۔''

''مزاج اور فطرت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ یہ قسمت کے لحاظ سے الٹ ہونے کا کیا مطلب ہے ......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''دیکھیں ...... پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے۔ لیکن دوسری بیوی کو آپ بس قبول کریں گے۔ دوسری بیوی کو آپ سے عشق ہوگا۔ پہلی بیوی کا مزاج اگر قابضانہ ہے تو دوسری آپ کی قید میں رہنا پسند کرے گی۔ پہلی بیوی اگر یہ چاہتی ہے کہ آپ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہیں تو دوسری آپ کی خوشی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار رہے گی۔ پہلی بیوی لینے والی ہے تو دوسری صرف دینے والی ہوگی۔ پہلی بیوی کی وجہ سے آپ نے جو کچھ گنوایا، دوسری آپ کو وہ سب کچھ واپس دلوائے گی۔ پہلی بیوی مطالبے کرنے والی ہے تو دوسری آپ سے کچھ بھی طلب نہیں کرے گی۔ حتیٰ کہ محبت بھی نہیں۔ پہلی بیوی سے آپ کو اگر کچھ بھی نہیں ملا تو دوسری آپ کو سب کچھ دے گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انشاء اللہ اس سے آپ کو دو بیٹے ملیں گے۔ آپ کی یہ دوسری بیوی بہت مبارک ہوگی۔ آپ کی دوسری بیوی بہت صابر ہوگی...... آپ کی طرح۔''

''جب ہوگی تو دیکھیں گے۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''ایک بات بتائیں عبدالحق صاحب! اولاد کی وجہ سے بھی آپ کو کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آتا۔ کیوں ......؟''

''میرا ایمان ہے کہ اللہ نے میرے لئے اولاد لکھی ہے تو ضرور ملے گی۔ اور اگر نہیں لکھی تو میں کچھ بھی کرلوں، محروم ہی رہوں گا اور الحمدللہ! میں اللہ کی رضا میں خوش ہوں۔''

''بے شک! اللہ اگر آپ کو پہلی بیوی سے اولاد دینا چاہے تو کون روک سکتا ہے۔'' شفیق صاحب نے ستائشی لہجے میں کہا۔

''جی ہاں ......! یہی تو کہہ رہا ہوں میں۔''

''اور اگر وہ آپ کو پہلی بیوی سے اولاد نہ دینا چاہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''جی ......!'' عبدالحق کے لہجے میں الجھن تھی۔

''بے شک ......!''

''تو اللہ کو اگر آپ کی پہلی بیوی سے اولاد دینا منظور نہیں، لیکن اس نے آپ کے نصیب میں اولاد لکھی ہے تو آپ چاہیں یا نہ چاہیں، دوسری شادی تو آپ کی ہو کر رہے گی۔''

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔

''جی ......! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اللہ کی مرضی تو پوری ہو کر رہتی ہے۔ لیکن وہ کسی کو بتاتا کب ہے؟'' اصل میں وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ بات تو زائچے کے حوالے سے کہی جا رہی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا بداخلاقی ہوتی۔

''میرا خیال ہے کہ اللہ بتاتا ہے، اور سب کو بتاتا ہے۔'' شفیق صاحب نے بڑی سادگی سے اس کی بات سے اختلاف کیا۔ پھر وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

''کبھی کسی کو خواب کے ذریعے بشارت یا تنبیہ، کبھی کسی کو کسی علم کے حوالے سے، کبھی کسی کو کسی دوسرے شخص کے ذریعے، اور کبھی براہِ راست۔''

''براہِ راست کیسے ......؟''

''کبھی دل پر خیال القا کر کے، دیکھیں نا! جسے ہم وجدان کہتے ہیں، درحقیقت اللہ کی راہنمائی ہے۔'' شفیق صاحب نے کہا۔

''اور اللہ کی طرف سے اشاروں کا سلسلہ تو جاری ہی رہتا ہے۔ اشارے اجتماعی بھی ہوتے ہیں اور انفرادی بھی۔ جب گھٹا چھاتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ بارش ہونے والی ہے۔ بارش زحمت کا باعث بن جائے، فصلیں تباہ ہو جائیں، سیلاب آ جائیں تو ہم کہتے ہیں کہ اللہ ناراض ہے۔ میں کوئی غلط کام کرنے لگوں تو میرے اندر اکراہ پیدا ہوتا ہے۔ میں جب بے نام خوف میں مبتلا ہو جاؤں،

اللہ کے سوا کسی بھی چیز سے ڈرنے لگوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ اللہ ناراض ہے۔ کیونکہ ایمان والوں کے لئے اللہ نے فرمایا ہے کہ نہ انہیں کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ تو اللہ کی طرف سے اشارے تو ملتے رہتے ہیں۔ آدمی اللہ سے رابطے میں نہ ہو تو وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔"

عبدالحق کو احساس ہوا کہ شفیق صاحب نے بہت گہری، بہت بڑی بات کہی ہے۔ اس نے اسے ذہن میں محفوظ کر لیا کہ اس پر غور کرنا ہے۔ اسے اس ملاقات پر خوشی ہو رہی تھی۔ وہ بہت کچھ سمجھ رہا تھا، بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔

"لیکن حضرت! جو لوگ غلط راستے پر ہوں، اللہ سے متصادم ہوں، وہ اللہ کی دی ہوئی خوش حالی کو اللہ کا اپنے لئے تائیدی اشارہ سمجھتے ہیں۔"

"جی ہاں! شاید ہر پیغمبر کی امت پر یہ گزری ہے۔ ہمیشہ حقیر اور غریب لوگ ایمان لائے اور صاحب ثروت یہ سوچ کر مگن رہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ درست ہے، ورنہ وہ اتنے زیادہ نوازے کیوں جاتے؟ اور ایمان لانے والے اتنے تباہ حال کیوں ہوتے؟"

"تو اس کا سبب......؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جنہوں نے پیغمبر کو جھٹلایا، انہوں نے گویا اللہ سے بغاوت کی۔ تو اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔ اور پھر پیغمبر کی موجودگی میں اشاروں کی ضرورت بھی کہاں رہتی ہے۔ تو جس نے پیغمبر کو جھٹلا دیا، وہ اشارے کہاں سمجھے گا۔ آلِ فرعون کو ہی دیکھ لیجئے، اللہ نے خبردار کرنے کے لئے کیسے کیسے عذاب بھیجے ان پر، اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنے ربّ سے دعا کرو کہ یہ عذاب ہٹا لے، ہم ایمان لے آئیں گے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا پر وہ عذاب ہٹا بھی لئے گئے۔ یعنی انہوں نے عذاب بھی دیکھا اور پیغمبر کی دعا کا اثر بھی۔ اس کے باوجود بھی ایمان نہیں لائے تو اس سے زیادہ واضح اشارے اور کیا ہو سکتے تھے۔ اللہ خود فرماتا ہے کہ جسے وہ گمراہ کر دے، اسے کہیں سے ہدایت نہیں مل سکتی۔ میں تو اللہ کی پناہ مانگتا ہوں گمراہی سے، جبکہ وہ مجھے ہدایت دے چکا ہے۔ میں تو ہر اچھی بری بات میں اللہ کے

اشاروں کی جستجو کرتا ہوں اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"سبحان اللہ......!" عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

"مجھے بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ اور میں نے بہت کچھ سیکھا آپ سے۔"

"سب اللہ کی طرف سے ہے۔" شفیق صاحب نے چھت کی طرف اُنگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ایک بات اور کہوں آپ سے۔ یہ دنیا اسباب کا کارخانہ ہے، اور اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اس نے اسباب کا ایک ایسا سلسلہ قائم فرمایا ہے، جسے اس کے بندے نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی کھوج سکتے ہیں۔ یہ دنیا حیلے بہانے اور اسباب پر چل رہی ہے۔ یہ بھی شاید اللہ کی طرف سے آزمائش ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر کام کے پیچھے واضح طور پر اللہ کارفرما نظر آتا تو کون ایسا ہوتا جو ایمان نہ لاتا۔ ہم جو آنکھوں سے دیکھتے اور عقل سے سمجھتے ہیں، اسی کے مطابق تو بات کرتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، میرا باپ بس کے نیچے آکر کچلا گیا اور مر گیا۔ یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے حکم سے اسے موت آگئی۔ کوئی کہتا ہے، بارش نہ ہونے سے میری فصل تباہ ہوگئی۔ کوئی کہتا ہے کہ طوفانی بارش اور سیلاب نے میری فصل تباہ کر دی۔ یہ خیال کسی کو نہیں آتا کہ بارش کا ہونا نہ ہونا اللہ کے حکم سے ہے۔ کوئی کہتا ہے، فلاں نے مہربانی کی، میرا فلاں کام کر دیا۔ مگر اسے اللہ کی رحمت کا خیال نہیں آتا۔ ہم اسباب کے حوالے سے معاملات کو جانچتے ہیں۔ جبکہ صرف ایک ظاہری سبب ہی ہمیں معلوم ہوتا ہے۔ اس ظاہری سبب سے جڑا ہوا اسباب کا وہ سلسلہ جس نے معاملے کو کامیابی کی اس نہج تک پہنچایا، اس کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ ایسے میں ہم اس مسبب الاسباب کے بارے میں کیسے سوچ سکتے ہیں، جس نے وہ اہتمام فرمایا۔

میں سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! ہمارے ہاں یہ جو محاورہ ہے...... حیلے روزی بہانے موت...... کتنا سچا ہے۔ موت کا کوئی بہانہ ہوتا ہے، حادثہ ہو یا بیماری۔ اور روزی کے لئے حیلہ ضروری ہے۔ سب کچھ اللہ کرتا ہے، لیکن پس پردہ رہ کر۔ تو عبدالحق صاحب! آدمی کو کچھ درکار ہو تو اسے حیلہ تو کرنا ہوتا ہے۔"

"میرے خیال میں تو دعا ہی حیلہ ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"نہیں عبدالحق صاحب! حیلہ تو عملی کوشش ہے، چاہے برائے نام ہو۔"

"اچھا......! آپ بتائیں، حیلہ کیا ہے آپ کے نزدیک؟"

"کسان کا بیج بونا، فقیر کا صدا لگانا۔ اب کوئی فقیر کہے کہ میرا حال ایسا ہے کہ صدا لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی، تو اس کا گھر سے نکلنا ہی حیلہ ہے۔ حیلہ ضروری ہے عبدالحق صاحب!"

"اور دعا کیا ہے حضرت......!"

"دعا بندگی ہے عبدالحق صاحب!"

"اور بندگی کیا ہے......؟"

"بندگی قلب اور روح کی سچائی کے ساتھ اللہ کے حضور اس بات کا اعتراف ہے کہ ہمارے نزدیک اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ ہماری چھوٹی سے چھوٹی کوئی ضرورت بھی اس کے سوا کوئی پوری کرنے والا نہیں۔"

"بس! اتنی ہی اہمیت ہے دعا کی......؟" عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"آپ بندگی کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ یہی تو اصل سبب ہے زندگی کا۔ اس پر تو جنت اور جہنم ہے۔ اگر دعا بندگی ہے تو بہت بڑی چیز ہوئی نا!"

"لیکن جنت اور دوزخ کا فیصلہ تو اعمال پر ہوگا۔"

"بے شک! دعا بندگی کا زبانی اور قلبی اظہار ہے۔ یعنی آپ نظریاتی طور پر اللہ کے بندے ہو گئے۔ سوچ کی، خیال کی بڑی اہمیت ہے۔ اعمال آدمی کے باطن کے مطابق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔"

"یہاں میں آپ سے اختلاف کروں گا۔" عبدالحق نے کہا۔

"ایمان سے محروم لوگ بھی اچھے اعمال کرتے ہیں۔"

"لیکن ایمان کے بغیر کچھ بھی نہیں۔ انہی کے لئے تو اللہ فرماتا ہے کہ ان

کے اعمال ضائع ہو گئے۔ یعنی دنیا میں ان کا پورا اجر ملے گا۔ لیکن آخرت میں وہ تول پر پورے نہیں اتریں گے۔ شمار ہی نہیں ہوں گے۔ تو پہلی شرط تو ایمان ہی ہے۔"

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے شفیق صاحب پر رشک آ رہا تھا۔ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ قرآن پڑھتے اور اس پر غور کرتے ہیں۔

"اور آپ نے اعمال کی بات کی ......" شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"تو عام انسانوں میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب عمل کی میزان پر پورا اترے۔ جہنم سے تو بس اللہ کی رحمت اور فضل ہی بچائے گا ہمیں، انشاء اللہ! عملی بندگی آسان نہیں۔ یہ دنیا جگہ ہی ایسی ہے۔ پھر ہمارے ساتھ نفس لگا ہوا ہے۔ میں سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! کہ زندگی ایک امتحانی پرچا ہے سو نمبر کا۔ اللہ کی رحمت کہ اس نے مشکل پرچے کو اپنے بندوں کے لئے آسان کر دیا۔ تو شاید یوں ہے کہ پہلا سوال لازمی ہے تیس نمبر کا۔ جس نے یہ سوال چھوڑ دیا، اس کا باقی پرچا کینسل ہو جائے گا۔ یعنی ستر فیصد لانے پر بھی صفر......"

عبدالحق اس مثال پر پھڑک گیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔

"اور تیس نمبر کا وہ سوال ہے ایمان۔"

"جی ہاں! اور جس نے اللہ کی رحمت سے پہلے سوال کے تیس فیصد نمبر لے لئے، اسے پاس ہونے کے لئے صرف تین نمبر ہی تو درکار ہیں۔ وہ اللہ اپنی رحمت سے ایمان کے صلے میں بھی دے دے گا۔"

"لیکن تھرڈ ڈویژن آئے گی۔" عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تو دنیا میں بھی ہوتا ہے۔ سب سے بڑی تعداد تھرڈ ڈویژن والوں ہی کی ہوتی ہے۔" شفیق صاحب اب بھی سنجیدہ تھے۔

"فرسٹ ڈویژن تو بہت کم طلبا کی آتی ہے۔ اللہ کے ہاں وہ ہیں سبقت لے جانے والے۔" وہ کہتے کہتے رکے، اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولے۔

"خیر......! بات تو کچھ اور ہو رہی تھی۔ دعا کی بات کر رہے تھے آپ۔ ذرا دیر کو فرض کریں کہ زمین پر زندگی جاری و ساری کرنے کے بعد اللہ اعلان فرماتا کہ

وہ ہر دعا قبول فرمائے گا، لیکن بغیر دعا کے کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔ اس صورت میں آپ کے خیال میں دنیا کا کیا نقشہ بنتا؟''

''میں اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔'' عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''میں نے ایک بار یہ تصور کیا، اور میری سمجھ میں آ گیا کہ اس صورت میں زندگی ایک گھنٹہ بھی جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ ذرا سوچیں، اللہ سمیع و بصیر ہے، علیم و خبیر ہے، عالم الغیب ہے۔ اس سے کچھ چھپا نہیں...... نہ ساتوں آسمانوں میں، نہ ساتوں زمینوں میں اور نہ ان کے درمیان، اور نہ سینوں میں۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اپنی تمام مخلوقات کی ہر ضرورت کا علم ہے اسے، اور وہ بغیر مانگے ان کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ زندگی کے تمام لوازمات انہیں عطا کرتا ہے۔ وہی تو پروردگارِ عالم ہے۔ اور باقی مخلوقات کو تو چھوڑیئے، اشرف المخلوقات کو دیکھئے، ہم وہ ہیں جنہیں اپنے اگلے پل کے بارے میں یہ خبر تک نہیں کہ اس میں ہمارے لئے زندگی بھی ہے یا نہیں، جبکہ دنیا کی ضرورتیں تو زندگی کے دم سے ہیں۔ زندگی نہیں تو سب کچھ ختم۔ ایسے لوگ اپنی ضرورتوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ ہم کیا مانگیں گے اللہ سے۔ وہ بغیر مانگے ہیں ہمیں سامانِ زیست عطا فرماتا ہے۔ بس اپنی ایک ضرورت کا ہمیں پوری طرح علم ہے۔ یہ کہ قیامت کے دن ہم اپنے اپنے نامہ اعمال کے اسیر، جہنم کے حقدار، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت اور اللہ کی مغفرت اور بخشش اور حسابِ یسیر کے محتاج ہوں گے۔ تو دعا بندگی ہی ہوئی نا...... !''

''جی......! میں سمجھ گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مگر حیلے کی اور وضاحت کر دیں۔''

''میں نے مثال دی تھی نا......! کسان اور فقیر کی۔''

''لیکن حیلے کے باوجود کچھ نہیں ہوتا تو...... فصل تباہ ہو جاتی ہے یا بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بھیک بالکل نہیں ملتی یا ضرورت بھر نہیں ملتی۔''

''تو یہ تو مشیت ہے۔ آپ اسے تقدیر کہہ لیجئے۔ بندے کا کام دعا کرنا اور حیلہ کرنا ہے، آگے اللہ کی مرضی۔ اب دیکھے نا، یہ مثالیں تو عام ہیں۔ ایک شخص صبح سے شام تک سخت محنت کرتا ہے۔ اور اسے بمشکل دو وقت کی روٹی ملتی ہے۔ اور کوئی

شخص ایک گھنٹے میں کوئی خاص مشقت کئے بغیر ہزاروں کما لیتا ہے۔ یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔ قرآن میں کئی جگہ اللہ نے فرمایا کہ وہ جسے چاہے فراخی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے، تنگ دست کر دیتا ہے۔ یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے لئے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ جو کچھ انہیں حاصل ہوا، وہ ان کی محنت، ان کے ہنر یا ان کے علم کی وجہ سے ہے۔ سعی اور عمل تو بس آخرت کے لئے ہے۔ تو دنیا میں حیلہ ضروری ہے۔ لیکن آخرت کے لئے خالص عمل۔ اب جیسے کی یہ بات دیکھئے کہ میرے پاس اللہ کا عطا کیا ہوا علم کا ایک بہت چھوٹا ذرہ ہے، جو میری اوقات سے بہت زیادہ ہے۔ میں اللہ کا نام لے کر، اس کے دیئے ہوئے علم سے استفادہ کرتے ہوئے، زائچہ بناتا ہوں۔ پھر اس پر غور کرتا ہوں اور بتاتا ہوں۔ اب وہ کتنا مجھ پر روشن ہوتا ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ میں جو بتاتا ہوں، اس کا صحیح اور غلط ہونا بھی اللہ کی طرف سے ہے۔''

''تو حیلہ بہت ضروری ہے ؟'' عبدالحق کے لہجے میں اب بھی بے یقینی تھی۔

''جی ہاں! اب آپ سوچئے تو، کسی کو اولاد کی آرزو ہو اور وہ اللہ سے اس کی دعا کرتا ہے۔ لیکن شادی کئے بغیر، تو اولاد اسے کہاں سے ملے گی؟ تو اولاد کے لئے شادی کا حیلہ ضروری ہے۔''

''لیکن میں تو شادی کر چکا ہوں۔'' عبدالحق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شفیق صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''میں نے تو بے خیالی میں ایک مثال دی تھی۔ میرا اشارہ آپ کی طرف نہیں تھا۔''

''مگر حیلہ تو میں کر چکا ہوں نا!''

''گستاخی معاف، آپ کو سوچنا چاہئے کہ شاید اللہ کی مرضی اس بیوی سے اولاد عطا کرنے کی نہیں، تو آپ کو دوسری شادی کرنی چاہئے۔''

''لیکن حضرت......! اللہ کی قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں۔ اس کی مثالیں موجود ہیں۔''

''دیکھئے عبدالحق صاحب! ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ایک بات واضح ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا ایک مربوط نظام، ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ اللہ کا قائم کیا ہوا نظام ہے۔ دن اور رات کی تقسیم، سورج ہر روز اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ دن روشن ہے، اس لئے دنیا کے کام اس میں آسانی سے ہوتے ہیں۔ اور رات اندھیری ہے، اس لئے آرام کے لئے ہے۔ موسم بھی مقررہ وقت پر آتے ہیں۔ اسی حساب سے فصلوں کے لئے وقت بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ کبھی آسمان پر گھٹا ہوتی ہے، اور دھوپ نہیں نکلتی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ سورج نہیں نکلا۔ سورج تو اپنے وقت پر ہی نکلا، لیکن گھٹا کی وجہ سے ہمیں نظر نہیں آیا۔ دن مقررہ وقت پر شروع ہو گیا اور مقررہ وقت پر ہی رات بھی آئے گی۔ سورج اور چاند گرہن کا حساب 2000ء تک کا تو یونانیوں نے لگایا ہوا ہے کہ اس دوران کب، کتنے بج کر کتنے منٹ پر سورج یا چاند گرہن ہوگا۔ اور وہ اب تک سیکنڈز کی حد تک درست ثابت ہوتا آیا ہے۔ صرف اس لئے کہ اللہ کا قائم کیا ہوا نظام مکمل ہے۔ اللہ نے راہنمائی فرمائی، انسان کو اس کا ادراک عطا فرمایا اور اسے آسانی کے ساتھ اس کا پابند کر دیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ فصل ربیع کا وقت کون سا ہے اور خریف کا کون سا ہے۔ سب مقررہ وقت پر ہل چلاتے اور بوائی کرتے ہیں، اور فصل بھی مقررہ وقت پر ہی اترتی ہے۔ اللہ اپنے نظام میں خلل نہیں پڑنے دیتا۔ اب اس مربوط نظام کی بنیاد پر دہریے کہتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں، ایک خلائی تصادم کے نتیجے میں زمین وجود میں آئی، اور کیمیاوی عمل اور ردعمل کے نتیجے میں اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ یہ خودکار نظام ہے اور خود بخود چل رہا ہے۔''

عبدالحق اس وقت سراپا سماعت تھا۔ وہ سحر زدہ سا شفیق صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اپنے لڑکپن میں پہنچ گیا تھا، جب وہ گرد و پیش پر غور کرتا اور اسی طرح کی باتیں سوچتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کب اور کیسے، وہ پیچھے چلا گیا۔ یہ سب تو اسے خود ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔

''لوگ اس طرح گمراہی میں پڑتے ہیں۔'' شفیق صاحب کہہ رہے تھے۔ ''اللہ کی رحمت بے پایاں ہے۔ اسے اپنے بندوں کی گمراہی گوارہ نہیں۔

ان کی ہدایت کے لئے اس نے معجزے بھی دکھائے۔ اللہ نے اپنے بندوں پر حجت تمام کر دی۔ ان کے لئے گمراہی کا کوئی معقول جواز نہیں رہنے دیا۔ پیغمبر بھیجے، انہیں معجزے عطا فرمائے، صحیفے اتارے، اپنی کھلی نشانیاں دکھائیں۔ قیامت کے دن کوئی اپنے کفر، اپنی گمراہی کا عذر نہیں پیش کر سکے گا۔''

''بے شک.....!'' عبدالحق نے کہا۔

''آپ نے جس طرف اشارہ کیا عبدالحق صاحب! وہ تین واقعات ہیں، جن کا اللہ نے قرآن میں ذکر فرمایا ہے۔ ان میں دو پیغمبر تھے اور ایک، ایک جلیل القدر پیغمبر کی ماں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی زوجہ کی موجودگی میں فرشتوں نے بیٹے کی بشارت دی تو ان کی زوجہ نے کہا کہ وہ بوڑھی اور بانجھ، اور ان کے شوہر ضعیف، اولاد کا کیا سوال؟ یعنی انہوں نے دنیاوی سسٹم کا حوالہ دیا۔ اور فرشتوں نے کہا، ایسا ہی ہوگا، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ اللہ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ پھر حضرت ذکریا علیہ السلام نے اولاد کے لئے اللہ سے دعا کی... ایسے عالم میں کہ ضعیف تھے اور ان کی زوجہ بھی بوڑھی اور بانجھ تھیں۔ اللہ نے دعا قبول فرمائی اور انہیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی۔ تب انہیں خیال آیا کہ اولاد کی اہلیت نہ تو وہ خود رکھتے ہیں اور نہ ان کی اہلیہ۔ لیکن اللہ نے فرمایا کہ یہ ہو کر رہے گا۔ پھر حضرت بی بی مریم کنواری تھیں۔ لیکن اللہ کے حکم سے حاملہ ہوئیں۔ انہیں بھی اس کی اطلاع دی گئی تو انہوں نے بھی حیرت سے فرمایا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ مجھے تو کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ اور اللہ نے فرمایا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اور ایسا ہی ہوا۔''

''میں اس پر سوچتا ہوں عبدالحق صاحب! تو میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ معجزے درحقیقت اس وقت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر پیدا ہونے اور زندگی گزارنے والے انسانوں کے لئے عظیم ترین رحمت تھے۔ میں غور کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ کلمہ شہادت کی شہادت دیتے ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ یعنی اس کی قدرت سے کچھ باہر نہیں۔ اس نے ایک مکمل نظام قائم اور جاری فرمایا۔ اس

نظام کو اصولوں اور ضابطوں کا پابند فرمایا۔ قوانین بنائے اور ان کا اطلاق فرمایا۔ سب اس کے پابند ہیں، سوائے اس کے۔ وہ اپنے بنائے ہوئے نظام سے باہر جب، جو چاہے کر سکتا ہے۔ اصول، ضابطے اور قوانین اس کے لئے نہیں۔ تو یہ گواہی ہے نا اس گواہی کی کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ واحد، احد اور یکتا ہے۔ کیونکہ اس کے سوا باقی سب اس نظام کے اصولوں، ضابطوں اور قوانین کے پابند ہیں۔''

''اب یہاں انسان کی بدبختی دیکھیں کہ وہ اللہ کی عظیم رحمت کو ہدایت کے بجائے گمراہی کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔ سو بدبختوں نے پیغمبر کو اللہ کا بیٹا مان لیا۔ جبکہ اللہ نے کتاب میں واضح کر دیا کہ وہ انسانوں میں انہی جیسے کسی انسان کو پیغمبر بنا کر بھیجتا ہے۔ اور وہ بدبخت اللہ کو ماننے والے ہیں، لیکن پورے کلمہ شہادت کی نفی کرتے ہیں۔ بیٹا تو باپ کا وارث ہوتا ہے۔ نسل آگے بڑھاتا ہے۔ بیٹا تو ہر چیز میں باپ کا شریک ہوتا ہے۔ معبود کا بیٹا ہو تو معبود واحد اور احد کیسے ہو سکتا ہے۔ باپ کی عبادت ہوگی تو بیٹے کی بھی ہوگی۔ تو ظالموں نے اللہ کو ماننے کے باوجود سب کچھ گنوا دیا۔ بلکہ اللہ کے شدید غیض و غضب کے حق دار ہو گئے۔ کیونکہ اللہ کو سب سے زیادہ غضب اس بات پر آتا ہے کہ اس پر رشتوں کی تہمت لگائی جائے۔ یہ بدترین شرک ہے۔'' شفیق صاحب کہتے کہتے رکے، پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ہم تو حیلے کے بارے میں بات کر رہے تھے، تو بات یہ ہے کہ اللہ کی قدرت کا یہ عالم ہے کہ کن فرما دیں تو زمین آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آ جائیں، اور جس امر کا وہ محض ارادہ کر لیں، وہ رونما ہو جائے۔ لیکن اللہ نے یہ نظام قائم فرمایا۔ اس کے لئے اصول، ضابطے اور قوانین بنائے۔ اسباب کا سلسلہ قائم فرمایا۔ اسی لئے تو کائنات کا نظام بغیر کسی خلل کے چل رہا ہے۔ اللہ کی مرضی ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن یہ نظام اس نے میزان کے ساتھ، عدل کے ساتھ قائم فرمایا ہے۔ تو دیکھ لیں کہ سورج ہر روز مقررہ وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ لیکن قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ ایک دن سورج الٹا چلے گا اور مشرق میں غروب ہوگا۔ یعنی نظام میں انتشار شروع ہوگا، جو قیامت پر ختم

ہوگا۔ قیامت تو سب کچھ تہس نہس ہو جانے کا نام ہے نا! اب آپ کو ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے اور آپ اللہ سے اس کے لئے دعا کرتے ہیں تو اس کے بعد آپ کو حیلہ کرنا ہوگا۔ یعنی اللہ کے بندوں میں سے کسی سے سوال کرنا ہوگا۔ اب دعا کی اور پہلے اللہ سے سوال کیا، تو اللہ خوش ہو کر آپ کو اس بندے کی طرف بھیجے گا، جو اس کے حکم سے آپ کی ضرورت پوری کرنے والا ہوگا۔ اور اس کی مرضی ہوئی، کرم زیادہ ہوا تو یہ ہوگا کہ بغیر مانگے کوئی آپ کو یہ رقم دے جائے گا۔ لیکن آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ آپ کے گھر کی چھت سے یہ رقم آپ پر ٹپک جائے گی۔ اگرچہ یہ بھی اللہ کی قدرت سے باہر نہیں۔ لیکن آپ کو بہرحال سسٹم میں رہ کر امید رکھنی ہے۔ اللہ سے معجزے کا تقاضا کرنا گستاخی ہے۔ جن لوگوں نے بھی یہ شرط لگائی، وہ ایمان سے ہمیشہ کے لئے دور ہوئے، اور کفر میں جا پڑے۔ لیکن دعا بندگی ہے اور بندگی میں بڑی طاقت ہے۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جنہیں ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ ان کے ہاں کبھی اولاد نہیں ہو سکتی۔ لیکن اللہ نے ان کی دعا سنی اور اولاد عطا فرما دی۔ میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں، جنہیں بیماری میں ڈاکٹروں نے جواب دے دیا کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ لیکن وہ شفایاب ہو گئے، اور ڈاکٹروں کے دیئے گئے وقت کے برسوں بعد، آج بھی زندہ ہیں۔ اللہ کی قدرت، رحمت، عطا اور فضل برحق ہے عبدالحق صاحب! لیکن میرے خیال میں حیلہ ایمان کے استحکام کے لئے ضروری ہے۔''

''جزاک اللہ! حضرت! آپ نے مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دیا۔'' عبدالحق نے پرخلوص لہجے میں کہا۔

''اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں آپ......؟''

عبدالحق ہچکچا رہا تھا۔ لیکن بالآخر اس نے کہہ ہی دیا۔

''مجھے حج کی بڑی آرزو ہے حضرت...!''

''تو یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ وہاں اللہ کے بلاوے کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔''

''جی...! بے شک.....! لیکن آپ کی ایک بات نے مجھے فکرمند کر دیا

ہے۔"

"آپ کھل کر کہیں نا.....!"

"آپ کے گرو جی نے میرے زائچے کے بارے میں کہا کہ میرے نصیب میں غیر ملکی سفر نہیں ہے.....؟"

"جی ہاں.....! زائچہ تو یہی بتاتا ہے۔"

"اور یہ بھی بتایا کہ میری موت ملک سے باہر ہوگی.....؟"

"جی ہاں.....! آپ کے زائچے میں یہ دونوں متضاد باتیں موجود ہیں۔"

"اگر میری قسمت میں غیر ملکی سفر نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ میں حج نہیں کر سکوں گا۔"

شفیق صاحب چند لمحے سوچتے رہے، پھر بولے۔

"دیکھئے..... میں حج کو اس معاملے سے الگ سمجھتا ہوں۔"

"لیکن علم تو آپ کو یہی بتاتا ہے نا.....؟"

شفیق صاحب ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب یہ بتائیں کہ اس تضاد کے بارے میں آپ کا علم کیا کہتا ہے کہ غیر ملکی سفر میں کروں گا نہیں اور موت میری بیرون ملک ہوگی۔"

شفیق صاحب پھر سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر وہ زائچے کا جائزہ لیتے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔

"اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے زائچے میں موجود ایک اور تضاد پر بات کر لیں۔ زائچے کی رو سے آپ بادشاہ بھی ہیں، فقیر بھی اور غلام بھی۔ اب میں تو آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ ہاں عبداللہ صاحب کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ بادشاہ تھے۔ لیکن لال آندھی میں تو سب کچھ ختم ہو گیا ہوگا۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں، عارف صاحب نے جو آپ کا تعارف کرایا تو اس سے تو یہ لگتا ہے کہ آپ نوکری کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں! یہ درست ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن کسی مجبوری اور ضرورت کے تحت نہیں۔ میرے ایک شفیق بزرگ

ہیں۔ یہ ان کے حکم کی تعمیل ہے۔ ان کے نزدیک یہ قومی خدمت ہے۔"

"تو آپ ضرورت مند نہیں۔ حالانکہ لال آندھی کے بعد"

"اللہ کا فضل ہے، اماں، جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا، انہوں نے لال آندھی سے پہلے بہت کچھ مجھے دے دیا تھا۔ وہی میرے لئے بہت کافی تھا۔"

عبدالحق نے انہیں قیام پاکستان کے بعد کی تفصیل بتائی۔

"افسروں نے ادھر ادھر کے گاؤں کی زمین بھی میرے نام کرا دی۔ اور کھدائی کے بعد حویلی کے تہ خانے سے بھی بہت کچھ نکلا۔ لیکن میں نے سب کچھ زبیر بھائی کو سونپ دیا ہے۔ میرے پاس تو اتنی فرصت ہی نہیں۔"

"یہ زبیر صاحب کون ہیں؟"

"حویلی کے ملازم تھے، بابا جی نے انہیں اور ان کی بیوی کو میرے ساتھ دہلی بھیجا تھا۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی مسلمان ہوئے تھے۔"

"ماشاء اللہ! ہدایت کا سلسلہ کتنی دور تک جاتا ہے۔" شفیق صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بولے۔

"تو بات تو سچ ہے۔ آپ بادشاہ ہیں۔ لیکن مزاج میں فقیری ہے۔"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

"جی نہیں! پیسہ میں دل کھول کر خرچ کرتا ہوں۔ کئی جگہوں پر زمینیں خریدی ہیں میں نے۔ گاڑیاں کئی ہیں میرے پاس۔ ابھی حال ہی میں ایبٹ آباد میں زمین خریدی ہے۔"

"بہرحال میری سمجھ میں بات آگئی۔" شفیق صاحب نے کہا۔

"زائچے کے جس تضاد کی آپ نے بات کی، میں اس کے بارے میں بتاتا ہوں کہ میں اسے کیسے دیکھتا ہوں۔ ایک پہلی بات تو یہ ہے کہ عین ممکن ہے، مجھ سے تشریح میں کوئی غلطی ہوئی ہو، اور ان میں سے ایک بات غلط ہو، یعنی بیرون ملک وفات اور غیر ملکی سفر میں سے کوئی ایک۔ دوسری بات، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ حج کا معاملہ میں سب سے الگ سمجھتا ہوں۔ بادشاہوں کا بادشاہ، جسے جب چاہے، اپنے ہاں مہمان بلا لے۔ اور اس کا بلاوا نہ ہو تو زائچے میں موجود

غیر ملکی سفر بھی بے کار ہے۔ ابھی ہم اس پر بات کر چکے ہیں کہ اللہ جب چاہے، اپنے لکھے ہوئے مقدر میں، اپنے بنائے ہوئے اٹل قوانین میں بھی وقتی ترمیم کر لیتا ہے۔ قادرِ مطلق جو ہوا۔ تو اس صورت میں زائچے کی کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اور عبدالحق صاحب، یہ بھی ممکن ہے کہ زائچہ بھی درست ہو اور میری تشریح بھی درست ہو۔ اور دونوں متضاد باتیں درحقیقت واقع ہو کر رہیں۔''

''یعنی میں غیر ملکی سفر بھی نہ کر سکوں اور میری موت بیرون ملک ہو۔'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے.....؟''

''جب اللہ کی بات ہو رہی ہو تو ایسا جملہ کبھی منہ سے نہ نکالیں عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب کے لہجے میں ہلکی سی تنبیہ تھی۔ ''یہ ممکن اور ناممکن تو ہم بے بس اور فانی انسانوں کے لئے ہے۔''

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کر رہا تھا۔ اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ زائچے کو شرک سمجھنے والا وہ تو ایسی بات کر رہا تھا، اور زائچہ بنانے والا اسے ٹوک رہا تھا۔ تو وہ زائچہ بنانے والا اللہ سے کتنا ڈرتا ہے، اور وہ خود.....!

''اللہ کے لئے کچھ ناممکن نہیں، معجزہ کیا ہوتا ہے۔ خلافِ معمول، خلافِ عقل اور خلافِ علم ہونے والا کوئی ایسا کام، جس کی توجیہہ سے انسان عاجز ہو، اور معجزہ صرف اللہ کے لئے ہے، صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس کی رحمت اور حکم سے کسی بندے سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جائے تو اسے کرامت کہتے ہیں، معجزہ نہیں، اور ہوتی وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے، اور اس کے حکم سے ہوتی ہے۔''

''جی.....! میں سمجھ گیا۔'' اس بار عبدالحق کے لہجے میں بلا کا عجز تھا۔

''یہ کائنات اسرار سے پٹی پڑی ہے عبدالحق صاحب!'' شفیق صاحب نے کہا۔

''ہر ہونی میں کتنے ہی رموز ہیں۔ اللہ نے انسان کو پیدا فرمایا تو اس پر بڑے کرم فرمائے۔ اسے تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی۔ زمین پر اسے اپنی

نیابت عطا فرمائی۔ اپنا خلیفہ بنایا اور سب کچھ اس کے لئے تسخیر کر دیا۔ لیکن دیکھیں تو انسان ابھی اپنے نظامِ شمسی کو بھی نہیں سمجھ پایا۔''

''اللہ نے سب کچھ تسخیر کر دیا تو انسان بے خبر کیوں ہے.....؟''

''میں بھی اس پر سوچتا ہوں۔ اللہ کا نائب ہونا کوئی مذاق نہیں۔ اللہ نے کتنی صلاحیتیں، کتنی طاقتیں انسان کو عطا کی ہوں گی، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اچھے بادشاہ اپنے ولی عہد کو ہر طرح کی تربیت دلاتے تھے، تمام علوم و فنون میں انہیں طاق کیا جاتا تھا، جنگی صلاحیتیں ابھاری جاتی تھیں۔ اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ جبکہ یہ تو اللہ کی نیابت کا معاملہ ہے۔ اور یہ نیابت کسی ایک انسان کے لئے نہیں، تمام انسانوں کے لئے ہے۔ جو چاہے، خود کو اہل ثابت کر دے، منصب اسی کا ہے۔ تو وہ بے پناہ صلاحیتیں اور طاقتیں ہر انسان میں موجود ہیں۔ لیکن وہ ان سے بے خبر ہے، ان کے ادراک سے محروم ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ ہر آدمی کے اندر ایک غار ہے، جس میں یہ خزانے موجود ہیں۔ چالیس چوروں کے غار کا تصور کیجئے۔ اس کا دروازہ..... کھل جا سم سم کہنے پر کھلتا تھا۔ تو یہ ہماری صلاحیتوں اور طاقتوں کے خزانے کا دروازہ کیسے کھلے گا؟ میرا خیال ہے، کلمہ شہادت کے ذریعے، یہ گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے آخری پیغمبر ہیں۔ لیکن یہ کوئی چوروں کا خزانہ نہیں کہ بس لفظ ادا کئے اور دروازہ کھل گیا۔ دنیا دارالعمل ہے۔ کبھی میں غور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ سورۂ اخلاص کلمہ شہادت کی تصریح ہے۔ کلمہ شہادت میں تو صرف اللہ کا معبود ہونا ہے۔ سورۂ اخلاص وضاحت کرتی ہے وحدانیت کی۔ یہاں وہ واحد ہی نہیں، احد بھی ہے۔ اور پھر اللہ کی ایک بڑی صفت، وہ صمد بھی ہے۔ بے نیاز، اسے کسی کی ضرورت نہیں، اسے کچھ چاہئے بھی نہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہے، سب اسی کا ہے۔ اسے تو ہماری بندگی کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ تو اس بندگی کے لئے بڑے بڑے انعامات لئے بیٹھا ہے۔ وہ تو دینے والا ہے۔ اور آگے فرماتا ہے، نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔ تو وراثت کا سلسلہ ختم۔ یہ جو ہمارے دنیاوی رشتے ہیں، ماں، باپ، بیوی، اولاد..... یہ وہ بنیادی رشتے ہیں، جس سے رشتہ داریاں

آگے بڑھتی ہیں، اللہ ان سب سے پاک ہے۔ یہاں اس کی صفت پر آخری مہر لگ گئی کہ وہ صمد ہے، ہر احتیاج سے پاک، ہر ضرورت سے بے نیاز۔ تو ثابت ہوگیا کہ وہ یکتا ہے، اس جیسا کوئی نہیں۔ کوئی اس کا ہم پلّہ، کوئی اس کا ہم سر نہیں۔ وہ سب سے بلند ہے اور ہر کمزوری سے پاک کہ ضرورت ہی تو کمزور بنانے والی چیز ہے۔ جبکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ دنیا میں یہ واضح ہے کہ بیٹا باپ جیسا ہوتا ہے، کبھی وہ باپ سے آگے بھی نکل جاتا ہے۔ اللہ نیواضح کر دیا کہ نہ اس کے ماں باپ ہیں، نہ بیوی اور نہ اولاد۔ تو اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ کلمہ شہادت کا ''لاشریک لہٗ'' ہوگیا۔ اور آخری آیت میں اس نے اعلان فرما دیا کہ کوئی اس کا ہم سر نہیں، کسی اعتبار سے اس جیسا نہیں، جو کہ پچھلی آیات سے اخذ ہونے والا منطقی نتیجہ ہے۔ یہ ہے سورۂ اخلاص، بندے خالص شرک سے پاک کر دینے والی، بندے کو اللہ کا بندہ بنا دینے والی سورۂ مبارکہ ...کلمہ شہادت کی بلیغ تشریح۔

''تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ چابی ہے، اللہ کی نیابت اور خلافت کی۔ اپنا اصل منصب حاصل کرنا ہے تو اس پر عمل کرو۔ یہ پہلی سیڑھی ہے اس مقام پر پہنچنے کی۔ اب اللہ کی نیابت کوئی ایسی چیز نہیں کہ ایک سیڑھی چڑھ کر حاصل کر لی جائے۔ لیکن اس سے آپ کے سامنے وہ پورا زینہ آجاتا ہے، جو آپ کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ اور زینہ ہے کتاب اللہ، جس میں یہ چھوٹی سی راہنما سورۂ مبارکہ ہے۔''

''تو اللہ نے یہ کائنات اور اس کی ہر چیز مسخر فرما دی۔ اپنے خلیفہ کے لئے، ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ باطنی طور پر صرف ان لوگوں کے لئے، جو اس کے بندے ہیں۔ اور ظاہری طور پر سب کے لئے، چاہے وہ اسے نہ مانتے ہوں۔ اب دیکھیں، چار اہم ترین عناصر ہیں، مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ مٹی یعنی زمین تو ہمیں عطا ہی مسخر کرکے فرمائی کہ وہ جائے قرار ہے۔ کشش کا اور میزان کا نظام قائم فرمایا اور زمین میں پہاڑوں کے لنگر گاڑے کہ وہ ہمیں ہمیں لے کر لڑھک نہ جائے۔ وزن کا نظام قائم فرمایا کہ بے وزنی کی کیفیت میں تو ہم اپنی مرضی سے چل بھی نہ پاتے۔ زمین کو تسخیر فرمایا کہ ہم اس پر مکان بناتے ہیں، کھیتی باڑی کرتے

ہیں، جنگلات اگاتے ہیں۔ یہ سب بغیر مانگے عطا فرمایا اور القا کے ذریعے راہنمائی فرمائی۔ پھر آگ پر قابو عطا فرمایا کہ تمام مخلوقات کے برعکس ہم کھانا پکا کر کھاتے ہیں۔ آگ پر باطنی طور پر مسخر کرنے کی نشانی آتش نمرود ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک رواں بھی نہیں جلا سکی۔ پھر پانی ہے، جس میں ہم تیرتے بھی ہیں، کشتیاں اور بڑے بڑے جہاز بناتے ہیں، جن پر اسباب تجارت لاد کر ہم سمندر کے سینے پر مہینوں کی مسافت طے کرتے ہیں، سمندر پر، جس کی گہرائی نامعلوم ہے۔ صرف اس لئے کہ اللہ نے اسے ہمارے لئے سفر کر دیا۔ اور ہوا کو لیجئے۔ پرندے اللہ کی نشانی ہیں کہ اس نے ہوا کو مسخر کر دیا ہے۔ انہیں اڑتے دیکھ کر ہی انسان کے دل میں اڑنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے اس پر سوچا، یوں جہاز بنائے گئے، جنہوں نے سفر کو آسان کر دیا۔ یہ سب ظاہری طور پر سامانِ زیست ہے۔ سب کے لئے ہے۔ لیکن اس میں حیلے کی ضرورت پڑی اور پھر اللہ نے راہنمائی فرما دی۔ غور وفکر اور تجسس بھی حیلہ ہے، اور اللہ نے قرآن میں اس کا حکم دیا ہے۔

''اب انسان کی فطرت اترا جانا ہے۔ غرور نہ کرنے لگے، یہ نہ سمجھنے لگے کہ وہی ہر چیز پر قادر ہے، اس کے لئے اللہ نے رحمت فرمائی۔ زمین مسخر کر دی۔ لیکن جب زلزلے کا حکم دیا تو نہ انسان کو اس کا پتا چلتا ہے اور نہ وہ اسے روک سکتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں بڑے بڑے سفر کرتی ہیں، لیکن آدمی اپنے بنائے ہوئے جن بڑے بڑے جہازوں کو ناقابل تسخیر سمجھتا ہے، وہ پہلے ہی سفر میں اپنی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی غرق ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے حکم سے سمندر چڑھ جائے تو بستیاں نیست و نابود ہو جاتی ہیں اور بے بس انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اللہ کے حکم سے ہوا غضب ناک ہو جائے تو آدمی کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ سب کچھ تہ و بالا ہو کر رہ جاتا ہے۔ جنگل میں آگ بھڑک اٹھے تو بجھائے نہیں بجھتی اور اتنی تیزی سے پھیلتی ہے کہ سنبھلنے کا موقع نہیں دیتی۔ یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں بندوں کے لئے اصل مالک وہ ہے۔ سب اس کی قدرت ہی ہے۔ اس کے نائب کے لئے اس کی اطاعت اور بندگی لازمی ہے۔'' شفیق صاحب کہتے کہتے رکے۔

''معاف کیجئے گا۔ میں بھی کہاں کا کہاں نکل گیا''

''آپ کہتے رہیے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''جب اللہ کے مظاہر پر بات ہو تو ارتکاز کہاں ممکن ہے۔ عقل تو کثرت سے حیران اور عاجز ہو جاتی ہے۔ آپ یقین فرمائیں، میں بڑی دلچسپی سے سن رہا ہوں۔ بلکہ اس دوران میری سمجھ میں عناصر کی باطنی تسخیر کی مثالیں بھی آئیں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کے لئے سمندر کو پھاڑ کر اسے پار کرنے کا راستہ بنا دیا۔ اور پھر اسی سمندر کو ملا کر فرعون کو اس کی فوج سمیت غرق کر دیا۔''

''جی ہاں ! یہ عناصر کی بات تو ضمنی طور پر نکل آئی۔ ویسے یہ بنیادی بات ہے۔'' شفیق صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

''دراصل میں ان دو اہم ترین جہتوں کی بات کر رہا تھا، جو اس نظام میں کارفرما ہیں، جن کے بارے میں انسان کم ہی غور کرتا ہے۔ وہ ہیں زمان و مکاں۔ یعنی وقت اور مقام، آپ وقت کہہ لیجئے یا زمانہ۔ اللہ نے آدم علیہ السلام اور بی بی حوا کو زمین پر بھیجا۔ یہ مقام ہے۔ پہلے ان کا مقام جنت تھا۔ اور وقت اس کائنات کی اہم ترین چیز، اللہ کی قدرت کا بہت بڑا مظہر اور بہت بڑا راز۔ وقت جو جاری و ساری ہے۔ کبھی رکتا نہیں۔ جس کی ابتداء ازل ہے اور انتہاء ابد، لیکن ازل اور ابد کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ وقت یہاں زندگی کا پیمانہ ہے۔ یہ میعاد کا، مہلت کا تعین کرتا ہے۔ اس کی اہمیت تو دیکھیں کہ اللہ نے اس کی قسم کھائی، تو ہم زمان و مکاں کے پابند ہیں۔ اگر ہمیں یہاں سے ایک میل دور جانا ہے بغیر سواری کے تو مجھے وہاں پہنچنے میں پندرہ منٹ لگیں گے اور آپ کو شاید دس منٹ لگیں لیکن یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک سیکنڈ میں وہاں پہنچ جائیں۔ یہ وہ قانون ہے، جس کے تحت زندگی کا نظام چل رہا ہے۔ ہم سب وقت کے تابع ہیں۔ وقت ہمیں آگے بڑھاتا اور اس منزل تک پہنچاتا ہے، جو اللہ نے ہمارے لئے متعین کی ہے۔ ہم وقت میں سفر کرتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہی وقت سے ہمارا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اس میں سفر کرتے ہوئے ہم بچپن، لڑکپن، جوانی اور ادھیڑ عمری سے گزر کر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں، اور اللہ نے ہمارے لئے جو میعاد مقرر کی ہے، اس تک پہنچ کر قوت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ ہم زمان و مکاں کی قید میں ہیں۔

لیکن اللہ نے اپنے بندوں، اپنے غلاموں کے لئے سب کچھ تسخیر کر رکھا ہے، اور اس میں زمان و مکاں بھی شامل ہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں.....؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''میری کیا مجال کہ کچھ کہہ سکوں۔'' شفیق صاحب عاجزی سے بولے۔

''یہ تو قرآن کہتا ہے۔ میں معراج شریف کا حوالہ نہیں دوں گا کہ وہ اللہ اور اس کے سب سے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ ہے، اور ایسا معاملہ کسی انسان کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن سورۂ کہف میں اصحاب کہف کا معاملہ دیکھ لیجئے کہ وہ ایمان سے جبراً محروم کئے جانے کے خوف سے پناہ لینے کے لئے ایک غار میں پہنچے، اور وہاں سو گئے۔ اٹھے تو ان کا گمان یہی تھا کہ وہ چند گھنٹے سوئے ہوں گے باہر نکلنے پر انہیں پتا چلا کہ زمانے گزر گئے۔ قرآن میں ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ لوگ تین سو سال اس غار میں رہے اور کچھ اس میں نو سال کا اضافہ کرتے ہیں، جبکہ حقیقت اللہ ہی جانتا ہے۔ اور وہ سو کر اٹھے تو ویسے ہی جوان تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس غار میں وقت کی گردش اللہ کے حکم سے ٹھہر گئی تھی۔ وہ اللہ کا راز ہے۔ وہ ایک نشانی تھی کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔

''مگر اب میں سورۂ نمل کا حوالہ دیتا ہوں۔ ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس خبر لایا سبا کے بارے میں اور انہیں ملکہ سبا کے بہت بڑے تخت کے بارے میں بتایا۔ آیت نمبر ۳۸ اور ۴۰ کے درمیان کچھ یوں ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے کہا، اے اہل دربار! کون تم میں سے لا سکتا ہے میرے پاس اس کا تخت اس سے پہلے کہ وہ حاضر ہوں میرے حضور مطیع فرمان ہو کر۔ عرض کیا ایک قوی ہیکل جن نے، میں حاضر کر دوں گا آپ کے پاس وہ تخت، اس سے پہلے کہ آپ اٹھیں اپنی جگہ سے۔ اور یقیناً میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار بھی ہوں۔ کہا اس شخص نے جس کے پاس تھا کتاب کا علم کہ میں لے آتا ہوں وہ تخت آپ کے پاس اس سے پہلے کہ جھپکے آپ کی پلک۔ چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔''

''میں نے ان آیات کو پڑھا عبدالحق صاحب! تو مجھے لگا کہ یہ ایک بہت

بڑی حقیقت کی اطلاع دے رہی ہیں۔ قوی ہیکل جن طاقت ور تھا اس نے دربار برخواست ہونے سے پہلے تخت لانے کی پیش کی کی۔ جو دنیاوی نظام کے مطابق تھی۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ جبکہ کتاب کا علم رکھنے والے نے وہ بھاری تخت پلک جھپکنے سے پہلے سلیمان علیہ السلام کے سامنے پیش کر دیا۔ جبکہ وہاں زمان و مکاں کا بڑا فاصلہ حائل تھا۔ یہ قوی ہیکل جن کی بات سے ثابت ہے۔ تو میرے خیال میں یہ آیت مبارکہ راہنمائی فرماتی ہے کہ ایمان اور اللہ کی مکمل تابع داری کے بعد تیسری سیڑھی کتاب ہے۔ اور جسے اللہ کے فضل سے، کہ اس کے فضل کے بغیر تو کچھ بھی ممکن نہیں، کتاب کا علم حاصل ہو جائے تو وہ ان بندوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کے لئے اللہ پاک نے کائنات کو تسخیر کر دیا۔ زمان و مکاں کے فاصلے اس کے لئے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ وہ ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، ان آیات میں جس صاحب علم کا ذکر ہے، ان کے پاس پچھلی ہی کسی کتاب کا علم ہوگا۔ جبکہ قرآن اللہ کی آخری اور مکمل کتاب ہے اور یقیناً ہر پچھلی کتاب سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس میں اللہ نے دین کو مکمل کر دیا تو جسے اس کتاب کا علم حاصل ہو جائے اس کا کیا مقام ہوگا۔"

"کتاب کا علم حاصل کیسے ہوگا؟" عبدالحق نے کہا۔

"یہ تو اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا فرمادے۔ نبوت کی طرح۔ بنی اسرائیل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ انہی کا حق ہے۔ اور اللہ نے فرمایا کہ یہ اس کا فضل ہے، وہ جسے چاہے، نواز دے۔ یہ تو اللہ کے منتخب بندے ہوتے ہیں، اور اس انتخاب کی وجہ منتخب کرنے والا ہی جانتا ہے۔ بندوں کا نہ اس میں کوئی ہیچ ہے اور نہ ہی ان کے سوچنے کی بات ہے۔" شفیق صاحب کہتے کہتے رکے اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر بولے۔

"بہرحال مجھے لگتا ہے کہ اللہ کو کسی بندے کی اطاعت اور بندگی پسند آجائے تو وہ اسے اپنی عطا کی ہوئی طاقتوں اور صلاحیتوں کا ادراک عطا فرماتا ہے اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی سکھا دیتا ہے، تاکہ وہ ان سے استفادہ کر سکیں۔"

"اور کتاب کا علم حاصل کیسے ہوتا ہے.....؟" عبدالحق نے سوال اٹھایا۔

"بنیادی بات تو وہی ہے، اللہ کا فضل۔ اور حیلہ ہے، کتاب کا مطالعہ کرنا۔ تو پہلا پہلو تو اکتسابی ہوا۔ وہ بہت محدود ہے، یعنی الفاظ کے ظاہری معانی سمجھنا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ میں، اور بین السطور میں بے شمار حکمتیں ہیں، جنہیں سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اسی لئے تو اللہ نے فرمایا کہ اس سے بہت لوگوں کو ہدایت ملتی ہے، اور بہت لوگ گمراہ بھی ہوتے ہیں۔ اب یہ بڑی ڈراؤنی بات ہے کہ قرآن پڑھ کر بندہ گمراہ ہو جائے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ ہدایت انہیں ملتی ہے، جو رجوع کرنے والے ہوں۔ تو واضح طور پر راہنمائی فرما دی کہ قرآن پڑھنے سے پہلے آدمی اللہ سے رجوع کرے اور راہنمائی اور ہدایت کی دعا کرے اور گمراہی سے پناہ مانگے۔ اللہ کی رحمت ہوتی ہے تو معانی اور اسرار کھلنے لگتے ہیں۔ اللہ دلوں پر مفاہیم القا فرماتے ہیں، اور یہ علم اکتسابی نہیں ہوتا۔"

عبدالحق اس بات کو سمجھتا تھا۔ اسے اس کا تجربہ بھی تھا۔ جن آیات کا شفیق صاحب نے حوالہ دیا تھا، وہ اس نے بارہا پڑھی تھیں۔ لیکن وہ کتاب کا علم رکھنے والے کی طاقت کے نکتے کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ جبکہ شفیق صاحب نے اسے سمجھ لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے لئے نئے در کھل گئے ہیں۔ یہاں آنے میں بھی اس کے لئے اللہ کی رحمت تھی۔

"میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ اللہ کی قدرت کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا۔" شفیق صاحب نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اس کے لئے عاجز کو دینے والا ایک حوالہ ہی کافی ہے کہ اللہ نے کن فرمایا اور زمین اور آسمان جیسی تخلیقات وجود میں آگئیں۔ جبکہ ہم اللہ کے نائب اور خلیفہ ہونے کے باوجود ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ تو اللہ جسے چاہے، زمان و مکاں کی قید سے آزاد کر دے۔ حج اللہ کی میزبانی کا شرف ہے، جو اس کے حکم کے بغیر ممکن نہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں، جن کے پاس تمام وسائل موجود ہیں، لیکن شدید خواہش کے باوجود حج نہیں کر پاتے۔ ان میں سے ایک صاحب تو پانچ

سال سے مکہ معظمہ میں مقیم ہیں، لیکن حج نہیں کر پائے۔ ایک صاحب کا نام چار سال سے قرعہ اندازی میں آ رہا ہے لیکن روانگی سے ذرا پہلے ایسا کچھ ہو جاتا ہے کہ وہ نہیں جا پاتے۔ اور میں نے بے حیثیت لوگوں کو، جنہیں نہ خواہش ہے، نہ اُمید، بالکل اچانک، بے گمان حج پر جاتے دیکھا ہے تو عبدالحق صاحب! یہ سعادت تو اللہ کی طرف سے ہے۔ زائچہ آپ کے لئے کیا بتاتا ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ممکن ہے، مجھ سے تشریح میں کوئی غلطی ہوئی ہو۔ کیونکہ بظاہر یہ ممکن نہیں کہ آپ غیر ملکی سفر بھی نہ کریں اور آپ کی موت، اب سے دور، بیرون ملک واقع ہو۔ ان میں سے کوئی ایک بات غلط ہو سکتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زائچہ بھی درست ہو اور میری تشریح بھی۔ اور قادرِ مطلق کے حکم سے یہ دونوں متضاد باتیں عملی طور پر واقع ہو کر رہیں۔''

چند لمحے خاموشی رہی، جیسے کسی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا ہو۔

پھر شفیق صاحب نے کہا۔

''کچھ مطمئن ہوئے آپ......!''

''جی الحمدللہ! مطمئن بھی اور کچھ سیراب بھی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اور الحمدللہ! پیاس بھی بڑھ گئی۔''

''الحمدللہ! یہ اللہ کا کرم ہے۔''

اسی لمحے شفیق صاحب کا بیٹا اندر آیا۔

''بابا جان! کھانا لے آؤں......؟''

عبدالحق وہاں سے واپس آیا تو اس کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ موجود تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اسے اس کا کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے۔ وہ دوبارہ اس ماضی سے جڑ گیا ہے، جسے یاد رکھنے کا اسے وقت کم ہی ملتا تھا۔

دوسرا واقعہ تصور صاحب سے تعلق رکھتا تھا۔

تصور صاحب اس کے پاس کام کرنے والے دو چپڑاسیوں میں سے ایک تھے۔ بڑی عجیب اور اثر انگیز شخصیت تھی ان کی۔ بہت خوب صورت اور وجیہہ آدمی تھے۔ دراز قد، متناسب الاعضا، گورا رنگ اور دل کش نقوش۔ انہیں دیکھ کر کوئی کہہ

ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چپڑاسی ہیں۔ ظاہری شخصیت کے علاوہ بھی ان میں بہت خوبیاں تھیں۔ خوش گفتار اور نرم خو تھے۔ بہت شائستہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ اور لہجے میں بھی شائستگی تھی۔ البتہ گفتگو بہت کم کرتے تھے۔ مزاج میں متانت بھی تھی، اور سنجیدگی ایسی کہ سنگینی کی حدوں کو چھوتی محسوس ہوتی تھی۔ اور ایک غیر معمولی بات یہ تھی کہ وہ بات کرتے وقت نظر کبھی نہیں اٹھاتے تھے۔ بلکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ نظر اٹھائیں۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ جھکی رہتی تھیں۔ کبھی کسی کام سے انکار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ہر کام نہایت مستعدی اور ذمہ داری سے کرتے تھے۔

عبدالحق کا اندازہ تھا کہ ان کی عمر تیس بتیس سے زیادہ نہیں ہوگی۔

عبدالحق کے اسٹاف میں ایک اسٹینو تھا، جو اس کا پی۔ اے بھی تھا۔ پھر ایک کلرک تھا اور دو چپڑاسی۔ دوسرا چپڑاسی شاید بہت تیز طرار آدمی تھا۔ زبان بھی اس کی بہت تیز چلتی تھی۔ البتہ افسروں کے سامنے وہ چرب زبانی میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

عبدالحق جب یہاں آیا تو اس نے اپنے معمول کے مطابق اپنے اسٹاف میں سے ہر فرد کو الگ الگ بلوا کر ان سے اپنا تعارف کرایا، ان کے بارے میں معلوم کیا اور انہیں اپنے اصول سمجھائے۔

تصور صاحب کو دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ وہ یقیناً کسی اعلیٰ خاندان کے ہیں۔ اس کے دل میں ان کے لئے خود بخود احترام ابھرا تھا۔

''آپ تشریف رکھئے۔'' اس نے بے حد احترام سے کہا۔

وہ ہچکچائے۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولے۔

''میں ایسے ہی ٹھیک ہوں جناب!''

''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ اور یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ اتنی دیر کھڑے رہیں۔''

''میرا تو کام ہی یہی ہے جناب!''

''مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا۔ تو پھر ایک ہی صورت ہے۔ میں بھی کھڑا ہو جاتا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"نہیں حضرت! یہ کیسے ممکن ہے؟" تصور صاحب تڑپ گئے۔

"آپ تشریف رکھئے۔ میں بھی بیٹھ جاؤں گا۔"

عبدالحق بیٹھ گیا۔ تصور صاحب بھی بیٹھ گئے۔ اگرچہ وہ کرسی کی پٹی پر بیٹھے تھے، جیسے، کسی بھی لمحے اٹھ کھڑے ہونے کو تیار ہوں۔

"آپ سکون سے بیٹھ جائیے۔ مجھے آپ کے ساتھ کام کرنا ہے۔"

"قطع کلامی کے لئے معافی چاہتا ہوں جناب عالی! لیکن آپ کو میرے ساتھ نہیں، درحقیقت مجھے آپ کے ساتھ کام کرنا ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"اور معافی کی کوئی بات نہیں۔ میری کوئی بات غلط لگے تو آپ کو قطع کلامی کا حق حاصل ہے۔ آپ کا نام کیا ہے ......؟"

"تصور حسین!"

"آپ کا تعلق کہاں سے ہے ......؟"

"جی کراچی سے، پاکستان سے۔"

"آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ ہجرت کر کے آئے ہیں۔"

"جی ہاں ...... ! الحمدللہ!"

"تو میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کہاں سے ہجرت کر کے آئے ہیں ......؟"

تصور صاحب کہ چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"جس وقت ہم وہاں سے پاکستان آنے کے لئے نکلے تو اسی لمحے ہم نے وہاں کی ہر چیز سے اپنا تعلق ختم کر دیا۔ اس لمحے سے میں پاکستانی ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔"

"پھر بھی آدمی جہاں پیدا ہو، پلے بڑھے، اس جگہ سے انسیت تو ہوتی ہے اسے۔"

"مسلمان کے لئے مقام کی اہمیت نہیں۔ وہ علامہ اقبال نے فرمایا نا کہ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ البتہ پاکستان سے مجھے غیر معمولی محبت ہوگئی ہے۔ یہ میرا وطن ہے، کیونکہ یہ ہم پر اللہ کی بہت بڑی عنایت ہے۔"

"تو یہ تو آپ کی پہلی بات کی نفی ہوئی۔" عبدالحق نے اعتراض کیا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ مکہ اور مدینہ کی اہمیت تو مسلمان کے لئے مسلم ہے، چاہے وہ وہاں نہ رہتے ہوں۔"

"لیکن پاکستان ......!"

"قطع کلامی پر معذرت جناب عالی! یہ پاکستان کوئی عام قطعہ زمین نہیں۔ یہ پہلی ریاست ہے جو صرف مسلمانوں کے لئے قائم ہوئی ہے۔ میرے والد حضور کے نزدیک اس کا قیام معجزہ تھا، اور اس کے لئے لاکھوں مسلمانوں نے اپنے جان و مال، بلکہ عزت اور آبرو تک کی قربانی دی ہے۔ یہ بہت قیمتی سرزمین ہے، جس سے محبت کو میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔"

"تو آپ یہ بتانا پسند نہیں کریں گے کہ آپ کا تعلق کہاں سے ہے ......؟"

"آپ کا حکم تو ٹال نہیں سکتا۔ دراصل آپ مجھ سے پچھلا تعلق پوچھ رہے ہیں۔ ورنہ بنیادی طور پر تو میری نسل کا تعلق کرۂ ارض کی مقدس ترین سرزمین عرب سے ہے۔ بہرحال ہم نے 1947ء میں لکھنؤ سے ہجرت کی تھی۔ اب گستاخی نہ ہو تو ایک عرض کروں ......؟"

"فرمائیے ......!"

"میں یہاں نوکری کر رہا ہوں، آپ میرے افسر ہیں۔ آپ کی بات میں ٹال نہیں سکتا۔ لیکن میرے ماضی سے اس ملازمت کا کوئی تعلق نہیں۔ میں ماضی سے مکمل طور پر تعلق منقطع کر چکا ہوں۔ اب آپ جو پوچھنا چاہیں، پوچھ لیں۔"

"آپ جو کچھ بتانا چاہیں، خود ہی بتا دیں۔ بتانا نہ چاہیں تو یہ بھی آپ کا حق ہے۔"

تصور صاحب شرمندہ سے نظر آنے لگے۔

"آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟"

''جی نہیں! ہرگز نہیں۔ بلکہ مجھے آپ کی صاف گوئی اچھی لگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں ڈرگ روڈ میں رہتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ میرے پانچ بچے ہیں اللہ کے فضل سے۔ تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ اب آپ اجازت دیں تو میں آپ سے ایک التجا کروں۔''

''جی ضرور...!''

''میں آپ کو سر نہ کہوں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا...؟''

''اگر میں کہوں کہ برا لگے گا تو...؟''

''تو میں آپ کو سر کہا کروں گا۔ نوکری کی ہے تو حکم بھی ماننا ہے افسر کا۔''

''آپ جس طرح چاہیں، مجھے مخاطب کر سکتے ہیں۔ میرا نام عبدالحق ہے۔ مجھے اس نام سے پکارے جانا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''بہت شکریہ آپ کا۔ لیکن میں یہ جرأت کبھی نہیں کروں گا۔''

''لگتا ہے، لفظ سر سے آپ کو چڑ ہے۔ اس کی کوئی وجہ...؟''

''بس اتنی سی بات ہے کہ اس سے مجھے انگریزوں کی غلامی کا عہد یاد آتا ہے۔ میرا یہ احساس مجروح ہوتا ہے کہ اب ہم ایک آزاد قوم ہیں۔''

''آپ کی یہ بات مجھے تو بہت اچھی لگی۔ مجھے خود بھی یہ پسند نہیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب میں آپ سے ایک بہت اہم بات کر رہا ہوں۔ میں کہیں بھی جاؤں، اپنے ماتحتوں سے یہ بات ہمیشہ کہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھیں۔''

''آپ حکم فرمائیے جناب عالی! میں انشاء اللہ ہمیشہ خیال رکھوں گا۔''

''دفتر میں ڈسپلن کی بڑی اہمیت ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اسے برقرار رکھتے ہوئے میں آپ سب کا دوست، آپ کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ آپ کو ذاتی زندگی میں کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو تو مجھے بتائیے۔ سرکاری طور پر اگر میں اسے حل نہ کر سکا تو انشاء اللہ ذاتی طور پر حل کروں گا۔ اللہ

کے فضل و کرم سے میں اس کی حیثیت رکھتا ہوں۔ بعض اوقات ذاتی مسائل ہماری دفتر کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے میں ان مسائل کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اب یہاں ہم لوگ ایک ٹیم ہیں۔ یہ دفتر ایک طرح سے ہمارا دوسرا گھر ہے اور ہم ایک گھر کے لوگ۔ ہمیں ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہنا ہے، ایک دوسرے کا خیال رکھنا ہے۔ صرف دکھ درد کا نہیں، عزت کا بھی۔ اور آپ جانتے ہیں تصور صاحب! کہ ہمارا محکمہ کتنا بدنام ہے، اور ایسا بھی نہیں کہ بلاوجہ بدنام ہو۔ میرا اندازہ ہے کہ میرے ساتھ ایماندار ہیں۔ لیکن میں نے انسانی مجبوریاں دیکھی بھی ہیں، اور انہیں سمجھتا بھی ہوں۔ بعض اوقات آدمی اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اسے ایمان بھی بیچنا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں نے اپنے اسٹاف کے ہر فرد سے یہ بات کہی ہے کہ اپنی کسی اہم ضرورت کے بارے میں مجھے ضرور بتائیے گا، ایسا کوئی کام نہ کیجئے گا جو ہمارے سب کے لئے شرمندگی کا باعث ہو۔''

''دوسروں کی میں نہیں جانتا بڑے صاحب! لیکن میں اپنے بچوں کے لئے حرام رزق کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ جو اپنی شرمندگی سے ڈرتے ہوں، وہ دوسروں کو شرمندہ نہیں کراتے۔'' تصور صاحب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

عبدالحق انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بات صرف رزق کی نہیں ہوتی تصور صاحب! زندگی بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ خیر، آپ میری یہ بات بس ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ میں ہر خدمت، ہر تعاون کے لئے حاضر رہوں گا۔''

''جی بڑے صاحب! میں آپ کی بات یاد رکھوں گا۔''

دن گزرے تو عبدالحق کو جیسے تصور صاحب سے محبت سی ہوگئی۔ وہ اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود اپنے اور ان کے درمیان بے تکلفی قائم نہ کر سکا۔ ایک بات یہ تھی کہ وہ کبھی اس کے لئے چائے یا کھانا لے کر آتے تو اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ لگتا تھا، یہ کام ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ دوسرے اسے ان پر چپڑاسی کی وردی اچھی نہیں لگتی تھی۔

ایک دن اس نے غور کیا کہ عارف بھائی کا چپڑاسی وردی نہیں پہنتا ہے۔ پھر اس نے سوچا، ممکن ہے، وہ چپڑاسی ہی نہ ہو۔ اس نے یہ بات عارف سے ہی پوچھ لی۔

''ہاں......! ہے تو وہ چپڑاسی ہی۔'' عارف نے جواب دیا۔

''تو پھر وہ وردی کیوں نہیں پہنتا......؟'' عبدالحق نے اعتراض کیا۔

''بھئی بڑے افسروں کی مرضی پر ہے۔ وہ چاہیں تو انہیں اس پابندی سے آزاد کر دیں۔ اب وہ میرے پاس ہے اور مجھے اس کا وردی پہننا اچھا نہیں لگتا تو میں نے اسے منع کر دیا وردی پہننے سے۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو عبدالحق اسے سمجھاتا کہ یہ دفتر کے ڈسپلن کے منافی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔

''تو کیا میں بھی اپنے چپڑاسی کو منع کر سکتا ہوں۔''

''کیوں نہیں......! گزیٹڈ آفیسر ہو۔'' عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اسسٹنٹ کلکٹر ہو تم!''

اگلے روز صبح کے وقت تصور صاحب اس کے سامنے چائے رکھ کر جانے لگے تو اس نے انہیں پکار لیا۔

تصور صاحب پلٹے۔

''کیا حکم ہے جناب عالی!''

''یہاں آیئے۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

وہ اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''بیٹھئے......!'' عبدالحق نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''معاف کیجئے گا بڑے صاحب، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

عبدالحق نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''میں نہیں سمجھتا تھا کہ آپ کبھی میرے کسی حکم سے انکار کریں گے۔''

''میں نے پہلے ہی آپ سے معذرت کر لی ہے بڑے صاحب!'' تصور صاحب نے بے حد لجاجت سے کہا۔

''مگر مجھے وجہ تو بتائیں گے نا آپ......!''

''دفتر کے ڈسپلن کی بات ہے جناب......!''

''میرا حکم ماننا یہاں ڈسپلن کا پہلا اور بنیادی اصول ہے۔''

تصور صاحب نظریں جھکائے خاموش کھڑے رہے۔

عبدالحق انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اصل بات کچھ اور ہے۔

''اب مجھے اصل بات بتایئے۔'' اس نے کہا۔

''دیکھئے بڑے صاحب! ہمارے پاس عزت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہم وہ گنوانا نہیں چاہتے۔''

''تو میرے کہنے سے اس کرسی پر بیٹھنے سے آپ کی عزت کم ہو جائے گی؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں! اس بات کا امکان موجود ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔ کچھ وضاحت کریں گے آپ۔''

تصور صاحب واضح طور پر ہچکچا رہے تھے۔

''جو بات ہے، آپ بے جھجک کہیں۔'' عبدالحق نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

''آپ سے پہلے جو بڑے صاحب تھے یہاں، انہوں نے ایک دن باہر والے کمرے میں مجھے کرسی پر بیٹھے دیکھ لیا تو سب کے سامنے میری بہت بے عزتی کی۔ کہنے لگے، چپڑاسی بھی کرسی پر بیٹھیں گے تو ان میں اور بابو میں کیا فرق رہ جائے گا۔ چپڑاسی کا کام تو کھڑے رہنا ہے۔ بیٹھنا ہو تو اسٹول رکھا ہے دفتر کے باہر دروازے پر۔ اس پر بابو صاحب نے کہا، بیٹھنا نہیں۔ پھر مجھے جھڑک کر بولے، آئندہ تمہیں کبھی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھوں۔ مجھے ایسا لگا بڑے صاحب! کہ کسی نے بھرے بازار میں مجھے بے لباس کر دیا ہے۔''

ان کے لہجے میں ایسا کرب تھا کہ عبدالحق تڑپ گیا۔ اور ان کی آواز آخر میں ایسے بھرا گئی تھی، جیسے رو رہے ہوں۔ لیکن آنکھوں میں نمی بھی نہیں تھی۔

"مجھے بہت دکھ ہوا یہ سن کر۔" اس نے کہا۔

"لیکن تصور صاحب! سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ بات جانتے ہیں آپ!"

"جی ہاں......!"

"اور میں خود آپ کو بیٹھنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"آج بیٹھوں گا، آپ بیٹھنے کی اجازت دیں گے تو عادت ہو جائے گی۔ پھر آپ چلے گئے اور کوئی پہلے والے صاحب جیسا آ گیا تو پھر وہی بے عزتی۔ اس سے بہتر ہے جناب! کہ ہم اپنی اوقات میں رہیں۔"

"جس وقت جو صورتِ حال ہو، اس سے مطابقت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ سمجھوتے کرنے ہوتے ہیں آدمی کو۔ آپ تو ہجرت کر کے آئے ہیں۔ بہت کچھ دیکھا ہوگا آپ نے۔ سمجھوتے بھی کئے ہوں گے۔"

"یہ ملازمت بھی ایک سمجھوتہ ہی ہے جناب!" اس بار تصور صاحب کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انہوں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

"تو پھر ڈریئے مت! میرے ساتھ کام کرتے ہوئے کبھی آپ کی بے عزتی نہیں ہوگی۔ اور خدانخواستہ میرے بعد کوئی پہلے والے صاحب جیسا آ جائے تو آپ خود کو اس کے مطابق ڈھال لیجئے گا۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔

"میری بات غلط تو نہیں ہے تصور صاحب!"

"جی نہیں جناب......!"

"تو پھر تشریف رکھئے۔"

تصور صاحب بیٹھ گئے۔

"کیا حکم ہے بڑے صاحب......!"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ وردی میں دفتر نہ آیا کریں۔"

"جی......! میں سمجھا نہیں۔"

"آپ سادہ لباس میں دفتر آیا کریں۔"

"لیکن جناب......!"

عبدالحق نے کرسی کے ساتھ رکھا ہوا تھیلا اٹھایا اور ان کے سامنے رکھ دیا۔

تصور صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لیکن جناب! دفتر کا ڈسپلن......"

"آپ کو یہ حکم دینا میرا حق ہے۔ آپ اس وردی میں مجھے اچھے نہیں لگتے۔ اس تھیلے میں آپ کے لئے کپڑا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں بڑے صاحب......!" تصور صاحب کے لہجے میں تناؤ سا تھا۔

"آپ کا حکم ہے تو میں سادہ لباس میں دفتر آیا کروں گا۔ گھر میں بھی تو میں کپڑے پہنتا ہی ہوں۔"

"دیکھیں...... وردی آپ کو سرکار دیتی ہے۔ اب میں وردی میں خوش نہیں ہوں تو متبادل لباس فراہم کرنا بھی میری ذمہ داری ہے۔"

تصور صاحب ہچکچا رہے تھے۔

"آپ آج چھٹی کے بعد ایک گھنٹہ رُکئے گا، اور جاتے وقت اپنی یہ چیزیں یہاں سے لے جایئے گا۔"

"میں پھر عرض کروں گا جناب! کہ اس کی ضرورت نہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ کوئی احسان نہیں ہے آپ پر۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بس میرے اور آپ کے درمیان رہے۔ اس لئے ایک گھنٹہ رکنے کو کہہ رہا ہوں۔"

تصور صاحب اب بھی ہچکچا رہے تھے۔ تاہم انہوں نے آہستہ سے کہا۔

"بہت بہتر جناب! اب میں جا سکتا ہوں؟"

"جی......! ضرور۔"

تصور صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ایک بات اور...... اس تھیلے کو گھر جا کر ہی کھولئے گا۔"

تصور صاحب کے چہرے سے لگا کہ وہ کچھ سمجھ نہیں پائے ہیں۔ تاہم

انہوں نے سر کو ہلکی جنبش دی اور کمرے سے نکل گئے۔

عبدالحق نے تھیلا اٹھا کر میز کے ایک طرف رکھ دیا۔ اس میں بغیر سلی ململ اور لٹھا تھا، بنیان تھے، اور ایک لفافہ، جس میں دس روپے تھے، اور عبدالحق کا رقعہ کہ یہ لباس اس کی ذمہ داری ہے، اس لئے سلائی کے پیسے بھی وہی دے گا۔

شام کو چھٹی کے وقت سب لوگ چلے گئے۔ عبدالحق آدھے گھنٹے تک کام کرتا رہا۔ تصور صاحب بیرونی کمرے میں بیٹھے تھے۔ پھر عبدالحق باہر آیا۔

''آپ دس منٹ بعد دفتر بند کر دیجئے گا۔ اور ہاں، تھیلا لے جانا نہ بھولیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ انہیں کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر دفتر سے نکل آیا۔

یوں تصور صاحب کو وردی سے چھٹکارا مل گیا۔ اب وہ کرتا پاجامہ پہن کر دفتر آتے تھے۔ پہلی بار عبدالحق نے انہیں اس لباس میں دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ایسی شخصیت! پہلی بار اسے احساس ہوا کہ چپڑاسی کی وردی شخصیت کو کیسے دبا دیتی ہے۔

لیکن تصور صاحب اب بھی ویسے ہی تھے۔ ان کی عاجزی ویسی ہی تھی۔ منع کرنا تو بہت دور کی بات، کسی کام کو کہا جاتا تو اسے ٹالتے بھی نہیں تھے۔ صاحب انہیں اہمیت دیتے ہیں، اس سے انہیں کوئی غرض نہیں تھا۔ وہ تو بس اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔

ایک دن شاہد عبدالحق کے پاس چلا آیا۔

''ایک بات کرنی ہے سر! آپ سے۔ غصہ تو نہیں ہوں گے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

عبدالحق اس کی تیزی اور طراری کی وجہ سے اس سے چڑتا تھا۔ اس وقت بھی اسے یقین تھا کہ زبان کھلے گی تو وہ ضرور کوئی فساد کھڑا کرے گا۔ تاہم اس نے کہا۔

''بولو......! کیا بات ہے......؟''

''یہاں میرے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے سر......!'' شاہد نے روہانسا ہو کر کہا۔ آواز بھی بھرا گئی تھی۔

عبدالحق جانتا تھا کہ وہ مکار بھی ہے۔ ابھی چاہے تو آنسوؤں کے ساتھ

رونے لگے۔

''کون کر رہا ہے زیادتی......؟''

''اپنے اسٹینو صاحب، وہی......ارے کیا نام ہے ان کا......؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ اس کا خاص انداز ہے۔ اپنی بات مخاطب کے منہ سے کہلوانا۔ اس نے اسے نظر انداز کر دیا اور متوقع نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

شاہد نے چند لمحے ذہن پر زور دینے کے بعد بالآخر کہا۔

''میں سعید صاحب کی بات کر رہا ہوں سر......!'' یہ کہتے ہوئے اس نے کئی بار پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، جو بند تھا۔

''کیا زیادتی کر رہے ہیں وہ تمہارے ساتھ......؟''

''اب دیکھیں نا سر......! یہاں دو چپڑاسی ہیں۔ تو دونوں سے برابر کا کام لینا چاہئے۔ یہ کیا کہ ایک پر بوجھ لاد دیا جائے اور دوسرا عیش کرے۔''

''یہ فیصلہ تو افسر ہی کریں گے کہ کس سے کیا کام لینا ہے؟ یا ہمیں یہ فیصلہ چپڑاسیوں پر چھوڑ دینا چاہئے۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

شاہد کچھ گڑبڑا گیا۔ لیکن تھا بہت ڈھیٹ۔ پیچھے نہیں ہٹا۔

''لیکن سر! انصاف تو ہونا چاہئے۔''

''کوئی بے انصافی ہو رہی تمہارے ساتھ......؟''

''جی سر......! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' شاہد نے جوش سے کہا۔

''تو بتاؤ نا مجھے۔''

''اب سر! کھانے کے برتنوں کو ہی لیجئے۔ ایک دن برتن میں دھوتا تھا تو دوسرے دن تصور صاحب۔ پھر اچانک اپنے سعید صاحب نے حکم لگا دیا کہ برتن صرف میں ہی دھوؤں گا۔ تصور صاحب کی چھٹی۔ اب یہ تو بے انصافی ہے نا صاحب! اور کاموں میں بھی یہی حال ہے۔ تصور صاحب نے نہ جانے ان پر...... کیا نام ہے ان کا......؟ ہاں سعید صاحب، سعید صاحب پر نہ جانے کیا پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ وہ تو بس ان کے شیدائی بن گئے ہیں۔ کام کے لئے انہیں میرے سوا کوئی نظر ہی نہیں آتا ہے۔''

''اوں ہوں......!'' عبدالحق نے ہنکارا بھرا۔

''اب آپ کے سوا یہاں کون مجھے انصاف دلا سکتا ہے۔'' شاہد نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں دیکھوں گا اس معاملے کو۔''

''ایک گزارش ہے سر......!''

''کچھ اور بھی ہے۔'' عبدالحق جھنجلا گیا۔

''پوچھ کچھ اپنے طور پر ہی کیجئے گا سر! میرا نام نہ لیجئے گا۔ ورنہ تو کیا نام ہے ان کا......سعید صاحب میرے دشمن ہی ہو جائیں گے۔''

''شکایت بھی کرتے ہو، انصاف بھی مانگتے ہو اور ڈرتے بھی ہو۔ یہ تو منافقت ہے۔'' عبدالحق نے طنزاً کہا۔

''منافقت نہیں، مجبوری ہے سر! افسر کی گاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بہت زور کا غصہ آیا۔

''افسر تو میں سعید صاحب سے بھی بڑا ہوں۔ میری گاڑی سے ڈر نہیں لگا تمہیں......؟''

''آپ جیسے افسر ہوں تو کیا بات ہے سر......! آپ کی تو بات ہی الگ ہے۔''

''اچھا......! اب تم جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ سعید بہت اچھا اور معقول آدمی تھا۔ اس سے یہ امید نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ دو ماتحتوں کے درمیان اتنی واضح تفریق کرے۔ لیکن بہرحال کچھ ذاتی پسند ناپسند بھی ہوتی ہے۔ وہ خود تصور صاحب کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے باوجود دفتری معاملات میں وہ ان کی کسی کوتاہی کو نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے اس نے سعید کو بلا لیا۔

''بیٹھئے سعید صاحب......!''

سعید سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''شکریہ جناب......!''

پہلے تو عبدالحق اس سے کام کے سلسلے میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے اچانک پوچھ لیا۔

''یہ کھانے کے برتن کون دھوتا ہے سعید صاحب......!''

''شاہد دھوتا ہے سر......!'' سعید نے بے جھجک کہا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کہ پہلے شاہد اور تصور صاحب باری باری برتن دھوتے تھے۔''

''جی سر......! یہ درست ہے۔''

''تو پھر یہ تبدیلی کیسی......؟''

''کسی نے مجھے بتایا تھا سر......! کہ تصور صاحب سیّد ہیں، تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ ان سے اس طرح کا کام کرایا جائے۔''

''کام میں بے عزتی کبھی نہیں ہوتی۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''بلکہ کام اچھی طرح سے کیا جائے تو اس کا درجہ عبادت کا ہوتا ہے۔''

''یہی بات تصور صاحب بھی کہتے ہیں اور عمل سے ثابت بھی کرتے ہیں سر......! انہوں نے کبھی کسی کام کو منع نہیں کیا۔ یہ تو میں نے خود انہیں چھوٹ دے دی ہے۔''

''اس کا اختیار ہے آپ کے پاس......؟'' عبدالحق کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''اس کا فیصلہ تو آپ کریں گے سر......! بس مجھے وضاحت کی اجازت دے دیں۔''

''وضاحت تو میں سننا چاہتا ہوں۔ یہ آفس کے ڈسپلن کا معاملہ ہے۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''تو سر......! شاید آپ کو علم نہ ہو کہ دفتر کی چابی تصور صاحب کے پاس ہوتی ہے۔ صبح دفتر کے وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ آتے ہیں۔ دروازہ کھولتے ہیں، جمعدار آ کر جھاڑو لگاتا ہے۔ پھر تصور صاحب ہر میز، ہر کرسی اور ہر الماری سے گرد

جھاڑتے ہیں۔ تازہ پانی بھر کر لاتے ہیں اور شام کو چاہے آپ دیر تک رکیں، وہ آپ کے ساتھ رکتے ہیں۔ کیونکہ دفتر انہیں بند کرنا ہوتا ہے۔ اور یہ ان کا روز کا معمول ہے۔ جبکہ شاہد ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ لیٹ ہوتا ہے۔''

''یہ بھی غلط ہے۔'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

''یہ ذمہ داری بھی دونوں پر برابر ڈالی جانی چاہئے۔''

''ڈالی تھی سر! شاید آپ بھول گئے۔ ایک دن آپ اور ہم سب دفتر آئے تو دفتر میں تالا لگا تھا۔ آپ ڈی سی صاحب کے دفتر میں جا بیٹھے تھے۔ اور ہم لوگ ادھر ادھر وقت گزاری کرتے رہے تھے۔ اس روز دفتر شاہد کو کھولنا تھا۔ چابی اس کے پاس تھی۔''

''تو اس کے خلاف کارروائی کیوں نہیں ہوئی؟''

''یہ تو کئی بار ہو چکا ہے سر......! اور گستاخی معاف، کارروائی کا خیال تو آپ کو بھی نہیں آیا۔''

عبدالحق کو شرمندگی کا احساس ہوا۔

''میں تو اس وقت محض وضاحت پیش کر رہا ہوں سر! اب ایک طرح سے دیکھیں تو تصور صاحب نے ایک بڑی ذمہ داری قبول کر رکھی ہے۔ اور انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ شاہد کی بھی یہ ذمہ داری ہے۔ برتن دھونا تو اس کے مقابلے میں چھوٹا کام ہے۔ اب یہ سمجھ لیں کہ تصور صاحب ہر روز دفتر بند کرتے اور کھولتے اور صفائی کرتے ہیں اور شاہد ہر روز برتن دھوتا ہے تو یہ زیادتی تو نہیں ہوئی کسی کے ساتھ۔''

''نہیں......! بلکہ زیادتی تو تصور صاحب کے ساتھ ہو رہی ہے۔'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔

''اب ایک بات اور......اس برتن دھونے کے سلسلے میں آپ بیس روپے ہر ماہ دیتے ہیں۔ تصور صاحب نے برتن دھونے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بلکہ اکثر شاہد برتن دھونے کے وقت کوئی بہانہ کر کے غائب ہو جاتا تھا اور اس کے حصے کا کام بھی تصور صاحب کو کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ خوش دلی سے کرتے تھے۔ لیکن آپ کے

دیئے ہوئے دس روپے لینے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ میں اپنا کام کرتا ہوں اور اس کی تنخواہ مجھے ملتی ہے۔ ان پیسوں پر میرا کوئی حق نہیں۔''

''حالانکہ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ اس لئے تو میں وہ دیتا ہوں۔'' عبدالحق بڑبڑایا۔

''اور ہمارے اصرار کے باوجود تصور صاحب نے پیسے نہیں لئے تو شاہد کو پورے بیس روپے ملنے لگے، اور اب تک ملتے ہیں۔ تو سر......! فرض تو اس کا ویسے ہی پورے مہینے برتن دھونے کا ہے۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ میں نے تصور صاحب کو چھوٹ دے کر غلطی کی ہے......؟''

''ہرگز نہیں......! لیکن آپ کو مجھے بتانا چاہئے تھا۔''

''آپ نے ابتداء میں ہی کہا تھا سر......! کہ چھوٹے موٹے معاملات میں خود نمٹا لیا کروں۔ لیکن سر......! میں نے ان معاملات میں بددیانتی کبھی نہیں کی۔''

''میں جانتا ہوں سعید صاحب، اور میں آپ سے بہت خوش ہوں۔''

''شکریہ سر......!''

''لیکن تصور صاحب کے سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے۔ اوور ٹائم تو یہاں ہوتا نہیں۔'' عبدالحق جیسے خود کلامی کر رہا تھا۔ پھر اس نے نظر اٹھا کر سعید کو دیکھا۔

''اب آپ شاہد کو صرف دس روپے دیں گے۔ اور دس روپے تصور صاحب کو اوور ٹائم کہہ کر دیں گے۔ ایک گھنٹہ صبح جلدی آنے اور ایک گھنٹہ دیر سے جانے کا اوور ٹائم۔ میں ایک واؤچر بک لا دوں گا آپ کو۔ اس پر ان سے دستخط کرا لیا کیجئے گا۔ تاکہ انہیں تسلی رہے کہ یہ سرکاری اوور ٹائم ہے۔''

''ٹھیک ہے سر......!''

شاہد اس پر بہت بلبلایا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ احتجاج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تو آ بیل مجھے مار...... والی حرکت کی تھی۔ اور اس میں اسے دس روپے کا نقصان ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ اسے وقت پر دفتر پہنچنے کا تحریری نوٹس مل گیا تھا۔

اس بات کو کوئی چھ ماہ ہوئے ہوں گے کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
عبدالحق کے ایک واقف کار نے اسے فون کیا کہ اس کا ایک دوست ایکسپورٹ کا کام شروع کرنا چاہتا ہے۔ وہ اسے راہنمائی اور مشورے کے لئے اس کے پاس بھیج رہا ہے۔
''تو میں انہیں امپورٹ ایکسپورٹ کے اے سی سے ملوا دوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔
''جی نہیں.....! میں جانتا ہوں کہ ان معاملات کو تم اس اے سی سے زیادہ سمجھتے ہو گے۔'' اس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تم تو بس یوں ہی.....!''
''ان کا نام سلطان ہے۔ اور یار.....! وہ میرے بہت خاص دوست ہیں۔ کل دس بجے آئیں گے تمہارے پاس۔ انہیں باہر انتظار نہ کرانا۔''
''میں تو ایسا کسی کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔''
''بس یار.....! ان کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔''
اگلے روز اتفاق سے شاہد دفتر نہیں آیا۔ عبدالحق نے دفتر پہنچتے ہی سعید کو بلا لیا۔
''دس بجے ایک صاحب مجھ سے ملنے آئیں گے۔'' اس نے سعید سے کہا۔
''ان کا نام سلطان ہے۔ تم انہیں فوراً اندر بھیج دینا..... بلا خبر.....!''
''جی سر.....!''
''اور ہاں.....! ان کی تواضع کے لئے چائے کے ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی منگوا لینا۔''
''بہت بہتر سر.....!'' سعید نے کہا۔ عبدالحق کے پیسے اس کے پاس رہتے تھے۔ مہمانوں کی تواضع اور عبدالحق کے کھانے میں وہ خرچ کرتا رہتا تھا، اور اس کا حساب رکھتا تھا۔
دس بج کر پانچ منٹ پر سلطان صاحب دفتر کے بیرونی کمرے میں داخل

ہوئے۔ وہ سیدھے سعید کی طرف بڑھے۔ تصور صاحب وہیں بیٹھے تھے۔ تصور صاحب نے انہیں دیکھا تو ہڑبڑا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ سلطان صاحب نے ان پر محض ایک نظر ڈالی تھی۔ جبکہ تصور صاحب کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑے تھے۔
''میرا نام سلطان احمد ہے، اور مجھے عبدالحق صاحب سے.....'' سلطان صاحب کہتے کہتے رکے اور چونک کر پلٹے۔ انہیں پلٹتے دیکھ کر تصور صاحب بہت تیزی سے دفتر سے نکل گئے۔
''میر صاحب.....!'' سلطان صاحب نے عین اس وقت پکارا، جب تصور صاحب دروازے سے نکل رہے تھے۔
سعید نے تصور صاحب کا ردعمل بھی نہیں دیکھا تھا، وہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکا۔
سلطان صاحب چند لمحے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر سعید کی طرف پلٹے۔
''یہ.....''
لیکن سعید نے انہیں بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔
''آپ اندر چلے جائیں سر!'' اس نے عبدالحق کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
''صاحب آپ کے منتظر ہیں۔''
چہرے کے تاثر سے لگتا تھا کہ سلطان صاحب کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر انہوں نے سر جھٹکا اور اندرونی کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔
سعید دوبارہ ٹائپ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ لیٹر مکمل کر کے اس نے ٹائپنگ مشین سے نکالا اور صاحب کے دستخط والے فولڈر میں رکھ دیا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا تو اس نے چونک کر کلرک سے کہا۔
''واجد.....! یہ تصور صاحب کہاں چلے گئے؟''
''وہ تو ان صاحب کے آتے ہی چلے گئے تھے۔'' واجد نے جواب دیا۔
''کچھ کہہ کر نہیں گئے.....؟''

"نہیں......!"

"حالانکہ ہمیشہ بتا کر جاتے ہیں۔" سعید کے لہجے میں تشویش تھی۔

"آج شاہد بھی نہیں آیا ہے۔ مہمان کے لئے چائے اور بسکٹ کا بندوبست کرنا تھا۔"

"پریشان کیوں ہوتے ہو۔ ابھی آجائیں گے۔" واجد نے اسے تسلی دی۔

لیکن اب سعید کو وہ صورتِ حال غیر معمولی لگ رہی تھی۔

"سنو! ہم پانچ منٹ انتظار کریں گے۔" اس نے واجد سے کہا۔

"اگر اس دوران تصور صاحب نہ آئے تو ایک زحمت کرنی ہوگی تمہیں۔"

واجد کا منہ بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ سعید اس سے چائے اور بسکٹ لانے کو کہے گا۔ وہ سوالیہ نظروں سے سعید کو دیکھتا رہا۔

سعید نے دراز سے پانچ کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"ڈی سی صاحب کے چپڑاسی سے چائے اور بسکٹ لانے کا کہہ دینا۔"

اس کا اشارہ عارف کے چپڑاسی کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہے......!" واجد نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرے خیال میں تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔"

اندر کمرے میں عبدالحق سلطان صاحب کو ایکسپورٹ کے طریقہ کار کے بارے میں بتا رہا تھا۔ سلطان صاحب بڑی توجہ اور دلچسپی سے سن رہے تھے۔

"حکومت ایکسپورٹ کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن ایکسپورٹ پروموشن بیورو سے تو مجھے یہ تاثر نہیں ملا۔" سلطان صاحب بولے۔

"بدقسمتی سے کسی برے افسر سے ملاقات ہوگئی ہوگی آپ کی۔"

"شاید یہی بات ہے۔" سلطان صاحب نے کہا۔

"یہ بتائیں! کیا ایکسپورٹ کرنا بہتر رہے گا۔"

"میرے خیال میں باہر ہماری دستکاری کی مصنوعات کے لئے بڑی

گنجائش ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ لیکن اب اس کے لئے گفتگو پر توجہ مرکوز رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے حساب سے تو اب تک چائے اور بسکٹ آجانے چاہئیں تھے۔

بہرحال وہ گفتگو کرتا رہا۔ سلطان صاحب بہت مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔

آخر عبدالحق کو ایکس ٹینشن پر سعید کو کال کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے سعید......؟"

"سوری سر......! بس دو منٹ انتظار کرلیں سر......!" سعید نے کہا۔ وہ عارف کے چپڑاسی کو چائے لانے کے لئے بھیج چکا تھا۔

"ٹھیک ہے......! شکریہ سعید......!" عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

لیکن چند منٹ بعد عارف کے چپڑاسی کو چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ کمرے میں آتے دیکھ کر اسے حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ شاہد نے آج چھٹی کی ہے۔ لیکن تصور صاحب تو موجود تھے، اور وہ بہت ذمہ دار آدمی تھے۔ کہیں خدانخواستہ ان کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی۔

"آپ نے تو تکلف کر ڈالا حضرت......!" سلطان صاحب نے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں، بسکٹ لیجئے نا۔"

چائے پیتے ہوئے اچانک سلطان صاحب نے کہا۔

"جب میں آیا تو باہر ایک اور صاحب بیٹھے تھے آپ سے ملنے کے لئے۔ آپ انہیں اتنا انتظار کروا رہے ہیں۔"

"مجھ سے ملنے کے لئے......؟" عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ایسا ہوتا تو سعید مجھے بتاتا۔"

سلطان صاحب نے لباس اور حلیہ بیان کیا تو عبدالحق سمجھ گیا کہ یہ تصور صاحب کی بات ہو رہی ہے۔

"مجھے دیکھتے ہی وہ کمرے سے نکل گئے۔" سلطان صاحب نے بتایا۔

"انہیں یقیناً آپ سے کوئی کام ہوگا۔"

"وہ آپ کو دیکھتے ہی چلے کیوں گئے......؟ آپ جانتے ہیں انہیں۔"

"جی......! میں میر صاحب کو ایک عمر سے جانتا ہوں، بلکہ ان کے ابا جان کو بھی۔"

"میر صاحب......!" عبدالحق نے حیرت سے دہرایا۔

"لکھنؤ کے بڑے رئیس تھے بڑے میر صاحب...... آم کے باغات، زمینیں، حویلی، کیا کچھ نہیں تھا ان کے پاس۔ لیکن پاکستان کے نام پر سب کچھ چھوڑ کر، پورے گھرانے کو صرف تن کے کپڑوں میں لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ میر صاحب ان کے اکلوتے بیٹے ہیں۔"

"نام کیا ہے ان کا......؟"

"سید تصور حسین، اعلیٰ نسب بھی ہیں، نجیب الطرفین سید ہیں۔"

"مجھے تو اشتیاق ہونے لگا ان سے ملنے کا۔"

"بہت نفیس آدمی ہیں۔ اور وہ یقیناً آپ سے ملنے آئے تھے۔"

"مجھے تو علم نہیں۔ ممکن ہے، پھر آئیں۔"

"آئیں تو انہیں میرا سلام کہیے گا۔" سلطان صاحب نے ایک کاغذ پر اپنا پتا اور فون نمبر لکھ کر عبدالحق کی طرف بڑھایا۔

"اور یہ انہیں دے دیجیے گا۔ ان سے کہیے گا کہ بس فون پر اپنا پتا بتانے کی زحمت کر لیں۔ میں خود ان کے دولت خانے پر حاضری دوں گا۔"

سلطان صاحب کے جانے کے بعد عبدالحق بیٹھا تصور صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ سلطان صاحب کے لہجے میں کتنا احترام تھا ان کے لئے۔ اور انہوں نے تصور صاحب کو اپنے گھر آنے کے لئے نہیں کہا، بلکہ کہا کہ وہ خود ان کے گھر حاضری دیں گے۔ تو کیا دبدبہ رہا ہوگا ان کے گھرانے کا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت تک تصور صاحب واپس آگئے تھے۔ مگر اس روز عبدالحق کو ان کا کھانا لے کر آنا اچھا نہیں لگا۔ لیکن ان کی خودداری کا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ انہیں ٹھیس بھی نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ تاہم کھانے کے بعد اس نے عارف کو فون کر کے اس سے درخواست کی کہ اپنے چپڑاسی کو کچھ دیر کے لئے بھیج دے۔ چنانچہ برتن اسی نے سمیٹے۔ عبدالحق نے اسے پانچ روپے دیئے تو وہ خوش

ہوگیا۔ برتن دھو بھی اسی نے دیئے۔

کھانے کے بعد عبدالحق نے تصور صاحب کو بلا لیا۔ حسب سابق بڑی ردّ و قدح کے بعد انہوں نے کرسی پر بیٹھنا قبول کیا۔

"آپ اچانک کہاں غائب ہوگئے تھے؟" عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

"طبیعت خراب ہوگئی تھی بڑے صاحب......! ڈسپنسری چلا گیا تھا۔" تصور صاحب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی سے منہ چھپانا چاہتے ہوں......؟"

تصور صاحب کا چہرہ فق ہوگیا۔ سمجھ گئے کہ ان کا راز کھل گیا ہے۔

"جی بڑے صاحب......! یہ درست ہے۔" انہوں نے گویا اعترافِ جرم کیا۔

"جب آپ سمجھتے ہیں کہ کام میں کبھی بے عزتی نہیں ہوتی تو پھر......"

"میں اس لئے منہ نہیں چھپا رہا تھا بڑے صاحب......!" تصور صاحب نے تڑپ کر اس کی بات کاٹ دی۔

"مجھے اس میں ہرگز شرم محسوس نہیں ہوتی کہ میں ان کے سامنے چپڑاسی بن کر آتا۔ میں تماشا نہیں بننا چاہتا تھا دفتر میں۔ میں لوگوں کی ہمدردی بھی نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ مجھ پر ترس کھائیں۔ اس لئے کہ میں جو کچھ ہوں، اس میں خوش ہوں۔ میں ماضی سے تعلق توڑ چکا ہوں۔ اب دیکھئے نا، اس فرار سے یہ فائدہ تو ہوا نا کہ میرا ماضی صرف آپ پر کھلا۔ آپ سے میری التجا ہے بڑے صاحب......! کہ میرے راز کو راز رکھیں۔"

"آپ کا ماضی کوئی عیب تو نہیں کہ اسے آپ یوں چھپائیں۔"

"میں نہیں چاہتا کہ اس سے مجھے کوئی فائدہ ملے یا میری تضحیک ہو۔ کیونکہ دونوں ہی باتیں ممکن ہیں۔"

"تضحیک کوئی کیوں کرے گا آپ کی......؟"

"یہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے بڑے صاحب......! شاید آپ کو معلوم نہیں۔"

’’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اتنا کچھ تھا آپ کے پاس، تو آپ نے یہاں آ کر کلیم کیوں داخل نہیں کیا......؟‘‘

تصور صاحب نے ایک سرد آہ بھری اور خلاؤں میں گھورنے لگے، جیسے گزرے ہوئے ماضی کو دیکھ رہے ہوں۔

’’جب ہم حویلی سے نکلے...... پاکستان آنے کے لئے، تو میں نے در و دیوار کو، گزرتے ہوئے باغات اور اپنی زمینوں کو حسرت سے دیکھا......‘‘ ان کی آواز کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

’’......تو ابی جان نے کہا، نظریں نیچی کر لو فرزند! سب کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ یہ زمین بھی اللہ کی تھی۔ اس کا کرم کہ اس نے ہمیں عطا کر دی۔ اب ہم اسی کے لئے اس زمین کو چھوڑ کر پاک سرزمین کی طرف جا رہے ہیں۔ تم سوچتے ہوگے فرزند! کہ آخر ہم یہاں کیوں نہیں رہ سکتے؟ تو یہ بات نہیں، رہ سکتے ہیں ہم۔ لیکن مسلمانوں نے ہزار سال حکومت کی ہے یہاں، مسلمانوں کی روایتی رواداری کے ساتھ، وسیع القلبی کے ساتھ۔ مگر اب یہاں ہندو حکومت کرے گا، اکثریت کے بل پر۔ اور وہ طبعاً گھٹیا، تنگ نظر ہے۔ میری نظریں جو دیکھ رہی ہیں، تم نہیں دیکھ سکتے میاں۔ پچاس سال ...... زیادہ سے زیادہ پچاس سال میں یہاں مسلمانوں کا مسلمان بن کر رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور فرزند! یہ زمینیں، حویلیاں، جاگیریں، جن کے لئے احمق مسلمان یہیں پڑے رہنے کی سوچیں، یہ تو اس سے بہت پہلے ہی چھن جائیں گی۔ پاکستان کی دو گز زمین ان تمام زمینوں سے افضل ہے ہمارے لئے۔ اور میاں! فراخی کے بعد تنگی تو ہوتی ہے۔ اللہ آزماتا ہے۔ تنگی میں کبھی دل چھوٹا نہ کرنا۔ خوش رہنا کہ مسلمان ہو اور مسلمان بن کر عزت کے ساتھ جی رہے ہو۔ ہماری دعائیں انشاء اللہ تمہارے ساتھ ہوں گی۔‘‘

عبدالحق کی عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ احترام سے سامنے بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہا تھا، جو اس کا چپڑاسی تھا۔

’’تو آپ کے والد محترم تو یہاں بہت خوش ہوں گے؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’وہ یہاں زندہ پہنچے ہی کب؟ انہوں نے پاکستان میں دو گز زمین مانگی

تھی، وہ انہیں مل گئی۔‘‘ تصور صاحب نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

’’بلکہ ہمارے گھر میں تو کوئی بھی نہیں بچا...... سوائے ہمارے۔ اماں بیگم بھی گئیں اور بہنیں بھی۔‘‘

عبدالحق سن ہو کر رہ گیا۔ کمرے میں بہت دیر تک خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے کہا۔

’’آپ نے میرے سوال کا جواب تو دیا ہی نہیں۔ آپ نے یہاں اپنی جائیداد کا کلیم داخل کیوں نہیں کیا؟‘‘

’’جواب تو دے دیا بڑے صاحب! شاید آپ تک پہنچ نہیں سکا۔‘‘ تصور صاحب بھی کسی اور ہی کیفیت میں تھے۔

’’میں سمجھا نہیں!‘‘

’’وہاں کے بدلے کی زمین تو ہمیں یہاں مل گئی بڑے صاحب! ابی جان، اماں بیگم اور تینوں بہنوں کو دو دو گز زمین۔ اور ہم زندہ ہیں تو اللہ کا شکر کہ اس نے رہنے کو ٹھکانا دیا۔ اور کیا چاہئے۔ ابی جان نے واضح کر دیا تھا کہ یہاں کی دو گز زمین وہاں کی تمام زمینوں سے افضل ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو ہم فائدے میں ہی رہے۔ ہمیں ہمارے حق سے زیادہ ہی مل گیا۔‘‘

’’آپ سید ہیں، اپنے نام کے ساتھ سید کیوں نہیں لکھتے آپ......؟‘‘

’’نسبت اوقات اور اعمال دونوں سے بہت بڑی ہے، اس لئے۔‘‘ تصور صاحب نے سادگی سے کہا۔

’’مگر دوسروں کے بھلے کے لئے آپ کو اس کا اعلان کرنا چاہئے۔ کسی سے انجانے میں کوئی زیادتی......‘‘

’’کیسی باتیں کر رہے ہیں بڑے صاحب! یہ تو اللہ کا دیا ہوا اعزاز، اس کا فضل ہے۔ میں تو پسند نہیں کرتا کہ اس حوالے سے دوسروں کو مرعوب کروں۔ انہیں اس عزت پر مجبور کروں۔ اللہ جسے چاہے، عزت دے، چپڑاسی ہوں، مگر اس نے مجھے عزت سے نوازا ہے۔‘‘

’’لیکن میں نے سنا ہے تصور صاحب کہ نسب کو چھپانا نہیں چاہئے۔‘‘

"نسب تبدیل کرنا تو بہت بڑا جرم ہے جناب!"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"یہاں لوگوں نے اپنا حسب نسب ہی تبدیل کر لیا ہے بڑے صاحب!" تصور صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یوں سمجھیں کہ پاکستان میں سب کچھ الٹ پلٹ گیا۔ جو وہاں سے یہاں آئے، تتر بتر تھے، سب نے یہی سوچا کہ اب یہاں کون پہچانے گا۔ جو جی چاہے، دعویٰ کر لو۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔"

"دیکھئے حضرت! یہاں میں کتنے ہی ایسے شناساؤں سے ملا، جو خاندانی اعتبار سے کم تر تھے، مگر اب وہ سیّد صاحب کہلاتے ہیں۔ جن کے پاس وہاں رہنے کو بس ایک چھوٹا سا گھر تھا، انہوں نے یہاں کلیم داخل کرا کے زرعی زمینیں حاصل کر لیں۔ زمیندار بن گئے۔"

"لیکن آپ کے سامنے تو انہیں شرم آئی ہو گی۔"

"نہیں حضرت! شرم تو ہمیں آئی۔ انہیں شرم ہوتی یا ڈر ہوتا تو وہ ایسا کرتے ہی کیوں؟ وہ تو اللہ سے بھی نہیں ڈرتے کہ حسب نسب تبدیل کرنے والوں کے لئے کیسی وعید ہے۔"

"اب میں سمجھا۔" عبدالحق نے کہا۔

"اس لئے آپ نے اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھنا چھوڑ دیا۔"

"جی حضرت......! جب کوئی عزت کی چیز ارزاں ہو جائے تو اسے چھپا لینا ہی بہتر ہے۔"

"جب آپ جیسے حقدار کلیم نہیں کریں گے تو لوگ جھوٹے کلیم تو بھریں گے ہی۔"

تصور صاحب نے بڑے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

"بے شک ہم جیسے لوگ بھی بہت تھے، جو صرف پاکستان کی بے غرض محبت لے کر یہاں آئے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے، جنہوں نے کلیم داخل کئے تو پتا چلا

کہ ان کے حصے کی زمین جائیداد تو کلیم کے ذریعے کسی اور کو دی جا چکی ہے۔"

"کیسے......؟"

"بہت کچھ ہوا ہے بڑے صاحب! کچھ تو ایسے تھے، جنہیں شہید لوگوں کے کاغذات مل گئے۔ کچھ ایسے تھے، جنہیں افراتفری میں ایسے کاغذات مل گئے۔ اور کچھ ایسے تھے، جنہوں نے کلیم افسر کو حصہ دار بنا کر جعلی کلیم داخل کئے اور منظور بھی کرا لئے۔ نتیجہ یہ کہ حق دار محنت مزدوری کر کے پیٹ پال رہے ہیں اور وہاں کے مزدور یہاں بادشاہ بن گئے۔"

لاہور میں عبدالحق نے یہی کچھ سنا بھی تھا اور دیکھا بھی تھا۔

"آپ کو اس پر دکھ نہیں ہوتا میر صاحب......!"

"الحمد للہ......! بالکل نہیں ہوتا۔ ہم یہاں دل میں کوئی لالچ لے کر تو نہیں آئے تھے۔ ہم جس حال میں ہیں، خوش ہیں۔ دوسرے یہ تو اس دنیا کی رسم ہے۔ وقت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ جس سے چاہے، بادشاہت لے کر، جسے چاہے دے دیتا ہے۔ باری بھی تو لگتی ہے یہاں۔ ہم نے بہت عیش کئے، اللہ کا شکر ہے، اب ان کی باری ہے، جو عیش سے محروم تھے۔"

"سلطان صاحب کو آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"ابّی جان سے یاد اللہ تھی ان کی۔ اسی لئے ہم سے بھی واقف ہیں۔" تصور صاحب نے سرسری انداز میں کہا۔

عبدالحق نے سلطان صاحب کا دیا ہوا پرچا ان کی طرف بڑھایا۔

"وہ کہہ رہے تھے کہ بس آپ انہیں فون کر کے اپنا بتا دیں، وہ خود آپ کے گھر پر حاضری دیں گے۔ بہت احترام کرتے ہیں وہ آپ کا۔"

"محبت ہے ان کی۔" تصور صاحب نے کہا اور پرچا خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔

"اب تو میرے لئے بھی آپ نہایت محترم ہیں۔ ایک بار پھر آپ سے عرض کروں کہ کوئی بھی ذاتی پریشانی یا مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ یہ سمجھ لیجئے کہ دفتری معاملات سے ہٹ کر میں آپ کے لئے ایک بھائی ہوں۔"

تصور صاحب کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''عزت افزائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ بس ایک احسان ضرور کر دیجئے گا مجھ پر۔''

عبدالحق سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

''میرا پردہ رکھ لیجئے گا۔''

''یہ وضاحت آپ نے اب بھی نہیں کی کہ آپ کا ماضی آپ کے لئے تضحیک کا باعث کیسے ہے؟''

''اللہ کا شکر کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا۔ لیکن میں نے اپنے جیسوں کی تضحیک ہوتے دیکھی ہے۔ کوئی کہے کہ ہندوستان میں ہم پر اللہ کا بڑا فضل تھا، تو جواب ملتا ہے، وہاں سے آنے والے تو سبھی یہی کہتے ہیں۔ اور ذرا لحاظ کیا تو پدرم سلطان بود کہہ کر گویا یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ تمہاری اپنی اوقات کیا ہے۔ کوئی کہے کہ میں سید ہوں تو کہا جاتا ہے کہ وہاں سے تو کنجڑے قسائی بھی یہاں کر سید بن بیٹھے۔ اب آپ ہی بتایئے بڑے صاحب کہ آدمی یہ سب کچھ سن کر اپنے آباء و اجداد کو رسوا کیوں کرے۔''

''آپ نے ٹھیک فرمایا میر صاحب!''

''اور آپ سے گزارش ہے کہ مجھے اس طرح پکاریئے بھی نہیں، وہی پہلے والا رویہ رکھئے۔''

''میں معذرت خواہ ہوں میر صاحب کہ یہ بات میں نہیں مانوں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب تو آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ اور پھر میں آپ کا احترام کروں گا تو دوسرے لوگ بھی کریں گے۔ اس میں کوئی نقصان نہیں آپ کا۔''

''میرا آپ پر کوئی زور تو ہے نہیں۔'' تصور صاحب نے مایوسی سے کہا۔

لیکن عبدالحق کی بات درست ثابت ہوئی۔ ماتحت افسروں کے رویے سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عبدالحق کے انداز میں تصور صاحب کے لئے احترام دیکھا تو اس کے ماتحت بھی ان کا احترام کرنے لگے۔ اور ان کی دیکھا دیکھی دفتر

کے دوسرے لوگ بھی انہیں میر صاحب کہنے لگے۔

دو سال گزر گئے۔ تصور صاحب عبدالحق کے احسان مند تھے۔

پھر عبدالحق کو احساس ہوا کہ تصور صاحب کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔ ان کے چہرے سے تو اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا لیکن وہ کچھ غائب دماغ رہنے لگے تھے۔ جبکہ پہلے وہ ایک بار کی کہی ہوئی بات بھولتے ہی نہیں تھے۔

ایک دن عبدالحق نے ان سے اس سلسلے میں بات بھی کی۔

''میر صاحب! ان دنوں خدانخواستہ کچھ پریشان ہیں آپ؟''

''جی نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟''

''بس ایسے ہی۔''

''کیا مجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے آپ کو؟''

''نہیں! دیکھ کر تو نہیں لگتا۔''

''ایسی کوئی بات ہے بھی نہیں بڑے صاحب!''

لیکن اگلے چند روز میں عبدالحق کا یہ تاثر اور گہرا ہو گیا۔ البتہ وہ اسے اہمیت نہیں دے سکا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں آڈٹ پارٹی آئی ہوئی تھی۔ حسابات کی سالانہ پڑتال ہو رہی تھی۔ اس کے اور اس کے اسٹاف کے لئے وہ بڑی مصروفیت کا عرصہ تھا۔

اس روز آڈٹ پارٹی کے کچھ لوگ اس کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اہم دفتری باتیں ہو رہی تھیں کہ تصور صاحب جھجکتے ہوئے اندر آئے۔ عبدالحق ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''خیریت تو ہے میر صاحب!'' عبدالحق نے پوچھا۔

''مجھے چھٹی چاہئے جناب عالی!''

''کل کی....؟''

''مجھے ابھی گھر جانا ہے بڑے صاحب! اور کل بھی دفتر نہیں آ سکوں گا۔''

''خیریت تو ہے میر صاحب!''

''جی، الحمدللہ!'' تصور صاحب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"تو آپ چلے جایئے۔ سعید صاحب کو بتا دیجئے گا۔"

لیکن تصور صاحب پھر بھی کھڑے رہے۔ انداز میں اب بھی جھجک تھی۔

عبدالحق آؤٹ پارٹی والوں کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تصور صاحب کا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔

تصور صاحب نے جھجکتے جھجکتے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک تہہ شدہ رقعہ نکالا اور کھنکھار کر گویا عبدالحق کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

عبدالحق کچھ جھنجلا سا گیا۔ تاہم اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کیا ہوا میر صاحب! آپ گئے نہیں؟"

تصور صاحب نے رقعہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ رکھ لیجئے سر! میری التجا ہے کہ گھر جا کر اسے پڑھ لیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ پلٹے اور کمرے سے نکل گئے۔

عبدالحق کو سچ مچ غصہ آیا۔ چھٹی کی درخواست وہ سعید کو بھی دے سکتے تھے۔ بہرحال رقعہ اس نے قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ یہ مداخلت اسے بہت بری لگتی تھی۔

"یہ تو شاید چپڑاسی ہے آپ کا؟" آؤٹ پارٹی کے لوگوں میں سے ایک نے پوچھا۔

"جی ہاں!" عبدالحق اس کے لہجے پر بھی جھنجلا گیا۔ وہ دن ہی شاید جھنجلاہٹ کا تھا۔

"زیادہ ہی منہ لگا رکھا ہے آپ نے!"

"میں جانتا ہوں کہ کسے کتنی اہمیت دینی ہے۔" عبدالحق اپنے لہجے کی تلخی نہیں چھپا سکا۔

"دفتر کا ڈسپلن خراب کر دیتے ہیں ایسے لوگ۔"

عبدالحق کو شرمندگی ہوئی۔ کیونکہ کہی گئی بات درست تھی۔ اور اس کی تردید ممکن نہیں تھی۔ اسے پھر تصور صاحب پر غصہ آنے لگا۔ چھٹی کی درخواست وہ سعید کو دے سکتے تھے۔ بلکہ وہ چھٹی کا بھی سعید سے ہی پوچھ لیتے۔ وہ ایکس ٹینشن پر اس

سے اجازت لے لیتا۔ یہ دفتری طریق کار ہوتا، جس پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ تصور صاحب کبھی چھٹی نہیں کرتے تھے۔ کجا یہ کہ دفتر آنے کے بعد چھٹی لے کر جانا۔

اس نے جواب دینے کے بجائے کام کی بات شروع کر دی۔

جس عرصے میں آؤٹ ہوتا تھا، وہ اس کے اور اس کے اسٹاف کے لئے بہت تھکا دینے والا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو دفتری اوقات کے بعد بھی کافی دیر رک کر کام کرنا ہوتا تھا۔ اس روز زیادہ ہی دیر ہوگئی تھی۔ مغرب کی نماز اس نے دفتر میں ہی پڑھی۔ گھر پہنچتے پہنچتے عشاء کا وقت ہوگیا تھا۔

گھر پہنچا تو نور بانو نے کہا۔

"اتنی دیر کر دی آپ نے۔"

"کام زیادہ ہو تو دیر ہو ہی جاتی ہے۔" عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

"وہ کام کل بھی تو کیا جا سکتا تھا۔ چھٹی کے وقت تو آدمی گھر پر آ جائے۔ میں یہاں اکیلی ہوتی ہوں۔"

"نوکرانی ہے تمہارے پاس۔ برابر میں ہی عارف بھائی ہیں۔"

"مگر آپ کی بات تو اور ہے۔ پتا ہے، کتنی طبیعت خراب ہوئی ہے میری آج۔"

"میں تو کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ تم لاہور چلی جاؤ۔"

"آپ سے دور نہیں رہ سکتی میں۔" نور بانو نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت عبدالحق تھکن کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا ہے۔ ایسے میں بحث و تکرار نقصان دہ ثابت ہوگی۔

"تو پھر برداشت کی عادت ڈالو، میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔"

"کپڑے نکال کر رکھ دیئے ہیں میں نے۔ آپ کپڑے تبدیل کر کے، ہاتھ منہ دھو کے آئیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

عبدالحق بیڈروم کی طرف چلا گیا۔

کھانا کھا کر اس نے عشاء کی نماز پڑھی، کچھ دیر قرآن پڑھا، اور پھر سو گیا۔

اگلے روز تصور صاحب دفتر نہیں آئے۔ عبدالحق کے ذہن سے وہ بات ہی نکل گئی۔ پھر اس کے بعد تصور صاحب دفتر آئے تو پریشان ہی نظر آرہے تھے۔ لیکن عبدالحق کی پوری توجہ آؤٹ پارٹی کی طرف تھی۔ وہ اس طرف دھیان ہی نہیں دے سکا۔

اس روز بھی آؤٹ پارٹی کے لوگ اس کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ تصور صاحب کئی بار کمرے میں آئے، کبھی چائے لے کر اور کبھی کھانا لے کر۔ عبدالحق کو احساس ہوا کہ وہ کچھ مضطرب ہیں، اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر اس نے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ پچھلی بار بھی ان کی وجہ سے اسے آؤٹ پارٹی والوں کی بات سننی پڑی تھی۔ اور یہ اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس پر وہ ان سے چڑا ہوا تھا۔ اس نے انہیں نظرانداز کر دیا۔

اگلے روز آؤٹ پارٹی والوں کے آنے سے پہلے تصور صاحب اس کے کمرے میں آئے۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''جی میر صاحب!''

''آپ مجھ سے کچھ خفا ہیں بڑے صاحب!''

''آپ کے خیال میں نہیں ہونا چاہئے۔'' عبدالحق نے الٹا ان سے سوال کیا۔

تصور صاحب کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔

''میں سمجھا نہیں جناب!''

''میں نے آپ سے پہلے دن ہی کہا تھا کہ دفتر کے ڈسپلن کی بڑی اہمیت ہے۔'' عبدالحق کا لہجہ سخت تھا۔

تصور صاحب نادم کھڑے تھے۔ عبدالحق نے ان سے بیٹھنے کو بھی نہیں کہا۔ ویسے ڈسپلن کی بات سننے کے بعد شاید وہ اس کے کہنے پر بھی نہیں بیٹھتے۔

''آپ نے آؤٹ پارٹی والوں کے سامنے اس دن مجھے شرمندہ کرا دیا۔

دیکھیں نا! وہ تو باہر کے لوگ ہیں۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب عالی! دراصل اہلیہ کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

تو آپ سعید صاحب سے بات کر سکتے تھے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''وہ تو میں نے کر لی تھی۔''

''تو پھر میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ کم از کم آؤٹ پارٹی والوں کے سامنے نہ آتے۔''

''مجبوری تھی جناب عالی!''

''میں تو نہیں سمجھ سکا آپ کی مجبوری۔''

''ہم نے تو ساری تفصیل لکھ دی تھی جناب!'' وہ بے بسی سے بولے۔

''تفصیل کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔'' عبدالحق نے بے رخی سے کہا۔

تصور صاحب گنگ ہو کر رہ گئے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

عبدالحق نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اسے ان کی نگاہوں میں التجا نظر آئی۔

''کچھ کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

تصور صاحب جھجکتے رہے۔ کچھ گومگو کی کیفیت میں تھے۔

عبدالحق کو ان پر ترس آنے لگا۔ اچانک اسے ان کا پس منظر یاد آیا۔

''کہئے نا! کیا کہنا ہے آپ کو؟''

''اب کیا کہیں صاحب! جو نہیں کہنا تھا، وہ بھی کہہ چکے ہم تو۔''

''تو پھر......؟''

''ہمیں بتا دیجئے کہ آپ کا فیصلہ کیا ہے؟''

''فیصلے کی کیا بات ہے، اتنی سی بات......''

اسی وقت ایڈیٹر صاحب آ گئے۔

''میرے لئے کیا حکم ہے بڑے صاحب!''

''آپ دوسری درخواست لکھ کر سعید کو دے دیجئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

تصور صاحب کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ جیسے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہے ہوں۔

''دوسری درخواست لکھوں؟''

''جی ہاں! یہی کہا ہے میں نے۔''

''اور وہ سعید صاحب کو دے دوں؟'' تصور صاحب نے زخمی لہجے میں کہا۔ ان کے لہجے میں تعجب اور بے یقینی بھی تھی۔

''جی......! دفتر کا یہی طرق کار ہے۔''

تصور صاحب کے کندھے جیسے ڈھلک گئے۔ وہ جانے کے لئے پلٹے۔

''اور ہاں میر صاحب!'' عبدالحق نے انہیں پکارا۔

وہ پلٹے تو ان کی نگاہوں میں امید کی چمک تھی۔

''جی بڑے صاحب!''

''چائے بھجوا دیجئے گا شاہد سے۔''

''بہت بہتر جناب!''

عبدالحق نے ان کی مایوسی بھی دیکھی تھی۔ ان کا زخمی لہجہ اس کی سماعت تک پہنچا تھا۔ لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ دوسری درخواست لکھنے کی بات پر ان کا ردِعمل کچھ ایسا تھا، جیسے وہ ان کے لئے توہین ہو۔ اسے نہیں لگتا تھا کہ وہ دوسری درخواست لکھ کر دیں گے۔

اسے افسوس ہونے لگا۔ قصور تو اس کا بھی تھا۔ انہوں نے درخواست لکھ کر اسے دی تھی۔ اور وہ جیب میں رکھ کر بھول گیا تھا۔ اس نے سوچا، آج وہ نور بانو سے پوچھے گا کہ جیب میں سے وہ درخواست نکالی ہے اس نے، اور کہاں رکھی ہے۔

لیکن اسے پھر جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ درخواست براہ راست اسے دینے کی تُک کیا تھی۔ سعید کو دینی چاہئے تھی۔

''کس سوچ میں ہیں عبدالحق صاحب!'' ایڈیٹر صاحب نے چونکا دیا۔

''کچھ نہیں، اور آپ سنائیں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔

اس شام بھی دفتر میں دیر تک کام رہا۔ گھر جانے کے لئے وہ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ ہی آفس سے نکلا تو بیرونی کمرے میں صرف تصور صاحب تھے۔

''سب لوگ چلے گئے؟'' اس نے ان سے پوچھا۔

''جی بڑے صاحب!''

''ٹھیک ہے۔ اب میں بھی جا رہا ہوں۔ آپ دفتر بند کر دیجئے گا۔''

''جی بہتر!''

اس روز بھی وہ نور بانو سے درخواست کے بارے میں پوچھنا بھول گیا۔

اگلے روز گھر جانے کے لئے نکلتے ہوئے اسے شاہد کو باہر بیٹھے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

''تم یہاں کیسے؟''

''دفتر لاک کرنا ہے نا سر!''

''میر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ تو تین دن کی چھٹی لے کر گئے ہیں۔''

عبدالحق کو حیرت بھی ہوئی اور تشویش بھی۔ تصور صاحب تو کبھی چھٹی کرتے ہی نہیں تھے۔ اور اب پہلے ڈیڑھ دن کی چھٹی، اسے دو دن بعد یہ تین دن کی چھٹی۔ اور کئی دن سے وہ پریشان بھی نظر آ رہے تھے۔

صبح وہ دفتر پہنچا تو دروازہ مقفل تھا۔ سعید باہر کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ سر! چابی شاہد کے پاس ہے نا! میر صاحب تو تین دن کی چھٹی پر ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔

عبدالحق کو شدت سے غصہ آیا۔ ابھی آؤٹ پارٹی والے آجائیں تو کتنی شرمندگی ہوگی۔

''میں عارف صاحب کے دفتر میں بیٹھا ہوں۔ آفس کھل جائے تو مجھے بلا لینا۔'' اس نے کہا اور عارف کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔

پانچ منٹ بعد شاہد اسے بلانے آگیا۔ اللہ نے عزت رکھ لی تھی۔ آؤٹ

پارٹی والے ابھی نہیں آئے تھے۔

اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے شاہد کو طلب کرنے کے لئے گھنٹی بجائی۔ شاہد خوفزدہ سا کمرے میں آیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی شامت آئی ہے۔

''تو تم سدھرو گے نہیں شاہد!''

''وہ سر......! میں ...... وہ بسوں میں بہت رش ہوتا ہے سر! میں نے پوری کوشش کی تھی۔''

''نہیں کی تھی۔'' عبدالحق میز پر ہاتھ مارتے ہوئے دہاڑا۔

''پوری کوشش کی ہوتی تو تم وقت سے پہلے یہاں پہنچ گئے ہوتے۔ میر صاحب کی طرح!''

''میں سچ کہہ رہا ہوں سر!''

''بسوں میں رش ہوتا ہے، دیر ہو جاتی ہے تو گھر سے جلدی نکلا کرو۔''

''یس سر!''

''پہلے میں ان کوتاہیوں کو نظرانداز کرتا رہا ہوں۔'' عبدالحق نے سنگین لہجے میں کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے کسی کو نقصان پہنچے۔ لیکن تم نے میری نرمی کا غلط مطلب لیا۔ تم بے حس آدمی ہو۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان دنوں آؤٹ والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے ہماری بے عزتی ہوگی۔''

''میں معافی چاہتا ہوں سر! آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''ہونا بھی نہیں چاہئے۔ اس میں تمہاری بہتری ہے۔''

''یس سر!''

''میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ اب اس کے بعد میں تمہیں کوئی موقع نہیں دوں گا۔'' عبدالحق نے کڑے لہجے میں کہا۔

''اگلی بار میں کوئی بات کئے بغیر تمہیں معطل کر دوں گا۔''

''اب ایسا نہیں ہوگا سر!''

اس کے جانے کے بعد عبدالحق کو تصور صاحب کا خیال آیا۔ وہ کتنے اچھے

تھے، کتنے ذمہ دار اور محبت سے کام کرنے والے۔ وقت نے انہیں کہاں سے اٹھا کر کہاں لا پھینکا تھا۔ لیکن وہ کوئی شکایت کئے بغیر پوری دیانتداری سے اپنا کام کر رہے تھے۔

اس نے سعید کو اندر بلا لیا۔

''تصور صاحب نے چھٹی کی درخواست دی تمہیں۔''

''جی سر!'' سعید نے دو درخواستیں ان کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے اوپر والی درخواست کو دیکھا۔ وہ تین دن کی چھٹی کے لئے تھی۔

''میں اس سے پہلے کی چھٹی کی بات کر رہا ہوں۔''

''جی سر! وہ تو جب انہوں نے آدھ دن کی چھٹی لی تھی تو جانے سے پہلے ہی اگلے دن کی چھٹی کی درخواست دے دی تھی۔ وہ بھی نیچے موجود ہے سر!''

عبدالحق پڑھے بغیر کبھی دستخط نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے پڑھے بغیر ہی دونوں درخواستوں پر منظوری کے دستخط کر دیئے۔ اسے حیرت ہو رہی تھی۔ اگر تصور صاحب سعید کو چھٹی کی درخواست دے کر گئے تھے تو جانے سے پہلے اسے انہوں نے کیا دیا تھا۔ کیا وہ چھٹی کی درخواست نہیں تھی۔

''مسئلہ کیا ہے میر صاحب کے ساتھ؟''

''آپ کو نہیں بتایا انہوں نے......؟''

''نہیں......!'' عبدالحق نے کہا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے درخواست میں وجہ پڑھی ہی نہیں۔ اور دستخط کر کے درخواستیں وہ سعید کی طرف بڑھا چکا تھا۔

''ان کی اہلیہ کی آنکھوں میں کوئی تکلیف تھی، جو بہت بڑھ گئی۔ خدانخواستہ بینائی تک جا سکتی ہے۔''

''اوہ......!'' عبدالحق کو یاد آیا کہ تصور صاحب نے اس صبح اسے بھی اپنی اہلیہ کی بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔

''تو اب کیا صورتِ حال ہے؟''

"آج آپریشن ہے سر! اللہ کرے، کامیاب ہو جائے۔ تین چھٹیوں کے ساتھ میر صاحب کو چوتھی چھٹی اتوار کی مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ۔"

اب عبدالحق کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔ وہ اس پر سوچتا رہا۔ تصور صاحب نے رقعہ اسے دیتے ہوئے التجائیہ انداز میں کہا تھا کہ گھر جا کر اسے پڑھ لیجئے گا۔ اس نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ وہ چھٹی کی درخواست ہوگی۔ اس لئے اس نے بے پروائی برتی۔ اور کچھ کام اور مصروفیت میں وہ سوچ بھی نہیں سکا، اور بھول گیا لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ تصور صاحب کو علاج کے سلسلے میں ضرورت رہی ہوگی۔ اور ضرورت بھی شدید ہوگی۔ اب زبان سے تو وہ کہہ نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اسے وہ رقعہ لکھ دیا ہوگا۔ بدقسمتی سے وہ اس نے پڑھا ہی نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ اس صبح وہ اس سے کیوں پوچھ رہے تھے کہ اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اور وہ حیران ہوا تھا کہ اس میں فیصلے کا پہلو کہاں سے نکل آیا۔ پھر جاتے جاتے انہوں نے پوچھا تھا۔ میرے لئے کیا حکم ہے بڑے صاحب! اب ان کی التجا، ان کا زخمی لہجہ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ اور اس نے بے پروائی سے کہا تھا کہ دوسری درخواست لکھ کر سعید کو دے دیں۔ اس پر وہ حیران بھی ہوئے تھے اور دکھی بھی۔ لیکن وہ ان کا دکھ اور ان کی حیرت نہیں سمجھ سکا تھا۔ پھر جب وہ جانے لگے اور اس نے چائے کے لئے کہنے کو انہیں پکارا تو انہوں نے کیسی امید اور تشکر سے اسے دیکھا تھا۔ اور اس کی چائے کی فرمائش سن کر وہ مایوس ہوئے تھے، اور دفتر سے چلے گئے تھے۔

مگر اس شام وہ دفتر سے نکلا تو اکیلے تصور صاحب باہر بیٹھے تھے۔ اس وقت انہوں نے اس سے کیوں نہیں کہہ دیا؟ جواب فوراً ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ زبان سے کہہ نہیں سکتے تھے، اسی لئے تو انہوں نے دو روز پہلے اسے اپنی ضرورت لکھ کر دی تھی۔ وہ کبھی رئیس تھے، ان کی زبان مدد کے لئے کیسے کھلتی۔

اور شاید کھل بھی جاتی۔ ضرورت بڑے بڑوں کو مجبور کر دیتی ہے۔ لیکن اس وقت اس کے ساتھ ایڈیٹر صاحب تھے۔ اور صبح وہ آفس ڈسپلن کے حوالے سے

تصور صاحب سے خاصی سختی سے بات کر چکا تھا۔ کوئی گنجائش ہی نہیں تھی بات کرنے کی۔ تصور صاحب کے خیال میں تو وہ ان کے رقعے کا جواب نفی میں دے چکا تھا۔

عبدالحق خود کو ملامت کرتا رہا۔ اس کا تاسف گہرا ہوتا گیا۔ تصور صاحب ایسے کہنے والے کہاں تھے۔ وہ تو اس نے دوبارہ انہیں جتا کر کہا تھا کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو تو وہ ایک بھائی کی طرح ان سے مدد طلب کر سکتے ہیں۔ اسی کے زور پر تو انہوں نے وہ رقعہ لکھا ہوگا اور جانے کس دل سے لکھا ہوگا۔

اور ان کا دل کیسے ٹوٹا ہوگا۔ عبدالحق کو اپنا دل لرزتا محسوس ہوا۔ اور نہ جانے کیا ہوا ہوگا، کیا ہو رہا ہوگا؟

پورے دن اس کا دل تصور صاحب میں اٹکا رہا۔ اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ کام کی طرف سے اس کے بے توجہی آؤٹ والوں نے بھی محسوس کر لی۔

شام کو عبدالحق نے ایڈیٹر صاحب سے کہا۔

"سوری! آج میں نہیں رک سکوں گا۔ مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔"

"عبدالحق صاحب! ہمیں ہفتے تک ہر حال میں کام مکمل کرنا ہے۔" ایڈیٹر صاحب بولے۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں کل اور پرسوں میں تلافی کر دوں گا۔ ہفتے تک انشاء اللہ کام مکمل ہو جائے گا آپ کا۔"

"دیکھ لیں، ہمیں بھی اپنے محکمے میں جواب دینا ہوگا۔"

"آپ بے فکر ہو جائیں۔ بس آج مجھے جانے دیں۔"

"چلیں.... ٹھیک ہے۔"

اس نے تصور صاحب کی سروس بک منگا کر اس میں سے ان کا پتا نوٹ کیا اور دفتر سے نکل آیا۔

"ہمیں ڈرگ روڈ چلنا ہے۔" گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے یعقوب سے کہا۔

"سر جی! میں تو ڈرگ روڈ پہلے بھی نہیں گیا۔" یعقوب نے اسے جتایا۔

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم کبھی بھی وہاں نہیں جا سکو گے۔" عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

"ویسے مجھے کچھ اندازہ ہے۔" عبدالحق کو یاد تھا کہ کراچی آنے پر عارف اسے ریسیو کرنے ائیر پورٹ آیا تھا۔ راستے میں اس نے ڈرگ روڈ کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ ائیر پورٹ کے قریب ہی کوئی علاقہ تھا۔

"چلیں سر! گاڈ از ماسٹر!" یعقوب نے ہمیشہ کی طرح انگریزی جھاڑی۔ وہ اب بھی اسی طرح انگریزوں کا فین تھا۔

ڈرگ روڈ پہنچنے میں تو زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن تصور صاحب کا گھر تلاش کرنا مسئلہ بن گیا۔ وہاں مکان نمبر ترتیب سے تھے نہیں، اس پر ستم یہ کہ اکثریت کچے مکانوں اور جھونپڑیوں کی تھی، جن پر نمبر بھی نہیں لکھے تھے۔ اگر پتے کے ساتھ "نزد شرف الدین کریانہ اسٹور" نہ لکھا ہوتا تو شاید وہ تلاش کر ہی نہ پاتے۔ بہرحال شرف الدین کریانہ اسٹور ڈھونڈنا بھی آسان نہیں تھا۔ جیسے تیسے پوچھتے پاچھتے وہ وہاں تک پہنچ ہی گئے۔

شرف الدین نے حیرت سے پہلے کار کو پھر باوردی یعقوب کو اور پھر عبدالحق کو دیکھا۔

"تصور میاں کو پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"جی ہاں!"

شرف الدین عقل مند آدمی تھے۔ انہوں نے پتا یعقوب کو سمجھایا۔ لیکن عبدالحق بھی سن کر ذہن نشین کرتا رہا۔

وہ پتا یعقوب کے لئے اتنا پیچیدہ تھا کہ شرف الدین کا بتایا ہوا پہلا موڑ مڑتے ہی اس نے گاڑی روکی اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا مسٹر جیکب!"

"سر! دِس بلڈی بھول بھلیاں۔ اب پتا نہیں، لیفٹ مڑنا ہے کہ رائٹ؟"

"تم بس میرے کہنے پر عمل کرتے رہو مسٹر جیکب!"

یعقوب نے گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔

"انگریز میں بڑی خوبیاں تھیں سر! اس نے کبھی ایسی بے نشاں بستیاں آباد نہیں کیں۔ نہ یہاں کوئی نمبر ہے، نہ بستی کا کوئی سر پیر۔ اٹ میری بل سر!"

"انگریز نے نہ کبھی ایسے آزادی حاصل کی، نہ ایسے اپنا وطن بنایا۔" عبدالحق نے حقارت سے کہا۔

"تم گاڑی چلاؤ یعقوب!"

یعقوب چوکنا ہوگیا۔ یعقوب کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل تھی کہ اب انگریزوں کی تعریف کرنا مخدوش ہوگا۔

کئی بار کی لیفٹ رائٹ کے بعد عبدالحق نے ایک کچے مکان کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

"یہی ہونا چاہئے تصور صاحب کا گھر۔"

اب وہاں اندھیرا ہوگیا تھا۔ گاڑی کے گرد بچے جمع ہوگئے۔ عبدالحق نے باہر اتر کر جائزہ لیا۔ مطلوبہ مکان کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ اس نے بچوں سے پوچھا۔

"تصور صاحب یہاں رہتے ہیں؟"

لیکن تصور صاحب کے نام سے کوئی بچہ واقف نہیں تھا۔ اور عبدالحق یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تصور صاحب کا گھر ہے۔ اس نے برابر والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، بچوں سے کہا۔

"اس گھر میں سے کسی کو بلا دو۔"

ایک بچے نے دوسرے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو نوید کا گھر ہے۔"

"نوید، اپنے ابو کو بلائیے ذرا۔"

نوید اپنے گھر چلا گیا۔ بچے حیرت اور خوشی سے کار کو دیکھتے رہے، جو ان کے لئے عجوبہ تھی۔

ایک منٹ بعد برابر والے مکان سے ایک ادھیڑ عمر شخص نوید کے ساتھ

نکلا۔ عبدالحق نے اسے سلام کیا۔ پھر پوچھا۔
''تصور صاحب، یہاں رہتے ہیں؟''
''وہی نا، جو کسٹم میں کام کرتے ہیں۔''
''جی ہاں!''
''یہ انہی کا گھر ہے۔''
''تو تالا کیوں لگا ہے یہاں؟''
''آج ان کی گھر والی کی آنکھوں کا آپریشن ہے۔''
''اور ان کے بچے؟''
''انہیں شاید کسی جاننے والے کے گھر چھوڑ گئے ہیں وہ۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ کہاں چھوڑا ہوگا۔''
عبدالحق نے ان کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔
''واپس چلو!'' اس نے یعقوب سے کہا۔
یعقوب نے سکون کی سانس لی۔
عبدالحق سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ تصور صاحب سے ملنا، ان کی ضرورت کے بارے میں پوچھنا اور ان کی مدد کرنا ضروری تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کراچی میں، آنکھوں کا ایک ہی اسپتال ہے۔ آپریشن وہی ہو رہا ہوگا۔ تصور صاحب وہیں ملیں گے۔

اب وہ مین روڈ پر تھے۔ عبدالحق نے یعقوب سے کہا۔
''لی مارکیٹ تو تمہیں معلوم ہے نا کہ کہاں ہے؟''
''یس سر! ویری ویل سر!''
''وہاں آنکھوں کا اسپتال دیکھا ہے؟''
''نو سر......!''
''خیر، تم لی مارکیٹ چلو۔ اور کل سے مجھے دفتر چھوڑ کر شہر میں گھومنا شروع کرو۔ اس وقت تک جب تک تمہیں پورے شہرے کے بارے میں معلوم نہ ہو جائے۔ یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ آدمی جس شہر میں رہے، اس کی بھی خبر نہ ہو

اسے۔'' عبدالحق چڑ چڑا ہو رہا تھا۔
یعقوب نے بھی ''یس سر!'' کہنے میں ہی عافی جانی۔ صاحب کو ایسے موڈ میں اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔
آنکھوں کے اسپتال پہنچنے میں بہر حال کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن تصور صاحب کا وہاں بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ یہ بات طے ہوگئی کہ تصور صاحب کی اہلیہ اس اسپتال میں نہیں ہیں۔
مگر ایک نرس کو تصور صاحب کا حلیہ سن کر یاد آ گیا۔
''وہ تو بہت پیچیدہ کیس تھا جناب!'' وہ بولی۔
''ڈاکٹر نے انہیں کہیں اور جانے کو کہا تھا۔ وہ آپریشن یہاں نہیں ہو سکتا تھا۔''

''کہاں......؟ مجھے بتائیے کہ وہ کہاں گئے ہوں گے؟''
''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔''
''کسی ڈاکٹر سے بات ہوئی تھی ان کی؟''
''ڈاکٹر جعفر سے۔''
''وہ کہاں ہیں؟''
''وہ تو کل سے گئے ہیں، دس دن کی چھٹی پر۔'' نرس نے جواب دیا۔ پھر اس کے اگلے سوال کو بھانپ کر پہلے ہی سے بولی۔
''وہ گھر پر بھی نہیں۔ چھٹیاں گزارنے شہر سے باہر گئے ہیں۔''
بات وہیں ختم ہوگئی۔ اب عبدالحق کے سامنے کوئی سراغ نہیں تھا۔
''اب گھر چلو!'' اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد یعقوب سے کہا۔
یعقوب نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔
وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ اس پر یہ تھکن اور ناکامی کی کوفت۔ کھانے کے بعد بمشکل اس نے نماز پڑھی اور سو گیا۔ نوربانو سے کچھ پوچھنے کا اسے خیال ہی نہیں رہا۔
اگلی صبح شاہد وقت سے پہلے دفتر آ چکا تھا۔ عبدالحق نے سعید کو اندر بلا لیا۔

''میر صاحب کی کوئی خیر خبر؟'' اس نے پوچھا۔

''اب تو پیر کو ہی کچھ معلوم ہو سکے گا سر!''

''ہو سکتا ہے، درمیان میں وہ ذرا دیر کے لئے آئیں۔ ایسا ہو تو مجھے فوراً بتانا۔ چاہے کوئی بھی بیٹھا ہو میرے کمرے میں۔''

''یس سر!''

''یہ بہت ضروری ہے سعید!''

''یس سر! وہ آئے تو میں آپ کو فوراً بتاؤں گا، اور انہیں آپ سے ملے بغیر نہیں جانے دوں گا۔''

''گڈ!''

لیکن اگلے دو دن بہت مصروفیت کے تھے۔ تصور صاحب آئے بھی نہیں، اور اسے ان کی طرف جانے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ ایڈیٹر صاحب سے وہ کام نمٹانے کا وعدہ جو کر چکا تھا۔ اب اس سے پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتا تھا۔

دونوں دن بہت دیر تک کام کرنے کے باوجود کام ختم نہیں ہو سکا۔ اس کے نتیجے میں اتوار کو بھی دفتر آنا پڑا۔ اتوار کی سہ پہر کام نمٹانے کے بعد وہ ایڈیٹر صاحب کے ساتھ الوداعی چائے پی رہا تھا۔ تھکن کے باوجود سب خوش تھے کہ کام وقت پر نمٹ گیا۔

''میں آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں عبدالحق صاحب!'' ایڈیٹر صاحب نے کہا۔

''آپ کے ساتھ کام کر کے خوشی ہوئی۔''

''ایسی کیا بات دیکھی آپ نے مجھ میں؟''

''لطف یہ ہے کہ آپ کو پتا ہی نہیں۔'' ایڈیٹر صاحب ہنسنے لگے۔

''آپ اس محکمے کے سربراہ ہیں۔ لیکن آڈٹ کے تمام عرصے میں عام اسٹاف کی طرح کام میں لگے رہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔''

''میرے خیال میں تو یہ میرا فرض تھا۔''

''ممکن ہے، ایسا ہو، لیکن میں نے تو کچھ اور ہی دیکھا ہے۔ یہ کام ماتحتوں

کو سونپ دیا جاتا ہے۔ میں نے کبھی کسی اسسٹنٹ کلکٹر کو اس کام میں دلچسپی لیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ تو بس ایڈیٹر سے پوچھ لیتے ہیں کہ کام کیسا چل رہا ہے۔ آفس ٹائم کے بعد ان کے رکنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔''

''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذمہ داری میری ہے۔ کمی بیشی کی جواب دہی بھی مجھے کرنی ہے، میرے ماتحتوں کو نہیں۔ بڑے عہدے کی ذمہ داری بھی تو ہوتی ہے نا۔ کوئی مسئلہ ہو، کوئی واؤچر غائب ہو یا کہیں کوئی گھپلا ہو تو مجھے اس کا جواب دینے کے لئے موجود ہونا چاہئے۔''

''کم از کم میں نے تو ایسا کوئی افسر نہیں دیکھا عبدالحق صاحب! بہرحال آپ کے ساتھ کام کرنا نیا اور اچھا تجربہ تھا۔ زندگی رہی تو اگلے سال پھر انشاء اللہ ساتھ کام کریں گے۔''

''انشاء اللہ!''

اس شام عبدالحق گھر پہنچا تو ہلکا پھلکا تھا۔ تھکن کے باوجود تازہ دم۔ کام مکمل کرنے کی خوشی نے تھکن کو جیسے مٹا ڈالا تھا۔ پھر اچانک اسے تصور صاحب کا خیال آیا۔ اس نے ان کے گھر جانے کا سوچا، لیکن اب کچھ فائدہ نہیں تھا۔ وہاں تو جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اور کل وہ دفتر تو آئیں گے ہی۔ لیکن وہ کم از کم اس رقعے کو تو تلاش کرے۔

اس نے نوربانو سے اس سلسلے میں استفسار کیا۔

''ہاں.....! نکلا تو تھا ایک کاغذ۔'' نوربانو نے بے پروائی سے کہا۔

''اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں نے کہاں رکھ دیا اسے۔''

''حالانکہ میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ دفتر کے کپڑوں میں سے کچھ نکلے تو سنبھال کر رکھو، بلکہ فوراً مجھے دو۔ کیونکہ وہ بہت اہم ہوگا، کسی کام کا ہوگا۔''

''ایسا کچھ نہیں تھا اس میں۔ نہ وہ کسی کام کا تھا، نہ اس کی کوئی اہمیت تھی۔'' نوربانو نے نخوت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے پڑھا تھا؟''

''ہاں، پڑھا تھا۔ لوگوں کو دنیا میں آپ سے بڑا کوئی بے وقوف نظر نہیں

آتا۔ جسے دیکھو، فقیروں کی طرح آپ سے مانگنے چلا آتا ہے۔ اور آپ کو بھی اس طرح بے وقوف بننا اچھا لگتا ہے۔''

عبدالحق کا غصے سے برا حال تھا۔ لیکن وہ خود پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم وہ کاغذ لا کر دو مجھے۔''

''کہا نا، مجھے یاد نہیں کہ کہاں رکھا ہے میں نے۔''

''تو ڈھونڈو اسے۔ حالانکہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔''

''تو پھر چھوڑیں نا اسے۔''

''تم نہیں جانتیں کہ کتنا بڑا ظلم سرزد ہوا ہے مجھ سے، اپنی نظروں میں گر گیا ہوں میں۔ کاش تلافی کی کوئی صورت نکل آئے۔'' عبدالحق کے لہجے میں تڑپ تھی۔

''تم وہ کاغذ فوراً تلاش کر کے دو مجھے۔''

نور بانو عبدالحق کے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ اس وقت صرف اس کی بات ماننے میں ہی عافیت ہے۔ پندرہ بیس منٹ کی جستجو کے بعد بہرحال وہ رقعہ اسے مل گیا اور اس نے وہ عبدالحق کو دے دیا۔

رقعے کی تہیں کھولتے ہوئے عبدالحق کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے رقعہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ لکھا تھا.....

''بڑے صاحب!

ایک ایسی مشکل میں ہوں کہ چپ رہے بھی نہیں بنتی اور کہا بھی نہیں جاتا۔ آپ نے کہا تھا کہ کوئی ذاتی پریشانی ہو تو بھائی کی حیثیت سے آپ کو ضرور بتاؤں۔ آپ نے اپنی حیثیت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ بس آپ کی بات سے ہی کچھ حوصلہ ہے۔ اب زبان سے کہنے کی تو ہمت نہیں کہ اللہ نے ہمیشہ اس سے بچائے رکھا۔ زبان تو کھل ہی نہیں سکتی۔ اس

لئے قلم کا سہارا لے رہا ہوں۔

میری اہلیہ کی آنکھوں میں کافی عرصے سے تکلیف تھی۔ دوا ڈالتے رہے، فرق نہیں پڑا۔ بلکہ تکلیف اور بڑھ گئی۔ اب آنکھوں کے اسپتال لے کر گئے تھے انہیں، ڈاکٹر نے چیک کیا اور کہا کہ یہ بڑی بیماری ہے۔ فوراً آپریشن نہیں کرایا تو خدانخواستہ بینائی جا سکتی ہے۔ اور وہ آپریشن اسپتال میں ممکن نہیں۔ انہوں نے ایک خاص ڈاکٹر کا کہا، بلکہ ان سے فون پر بات بھی کی۔ وہ مہنگے ڈاکٹر ہیں۔ آپریشن کی فیس اور دواؤں کا خرچ ملا کر آٹھ سو روپے کا تخمینہ دیا ہے انہوں نے۔ ہم تو اتنی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے جناب!

ایک وضاحت کرنا چاہتا ہوں بڑے صاحب! میں اس آپریشن کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تو اصولاً مجھے اس پر صبر کر لینا چاہئے۔ لیکن میرے پانچ بچے ہیں، جن میں سب سے بڑا آٹھ سال کا ہے اور سب سے چھوٹا ایک سال کا۔ میری اہلیہ ہی انہیں سنبھالتی ہیں۔ میں تو صبح کا نکلا غروب آفتاب کے بعد گھر میں گھستا ہوں۔ اگر خدانخواستہ میری اہلیہ بینائی سے محروم ہو گئیں تو سب الٹ جائے گا جناب! تب تو انہیں خود اس بات کی ضرورت ہوگی کہ کوئی ان کا خیال رکھے۔ اور بچے میرے بہت چھوٹے ہیں جناب! وہ تو خود اپنا اور ایک دوسرے کا خیال بھی نہیں رکھ سکتے۔ بس اس لئے مجبور ہو گیا ہوں۔

آپ سے امداد نہیں مانگتا۔ قرض مانگ نہیں سکتا کہ واپس دینے کی نہ سکت ہے نہ امکان۔ ایسے میں قرضِ حسنہ ہی مانگ سکتا ہوں آپ سے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ ساری زندگی سہی، تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کرتا رہوں گا، اور آپ کا

احسان مند بھی رہوں گا۔

اللہ سے دعا کی ہے اور امید ہے کہ آپ اس موقع پر میرا ہاتھ تھام لیں گے۔

آپ کا خادم ......!''

خط پڑھتے پڑھتے عبدالحق کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ احساسِ جرم سوا ہو گیا۔ کیا گزری ہوگی تصور صاحب پر۔ کیا کیا ہوگا انہوں نے۔ بہرحال اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی اہلیہ کو آپریشن کے لئے لے گئے تھے، اس کا مطلب تھا کہ کہیں سے رقم کا بندوبست ہو گیا تھا۔

لیکن اس معاملے میں اپنی غفلت اس کے لئے ناقابل معافی تھی۔ تلافی کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب وہ اللہ کو کیا جواب دے گا؟

''آپ اتنے غمزدہ کیوں ہو رہے ہیں؟ لوگ یوں ہی لوٹتے رہتے ہیں آپ کو۔'' نور بانو نے اسے چونکا دیا۔

عبدالحق تڑپ گیا۔

''تم نہیں جانتیں کہ تم کس کے بارے میں بات کر رہی ہو؟'' اس نے کہا۔ پھر اس نے نور بانو کو تصور صاحب کی کہانی سنائی۔

لیکن نور بانو پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

''یہاں کون ایسا ہے، جو لٹ کر نہیں آیا؟ جو زخم زخم نہیں۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

''لیکن کسی نے کسی پر احسان نہیں کیا یہاں آکر۔ جو آیا، اپنی مرضی سے اپنی خوشی سے آیا۔ کوئی ہندوستان مسلمانوں سے خالی تو نہیں ہو گیا۔''

''تم اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے نہیں آئیں۔ تم تو اپنے چچا جان کے پاس جانا چاہتی تھیں۔'' عبدالحق سے رہا نہیں گیا۔

''قدرتی بات تھی۔ چچا سے میرا خون کا رشتہ تھا۔ آپ تو غیر تھے۔ میں چچا جان کے سوا اور کس کا سوچتی؟''

عبدالحق اس وقت احساسِ جرم سے دوچار تھا۔ اگرچہ اپنی فطرت کے

مطابق وہ الزام پوری طرح اپنے سر لے رہا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ اس میں نور بانو کی بھی بڑی غلطی ہے۔ اور اب وہ جس بے رحمی سے بات کر رہی تھی، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس نے تصور صاحب کا رقعہ پڑھا اور جان بوجھ کر اسے نہیں دیا۔ کیونکہ اس کے خیال میں تصور صاحب اسے لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بات، یہ انداز اس کی بیوی کے شایانِ شان نہیں تھا۔

جھنجلاہٹ میں اس نے دوسرا وار بھی کر دیا۔

''انہی چچا جان کی بات کر رہی ہو نا، جنہوں نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جنہوں نے تم پر تہمت بھی لگائی۔ مجھ سے منسوب کر کے۔''

نور بانو کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''آپ مجھے طعنہ دے رہے ہیں؟'' اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اذیت بھی۔

''نہیں! میں تمہیں یاد دلا رہا ہوں۔''

نور بانو نے اپنا سب سے موثر ہتھیار استعمال کیا۔ وہ رونے لگی۔

لیکن اس روز اس کے آنسو بھی کام نہ آئے۔ عبدالحق نے بے رخی سے کہا۔

''کاش، یہ آنسو ندامت کے، افسوس کے ہوتے، تم نے سمجھا بھی نہیں کہ تم نے کتنا برا کیا... کتنا ظلم کیا۔''

''میں کیوں نادم ہوں؟'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''میں نے وہی کیا، جو مجھے کرنا چاہئے تھا۔ آپ کو بے وقوف بننے دوں؟''

''میں تمہیں ضرور بتاؤں گا کہ تمہیں کیوں نادم ہونا چاہئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں نے ابتداء ہی سے تم میں سخت دلی بھی دیکھی اور تنگ نظری بھی۔ میں نے تمہیں سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ تمہارے پاس کوئی جواز بھی نہیں تھا۔ لیکن تمہارے اس مزاج سے گھر میں کوئی بھی محفوظ نہیں رہا۔ ننھے ساجد سے لے کر اماں

تک، تمہاری سوچ یہی رہی کہ مجھ پر، میری ہر چیز پر تمہارے علاوہ کسی کا حق نہیں۔ محبت ہے تو میں نے اسے بھی قبول کر لیا۔ لیکن محبت ہی کی وجہ سے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ اس مزاج کی وجہ سے تم خوفِ خدا سے دور ہوگئی ہو۔ اس میں تمہارا ہی نقصان ہے۔“

”آپ میرے بارے میں اتنا بڑا اعلان کر رہے ہیں؟“

”ثبوت سامنے ہے۔ تصور صاحب بڑے بچے اور عزت دار آدمی ہیں۔ میں نے ہمت دلائی تھی تو ان کی اتنی ہمت ہوئی، وہ بھی زبانی نہیں، لکھ کر۔ ورنہ وہ کسی سے سوال کرنے والے نہیں۔ بہت بڑی ضرورت تھی ان کی۔ تم نے یہ رقعہ چھپا کر ان پر اور مجھ پر ہی نہیں، خود پر بھی ظلم کیا۔ اللہ کی شان کہ اس نے ان کے لئے تو بندوبست کر دیا۔ ان کا تو کام ہوگیا اللہ کے فضل سے۔ نقصان تو میرا اور تمہارا ہوا۔“

”لو..... کیا نقصان ہوگیا ہمارا؟“

”یہ اور بڑا نقصان ہے کہ تم اسے نقصان ہی نہیں سمجھتیں۔ دیکھو سچ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اللہ کا دیا ہوا، اللہ کی امانت ہے، اس نے ہمیں استطاعت دی تو ہمارا فرض ہے کہ کسی کو پریشان دیکھیں تو اس کی مدد کریں۔ دولت جمع کرنے کی، محبت کرنے کی چیز نہیں۔ اسے تو اللہ کی راہ میں، اس کی خوشی کے لئے خرچ کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور یاد رکھو نوربانو! اللہ جب چاہے، اپنی عطا کی ہوئی کوئی نعمت بھی واپس لے سکتا ہے۔ دولت بھی ان نعمتوں میں سے ایک ہے۔ اور دولت کا حساب بھی دینا ہوتا ہے آپ کو۔“

”تو آپ کی طرح آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانی چاہئے سب کو؟“ نوربانو نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”تم کیوں غم کرتی ہو؟ تمہارے نکتہ نظر سے بھی یہ دولت میری ہے، تمہاری نہیں۔“

”تو آپ کی ہر چیز میری ہی تو ہے۔ آپ نے تو مجھے باہر ہی کر دیا۔“

”اللہ کو حساب مجھے دینا ہوگا تو دولت میری ہی ہوئی نا! تمہاری ہوتی تو

تمہیں فکر ہوتی جواب دہی کی۔“

”عجیب منطق ہے آپ کی۔“ نوربانو جھنجلا گئی۔

”تم میری بات غور سے سنو۔ ایک تو اس معاملے میں تم نے تنگ دلی اور سخت دلی کا مظاہرہ کیا۔ دوسرے تم نے خیانت بھی کی۔“

”آج آپ کو مجھ میں ایک دم اتنی خرابیاں نظر آنے لگیں؟“

”پہلے بھی نظر آتی تھیں، مگر میں چشم پوشی کرتا تھا۔ اب احساس ہوا ہے کہ میں تو محبت کے نام پر تمہیں نقصان پہنچا رہا ہوں۔ یہ تو محبت کے منافی ہے۔ اس لئے تمہیں سمجھا رہا ہوں۔“

”یہ بتائیں، خیانت کیا کی ہے میں نے؟“

”وہی تو بتا رہا ہوں۔ میری جیب میں سے کچھ نکلے تو تمہاری ذمہ داری ہے کہ وہ مجھے دو۔ وہ دفتر کی کوئی اہم دستاویز بھی ہو سکتی تھی۔“

”نہیں تھی نا، میں نے پڑھ لیا تھا۔“

”یہ بھی ایک خیانت ہے۔ بہت بری بات ہے۔ تمہیں اسے پڑھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔“

”آپ تو آج مجھ سے ہر حق چھین رہے ہیں۔“

”نہیں! تمہیں تمہاری حدود سمجھا رہا ہوں۔ اب میں سختی سے کہہ رہا ہوں کہ آئندہ ایسا کبھی نہ کرنا۔ میری جیب سے کچھ نکلے تو مجھے دو۔ اور میری دولت کی طرف سے تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اس رات عشاء کے بعد اس نے توبہ کے لئے دو نفل پڑھے، اور اللہ سے اپنی مجرمانہ غفلت اور بے پرواہی پر رو رو کر بخشش کی دعا کی۔ بالآخر اس کے دل کو قرار آ گیا۔ ورنہ وہ شاید سکون سے سو بھی نہ پاتا۔

اگلی صبح وہ صور صاحب کا انتظار کرتا رہا۔ کافی دیر ہوگئی۔ لیکن وہ نہیں آئے۔ اسے لگا کہ وہ آج بھی چھٹی کریں گے۔ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ مایوس ہوگیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے کہا۔

"کم آن!"

اور تصور صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ عبدالحق انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

"آئیے میر صاحب! کب سے آپ کا انتظار کر رہا ہوں میں۔ اب تو مجھے لگ رہا تھا کہ آپ نہیں آئیں گے۔"

تصور صاحب اس کے سامنے مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھئے نا!"

"نہیں بڑے صاحب! میرا یہ مقام نہیں۔"

"میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا!"

"آپ نہیں سمجھتے بڑے صاحب! میں ایک مجرم کی حیثیت سے آپ کے رو بہ رو کھڑا ہوں۔"

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے خوش دلی سے کہا۔

"تب تو میرا حکم ماننے میں آپ کو تامل نہیں ہونا چاہئے۔"

تصور صاحب ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

"میں اعترافِ جرم کے لئے اور سزا کے لئے حاضر ہوا ہوں جناب!"

"سب سے پہلے آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپریشن ہو گیا؟ کامیاب رہا؟"

"جی...... ! اللہ کے فضل سے کامیاب رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا تو یہی کہنا ہے۔ اب چار دن بعد پٹی کھلے گی تو پتا چلے گا۔"

"اب میں پہلے صفائی پیش کروں۔ آپ کا دل تسلیم کرے تو مجھے معاف کر دیجئے۔"

"ایسی باتیں نہ کیجئے جناب! مجرم تو میں ہوں اور خود کو سزا کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ میں بدترین سزا کا حق دار ہوں جناب!"

"آپ پہلے میری بات سنئے!" عبدالحق نے کہا اور پھر ان کے رقعے کے بارے میں گزشتہ رات تک کی تفصیل سنا دی۔

"اب میں آپ سے کس منہ سے کہوں کہ مجھے معاف کر دیں۔ ویسے تو

اس نیکی سے محروم ہونا بھی میرے لئے بڑی سزا ہے۔ لیکن آپ معاف نہیں کریں گے تو اللہ بھی مجھے معاف نہیں کرے گا۔"

"آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ مجھ سے معافی مانگیں۔ لیکن میں سچ مچ بڑا مجرم ہوں جناب! آپ میرا اعترافِ جرم تو سن لیں۔" یہ کہتے کہتے تصور صاحب رونے لگے۔

عبدالحق کو پہلی بار احساس ہوا کہ کوئی بڑی بات ہے۔ تصور صاحب کو اس نے پہلی بار روتے دیکھا تھا۔

"دیکھیں تصور صاحب! اب میں آپ کا افسر ہونے کے ناطے آپ کو حکم دے رہا ہوں کہ آپ مجھے ترتیب اور تفصیل سے سب کچھ بتائیے۔ یہ فیصلہ میں کروں گا کہ آپ مجرم ہیں یا نہیں۔ آپ خود فیصلہ نہ کریں۔"

"میں مجرم ہوں صاحب! آپ کا مجرم کہ آپ کے اعتبار کو ٹھیس پہنچائی میں نے۔ سرکار کا مجرم کہ میں نے خیانت کی، بددیانتی کی۔"

عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔

"آپ میری نافرمانی کر رہے ہیں میر صاحب!" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"میں نے کہا کہ آپ شروع سے سب کچھ بتائیں۔"

تصور صاحب نے گہری سانس لی۔

"ٹھیک ہے بڑے صاحب! لیکن اس سے میرے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوگی۔"

"آپ اس وقت سے سب کچھ بتائیں، جب میں نے نادانستگی میں، اپنی غفلت اور بے پروائی کی وجہ سے آپ کو مایوس کیا۔"

"میں اس صبح آپ کے پاس بڑی امید سے، بڑے یقین کے ساتھ آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا رقعہ آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ اور مجھے آپ کے کہے ہوئے لفظ بھی یاد تھے کہ آپ صاحب حیثیت بھی ہیں، اور ذاتی پریشانی میں بھائی کی حیثیت سے کام آئیں گے۔ لیکن جب آپ نے مجھ پر عنایت کرنے کے بجائے ڈسپلن کے معاملے میں سرزنش کی تو میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ پھر

بھی میں نے آپ کو یاد دلانے کی غرض سے پوچھا۔ میرے لئے کیا حکم ہے
صاحب! اور آپ نے فرمایا کہ دوسری درخواست لکھ کر سعید صاحب کو دے دوں۔
میں نے سوچا، شاید آپ میری گزارش پر سرکاری طور پر کارروائی کرنا چاہتے ہیں۔
میری تنخواہ اتنی کم ہے اور جی پی فنڈ بھی اتنا نہیں۔ سرکاری طور پر میری ضرورت
پوری ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

میں مایوس ہوگیا صاحب! اہلیہ کی آنکھوں کی بڑی اہمیت تھی۔ چھوٹے
چھوٹے بچے، اور میری دن بھر کی مصروفیت، گھر چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اللہ مجھے
معاف کرے، شاید اسی لئے کہا گیا ہے کہ مایوسی کفر ہے۔ میں نے اللہ سے مانگنے
کے بجائے خود کچھ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور یوں وہ کچھ ہوگیا، جس پر اپنی جان کی
روح بھی تڑپ رہی ہوگی۔ میں نے بہت برا کیا بڑے صاحب! اب اس داغ کو
دھو بھی نہیں سکتا میں۔'' اتنا کہہ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عبدالحق کرسی سے اٹھا، گھوم کر ان کی طرف گیا اور ان کے دونوں کندھے
تھام لئے۔

''ہر داغ دھل جاتا ہے میر صاحب! آپ مجھے بتائیں تو سہی کہ ایسا کیا
کر دیا آپ نے؟''

''جو کچھ کیا، اس کے بارے میں سوچنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔ صرف اس
لئے سنا سکوں گا کہ آپ کے پاس آیا ہی اعترافِ جرم کے لئے ہوں۔'' تصور
صاحب نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

عبدالحق کمرے سے باہر گیا اور شاہد سے ایک گلاس پانی طلب کیا۔

''کمرے میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔''
اس نے سعید سے کہا۔ دروازہ بند کر کے وہ کمرے میں واپس آیا اور بڑے احترام
سے تصور صاحب کو پانی پیش کیا۔

''لیجئے! اور خود کو سنبھالئے۔ کوئی بات بھی بہت بڑی نہیں ہوتی۔ ابھی آپ
نے کہا کہ مایوسی کفر ہے۔ بے شک کفر ہے، اس لئے کہ اس کا مطلب ہے کہ آپ
نے اللہ سے بھی اُمید چھوڑ دی۔ ورنہ اللہ نے تو توبہ کا دروازہ سب کے لئے کھلا رکھا

ہے۔ بدترین گناہ بھی دھل جاتا ہے۔''

تصور صاحب نے بڑی مشکل سے دو گھونٹ پانی لیا اور پھر گلاس میز پر
رکھ دیا۔

عبدالحق نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اعتراف تصور صاحب کے لئے کتنا مشکل
ہے۔ اس نے اسے آسان کرنے کی کوشش کی۔

''میں شرمندہ ہوں میر صاحب! کہ نادانستگی میں اپنے قول سے انحراف
کیا۔ اس وقت میں آپ کا بھائی نہیں بن سکا۔ لیکن اس وقت میں آپ کا افسر نہیں،
بھائی ہوں۔ اس لئے اس کرسی پر بیٹھ کر نہیں، آپ کے برابر، آپ کے ساتھ بیٹھ کر
آپ کی بات سنوں گا۔ ایک بھائی کی حیثیت سے۔''

تصور صاحب نے سر اٹھا کر متشکرانہ نظروں سے اسے دیکھا، مگر فوراً ہی
نظریں جھکا بھی لیں۔

''اب بے فکری سے بتائیے، ایسا کیا سرزد ہوگیا آپ سے؟''

''وہ جناب! اصغر ٹیکسٹائل کی ایک فائل ہے، جس پر ویلیویشن والوں نے
گیارہ ہزار سات روپے کی ڈیمانڈ نکالی ہے۔ انہیں فائنل ریمائنڈر دیا جا چکا ہے،
اور اب وصول کے لئے کیس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو بھیجا جانے والا ہے۔''

عبدالحق کو یاد تھا۔ آؤٹ پارٹی کے آنے سے پہلے اس نے خود فائل پر یہ
آرڈر کیا تھا۔

''جی.... ! مجھے یاد ہے۔'' اس نے کہا۔

''ان کے نمائندے ہیں نا جعفر صاحب! انہوں نے مجھ سے تین چار ماہ
پہلے کہا تھا کہ میں وہ فائل انہیں دے دوں تو وہ مجھے ایک ہزار روپے دیں گے۔ میں
نے انہیں بہت ڈانٹا اور منع کر دیا۔ یہاں ساری چابیاں میرے پاس رہتی ہیں۔ میں
نے سوچا، میرے انکار کے بعد وہ کسی اور سے بھی بات کر سکتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم
کے لئے تو کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اور ذمہ داری میرے سر آئے گی۔ اس خال
سے میں نے اس پوری فائل کی کاپی بنوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی۔''

''واہ......! کمال کر دیا آپ نے۔'' عبدالحق نے بے ساختہ کہا۔ ایک

چڑا اسی سے اتنی ہوشیاری کی امید نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

"آپ زوال کی سینے بڑے صاحب! اس روز مایوس ہوا تو میں نے دفتر لاک کرتے ہوئے وہ فائل نکالیا اور جعفر صاحب کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے فائل لی اور وعدے کے مطابق ایک ہزار روپے مجھے دے دیئے۔ گھر جاتے ہوئے میں سوچتا اور لرزتا رہا کہ میں نے کیا کر دیا۔ لیکن اہلیہ کی صورت نگاہوں میں پھر جاتی تھی۔ اگلے روز میں اہلیہ کو آپریشن کے لئے لے گیا۔ یہ سنگین جرم کیا ہے میں نے بڑے صاحب!"

عبدالحق نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

"اس معاملے میں آپ سے بڑا مجرم میں ہوں میر صاحب! یہ سب میری غفلت اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے ہوا۔"

"آپ مجھے ڈس مس کر دیں صاحب! میں نے رشوت لی ہے۔ اپنے ابی جان کی روح کو شرمندہ کرایا ہے۔"

"اللہ پردہ رکھنے والا ہے میر صاحب! یہ تو مجھے اپنے جرم کی تلافی کا موقع ملا ہے۔ سرکاری رقم میں خود جمع کرا دوں گا آپ فکر نہ کریں۔"

"اس کی ضرورت نہیں بڑے صاحب! میں آج صبح جعفر صاحب کو وہ ہزار روپے واپس کر آیا ہوں۔"

حیرت سے عبدالحق کا منہ کھل گیا۔

"کیسے میر صاحب......!"

"اس روز میں نے ایک نہیں، دو بے ایمانیاں کی تھیں بڑے صاحب!" تصور صاحب نے پشیمانی سے کہا۔

"ایک تو میں نے ہزار روپے رشوت لی۔ پھر گھر جاتے ہوئے جب ضمیر کچوکے لگا رہا تھا تو مجھے اچانک یاد آیا کہ میرے پاس اس فائل کی کاپی موجود ہے۔ میں نے سوچا، میں سرکاری رقم ڈوبنے نہیں دوں گا۔ آپریشن کے بعد وہ کاپی آپ کو دے دوں گا۔ اور میں سوچتا رہا کہ یہ دوسری بے ایمانی تو نیکی ہے۔ حالانکہ بے ایمانی کبھی نیکی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو دھوکا دہی بھی ہے۔ یہ وہ فائل ہے صاحب!" تصور

صاحب نے ہاتھ میں موجود فائل عبدالحق کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے فائل میں دلچسپی نہیں لی۔

"یہ بتایئے! آپ نے ہزار روپے جعفر صاحب کو واپس کیسے کئے؟"

"اللہ بڑا کارساز ہے بڑے صاحب! میں اہلیہ کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ باہر بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ ابی جان کے ایک بہت عزیز دوست وہاں آ گئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ حال احوال پوچھا۔ میری پریشانی کا سن کر افسردہ ہوئے۔ پھر بولے۔ اجازت ہو تو میں ڈاکٹر صاحب سے پہلے مل لوں، مجھے تو چھوٹا سا کام ہے۔ میں نے کہا، بسر وچشم۔ وہ اندر گئے، دو منٹ میں واپس آئے اور دعائیں دے کر رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد میں ڈاکٹر سے ملا۔ انہوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پیسے جمع کرانے کو کہا تو انہوں نے منع کر دیا، کہنے لگے کہ دواؤں سمیت سب کچھ کلینک کے ذمے ہے۔ میں نے کہا کہ مجھے تو کچھ اور بتایا گیا تھا۔ وہ بولے، کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا صاحب! لیکن میرا احساسِ جرم اور بڑھ گیا کہ میں نے بلاوجہ رشوت لی۔ خیر، آپریشن ہوا اور کامیاب رہا۔ اہلیہ پٹی کھلنے تک اسپتال میں ہی رہیں گی۔ ہمارا تو ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ آج میں جعفر صاحب کے دفتر گیا اور ہزار روپے واپس کئے۔ وہ کہنے لگے، اس کی کیا ضرورت ہے، فائل تو میں پھاڑ چکا ہوں۔ میں نے کہا، مجھے معلوم ہوا ہے کہ فائل کی کاپی موجود ہے۔ ادائیگی تو آپ کو کرنی پڑے گی۔ پھر انہوں نے وہ رقم واپس لے لی۔ اور یہ فائل کی کاپی اب آپ کو تحویل میں ہے۔"

عبدالحق حیران بیٹھا تھا۔

"تو آپ نے جرم کیا کیا ہے میر صاحب!" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"رشوت بھی لی، کسی کو دھوکا بھی دیا۔ یہ جرم ہی تو ہیں بڑے صاحب!"

مگر عبدالحق کو کوئی اور بات رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ پھر وہ اس کے شعور تک پہنچ ہی گئی۔

"یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ڈاکٹر مہربان کیسے ہو گیا۔ اس کا اپنی فیس چھوڑنا تو

سمجھ میں آتا ہے، لیکن ......"

"میں آپ کو بتانا بھول گیا تھا۔ نرس نے اسی دن مجھے بتا دیا تھا۔ وہ جو ابی جان کے دوست تھے نا، وہ ڈاکٹر صاحب ان کے بیٹے ہیں۔ انہوں نے اندر جا کر ڈاکٹر صاحب کو سمجھا دیا تھا۔ بعد میں وہ میری اہلیہ کی عیادت کے لئے بھی آئے۔ اللہ بڑا کارساز ہے صاحب!"

"بے شک......!" عبدالحق نے افسردگی سے کہا۔

"اب میرے لئے کیا حکم ہے صاحب!"

"کچھ نہیں! ابھی آپ کی اہلیہ اسپتال میں ہیں۔ ان کے ٹھیک ہو کر گھر جانے تک میری طرف سے آپ کو چھٹی۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہیں صاحب!" تصور صاحب نے حیرت سے کہا۔

"میں اعترافِ جرم کر چکا۔ میرا جرم ثابت ہے۔ آپ کو تو مجھے ڈس مس کرنا چاہئے۔"

"نہیں میر صاحب! سرکار کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ رقم آپ نے واپس کر دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ آپ کے ساتھ ہے اور اس نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ پھر میں کون ہوتا ہوں آپ کو سزا دینے والا۔"

"لیکن صاحب......!"

"دیکھئے میر صاحب! یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا، تب بھی میں آپ کو سزا نہ دیتا۔" عبدالحق نے ان کی بات کاٹ دی۔

"بلکہ سچ کہوں، میں سوچتا ہوں کہ کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ کاش، آپ نے فائل کی کاپی بھی نہ بنائی ہوتی۔"

"اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوتا بڑے صاحب!"

"کوتاہی میری تھی۔ میں آپ کا مجرم تھا۔ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو مجھے تلافی کا موقع مل جاتا۔"

"میں سمجھا نہیں بڑے صاحب!"

"میں خود وہ رقم سرکار کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا۔ کیونکہ میری بے

پرواہی اور غفلت کی وجہ سے یہ نوبت آئی۔"

"اللہ نے آپ کو بڑا آدمی بنایا ہے بڑے صاحب!"

"نہیں میر صاحب! میں تو یہ سوچ کر پریشان ہو رہا ہوں کہ اللہ مجھ سے جواب طلب کرے گا کہ میں نے اس کے ایک نیک بندے کو برائی کی طرف دھکیل دیا۔ جبکہ میں اس کی مدد کر کے اسے بچا سکتا تھا۔ اللہ آپ سے خوش ہے میر صاحب کہ اس نے آپ کو بچا لیا اور آپ کے سارے کام سیدھے کر دیئے۔"

"بے شک بڑے صاحب!"

"اور اللہ یقیناً مجھ سے ناراض ہے، کیونکہ اس نے مجھے تلافی کا موقع بھی نہیں دیا۔"

"تو بڑے صاحب! آپ میرے خلاف کارروائی نہیں کریں گے؟" تصور صاحب نے پوچھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

تصور صاحب رونے لگے۔

"آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے صاحب! میری عزت رکھ لی، میرا پردہ رکھ لیا۔" انہوں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"اب ایک احسان اور کر دیجئے مجھ پر۔"

"آج آپ کا حق ہے کہ آپ مجھے حکم دیں۔"

تصور صاحب نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"مجھے گناہ گار نہ کریں۔"

"آپ کہیں نا، کیا بات ہے؟ کیا چاہتے ہیں آپ؟" عبدالحق کے لہجے میں عاجزی تھی۔

تصور صاحب نے جیب سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔

"میرا استعفیٰ آج ہی منظور کر لیں، یہ آپ کا احسانِ عظیم ہوگا مجھ پر۔"

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

''یہ کیوں میر صاحب!''

''اللہ نے اور آپ نے میرا پردہ رکھ لیا۔ لیکن میں تو سب جانتا ہوں۔ میں اپنی نظروں میں گر چکا ہوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ میں اس ملازمت کا اہل نہیں ہوں۔ یہ ملازمت تو پل صراط ہے صاحب!''

''آزمائشیں آتی ہیں میر صاحب! اللہ ان سے گزار دیتا ہے بندے کو۔ میری مانیں، آپ ایسا نہ کریں۔''

''نہیں بڑے صاحب! اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔ یہاں سر اٹھا کر نہیں چلا سکتا اب۔ اور جہاں سر جھک جائے، آدمی کو وہاں سے چلے جانا چاہئے۔'' تصور صاحب نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے اور رونے لگے۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو بولے۔

''مجھے معلوم ہے کہ استعفیٰ فوری طور پر منظور ہونے کی صورت میں میری پندرہ دن کی تنخواہ کٹے گی۔ لیکن صاحب! آپ آج ہی، ابھی میرا استعفیٰ منظور کر لیں۔ یہ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔''

عبدالحق حیران تھا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اور وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر سکتا۔ اس عالم میں کہ ان کی بیوی ابھی اسپتال میں ہے، وہ اپنے قلم سے انہیں بے روزگار کیسے کرے۔

''میری بات مانیں میر صاحب! جانے دیں.....''

''نہیں بڑے صاحب! میں جانتا ہوں کہ میں نے گناہ کیا، یہ اس کی عملی توبہ ہے۔''

''لیکن آپ بے روزگار ہو جائیں گے۔''

''ہم بھول گئے تھے بڑے صاحب! کہ اللہ بندوں کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے، اس لئے بھٹک گئے تھے۔ اللہ نے کرم فرمایا، ہمیں یاد دلا دیا کہ اس نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

''اچھا تو ایسا ہے کہ میں آپ کے لئے کسی ملازمت کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''نہیں صاحب! بس آپ میرا استعفیٰ منظور کر لیں۔ ابھی دستخط کر دیں۔''

عبدالحق نے دستخط کر دیئے۔ اس کے اصرار کے باوجود تصور صاحب نے اس سے کچھ لینے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے پریشان اور دکھی چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ بہت بوجھل ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس معاملے میں اسے بہت بڑا خسارہ ہوا ہے۔

لیکن تصور صاحب کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

چوتھے دن اچانک سلطان صاحب اس سے ملنے کے لئے آ گئے۔ عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ وہ انہیں ان کے ایکسپورٹ کے کاروبار کے سلسلے میں مکمل مشورے دے چکا تھا

''کہئے.....! کیسے زحمت کی آپ نے .....؟ کوئی دشواری پیش آ رہی ہے.....؟''

''جی نہیں.....! آج تو میں ذاتی کام سے آیا ہوں۔''

''حکم کیجئے.....!''

''میر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی آپ کی.....؟''

''کون میر.....؟'' کہتے کہتے عبدالحق کو اچانک یاد آ گیا۔

''جی ہاں.....! ہوئی تھی۔''

''آپ نے میرا پتا اور فون نمبر دیا تھا انہیں.....؟''

''جی ہاں.....!''

''انہوں نے رابطہ نہیں کیا مجھ سے۔'' سلطان صاحب کے لہجے میں افسردگی تھی۔

''اب آئیں تو ان سے کہئے گا کہ خدا کے واسطے، مجھے بس ایک فون کر لیں۔ میں خود ان کے پاس حاضر ہو جاؤں گا۔''

''اب وہ یہاں نہیں آئیں گے سلطان صاحب!''

''کیا مطلب.....؟ کیوں .....؟''

''میر صاحب یہاں نوکری کرتے تھے۔ چار روز پہلے استعفیٰ دے کر چلے

گئے۔"

سلطان صاحب کو جیسے کرنٹ لگا۔

"نوکری...... یہاں......؟ کیسی نوکری......؟"

"اب آپ کو بتا ہی دوں، وہ یہاں چپڑاسی تھے۔" عبدالحق نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

اگلا لمحہ اس کے لئے حیرت کا تھا۔ سلطان صاحب بیٹھے بیٹھے اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

عبدالحق بوکھلا گیا۔

"کیا ہوا سلطان صاحب!"

لیکن لگتا تھا کہ سلطان صاحب کو خود پر قابو نہیں ہے۔ وہ خاموش بیٹھا انہیں تکتا رہا۔ وہ سر جھکائے روتے رہے۔

بالآخر انہوں نے سر اٹھایا اور شرمندگی سے عبدالحق کو دیکھا۔

"ہو کیا گیا تھا آپ کو......؟" عبدالحق نے پوچھا۔

"میں مر بھی جاتا تو کم تھا عبدالحق صاحب! جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ لعنت ہو میری زندگی پر۔ میں اور میرے بیوی بچے عیش کریں اور میرے شہزادے، میرے میر صاحب چپڑاسی کی ملازمت کریں۔ لوگوں کے چائے پانی کا اہتمام کریں۔ اب میں سمجھا کہ اس روز وہ مجھے پہچان کر چلے کیوں گئے تھے؟ وہ نہ جاتے تو انہیں چائے پیش کرنی پڑتی مجھے۔ یہی بات ہے نا......!"

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تف ہے مجھ پر...... میری زندگی پر۔"

"اس میں آپ کا کیا قصور......؟"

"اس دن نہیں بتائی تھی، آج میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں۔" سلطان صاحب نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اللہ جنت نصیب فرمائے بڑے میر صاحب کو۔ میں ان کی جاگیر کا منتظم

تھا، منیجر۔ سب کچھ انہوں نے مجھے سونپ رکھا تھا۔ جب پاکستان جانے کا وقت آیا تو میں نے انہیں سمجھایا کہ زمینوں کے کاغذات لے لیں، اور زیورات اور نقد رقم بھی ساتھ رکھ لیں۔ انہوں نے پرواہی سے کہا...... سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا، جب لاد چلے گا بنجارہ۔ مال ساتھ لے کر نکلوں گا تو لٹنے کا خطرہ اپنی جگہ، مال کی وجہ سے جان بھی جائے گی۔ اللہ نے یہ سب کچھ دیا تھا۔ وہ چاہے تو وہاں بھی دے دے گا۔ اور رہے زمینوں کے کاغذات، تو ہم وہاں پاکستان کی محبت میں جا رہے ہیں۔ قیمت وصول کر لی تو محبت کہاں رہی۔ مجھے ان سے اختلاف تھا عبدالحق صاحب! لیکن قائل کرنے کی حیثیت نہیں تھی میری۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ کاغذات، نقدی اور زیورات، سب لے کر نکلوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے ساتھ نہیں نکلا۔ میں ان کے بعد روانہ ہوا۔ اللہ کا کرم کہ میں بخیر و عافیت پاکستان پہنچ گیا۔ یہاں آ کر کاغذات کے زور پر تین کوٹھیاں اور اراضی حاصل کی۔ دولت بھی بہت تھی۔ لیکن اس دولت کے مالک موجود نہیں تھے۔ میں انہیں تلاش کرتا رہا۔ لیکن کوئی سراغ نہیں ملا۔ میں بے چین رہتا تھا۔ دل کو سکون نہیں تھا۔ پھر اس روز آپ کے دفتر میں چھوٹے میر صاحب کو دیکھا تو قرار آ گیا۔ سوچا، اب ان کی ہر امانت انہیں سونپ کر پھر ان کی غلامی میں جیوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آپ کے پاس آئیں گے، آپ انہیں میرا پتا دیں گے، وہ مجھے فون کریں گے اور میں ان کی قدم بوسی کے لئے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ لیکن اتنے دن ہو گئے، کچھ بھی نہیں ہوا۔ آخر پریشان ہو کر آپ کے پاس چلا آیا۔"

اس دوران تصور صاحب پر کیا گزری، یہ احوال عبدالحق نے انہیں سنایا۔

وہ تڑپ گئے۔

"خدا کے لئے، مجھے ان کا پتا دے دیجئے۔"

"میرے ڈرائیور نے ان کا گھر دیکھا ہے۔ وہ آپ کو لے جائے گا۔"

"بہت شکریہ......!" سلطان صاحب اٹھنے لگے۔

"اب ایسا کیا، چائے پی کر جائیے گا۔"

"اتنا کچھ ہونے کے بعد میں کیسے......"

"آدھے گھنٹے کا ہی تو فرق پڑے گا ..... میری خاطر ....."

سلطان صاحب انکار نہ کر سکے۔ وہ چائے کے لئے رک گئے۔

"دیکھا عبدالحق صاحب! کردار اسے کہتے ہیں۔" انہوں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"خود کو سزا دینے کے لئے بے روزگاری قبول کر لی۔"

"جی ہاں! بہت بڑی بات ہے۔ اور کسی طرح رکے نہیں۔ میں نے بہت سمجھایا۔"

"یہ خالص خون کا کمال ہے عبدالحق صاحب!"

"سب اللہ کی عطا ہے سلطان صاحب! اس کا کرم ہے۔"

عبدالحق نے یعقوب کو بلا کر سمجھا دیا۔ سلطان صاحب یعقوب کے ساتھ چلے گئے۔

اس کے بعد عبدالحق نے تصور صاحب کو اب سے ایک سال پہلے دیکھا۔ شیروانی پہنے ہوئے وہ بہت باوقار لگ رہے تھے۔ وہ ایک کار میں تھے، جسے باوردی شوفر ڈرائیو کر رہا تھا۔

دونوں کاریں ساتھ ہی رکیں۔ تصور صاحب کی نظر عبدالحق پر پڑی تو وہ اس کی طرف لپکے۔ عبدالحق تو اس حال میں انہیں پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ آسودگی کا رنگ و روغن تو چہرے کے خدوخال بھی بدل دیتا ہے۔

عبدالحق ان کے چہرے کے تاثر پر حیران تھا۔ اس کے لئے وہ اجنبی آدمی تھے۔ اور اتنی محبت سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ کون صاحب ہیں؟ شناسا تو لگتے ہیں لیکن میں انہیں پہچان کیوں نہیں رہا؟

پھر تصور صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"السلام علیکم بڑے صاحب!"

اور اس "بڑے صاحب" پر عبدالحق کو یاد آ گیا۔ وہ اس کے سامنے سر جھکائے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑے تھے۔ عبدالحق نے انہیں لپٹا لیا۔

"کیسے ہیں میر صاحب.....!"

"اللہ کا فضل ہے۔ جو کچھ بھی ہوں، اللہ کے بعد آپ کی مہربانی سے ہوں۔"

"مجھے شرمندہ نہ کریں میر صاحب!"

سرِراہ ان کے درمیان چند لمحے گفتگو ہوئی۔ تصور صاحب نے اسے اپنا کارڈ دیا اور دوبارہ ملنے کا کہہ کر رخصت ہو گئے۔

اور تیسرا واقعہ بہت ذاتی تھا۔ اللہ کی بہت بڑی عنایت تھی اس پر۔ کراچی آئے ہوئے اسے تین سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔

اس صبح وہ بہت سویرے اٹھ گیا۔ ایسا لگا، جیسے کسی نے جھنجوڑ کر اسے اٹھا دیا ہو۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، چار بجنے والے تھے۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ آنکھیں دوبارہ بند کر لے اور سو جائے۔ لیکن پھر اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ یہ تو نعمت تھی، اس سے استفادہ کرنا تھا۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا اور تہجد پڑھی۔ اس کے بعد وہ قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔

اجالا ہونے سے پہلے کا وقت، جب ہر طرف سناٹا اور خاموشی ہوتی ہے، جب پرندے بھی بیدار نہیں ہوتے، قرآن پڑھنے کے لئے بہت اچھا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت ایسی تنہائی، ایسی یکسوئی ہوتی ہے کہ اللہ آس پاس محسوس ہوتا ہے، اور کبھی کبھی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ عبدالحق کو اس کا تجربہ تھا۔

وہ بڑی خوب صورت کیفیت میں تھا۔ گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ پہلے عربی میں آیت پڑھتا تھا۔ پھر اس کا ترجمہ پڑھتا تھا، اور اس پر غور کرتا تھا۔ عام طور پر توقف مختصر ہوتا تھا، اور پھر وہ اگلی آیت پر چلا جاتا تھا۔

پھر پڑھتے پڑھتے اچانک وہ چونکا، اور اسے اپنے جسم میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ وجود میں یہ احساس ابھرا کہ اس پر کچھ انکشاف ہونے والا ہے۔ کوئی بڑی بات ہے، جو اس کے دل کے توسط سے اسے بتائی، سمجھائی جا رہی ہے۔

اس کے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی تھی۔

اس نے سوچا کہ ان آیات کے ترجمے کو دوبارہ پڑھے۔ وہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۶۷ سے ۷۱ تک تھیں۔ جسم میں دوڑتی ہوئی سنسنی اور دل کی دھڑکنوں کی بے ربطی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

اس نے وہ آیات دوبارہ پڑھیں۔

''اور جب کہا موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے، بے شک اللہ حکم دیتا ہے تم کو کہ ذبح کرو ایک گائے، کہنے لگے، کیا کرتے ہو تم ہم سے مذاق؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، اللہ کی پناہ اس سے کہ میں ہوں جاہلوں میں سے۔'' (۶۷)

''وہ بولے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ کھول کر بتائے ہمیں کہ وہ گائے کیسی ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہو نہ بوڑھی اور نہ بچھیا۔ بلکہ اوسط عمر کی، درمیان بڑھاپے اور جوانی کے۔ لہٰذا تعمیل کرو تم اس حکم کی، جو دیا جارہا ہے۔'' (۶۸)

''کہنے لگے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ وہ کھول کر بتائے ہمیں کہ کیسا ہو رنگ اس کا؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہو زرد رنگ کی، ایسی خوش رنگ کہ جی خوش ہو جائے دیکھنے والوں کا۔'' (۶۹)

''کہنے لگے، درخواست کیجئے ہماری خاطر اپنے رب سے کہ وہ کھول کر بتائے ہمیں کہ وہ کیسی ہو۔ بے شک گائے مشتبہ ہوگئی ہے ہم پر اور بے شک ہم انشاء اللہ اب اس کا ٹھیک پتا پالیں گے۔'' (۷۰)

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا، بے شک اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے، جو نہیں ہے محنت کرنے والی کہ زمین

جوتتی ہو اور پانی دیتی ہو کھیتی کو، صحیح و سالم، بے داغ۔ کہنے لگے، اب لائے ہو تم بالکل ٹھیک بات۔ بالآخر ذبح کر دیا انہوں نے اسے، اگرچہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔'' (۷۱)

عبدالحق نے ان آیات کے ترجمے کو کئی بار پڑھا۔ اسے احساس ہوا کہ کہیں گہرائی سے کوئی خیال ابھر کر شعوری سطح پر آنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن شعور اسے گرفت میں نہیں لے پا رہا تھا۔ اسے بڑی شدت سے بے بسی کا احساس ہوا۔ لیکن اس کی کیفیت کی خوب صورتی مجروح نہیں ہوئی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ اسے ارجمند یاد آئی، اور بہت شدت سے یاد آئی۔ کاش...... کاش اس وقت وہ ساتھ ہوتی۔ ہم ان آیات پر بات کرتے، اور سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔ لاہور میں کیسے ان کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ کتنا اچھا لگا تھا۔

چلو، تو مل کر سمجھتے ہیں۔ اندر سے ایک آواز ابھری۔

حیرت کا سایہ سا اس کے ذہن پر سے گزرا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی کہ ان آیات سے باہر کی کوئی چیز اس کے ذہن کو نہیں چھو سکتی تھی۔

یہ تو بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ وہ شاید اس کی اپنی آواز تھی۔

مجھے یقین ہے کہ ان آیات میں کوئی بہت بڑا پیغام چھپا ہے، کوئی تلقین موجود ہے۔ وہ بڑبڑایا۔ میں اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔

تو پھر سے پڑھو۔

اس نے ایک بار پھر ان آیات کا ترجمہ پڑھا۔ بے بسی کا احساس اور شدید ہوگیا۔

نکتہ کہیں آخر میں ہوگا۔ آخری آیات سے شروع کرو۔ ذہن کو چوکس رکھو۔

بات معقول تھی۔ اس نے سوچا۔ پھر آخری آیات کا آخری حصہ پڑھا۔ اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔

اس نے ایک ایک لفظ پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اللہ فرما رہا تھا کہ ظاہری طور پر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے...... یعنی اللہ کے حکم کی

تعمیل .....

اور حکم کیا تھا....

بالآخر ذبح کر دیا انہوں نے اسے، اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔

یعنی اللہ نے انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن وہ اس حکم کی تعمیل سے گریزاں تھے۔

اور اللہ فرما رہا ہو.... اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے .... تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا یہ رویہ حتمی تھا۔

عبدالحق کو ذہن میں، اپنے سینے میں روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ خود ہی سوال اٹھا رہا ہے اور خود ہی جواب بھی دے رہا ہے۔

لیکن ارادہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل کر دی اور نافرمانی سے بچ گئے۔ کیسے ....؟ اس کی کوئی وجہ بھی ہوگی ....؟ اور وہ ان آیات میں بیان بھی کی گئی ہوگی۔

اور یہ لوگ کون ہیں، جن کی بات ہو رہی ہے ...

بنی اسرائیل کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کی، ان لوگوں کی جو بدتمیز، منہ پھٹ اور گستاخ تھے، نافرمان تھے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی کتنی ہی مثالیں قرآن پاک میں اللہ نے بیان فرمائی ہیں۔ یہ وہ ہیں، جنہیں حضرت ہارون علیہ السلام کے سپرد کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلاوے پر گئے تھے، اور ان کی غیر موجودگی میں انہوں نے سامری کے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تھی۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ ہمیں اس کا ایک بت بنا دو۔ دوسری قوموں کے پاس بھی بت ہیں۔ انہوں نے من و سلویٰ جیسی نعمتوں سے اکتا کر پیاز اور مسور کی دال جیسی عام چیزیں اللہ سے طلب کرنے کی فرمائش کی تھی۔ انہوں نے پیغمبر علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ علیہ السلام! تم اور تمہارا خدا جا کر ان لوگوں سے لڑو۔ جب تم شہر خالی کرا لو گے تو ہم اس میں داخل ہو جائیں گے۔ ورنہ ہم ان طاقت ور اور قد آور لوگوں سے لڑنے والے نہیں۔

یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے اللہ کے پیغمبر کو بہت ستایا تھا، بہت ایذاء پہنچائی تھی انہیں۔ وہ تھے ہی نافرمان۔ مفاد کے خلاف کو قبول نہیں کرتے تھے۔

وہ طرزِ عمل ان آیات میں، اور ان میں موجود اس واقعے میں بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے نشانیاں دیکھی تھیں، معجزے دیکھے تھے۔ کوہِ طور ان کے سروں پر معلق رہا تھا اور انہوں نے عہد کیا تھا۔ لیکن پاسِ عہد کبھی نہیں کیا۔ ان آیات کے سوال ان کے گستاخانہ طرزِ عمل کو ثابت کرتے ہیں۔ اللہ نے اسے ایک بڑی بات سمجھائی۔ پھر اس نے ذہن کو کھلا چھوڑ دیا تا کہ یہ دوسری بات بالآخر شعوری سطح پر آ جائے۔

پھر ہوا بھی یہی، وہ بات شعور تک آ گئی۔ ابھی جو آیات اس نے پڑھی اور اللہ کی رحمت اور فضل و کرم سے سمجھی تھی، ان میں انشاء اللہ کہنے کی افادیت نمایاں ہوئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اسے سورۂ قلم کا خیال آیا تھا۔ اس میں انشاء اللہ نہ کہنے کے نتائج تھے۔ ان آیات میں اللہ کریم نے ایک باغ والوں کا واقعہ بیان فرمایا تھا۔

عبدالحق نے قرآن دوبارہ کھولا اور سورۂ قلم نکالی۔ وہ ۱۷ ویں آیت سے ۳۳ ویں آیت تک تھیں، اور وہاں رکوع ختم ہو رہا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔

''ہم نے آزمائش میں ڈالا ہے ان کفارِ مکہ کو، جس طرح آزمائش میں ڈالا تھا ہم نے ایک باغ والوں کو۔ جب انہوں نے قسم کھائی تھی کہ ضرور ہم پھل توڑیں گے اپنے باغ کے صبح سویرے۔ (۱۷)

''اور انشاء اللہ نہ کہا تھا۔'' (۱۸)

''تو پھر گئی اس باغ پر ایک آفت تیرے ربّ کی طرف سے، جبکہ وہ سو رہے تھے۔'' (۱۹)

''پس ہو کر رہ گیا وہ کٹے ہوئے کھیت کی طرح۔'' (۲۰)

عبدالحق پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے کھیت بھی دیکھے تھے اور فصل کٹنے کے بعد کھیت کی خالی جگہ بھی دیکھی تھی۔ اپنی اس وقت کی کیفیت اسے اب بھی یاد

تھی۔ کٹے ہوئے کھیت کو دیکھ کر دل دھک سے رہ جاتا تھا۔ لگتا تھا، جیسے سب کچھ لٹ گیا ہے۔ حالانکہ فصل کاٹنا اور اٹھانا کسان کے لئے بہت بڑی کامیابی ہوتی ہے، اور اس پر جشن منایا جاتا ہے۔ لیکن کٹا ہوا کھیت کوئی اچھا منظر پیش نہیں کرتا۔ جبکہ وہ اللہ کی رحمت کا مظہر ہوتا ہے۔ اور یہاں تو اس باغ پر اللہ کی طرف سے آفت آئی تھی۔ تو اس کا منظر کٹے ہوئے کھیت سے لاکھوں گنا ڈراؤنا ہوگا۔

وہ جسم کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''پھر پکارا انہوں نے ایک دوسرے کو صبح سویرے۔'' (۲۱)

''یہ کہ چل پڑو صبح سویرے اپنی کھیتی کی طرف، اگر تمہیں پھل توڑنے ہیں۔'' (۲۲)

''چنانچہ وہ چل پڑے اور وہ آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے۔'' (۲۳)

''کہ نہ داخل ہونے پائے آج یہاں تمہارے پاس کوئی مسکین۔'' (۲۴)

عبدالحق نے توقف کیا اور غور کرتا رہا۔ یہ وہ لوگ تھے، جنہوں نے کسی امر کا ارادہ کیا، لیکن اللہ سے رجوع نہیں کیا، جو اختیار سمیت ہر چیز اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ گویا انہوں نے نہ صرف سمجھا، بلکہ اعلان کر دیا کہ وہ باغ ان کے تصرف میں ہے، اور اس پر ان کا کامل اختیار ہے۔ اور رعونت کا ان کی یہ عالم تھا کہ وہ کسی غریب مسکین کو ان پھلوں میں حصہ دینے کو تیار نہیں تھے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ باغ ان کی ملکیت ہے۔ جبکہ اللہ نے باغ کے پھلوں میں اپنا حصہ بھی مقرر کیا ہے، جو ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے، اور اللہ والے تو اپنی ہر چیز میں محروم اور مسکین لوگوں کو شریک کرتے ہیں۔

یعنی اللہ سے رجوع نہ کرنے والا غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ اور وہ دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے اور بڑے بڑے فیصلوں کا اعلان کرتا ہے۔ یہ

زوال کی نشانی ہے اور اللہ کے غضب کو للکارنا ہے۔

اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''اور گئے وہ صبح سویرے لپکتے ہوئے، گویا وہ ہر چیز پر قادر ہیں۔'' (۲۵)

جبکہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ بندے کے پاس جو بھی، جتنی بھی قدرت ہوتی ہے، وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہوتی ہے۔ اور ہر چیز کی طرح وہ اسے جب چاہے، واپس لے لیتا ہے، خواہ عارضی طور پر ہو یا مستقل طور پر۔ اللہ کی مرضی کے بغیر تو ایک سانس بھی ممکن نہیں، جس سے زندگی ہے..... اور زندگی، جس کے دم سے سب کچھ ہے۔

وہ اور آگے بڑھا۔

''مگر جب دیکھا انہوں نے باغ کو تو کہنے لگے، ہم یقیناً راستہ بھول گئے ہیں۔'' (۲۶)

''نہیں! بلکہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی ہے۔'' (۲۷)

ان دو آیات کی کیفیت نے اسے دہلا دیا۔ باغ پر اللہ کی طرف سے آفت پہنچنے پر جو اس باغ کا حال اللہ نے بیان فرمایا تھا، اور اسے کٹے ہوئے کھیت سے مشابہ قرار دیا تھا، وہ تو اسی پر تھرا گیا تھا۔ لیکن ان دو آیات سے تو اس پر ایسا لرزہ چڑھا کہ تادیر وہ سنبھل نہ سکا۔

اس کی یہ کیفیت اس احساس کے باوجود تھی کہ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس صبح اس باغ کے مالکوں نے دیکھا، وہ نہیں دیکھ سکتا۔ اور اسے دیکھ کر ان پر جو گزری، وہ اللہ کے بیان کرنے کے باوجود بھی اسے محسوس نہیں کر سکتا۔

آدمی جس جگہ کا مالک ہو، اسے خوب پہچانتا ہے۔ اردگرد کی تمام نشانیاں اسے یاد ہوتی ہیں۔ وہ اپنی اس ملکیت کو کبھی بھولتا ہے، نہ اس کے گرد و پیش کو۔ اس کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اسی جگہ کو نہیں پہچانتا یا پہچاننا نہیں چاہتا۔

عبدالحق نے اس منظر کو دیکھنے کی، ان لوگوں کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش

کی۔ وہ لوگ جن کی نگاہوں میں اپنا پھلوں سے لدا باغ بسا ہو، وہ اپنے باغ کی طرف آ رہے ہیں۔ راستہ انہیں ایسا یاد ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو ان کے سامنے تباہی کا ایک منظر ہوتا ہے۔ جہاں ان کے باغ کی کوئی ایک نشانی بھی موجود نہیں۔ جبکہ وہ پورے یقین کے ساتھ اس باغ کے پھل توڑ کر کھانے کی نیت سے آئے تھے۔ اور وہاں درخت تو کیا، پھل کا ایک دانہ بھی نہیں۔ ایسا منظر دیکھنے کے بعد آدمی کو کیسا شاک لگے گا۔ اگر وہ کئی ہیں تو ان کے درمیان کچھ اس طرح کے مکالمے ہی ہوں گے۔

''یار..... ! یہ وہ جگہ تو نہیں۔''

''شاید ہم راستہ بھول گئے۔''

''یہاں تو ہمارا باغ تھا، نہیں! یہ وہ جگہ ہے ہی نہیں۔''

اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے، اپنے اندر وہ یقینی طور پر آگاہ ہوں گے کہ یہ وہی جگہ ہے، اسے وہ کبھی بھول نہیں سکتے، اور یہاں تک آنے کا راستہ انہیں ایسا یاد ہے کہ وہ اندھیری سیاہ رات میں بھی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اور انہوں نے دیکھتے ہی سمجھ لیا ہوگا کہ ان کا باغ تباہ ہو چکا ہے۔

اب آدمی جتنا دنیادار ہوگا، جتنا دنیا سے محبت کرنے والا ہوگا، اتنا ہی بڑا اس کا صدمہ ہوگا دنیاوی نقصان پر۔ اور اللہ نے آدمی کے اندر اس طرح کی صورت حال کے لئے کچھ دفاعی میکنزم کے تحت وہ اپنی توجہ ہٹانے کی غرض سے پہلے اس حقیقت کا انکار کرتا ہے، اور اس وقفے میں وہ اس صدمے سے گزرنے، اس جھیلنے کے لئے خود کو تیار کر رہا ہوتا ہے۔ بہت دنیا دار آدمی تو ایسے کسی صدمے سے مر بھی سکتا ہے۔

اور جو اللہ کو ماننے والا ہوگا، جو ہر وقت یہ خیال دل میں رکھتا ہوگا کہ یہ دنیا، یہاں اس کا قیام، یہاں کے رشتے ناطے، یہاں اس کے املاک، سب کچھ عارضی ہے اور اللہ کی طرف سے ہے، جسے وہ جب چاہے، واپس لے لے، وہ صدمے کی حالت میں بھی کہے گا۔

''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔''

''بے شک! ہم بھی اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''

تو ان باغ والوں نے بھی پہلے یہی کہا کہ ہم یقیناً راستہ بھول گئے ہیں۔ یہ وہ جگہ نہیں۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ صحیح مقام پر آئے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد انہوں نے کہا، نہیں، بلکہ ہماری قسمت بھی پھوٹ گئی ہے۔

عبدالحق غور کرتا رہا۔ انہوں نے ابتداء میں اللہ سے رجوع نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو قادر سمجھ رہے تھے۔ لیکن تھے وہ اللہ کو ماننے والے ہی۔ ورنہ انشاء اللہ نہ کہنا ان کے لئے جرم نہ ہوتا۔ جیسے رجوع کرنے میں ہدایت بڑھتی ہے، ویسے ہی رجوع نہ کرنے میں آدمی ہدایت سے دور ہوتا ہے۔ اب یہ تو اللہ ہی جانے کہ ان کا آج کا ردِعمل اللہ سے رجوع نہ کرنے کا شاخسانہ محض تھا یا اس میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی دنیاداری کا بھی دخل تھا۔ بہرحال دنیا کے کسی بھی نقصان پر قسمت کا گلہ کرنا، قسمت پھوٹنے کا جملہ ادا کرنا بہت بڑی ناشکری ہے۔ ایک باغ اجڑ گیا تو کیا، ہاتھ پاؤں، جسم کے تمام اعضاء تو سلامت ہیں۔ تمام حواس اور عقل و شعور تو کام کر رہے ہیں۔ ان کا شکر ادا کرنے کے بجائے یہ ناشکرا پن۔ اور اگر آدمی معذور بھی ہو جائے، تب بھی شکر واجب کہ زندگی تو قائم ہے، جس میں نیکی کا ایک لمحہ بھی اللہ کے فضل و کرم سے عاقبت سنوار سکتا ہے۔

یہ تمام خودکار سوچیں تھیں عبدالحق کی، جیسے اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ جیسے اس کے سینے میں بیٹھا کوئی معلم اسے پڑھا رہا ہو، سمجھا رہا ہو۔ اس نے چونک کر جھرجھری سی لی اور شرمندگی سے نظریں جھکا لیں۔ اللہ اسے اپنی امان میں رکھے، آزمائش سے بچائے اور اسے ہدایت سے نوازتا رہے۔ کون جانے، یہ سب کچھ اس کے ساتھ ہوا ہوتا تو وہ بھی یہی سب کچھ کہتا۔ اور کرتا۔ وہ دل میں استغفار کرنے لگا۔

پھر وہ آگے بڑھا۔

''کہا ان کے بہتر آدمی نے، کیا نہیں کہا تھا میں نے تم سے کہ کیوں نہیں تسبیح کرتے تم؟'' (۲۸)

عبدالحق ٹھہر گیا۔ قرآن کے ایک ایک لفظ میں ہزاروں حکمتیں ہیں، پیغام ہیں، کوئی انہیں سمجھ نہیں سکتا، الا یہ کہ اللہ خود سمجھا دے، جسے چاہے۔ بس بندہ خلوص سے پڑھے، اللہ سے التجا کرے کہ مجھے کچھ عطا کر دیں۔

اور عبدالحق کو صاف احساس ہو رہا تھا کہ اللہ اسے سمجھا رہا ہے۔

اس آیت میں ایک پیغام تھا۔ اللہ کا ذکر کرتے رہو، اس کی بڑائی بیان کرتے رہو۔ پھر وہ چاہے گا تو وہ تمہارے اندر اُتر جائے گی۔ اور جب تمہیں ہر وقت اللہ کی بڑائی، ان کی قدرت اور اس کی رحمتوں کا احساس رہے گا تو تم ہر معاملے میں اس سے رجوع کرو گے۔ کبھی غلطی نہیں کرو گے۔ تسبیح بڑی چیز ہے۔

اور جس آدمی نے یہ بات کہی، وہ ان باغ والوں میں سب سے اچھا تھا۔ وہ اپنے شرکاء کو تسبیح کی تلقین کرتا تھا، جو نہیں مانی جاتی تھی، اور اب اپنے اجتماعی نقصانِ عظیم کو دیکھ کر انہیں یہ بات یاد دلا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ نصیحت وہ کرتا تھا، لیکن خود تسبیح بھی کرتا تھا یا نہیں؟ اب اس کی حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن اللہ نیکی کو بہت اہمیت دیتا ہے، حالانکہ وہ گنتی میں کم ہوتی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ روئے زمین پر جب تک اللہ کا ایک ماننے والا بھی موجود ہوگا، قیامت نہیں آئے گی۔

تو اگر نصیحت کرنے والا تسبیح کرتا ہوتا تو شاید باغ پر یہ آفت نہ آتی۔ واللہ اعلم! مگر یہ تو حقیقت ہے کہ انشاء اللہ تو اس نصیحت کرنے والے نے بھی نہیں کہا تھا۔

عبدالحق کی عجیب کیفیت تھی۔ اسے اپنا وجود تنگ محسوس ہو رہا تھا۔

''ایسی کوٹھری، جس میں بہت زیادہ سامان بھر دیا گیا ہو، جہاں کوئی چیز ڈھونڈنا آسان نہ ہو۔ ذہن میں اتنا کچھ تھا کہ سب گڈمڈ ہو رہا تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ذرا دیر میں کیفیت بہتر ہوگئی۔

اس نے آگے کی آیات پڑھیں۔

''وہ پکار اٹھے، پاک ہے ہمارا رب، بے شک ہم ہی

تھے ظالم۔'' (۲۹)

''پھر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے باہم ملامت کرنے لگے۔'' (۳۰)

یعنی بالآخر یاد دلانے پر انہوں نے اللہ سے رجوع کیا۔ اس کے بعد ردِعمل فطری تھا۔ کسی اجتماعی کام کا برا نتیجہ نکلے، نقصان ہو جائے تو تمام شرکاء ایک دوسرے پر خرابی کا الزام عائد کرتے ہیں، مطعون کرتے ہیں۔ اللہ سے رجوع کرنے کے باوجود یہ عمل توبہ کو ردّ کرتا ہے۔ کیونکہ توبہ تو اعتراف کے بعد ہے۔ اب آپ اعتراف تو سطحی اور زبانی کریں اور پھر خرابی کا الزام دوسروں پر عائد کر دیں۔ نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیں تو یہ آپ توبہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ توبہ کے لئے تو ندامت شرط ہے۔ جس درجہ ندامت ہوگی، اتنی ہی مقبول توبہ ہوگی۔

وہ آگے بڑھا۔

''کہنے لگے، ہائے بدنصیبی! ہم ہی تھے سرکش۔'' (۳۱)

''کچھ بعید نہیں کہ ہمارا رب بدلے میں دے ہمیں بہتر اس باغ سے۔ بے شک ہم اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ (۳۲)

اب حقیقت تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرکشی کو تسلیم کیا کہ وہی ان کی بدنصیبی کا سبب بنی۔ انہوں نے اللہ سے رجوع بھی کیا۔ لیکن بظاہر یہ لگتا تھا کہ اب بھی وہ دُنیا دار ہی ہیں۔ اللہ سے رجوع کرتے ہوئے انہوں نے آخرت میں بھلائی کی امید نہیں باندھی۔ بلکہ جو باغ ان کا تباہ ہوا تھا، امید وار ہوئے کہ عجیب نہیں کہ اللہ انہیں اس سے بہتر باغ عطا فرما دے۔

بظاہر یہی لگتا تھا کہ اس نقصان کے باوجود ان کے دلوں سے دنیا کی محبت کم نہیں ہوئی۔ اور انہوں نے آخرت کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔ انہیں آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں۔ شاید رکوع کی آخری آیات اسی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

الله نے فرمایا۔

''ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور عذاب آخرت تو کہیں
بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے۔'' (۳۳)

پہلے الله نے بتایا کہ دنیا کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ پھر بتایا کہ عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ یہ الله کے اقتدار، اس کے ذکر سے غفلت برتنے والوں کا انجام ہے۔ اور آخر میں الله نے گویا ان کی بدنصیبی پر مہر ثبت کر دی۔ یہ کہہ کر کہ کاش یہ لوگ جانتے۔ لیکن یہ بے خبر غفلت میں پڑے ہوئے لوگ دنیا کا عذاب دیکھ کر بھی آخرت کے عذاب کو نہیں سمجھ پاتے۔

عبدالحق پر لرزہ چڑھ گیا۔ دیر تک اس کے جسم پر تھرتھری رہی۔ اس نے سوچا کہ وہ کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ دینا کی مصروفیات میں گم ہے۔ اور اسے الله کے ذکر کے لئے فرصت نہیں ملتی۔ اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ الله کے اتنا نوازنے پر اس کی بے خبری، غفلت اور دنیاداری کا یہ حال ہے۔ تو اس کا انجام کیا ہوگا؟

اس کے ذہن میں آخری آیت کے الفاظ گردش کرتے رہے۔ ایسا ہوتا ہے عذاب۔ اور آخرت کا عذاب تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ جانتے ...

عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش ..... اور اسے صاف طور پر ایسا لگا کہ الله اس سے فرما رہا ہے، تو یہ بات سمجھ لے، جان لے۔ تو خود کو اس بدنصیبی سے، اور بدترین عذاب سے بچانے کی کوشش کر۔

خوف کے اس عالم میں وہ استغفار کرتا رہا، ایسے کہ اسے اس کا ہوش بھی نہیں تھا۔ استغفار بے اختیار ان کی زبان پر، اور آنسو اس کی آنکھوں سے جاری تھے۔ دیر تک وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ پھر اذان کی آواز نے اسے اس کیفیت سے نکالا۔

اذان کے بعد وہ نماز کے ارادے سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا..... اس کا مطلب ہے کہ دنیا کا نقصان، کوئی محرومی، کوئی عذاب درحقیقت الله کی رحمت ہے۔ اس خیال کی بازگشت اس کے دل و دماغ میں چکرا رہی تھی۔

پہلے تو وہ نقطوں کے پار کچھ دیکھ، کچھ سمجھ نہیں سکا۔ پھر بالآخر وہ الفاظ اس کے شعور کی گرفت میں آئے۔ اس کا پہلا ردِّعمل حیرت کا تھا۔

نقصان، محرومی اور عذاب ..... اور الله کی رحمت! وہ کیسے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ کیسے بھلا؟

خود سوچو، غور کرو۔ اندر اس سوال کا جواب ابھرا۔

وہ سوچنے لگا۔ پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ آیت کا آخری حصہ پکار رہا تھا..... کاش یہ لوگ جانتے۔ الله فرما رہے ہے کہ میں انہیں بتا رہا ہوں، سمجھا رہا ہوں۔ یہ لوگ نہیں سمجھتے پھر بھی۔ کاش ..... کاش یہ لوگ جانتے۔ دنیا کے نقصان، دنیا کے عذاب کے بعد، الله بتا رہا تھا کہ سمجھ لو، عذابِ آخرت اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مان جاؤ، سمجھ لو، مجھ سے رجوع کر لو۔ تو یہ رحمت ہی تو ہے۔

جب کوئی بڑی بات، بہت بڑی بات آدمی کی سمجھ میں آتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لئے شل ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبدالحق کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ ذہن کو بس اتنا پتا تھا کہ اس نے ایک بہت بڑا راز پا لیا ہے۔ اس کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی وضاحت نہیں تھی، کچھ بھی نہیں۔

پھر اچانک ذہن جیسے جگمگا اٹھا۔

بے شک، ہر نقصان، ہر محرومی، ہر تکلیف درحقیقت الله کی رحمت ہے۔

آدمی کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ الله کی رحمت ہوتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ اگر اس نے اپنی سمت درست نہ کی اور الله سے رجوع نہ کیا تو کانٹا چبھنے سے تڑپنے والا جہنم کا عذاب کیسے برداشت کرے گا، جو ناقابلِ تصور حد تک اذیت ناک ہوگا تو ہر نقصان، ہر محرومی اور ہر تکلیف کے ذریعے الله اپنے بندے کو عذابِ آخرت یاد دلاتا ہے، اور بے شک یہ اس کی رحمت ہے۔

پھر اسے خیال آیا کہ الله کی رحمت بے پایاں ہے، اور الله نے اس سے پوری کائنات کا احاطہ کر رکھا ہے۔ تو کوئی شخص کسی بھی لمحے الله کی رحمت سے باہر نہیں۔ اور الله نے ہمیں اپنی جن صفات کے بارے میں بتایا ہے، وہ سب رحمت ہیں۔ اس کا قہر بھی اس کی رحمت ہے، کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

تو بندے کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ ہر پل، ہر معاملے میں اللہ سے رجوع کرتا ہے۔ اور اس کے لئے اللہ نے بندوں کو زبان پر رواں اور آسان کلمات عطا فرماتے ہیں ..... الحمد للہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، انشاء اللہ، اور کسی نقصان کے لئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بلکہ اگر بندہ سمجھے تو ہر نقصان میں بھی اللہ کی رحمت ہے۔ اور اگر وہ ایمان رکھتا ہو کہ ہر چیز میں اللہ کی طرف سے بہتری ہے تو نقصان پر بھی الحمد للہ کہے۔

عبدالحق نماز کے لئے کھڑا ہوگیا۔ لیکن اس تشنگی کا احساس ستا رہا تھا۔ اس کے دل میں یہ خیال چبھ رہا تھا کہ کچھ اور بھی ہے، جو وہ اس وقت سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اس کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اور یہ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ اس کے لئے اسے کیا کرنا ہے۔

نماز کے بعد اس نے اللہ سے راہنمائی کی دعا کی، ورنہ وہ جانتا تھا کہ یہ تشنگی، یہ خلش نہ جانے کب تک اسے بے چین رکھے گی۔ دعا کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیر کر چند لمحے وہ بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں سورۂ نمل کا خیال ابھرا۔

یعنی مجھے سورۂ نمل پڑھنی چاہئے۔ اس نے سوچا۔ اس پر اسے خیال آیا کہ شفیق نے اس سورۂ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہوئے کتاب کے علم کی اہمیت اور قوت واضح کی تھی، اور زمان و مکاں کے فاصلوں کی سمت جانے کو بیان کیا تھا۔

وہ پھر قرآن لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے سورۃ النمل کی وہ آیات نکالیں۔ اندر سے انہی کی طرف اشارہ ہو رہا تھا۔

جہاں ہدہد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے عرض کی تھی ..... اور لایا ہوں میں آپ کے پاس سب سے ایک یقینی اطلاع ..... وہاں سے وہ تمام آیات ترجمے کے ساتھ اس نے کئی بار پڑھیں۔ کتاب کا علم جاننے والے نے پلک جھپکنے سے پہلے وہ تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس حاضر کر دیا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ کتاب کا علم کیسا ہے، اور اس کے عالم کے پاس کتنی قوتیں ہوتی ہیں۔ درحقیقت وہی تو اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہے کہ ایں سعادت بزور بازو

نیست۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کر دے۔

لیکن وہ خلش اب بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ عبدالحق بے چین تھا۔

اس نے آخری آیات کو پھر پڑھا۔ کہا اس شخص نے جس کے پاس تھا کتاب کا علم کہ میں لے آتا ہوں وہ تخت آپ کے پاس اس سے پہلے کہ جھپکے آپ کی پلک۔ چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔

یہ آیت مبارکہ ظاہر کر رہی تھی کہ سلیمان علیہ السلام نے پلک بھی نہیں جھپکی تھی، اور تخت ان کے دیکھتے ہی دیکھتے اس طرح موجود ہوگیا تھا کہ دیکھتے ہوئے بھی انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کب آگیا۔

عام انسانوں کے لئے تو یہ محیر العقول واقعہ تھا۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔

عبدالحق نے تصور کیا کہ اس کے سامنے ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔ اس کا کیا ردِعمل ہو سکتا ہے۔ پہلے تو وہ سکتے میں رہ جاتا۔ دیر تک اس کے ہونٹ لرزتے، اور منہ سے آواز نہ نکلتی۔ پھر جب وہ کافی دیر بعد سنبھلتا، گویائی بحال ہوتی تو اس کا کیا ردِعمل ہوتا۔

اس کے لئے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ عبدالحق نے بے ساختہ بلند آواز میں کہا، جس پر وہ خود بھی حیران رہ گیا ..... یہ تو کمال کر دیا آپ نے۔ واقعی آپ باکمال آدمی ہیں۔

ہاں! اس کا یہی ردِعمل ہوتا۔ اس نے دل میں اعتراف کیا۔

لیکن سلیمان علیہ السلام کا کیا ردِعمل تھا۔

چنانچہ جب دیکھا سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو رکھا ہوا اپنے پاس تو پکار اٹھے، یہ فضل ہے میرے رب کا۔

ایسی ناقابل یقین کارکردگی دیکھنے کے بعد کیا پہلا جملہ تھا حضرت سلیمان علیہ السلام کا......

''هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ''

"یہ فضل ہے میرے رب کا۔"

سبحان اللہ! عبدالحق کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ کارکردگی دکھانے والے کی تعریف نہیں کی، اب ربّ کی تعریف بیان کی، جو تنہا، واحد اور احد ہر تعریف کا سزاوار ہے۔ جس کے پاس جو خوبی، جو صلاحیت، جو طاقت، جو ملکیت، جو چیز بھی تعریف کے قابل ہے، وہ اسی کی عطا کی ہوئی ہے۔ اس لئے ہر تعریف بھی صرف اسی کے لئے ہے۔ اس نے فرمایا...... اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ...... کسی کی تعریف کرنے سے پہلے اپنے ربّ کی تعریف کرو، جو رب ہے تمام جہانوں کا، اور ہر تعریف کا سزاوار وہی ہے۔

واہ! عبدالحق نے دل میں سوچا۔ یہ فرق ہے عام آدمی اور نبی کا...... مگر یہ سوچتے ہوئے اچانک میں وہ ٹھرا گیا۔ یہ وہ کیا کر رہا ہے؟ ابھی جو سکھایا گیا ہے، اسی کے خلاف کر رہا ہے۔ اللہ سے پہلے کسی کی تعریف، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔

"ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ" اس نے عاجزی سے دہرایا۔ کلام اللہ کا ہے۔ وہ اتنی اہم تعلیم دے رہا ہے۔ اور میں توصیف کر رہا ہوں نبی کی۔ تعلیم کو تو سمجھا ہی نہیں میں نے۔ تعلیم کو تو پیچھے چھوڑ دیا۔

"ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ"

اور "ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ" کے بعد کیا فرمایا نبی نے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔

تو جو بھی اللہ کی طرف سے نعمت ہے، اس کا فضل ہے، درحقیقت بندے کی آزمائش ہے۔ اللہ اس سے یہ جانچتا ہے کہ بندہ شکر گزار ہے یا احسان ناشناس۔

تو شکر کیا ہے اور ناشکری کیا؟

شکر، یہ ہے کہ وسیلوں میں، ظاہری اسباب میں نہ الجھو، اپنے معبودِ حقیقی کو، اپنے ربّ کو پہچانو اور اس کی تعریف کرو۔ اور اس کی تعریف و توصیف میں بھی کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

اور ناشکری؟

دودھ دینے والی بھینس کے کُھر چوم لینا، اسے بھول کر جس نے وہ دودھ

بھینس کو عطا فرمایا، پھر بھینس سے اسے دلوایا، اسے پینا نصیب فرمایا، اس کے ذائقے سے فرحت عطا فرمائی، اسے مضر اثرات سے پاک فرمایا، اسے جزوِ بدن بنایا اور اس سے اسے طاقت عطا فرمائی۔ کتنے احسان فرمائے ایک نعمت کے ساتھ ربّ نے، اور بندے نے شکر ادا کیا تو بھینس کا۔ یہ ناشکری ہے۔

اور آیت کے آخری حصے میں کیا فرمایا سلیمان علیہ السلام نے؟

اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو درحقیقت وہ شکر کرتا ہے اپنے ہی فائدے کے لئے۔ اور جو کوئی کفر کرتا ہے تو میرا ربّ بے نیاز اور بہت کریم ہے۔

اللہ بے نیاز ہے، اور سب اس کے محتاج ہیں، اسے کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ نہ تعریف، نہ توصیف نہ کلمہ شکر۔ وہ ہر طرح کی حاجتوں سے پاک ہے۔ اور وہ کریم ہے۔ بغیر کسی استحقاق اور جواز کے اپنی تمام مخلوقات کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے، اور بن مانگے پوری فرماتا ہے۔ بلکہ مخلوق کو اپنی حاجت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اللہ پوری فرماتا ہے، اور بعض اوقات مخلوق کو حاجت روائی کے بعد معلوم تک نہیں ہوتا کہ اس کی کوئی حاجت پوری ہوگئی ہے۔ یہ کریمی ہے، بے گمان، بے سبب، بے کاوش عطا فرمانا۔

تو بے نیاز اور کریم ربّ کا جو شکر ادا کرے تو اس سے ربّ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس میں فائدہ شکر ادا کرنے والے کا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ مقامِ فکر تھا، غور کرنے کی بات تھی۔ عبدالحق نے سوچا، اسے شکر کے فوائد کے بارے میں سوچنا ہوگا، غور کرنا ہوگا۔ وہ بھی یقیناً بے شمار ہوں گے۔

اور آخری حصے سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ چاہے کم تر درجے میں ہو، لیکن ناشکری بہر حال کفر ہے۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے پہلے فرمایا کہ ربّ آزماتا ہے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری۔ اور دوسرے حصے میں شکر اور کفر کا تذکرہ کیا۔

عبدالحق کی روح سرشار ہوگئی۔ الحمد للہ! اس نے سوچا، اللہ نے مجھے ایک اور کلمہ عطا فرما دیا۔ کسی سے کچھ ملے، کوئی مہربانی کرے، کوئی ناممکن کو ممکن بنا دے، کوئی غیر معمولی بات رونما ہو تو مجھے سب سے پہلے ہر بات کو بھول کر "ھٰذَا مِنْ

فَضْلِ رَبِّی '' کہنا ہے۔ اے اللہ! جو کچھ آج آپ نے مجھے سمجھایا ہے، مجھے اس پر عامل بھی کر دیجئے۔ اس نے دل کی گہرائیوں سے اللہ کو پکارا۔

اور اس کا دل جیسے قبولیت کی روشنی سے بھر گیا۔

لیکن دل میں ایک خلش اب بھی تھی۔ البتہ اس بار اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اسے درحقیقت سورۃ البقر کی ان آیات کا خیال آ رہا تھا، جن میں انا للہ وانا الیہ راجعون بھی تھی۔

اس نے سورۂ بقر کی وہ آیات نکالیں اور ترجمے کے ساتھ پڑھیں۔

''اور ضرور آزمائیں گے ہم تم کو کسی قدر خوف اور بھوک سے اور نقصان میں مال و جان کے اور آمدنیوں کے، اور خوش خبری دو صبر کرنے والوں کو۔'' (۱۵۵)

''وہ کہ جب پہنچتی ہے انہیں کوئی مصیبت تو کہتے ہیں، بے شک! ہم للہ ہی کے ہیں اور بے شک ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)'' (۱۵۶)

''یہی وہ لوگ ہیں کہ ان پر ہیں عنایتیں ان کے رب کی، اور رحمتیں بھی۔ اور یہی لوگ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں۔'' (۱۵۷)

کیسی حوصلہ افزاء آیات ہیں یہ، کیسی خوش خبری دیتی ہیں پریشان حال لوگوں کو۔ انہیں صرف اتنا کرنا ہے کہ پورے یقین کے ساتھ، خود کو ہر گلے اور تاسف سے پاک کر کے، خود کو اللہ کی رضا پر چھوڑ کر انا للہ وانا الیہ راجعون کہیں۔ تو پھر ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے عنایتیں اور رحمتیں ہیں اور ان کے لئے ہدایت ہے۔ کتنی بڑی خوش خبری ہے یہ۔

عبدالحق جب بھی ان آیات کو پڑھتا تھا، اس پر گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ اللہ کتنی محبت کرتا ہے اپنے بندوں سے۔ دنیا میں تو انہیں سامانِ زیست عطا کرتا ہی ہے، لیکن ان کی فکر بھی کرتا ہے۔ ان کے لئے بشارتوں کا اہتمام بھی فرماتا ہے۔ ورنہ اس کے لئے کیا بڑی بات ہے کہ وہ انہیں محرومیوں سے بچا لے۔ لیکن وہ

محرومیاں، اگر ان پر صبر کیا جائے تو دنیا اس آخرت میں بندے کے لئے اللہ کی عنایات، رحمتوں اور ہدایات کا سبب بن جاتی ہیں۔ اور پھر بھی تو وہی دیتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں۔

اللہ کی رحمت ہی رحمت ہے۔ عبدالحق کے دل نے کہا۔ ہر کام میں رحمت، ہر بات میں رحمت۔ بس بندہ سمجھ نہیں پاتا۔ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ سمجھتا بھی وہی کچھ ہے، جو اللہ سمجھا دے۔ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اللہ ہی اللہ۔ بندہ تو بس گمان میں مبتلا رہتا ہے کہ میں نے یہ کر دیا اور وہ کر دیا۔

اور اللہ کی رحمت کہ اس نے کلمہ صبر بھی عطا فرمایا...... انا للہ وانا الیہ راجعون...... بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ کتنا آسان کر دیا اللہ نے۔ صبر کہاں آتا ہے بندے کو۔ تو صبر آئے یا نہ آئے، زبان پر کلمہ صبر جاری رکھو۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔ اور یہ کلمہ زبان پر جاری رہے گا تو صبر بھی آ ہی جائے گا۔ ذکر کا یہی تو کمال ہے۔ بے دھیانی میں بھی کرتے رہو تو اندر اتر جائے۔ آخر اللہ کا کلام ہے۔

عبدالحق اس کلمہ صبر پر غور کرنے لگا۔ بے شک ہم اللہ کے ہیں، اور بے شک سبھی کچھ اللہ کا ہے۔ اور بے شک ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اور بے شک جو کچھ بھی اس نے عطا فرمایا، وہ اس کا احسان ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ جب یہ مان لیا تو غم کاہے کا۔ زندگی کے دم سے سب کچھ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہ روح کی بیڑی ہے، جس کی توانائی سے جسم کی مشین چل رہی ہے۔ اللہ کے مقرر کئے ہوئے وقت پر یہ روح جسم کو چھوڑ کر اللہ کی طرف چلی جائے گی۔ یہ جسد خاکی بے جان ہو جائے گا۔ مشین رک جائے گی۔

تو کوئی بھی پریشانی ہو، خوف ہو یا بھوک، اور کوئی بھی نقصان ہو، جان و مال کا ہو یا آمدنی کا، بندہ کلمہ صبر ادا کرے کہ اللہ کی دی ہوئی چیز تھی، سو اس نے واپس لے لی۔ اور ایک دن ہم خود بھی اسی کے پاس چلے جائیں گے۔ غم کی کوئی بات ہی نہیں۔

وہ چونکا۔ غم کا کیا سوال ہے۔ پہلے تو شکر ادا کرنا چاہئے۔ اس کے دل

بس یہ خیال ابھرا۔

چند لمحے وہ اس کا مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ پھر بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ ہل کر رہ گیا۔ شکر ادا نہ کرنا گویا ناشکری ہے اور ناشکری کفر ہے۔ بات کہاں سے کہاں تک جاتی ہے۔

تو کلمہ صبر سے پہلے کلمہ شکر ہے...... الحمد اللہ......!

کیوں؟

اللہ نے تمہیں دیکھتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ پیدا فرمایا تو کیا یہ تمہارا حق تھا؟

نہیں! یہ اس کا احسان تھا۔

کبھی اس پر شکر ادا کیا تم نے؟

نہیں! کبھی نہیں۔

کیوں نہیں کیا؟

کبھی خیال ہی نہیں آیا۔

اور ابھی، اسی لمحے آنکھوں سے، بینائی سے محروم ہو جاؤ تو کیا کرو گے؟

عبدالحق سوچتا رہا۔ وہ جیسے اللہ کے روبرو کھڑا تھا۔ غلط جواب تو نہیں دے سکتا۔ بہت سچائی کے ساتھ جواب دینا تھا اسے۔ بجھ کر رہ جاؤں گا کہ میرے لئے دنیا ہی اندھیر ہوگئی۔ وہ بڑبڑایا۔

یعنی غم کرو گے نا...... شدید غم؟

ہاں!

لیکن جو کچھ آج سیکھا ہے، اس کی روشنی میں کیا کرنا چاہئے تمہیں؟

صبر کرنا چاہئے، محرومی پر جب بھی دکھ ہو تو انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہئے۔

نہیں! اس سے پہلے بھی کچھ ہے۔

عبدالحق نے ذہن پر زور دیا۔ کلمہ شکر ادا کرنا چاہئے...... الحمد للہ!

کس لئے؟

وہ سوچتا رہا، پھر بے بسی سے بڑبڑایا۔ یہ سمجھ سکتا ہوں کہ صبر سے پہلے شکر لازم ہے۔ لیکن کیوں؟ یہ نہیں سمجھ پایا۔

جواب اگلے ہی لمحے اس کے اندر ابھرا۔ صبر سے پہلے شکر اس پر کہ اللہ نے اتنے برسوں تک تمہیں یہ نعمت عطا فرمائی۔

بے شک! میں سمجھ گیا۔

لیکن شکر سے بھی پہلے ایک چیز اور ہے۔

وہ کیا؟

استغفار، اس کی وجہ جاننا چاہتے ہو۔

ہاں! تاکہ آئندہ کے لئے محتاط ہوں۔ عبدالحق نے عاجزی سے کہا۔

جب بینائی سے محروم ہو گئے اور صبر سے پہلے تم نے شکر ادا کیا کہ اللہ نے اتنے برسوں تک تمہیں اس نعمت سے سرفراز رکھا تھا، اور وہ بھی بغیر مانگے تو تمہیں اس پر شرم نہیں آئی کہ اتنے برسوں تک اتنی بڑی نعمت تمہارے پاس رہی اور تمہیں اس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کا خیال بھی نہیں آیا، جیسے یہ کوئی نعمت تھی ہی نہیں۔ محروم ہوئے تو جانا۔ تو اتنے برسوں ناشکری کے مرتکب ہوتے رہے۔ اتنی بڑی نعمت سے بے نیازی بھی تری، جبکہ بے نیازی صرف اللہ کو زیبا ہے۔

عبدالحق پر ایسی تھرتھری چڑھی کہ وہ نڈھال ہوگیا۔

بہت دیر تک وہ ساکن بیٹھا رہا۔ دماغ میں اتنی روشنی تھی، ایسی چکاچوند تھی کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

زندگی آخرت کے نکتہ نظر سے کتنی دشوار ہے۔ کافی دیر بعد اس نے سوچا۔

اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا شمار تو ممکن ہی نہیں۔ شکر کیا ادا کر سکتا ہے بندہ!

یہ تو غلط بات ہے۔ اندر کی آواز ابھری۔ زندگی سامنے کی نعمت ہے۔ اللہ نے ہدایت دی، تمہیں دین اسلام میں لایا، سامنے کی نعمت ہے۔ بصارت، سماعت، گویائی، تمام حواس، فہم و ادراک، سمجھ بوجھ سب سامنے کی نعمتیں ہیں۔ پر ان کا خیال ہی نہیں آتا تمہیں۔ اور اللہ نے آخرت کے لئے زندگی کتنی آسان کر دی، جب کوئی نعمت یاد آئے، اس پر شکر ادا کرلو۔ جب کچھ اچھا ملے تو الحمد للہ اور ھذا من فضل

ربی کہہ لو۔ جب کوئی پریشانی اور محرومی زندگی میں آئے، انا للہ وانا الیہ راجعون کہو اور اللہ کی ہدایت اور رحمت پا جاؤ۔ چھوٹے چھوٹے کلمے، مقبول کلمے اسی نے تمہیں عطا کیے۔ لا الہ الا اللہ کہو اور اس کی وحدانیت کا اعلان کرو۔ سبحان اللہ کہو اور اس کی پاکی بیان کرو۔ اللہ اکبر کہو تو اس کی بڑائی بیان کرو۔ الحمد للہ کہو اور شکر کرو اور ہر اچھی چیز اس کی طرف سے ہونے کا اعلان کرو۔ انشاء اللہ کہو اور معاملات اسے سونپ کر خیر اور فلاح پا جاؤ۔ ماشاء اللہ کہو اور غرور اور اتراہٹ سے محفوظ ہو جاؤ۔ ھٰذا من فضل ربی کہو اور شرک سے دور ہو جاؤ۔ اور کیا چاہیے تمہیں، اور کتنی آسانیاں چاہتے ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ انسان غفلت میں پڑا رہتا ہے۔ اپنی خوبیوں کو اپنا جانتا ہے، اور ہر نعمت کو اپنی کسی خوبی، کارکردگی اور محنت کا سبب جانتا ہے۔ عام طور پر اللہ کی نعمت کو نعمت اس وقت تک نہیں مانتا، جب تک اس سے محروم نہ ہو جائے۔ اور کبھی کبھی تو شرمندہ ہونے کے بجائے الٹا گلے شکوے کرنے لگتا ہے۔

سب کچھ آسان ہو جائے، اگر تم ہر وقت اور ہر لمحہ اپنے دل میں اللہ کو یاد رکھو، ہر کام کرتے ہوئے، ہر بات کرتے ہوئے، تو تمہیں سب کچھ اللہ سے منسوب کرنے میں آسانی رہے گی۔ غور تو کرو صرف اس کی ان نعمتوں پر جن کا تمہیں شعور ہے، ان کو تو بھول جاؤ، جن کا تمہیں ادراک ہی نہیں ہے، تو احسان مند ہو کر ہمیشہ ہر لمحہ اسے یاد کرنا چاہو گے۔ ارے، وہ تو ایسا ہے کہ تم پر ہر وقت اس کی بات، اس کا ذکر کرتے رہو، یہاں تک کہ لوگ تمہیں دیوانہ کہنے لگیں۔ جب وہ ہر لمحہ تمہیں یاد رہے گا تو اس کی صفات بھی تمہارے ذہن میں رہیں گی، اور تمہیں پتا چلتا رہے گا کہ کون سی نعمت جو تمہیں ملی، اس کی کس صفت کی مرہونِ منت ہے۔ تمہیں خیال رہے گا تو شکر ادا کرتے رہو گے۔

اور کثرت سے استغفار کرو۔ کیونکہ جیسے اللہ کی نعمتوں کا شمار ممکن نہیں، ویسے ہی تمہارے گناہوں کا شمار بھی ناممکن ہے۔

عبدالحق کا حال ایسا تھا، جیسے کسی بھکاری کو خزانہ مل گیا ہو۔ اس نے سوچا، کاش اس وقت ارجمند یہاں موجود ہوتی۔ ہم دونوں بات کرتے تو شاید کچھ اور روشنی مل جاتی۔

اس نے قرآن کو چوما، سینے سے لگایا اور الماری میں رکھ آیا۔ اسے احساس ہوا کہ دھوپ چڑھ آئی ہے، اور وہ دفتر کے لئے تیار بھی نہیں ہوا ہے۔ وہ باتھ روم کی طرف لپک رہا تھا کہ اسے خیال آیا، یہ اتوار کا دن ہے...... چھٹی کا دن۔

تو پھر کیا فکر ہے۔ ایک اہم کام کر لیا جائے۔ اس نے میز کی دراز کھول کر اپنی ڈائری نکالی اور اس میں یاد کر کے یہ سب کچھ لکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی باتیں کتنی تیزی سے ذہن سے محو ہوتی ہیں۔

ڈائری لکھتے ہوئے اس نے سوچا، موقع ملا تو یہ ارجمند کو ضرور پڑھوائے گا۔

اور اب وہ لاہور واپس جا رہا تھا۔

کلکٹر صاحب کو تمام صورتِ حال بتاتے ہوئے اس نے تبادلے کی بات کی تھی۔ لیکن کلکٹر صاحب بھڑک گئے۔

''نہیں بھئی! تمہیں تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔'' ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''تمہارا متبادل تو مجھے کوئی مل ہی نہیں سکتا۔''

''میری مجبوری ہے جناب!''

''ایسی کیا مجبوری ہے؟ یہاں بہترین علاج ہو سکتا ہے تمہاری اہلیہ کا، میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔''

''وہ بہت ضدی ہے جناب! اور آپریشن سے ڈری ہوئی ہے۔ اپنوں میں شاید آپریشن کروا بھی لے، یہاں ہرگز نہیں کرائے گی۔''

کلکٹر صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ بھلے آدمی تھے۔ اور عورت کی ضد کا تجربہ نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ بولے۔

''تبادلے کی بات بھول جاؤ۔ میں تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دے رہا ہوں۔''

''ایک ہفتے سے کیا ہوگا جناب! چھ سال سے میں نے اپنی اماں کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ پھر بیوی کو آپریشن کے لئے رضامند کرنا......''

''چلو...... دو ہفتے سہی۔ اس سے ایک دن زیادہ بھی نہیں۔''

"یہ بھی بہت کم ہے۔"

"تمہارے پیچھے یہاں سب کچھ چوپٹ ہو جائے گا۔" وہ بولے۔

"نہیں بھئی! یہ ناممکن ہے۔"

"تو پھر میرے سامنے ایک ہی راستہ ہے جناب! میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔"

کلکٹر صاحب دہل گئے۔

"نہیں بھئی! ایسا سوچنا بھی نہیں۔ اچھا! یہ بتاؤ، کم سے کم کتنی چھٹی چاہئے تمہیں؟"

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔

"ایک ماہ تو ضروری ہے سر.....!"

کلکٹر صاحب چند لمحے ہچکچاتے رہے۔ پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے عبدالحق! مگر توسیع نہ کرنا۔" پھر وہ مسکرائے۔

"چھٹیوں کا حق تو تمہارا بہت زیادہ کا ہے۔ اور تم اصرار کرو تو سرکاری طور پر میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تمہاری لیاقت اور لحاظ ہے کہ تم نے اپنا حق بھی عاجزی سے مانگا۔ لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں بھی تمہیں چھوٹے بھائی جیسا سمجھتا ہوں۔ ورنہ تمہیں روکنے کی کوشش کبھی نہ کرتا۔ یہ تو مان کی بات ہے نا، تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا مان رکھا۔"

"ایسی بات نہ کریں جناب! آپ میرے لئے بہت محترم ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے استعفیٰ کی بات کی۔ میں کبھی نہ کرتا جناب! لیکن دل بہت پریشان ہے۔ اہلیہ کی اس بیماری کی وجہ سے تو کبھی اماں سے ملنے نہیں جا سکا۔ اب چھ سال بعد جا رہا ہوں تو ان سے رخصت ہو کر اتنی جلدی آنا آسان تو نہیں ہوگا۔ اور اماں کا حکم ٹال بھی نہیں سکتا میں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ تو بس یہ ایک ماہ تمہارا ہوا۔"

"شکریہ جناب!"

عبدالحق نے گھر آ کر نور بانو کو خبر سنائی۔ طے یہ پایا کہ بغیر بتائے لاہور پہنچ

کر سب کو سرپرائز دیں گے۔

"چار دن ہیں روانگی میں۔"

"کل سب کے لئے تحفے خرید لیں گے بازار چل کر۔" نور بانو نے کہا۔

وہ بھی خوش نظر آ رہی تھی۔

عبدالحق نے یعقوب سے بات کی کہ اسے یہیں رہنا ہے تو اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

"ایلون سر.....؟" اس عالم میں بھی وہ انگریزی جھاڑنا نہ بھولا۔

"کیوں.....؟ آپ کو ڈر لگے گا؟" عبدالحق نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"سر! آپ جانے سے پہلے میری میرج کرا دیجئے۔" یعقوب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ارے.....! چار دن بعد میں جا رہا ہوں۔ شادی کوئی ایسے ہوتی ہے؟"

"میرج میں تو ایک گھنٹہ بھی نہیں لگتا سر!"

عبدالحق نے متجسس نظروں سے اسے دیکھا۔ کوئی پسند کر رکھی ہے.....؟"

"یس سر.....! ایک ونڈو ہے سر! چار بچے بھی ہیں اس کے۔ بے سہارا ہے۔ وہ میرا خیال رکھے گی۔ میں اسے سہارا دوں گا۔"

"یہ ونڈو کیا بلا ہے مسٹر جیکب!"

"آپ اُردو اسپیکنگ لوگ شاید اسے بیوہ کہتے ہیں۔" یعقوب نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

عبدالحق کو ہنسی آ گئی۔

"اوہ.....! ہم جاہل لوگ انگریزی میں اسے وِڈو کہتے ہیں۔ آپ نے اسے کھڑکی بنا دیا..... ونڈو۔"

"لفظوں میں کیا رکھا ہے سر.....! اصل چیز ہے کام....."

"رہتی کہاں ہے وہ.....؟"

"یہ ریلوے کالونی کے ساتھ کچی بستی ہے نا سر.....! وہ وہاں رہتی ہے۔"

"اور کب شادی کرنا چاہتے ہیں آپ......؟"

"ابھی چلے چلیں سر......!"

"تو ٹھیک ہے۔آج شام کو تمہاری شادی ہے۔ میں ابھی تمہاری میم صاحب سے بات کرتا ہوں۔آج میں دفتر عارف بھائی کے ساتھ چلا جاؤں گا۔تم میم صاحب کے ساتھ جانا۔ وہ تمہاری دلہن کے لئے زیور اور کپڑے اور تمہارے لئے لباس خرید دیں گی۔ٹھیک ہے......؟"

"تھینکس ٹو سر......!" یعقوب نے کھٹ سے ایڑیاں بجا کر اسے سلیوٹ کیا۔

نور بانو بھی شاید بہت خوش تھی۔عبدالحق نے اسے پیسے دیئے۔اس نے یعقوب کے ساتھ جا کر بہت خوش دلی سے بہت اچھی خریداری کی۔پھر وہ یعقوب کے ساتھ اس عورت کے گھر گئی اور تمام معاملات طے کر آئی۔

شام کو یعقوب کی شادی ہوگئی۔عبدالحق اور نور بانو کے علاوہ عارف اور اس کی فیملی اس میں شریک تھی۔

اگلے روز عبدالحق نے ٹرین کی نشستیں بک کرا لیں۔نور بانو ہوائی جہاز کے سفر پر آمادہ نہیں تھی۔

❁ ❁ ❁

سہ پہر کا وقت تھا۔رابعہ اپنے کمرے میں تھی اور حمیدہ اپنے کمرے میں۔

ارجمند لاؤنج میں بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ ساجد آندھی طوفان کی طرح لاؤنج میں داخل ہوا۔اس کے دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس تھے۔چہرہ تمتما رہا تھا، دانت نکلے ہوئے تھے۔ارجمند کو دیکھ کر وہ ہر احتیاط بھول گیا۔

"چھوٹی چاچی! چھوٹی چاچی! چاچا آ گئے۔"

ارجمند کو چھوٹی چاچی کے سوا کچھ بھی سنائی نہیں دیا۔آگے کی بات تو اس کے شعور تک پہنچی ہی نہیں۔ساجد نے اتنی بلند آواز میں اسے چھوٹی چاچی کہا تھا اور وہ بھی لگاتار دو بار، کہ وہ بوکھلا گئی۔یہ آواز تو پورے گھر میں گونجی ہوگی، سب نے سن لی ہوگی۔

اس نے آنکھیں نکالیں اور ساجد کو گھورتے ہوئے تنبیہی لہجے میں کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے ساجد! میں نے کتنی بار تمہیں سمجھایا کہ......" وہ دبی دبی آواز میں بولی تھی کہ بات صرف ساجد تک پہنچے۔

ساجد اس کی بات سمجھ بھی نہیں سکا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں چھوٹی......"

ارجمند نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

"میری بات کیوں نہیں سنتے ساجد! کوئی سن لے تو۔"

اس بار ساجد کی سمجھ میں بات آ گئی۔

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ چاچا آ گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

ارجمند اس بار سنا بھی اور اس کے ہاتھوں میں سوٹ کیس بھی دیکھے۔وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑی ہوئی۔گود میں رکھی کتاب نیچے گر گئی۔

"آغا جی آ گئے......؟" اس کا دل عجب طرح دھڑکا۔اس نے جھک کر کتاب اٹھائی اور میز پر رکھی۔

اسی لمحے عبدالحق بیگ اٹھائے کمرے میں آیا۔اس کے پیچھے نور بانو تھی۔

ارجمند کے لئے وقت جیسے رک گیا۔وہ شاید خواب دیکھ رہی تھی۔

رابعہ کا کمرہ اندر کی طرف تھا۔اس تک ساجد کی آواز پہنچی ہی نہیں۔

لیکن حمیدہ نے وہ آواز صاف سنی۔البتہ اس کے ساتھ معاملہ ارجمند کے برعکس ہوا۔چھوٹی چاچی کی پکار اس کے ذہن کو چھو کر گزری ضرور، لیکن شعور تک نہیں پہنچی۔آگے کی بات اس پر حاوی آ گئی تھی...... چاچا آ گئے۔عبدالحق آ گیا؟ کیا سچ مچ!

وہ تو بابا کی بات پر صبر کئے بیٹھی تھی۔کبھی سوچتی ضرور تھی کہ ہو تو گئے برسوں، اور کتنے برس لگیں گے۔انتظار تو عبدالحق کے باپ بننے کا تھا، اور آرزو بھی۔لیکن قیمت یہ تھی کہ برسوں سے اس نے عبدالحق کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔وہ تو اس کی دید سے بھی محروم ہوگئی تھی۔

اور اب ساجد کہہ رہا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔وہ آ گیا ہے تو اس کا مطلب

ہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وہ مسہری سے اتری اور دروازے سے گزر کر لاؤنج کی طرف لپکی۔ ادھر سے وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو ادھر دوسرے دروازے سے عبدالحق آ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ سننے اور دیکھنے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

عبدالحق نے اسے دیکھا تو بیگ چھوڑا اور اس کی طرف لپکا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس لپٹائے ہوئے دھیرے دھیرے...... اماں...... اماں...... پکار رہا تھا۔

ادھر نور بانو نے ارجمند کو لپٹا لیا تھا۔ پھر اس نے ارجمند کو ہٹایا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اسے بہت غور سے دیکھا۔ ماشاء اللہ......! اس کے دل نے بے ساختہ کہا۔ سچ یہ تھا کہ اس کی گلنار بہت حسین تھی۔ لیکن ارجمند کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا تو وہ بھی بجھ جاتی۔ اور وہ بڑی ہوگئی تھی۔ اس کو دیکھنے کی خوشی دوچند ہوگئی۔

عبدالحق حمیدہ کو تکے جا رہا تھا۔ حمیدہ کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ ہل رہے تھے۔ عبدالحق نے کان لگا کر سنا۔ وہ کہہ رہی تھی، تیرا شکر ہے ربا! تیرا شکر ہے۔

خود عبدالحق نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ حمیدہ کو جیسا چھوڑ کر گیا تھا، وہ ویسی ہی ہے۔ ورنہ وہ بہت ڈرتا تھا کہ وہ بوڑھی ہوگئی ہوگی۔

''آنکھیں تو کھولو اماں......!''

حمیدہ اس وقت نظر اتارنے کی دعا پڑھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کے سینے پر دم کیا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''اماں......! میں شرمندہ ہوں کہ اتنے برس......''

''سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے پتر! اور اچھا ہی ہوتا ہے۔'' حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تیرا اس میں کیا قصور......؟''

''آؤ اماں......! اب بیٹھ جاؤ۔ تھک گئی ہوگی۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تھکن تو آج دور ہوگئی ہے پتر! ابھی تو اپنی پتری سے ملنا ہے مجھے۔'' وہ

عبدالحق کو چھوڑ کر نور بانو کی طرف بڑھی۔

نور بانو اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

حمیدہ نے اسے دیکھا تو اپنی بدگمانیوں پر شرمندہ ہوگئی۔ اسے دکھ ہونے لگا۔ نور بانو بہت کمزور ہوگئی تھی۔

''یہ تجھے کیا ہوگیا ہے دھیے......!'' اس نے بڑی محبت سے کہا۔

''کتنی کمزور ہوگئی ہے تو......!''

یہ سننا تھا کہ نور بانو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ کئی طرح کے آنسو تھے، جو گھل مل کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ شرمندگی کے بھی تھے، پچھتاوے کے بھی اور دکھ کے بھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں سے دور جا کے اس نے کیا پایا تھا...... تنہائی، خوف، زبردستی کی پالی ہوئی بیماری، جو اب سچ مچ بیماری بن گئی تھی، ایسی کہ اسے چیر پھاڑ کے لئے کہا جا رہا تھا۔

حمیدہ نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''تو فکر نہ کر دھیے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تیری ضرورت یہ ہے کہ میں تیرا خیال رکھوں۔''

نور بانو کے آنسو اور بڑھ گئے۔

عبدالحق اب ارجمند کے سامنے کھڑا تھا۔

''تم کیسی ہو ارجمند......!'' اس نے ابھی تک اسے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔

''الحمدللہ آغا جی! میں ٹھیک ہوں۔''

عبدالحق چونکا۔ یہ تو کوئی اجنبی آواز ہے۔ اس نے سوچا۔ ایسی کھنکتی ہوئی، روح میں اتر کر انجان سی چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی آواز تو نہیں تھی اس کی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا، اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ ایسا حسن، ایسی رنگت اور ایسا قد و قامت۔ اس کا سر اس کے کندھے کو چھو رہا تھا۔

ارجمند کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اور عبدالحق کے لئے نگاہیں جھکانا آسان نہیں رہا تھا۔ نہ وہ حسن پرست تھا اور نہ یہ بوالہوسی۔ لیکن پہلی بار اسے حسن کی طاقت کا احساس ہو رہا تھا۔ اطمینان کی بات بس یہ تھی کہ دل میں کوئی برا خیال نہیں

تھا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے ارجمند......؟'' اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''جی......! سب ٹھیک ہے۔''

''میٹرک تو تم نے کر لیا ہوگا۔''

ارجمند دھیرے سے ہنسی۔

''میں فورتھ ائیر میں ہوں آغا جی!'' اس بار اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

عبدالحق بوکھلا گیا۔

''ارے ہاں......! اتنے برس ہو گئے۔''

''آپ سے ایک شکایت کروں......؟''

''شکایت......؟'' عبدالحق اور گھبرا گیا۔

''ہاں ہاں......! کہو نا!''

''آپ نے مجھے اتنا نالائق سمجھا۔ حالانکہ میں آپ کی شاگرد ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں......!''

''آپ کو لگا کہ میں سات برس میں بھی میٹرک نہیں کر سکوں گی۔''

''نہیں نہیں! یہ بات نہیں۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ اتنا وقت گزر چکا ہے۔''

''آپ کے لئے سات برس ہوا کا جھونکا تھے۔'' اس بار اس کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔

''اور میں نے ان برسوں میں......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''میرا مطلب ہے کہ میں آٹھویں سے چلتے چلتے فورتھ ائیر میں آ گئی۔ کتنا فاصلہ طے کر لیا میں نے۔''

اس کی دل گرفتگی عبدالحق کے لئے دل کا بوجھ بن گئی۔

''سوری ارجی......!'' اس نے بے تکلفی سے پکار کر ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

اور ارجمند کھل اٹھی۔ عبدالحق نے پہلی بار اسے ایسے پکارا تھا۔ لیکن عبدالحق کو پتا نہیں چلا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

''یوں ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ ورنہ یہ برس سب سے زیادہ بھاری تو مجھ پر تھے۔ تمہارے ساتھ تو سب تھے، جبکہ میں وہاں اکیلا تھا۔''

''یہ اکیلا پن تو اندر کی بات ہے آغا جی! ورنہ آدمی بھری محفل میں بھی اکیلا رہتا ہے۔''

ہر طرح سے بڑی ہو گئی یہ لڑکی۔ عبدالحق نے سوچا۔ پھر اس نے شوخی سے کہا۔

''لیکن حساب میں کمزور ہو تم۔ میں سات برس دور نہیں رہا۔ وہ تو چھ سال تھے۔''

''میں نے تو اپنے تعلیمی سفر سے حساب لگا کر کہا ہے۔'' ارجمند نے وضاحت کی۔

''اب رہی حساب کی بات تو آپ چھ سال سات ماہ اٹھارہ دن کے بعد واپس آئے ہیں۔ بس اس میں سے سوا دو گھنٹے کم کر لیں۔''

''اتنا حساب تو میں نے نہیں لگایا تھا۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ ہے نا اکیلے پن کی بات!'' ارجمند بولی۔ پھر رخ بدلتے ہوئے کہا۔

''آپ بیٹھیں! میں آپ کے لئے کچھ کروں۔ آپ نے تو استقبال کی خوشی بھی نہیں دی ہمیں۔''

اور عبدالحق کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

''تمہارے لئے استقبال میں زیادہ خوشی ہوتی اس سرپرائز سے۔'' عبدالحق بڑبڑایا۔

✿ ✿ ✿

نور بانو نے بہت سوچا تھا، اور دور تک سوچا تھا۔ بڑی طویل منصوبہ بندی کی تھی اس نے۔ اسے یاد تھا کہ کراچی جانے سے چند دن پہلے تک کیا معاملات چل رہے تھے۔ حمیدہ اسے کسی بابا کے پاس لے جانا چاہتی تھی، اور اس نے محسوس

کیا تھا کہ وہ کوئی پہنچی ہوئی ہستی ہے، اسے اس کا بھید معلوم ہے...... یہ بھید کہ اس نے مقبول وقت میں اپنے لئے خود اولاد نہ ہونے کی دعا کی تھی۔ لیکن وہ اس کا اعتراف کسی کے سامنے بھی نہیں کر سکتی تھی، اور حمیدہ کے سامنے تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اس لئے اس نے حمیدہ کے ساتھ اس بابا کے پاس جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر حمیدہ نے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ عین وقت پر اللہ نے مدد کی اور عبدالحق کا کراچی تبادلہ ہو گیا۔ ورنہ نہ جانے کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔

لیکن نوربانو مسائل کو بھولنے والی نہیں تھی۔ اس کی کبوتر کی فطرت نہیں تھی، جو آنکھیں بند کر کے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب وہ بلی کو نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔ اور وہ ایسی بھی نہیں تھی کہ خطرہ ٹل جانے پر سکون کا سانس لے اور مطمئن ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے نزدیک خطرے کا ٹلنا اس کے لئے مہلت تھی کہ وہ خطرے کا تدارک کرنے کے بارے میں سوچے۔

چنانچہ کراچی میں وہ سوچتی رہی۔ ذہین تو وہ تھی ہی۔ یہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا کے رہے گی، اور عبدالحق نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہیں کر سکے گا۔ تو اس سے بہتر تھا کہ وہ خود ہی عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے۔

دوسری بات یہ کہ یہ اس کے لئے بہت بڑا طعنہ تھا۔ اس کی انا پر بڑی ضرب تھی کہ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ بے شک اپنی اس احمقانہ دعا پر وہ پچھتاتی تھی۔ لیکن کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ وہ تو کمان سے نکلا ہوا تیر تھا، جو نشانے پر بھی جا بیٹھا تھا۔ وہ اس دعا کے ردّ کے لئے دعا کر سکتی تھی، اور اس نے بہت دعا کی تھی۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اس دعا کی قبولیت کے بعد اب یہ دعا قبول نہیں ہو گی۔

تو اب اس کا ایک ارمان تھا...... یہ کہ حمیدہ کو ماں بن کر دکھائے۔ اور اللہ کی مرضی کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ لیکن کچھ ترکیب تو کر سکتی تھی۔ ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ ماں نہیں بن سکتی۔ مگر دوسروں کو دکھا تو سکتی ہے، ان پر ثابت تو کر سکتی ہے کہ وہ ماں بن گئی ہے۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے ایک منصوبہ بنا لیا تھا، جو عمل درآمد کے اعتبار سے دشوار تھا۔ لیکن ناممکن نہیں تھا۔ بس اسے موجود وسائل کو سلیقے اور ذہانت سے استعمال کرنا تھا، اور ایسی دھند پھیلانا تھی کہ کسی کو کچھ نظر نہ آئے۔

اب وہ حمیدہ سے بات کرنے کے لئے بے تاب ہو رہی تھی۔ لیکن عبدالحق حمیدہ کے پاس سے اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ اسے حمیدہ سے تنہائی میں بات کرنا تھی۔ بالآخر زبیر آیا تو اسے موقع مل ہی گیا۔

عبدالحق کمرے سے نکلا اور زبیر کے پاس گیا تو وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور پھر حمیدہ کے پاس جا بیٹھی۔

حمیدہ حیران نظر آئی۔

’’کیا بات ہے نوربانو! دروازہ کیوں بند کر لیا تو نے؟‘‘

’’اکیلے میں بہت خاص بات کرنی ہے تم سے اماں!‘‘

حمیدہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

’’ایسی کیا بات ہے دھیے!‘‘

’’اماں! عبدالحق صاحب کی نسل آگے نہ بڑھے، یہ تو بڑا ظلم ہو گا۔‘‘

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔ بس اثبات میں سر ہلا دیا۔

’’میرے دل میں ایک خیال آتا رہا ہے اماں...... ! یہ کہ ہم ان کی دوسری شادی کرا دیں۔‘‘

حمیدہ کی حیرت دو چند ہو گئی۔

’’یہ کیسی بات کر رہی ہے تو......؟‘‘

’’یہ تو تم بھی کہتی تھیں اماں! یاد نہیں تمہیں۔ لیکن اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔‘‘

’’تو اب کیا ہو گیا......؟‘‘

’’میں نے جان لیا کہ میں تنگ دل اور خود غرض ہوں، اور ایسے لوگوں کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔‘‘

حمیدہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو پھر......؟"

"میں نے سوچا، کیوں نہ اپنا دل بڑا کروں اور خود سے زیادہ دوسروں کے لئے سوچوں۔ میرے دل میں آیا کہ اگر میں خود عبدالحق صاحب کی دوسری شادی کرا دوں، اور وہ بھی ہنسی خوشی، محبت کے ساتھ تو ممکن ہے، اللہ کو یہ بات پسند آ ئے۔"

"اللہ ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتا ہے دھیے!" حمیدہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

نور بانو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"اور کون جانے کہ اللہ میرے اس خلوص سے خوش ہو کر مجھے اولاد ہی دے دے۔"

"بے شک پتری! اللہ بڑا مہربان ہے۔ اس کے ہاں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ سب خزانے اس کے ہیں۔ وہ جسے جو چاہے عطا کر دے۔"

"بس تو میں یہ فیصلہ کر کے آئی ہوں اماں! تین دن میں صاحب کی شادی کرانی ہے۔"

"تین دن......!" حمیدہ کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔

"کوئی گڈے گڑیا کی شادی ہے؟ ارے پہلے تو......"

نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"صرف ایک مہینے کی چھٹی ملی ہے انہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اپنی دُلہن کے ساتھ گزار لیں۔"

"ایسا کیا ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ کراچی بھی تو لے جا سکتا ہے۔" حمیدہ نے اعتراض کیا۔

نور بانو سب کچھ سوچ کر آئی تھی۔

"نہیں لے جا سکتے۔ اس کی وجہ میں بعد میں بتاؤں گی۔" نور بانو نے کہا۔

"بات یہ ہے اماں! کہ میں اب کراچی نہیں جاؤں گی۔ یہیں علاج

کراؤں گی اپنا۔"

"تب تو اس کی دلہن کو اسی کے ساتھ جانا ہی چاہئے۔ وہ وہاں اکیلا رہے گا کیا......؟"

"میں نے کہا نا اماں! کہ اس پر بعد میں بات کریں گے۔"

"پر یہ تو بتا کہ یہ سب کچھ اچانک تجھ پر سوار کیوں ہو گیا......؟"

"ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتا دی اماں!" نور بانو نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اب دوسری بات بھی سن لو۔ میری صحت ایک دم سے بہت خراب ہوئی ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتیں کہ کیسی تکلیف ہوتی ہے مجھے۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں اماں......!" اس کی آواز رندھ گئی۔

"سوچا! اپنی زندگی میں ہی عبدالحق کی شادی کرا دوں۔ اگر میں یوں ہی مر گئی تو......"

"اللہ نہ کرے......!" حمیدہ نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ماؤں سے ایسی بات نہیں کرتے پتری!"

نور بانو نے نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے نا اماں! لیکن مجھے ڈر لگتا ہے کہ میرے بعد شاید عبدالحق صاحب تمہارے کہنے پر بھی دوسری شادی کے لئے تیار نہ ہوں۔"

حمیدہ نے اس پر سوچا۔ واقعی، یہ ناممکن تو نہیں ہے۔

"لیکن یہ تین دن والی بات سمجھ نہیں آئی مجھے۔" اس نے کہا۔

"دیکھو نا، ابھی تو اس کے لئے لڑکی تلاش کرنی ہے......"

"میں بہت سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہوں اماں......!" نور بانو نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"لڑکی بھی میں نے تلاش کر لی ہے۔"

اس پر حمیدہ کے کان کھڑے ہوئے۔

"اور مجھے پتا بھی نہیں۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

"مجھے خود ابھی پتا چلا ہے۔"

"کیا مطلب ..... ؟"

"تم نے کب سے ارجمند کو غور سے نہیں دیکھا اماں ..... ؟"

حمیدہ کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔

اس کی کیفیت سے بے خبر نور بانو اپنی کہے جا رہی تھی۔

"وہ کتنی بڑی ہوگئی ہے اماں! اور کتنی خوب صورت۔ چاند گھر میں ہے اماں! تو ہم داغ ڈھونڈنے گھر کے باہر کیوں پھریں؟ یہ تو بے وقوفی ہوگی۔"

حمیدہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ خواب اس کا، اور تعبیر دینے والی نور بانو ..... نور بانو ..... !

"اب بولو اماں! ایسے میں تین دن کم تو نہیں ہوتے۔ خریداری کے لئے دو دن بہت ہیں۔"

چند لمحے تو حمیدہ سے بولا ہی نہیں گیا۔

"لیکن نکی کی مرضی نہ ہوئی تو ..... " دل کا اندیشہ بالآخر زبان پر آ گیا۔

"تم فکر نہ کرو اماں! میں ہوں نا ..... ! یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ انہیں بھی میں ہی منا لوں گی اور ارجی کو بھی۔ تم بس تیاری کرو شادی کی۔ کل صبح میں تمہیں پکی خوشی خبری سناؤں گی۔ پھر رابعہ آپا سے بھی بات کر لینا اور گاؤں بھی فون کر دینا زرینہ کو ..... اور مسعود چچا کو بھی۔"

"ٹھیک ہے ..... !" حمیدہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب نور بانو اٹھی اور کب دروازہ کھول کر چلی گئی۔

وہ تو جاگتی آنکھوں خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن دل میں اندیشے بھی تھے۔ کہیں نکی ..... لیکن نہیں، وہ تو بتا چکی تھی کہ وہ کسی کو پسند نہیں کرتی۔ لیکن عبدالحق کیسے مانے گا؟ وہ تو اس کے سامنے کی بچی ہے۔ وہ تو اسے بچی ہی سمجھتا ہے۔

اچانک اس کی سماعت میں بابا کی آواز گونجی ..... تجھے کچھ نہیں کرنا، تیری بہو خود ہی کرائے گی تیرے بیٹے کی دوسری شادی۔ وہ نادان اسے بھی کھیل سمجھ کر کھیلے گی۔ اور وہ کھل اٹھی۔ اللہ کے ولی کی بات سچی ثابت ہوئی۔ اس نے خوش ہو کر

سوچا۔

لیکن آگے کی بات نے اسے ڈرا دیا۔ اگر یہ نور بانو کا کھیل ہے تو کیسا کھیل ہے؟ اس میں اس کا کیا فائدہ؟ وہ کیا چاہتی ہے؟ کیا سوچا ہے اس نے؟ نہیں، مجھے تو اس کی باتوں میں خلوص ہی نظر آیا ہے۔ بندہ تائب بھی تو ہو جاتا ہے۔

وہ الجھنے لگی ..... نور بانو سے پوچھے، اسے کریدے .....

بابا کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی ..... اور تجھے میں سختی سے تاکید کر رہا ہوں کہ تو خود کچھ بھی نہیں کرنا۔ زبان سے بھی کچھ نہ کہنا۔ سب اللہ پر چھوڑ دے، اپنے بیٹے کی طرح۔

اور اسے سکون آ گیا۔

بابا نے کہا تھا ..... تجھے تو بس پوتا چاہئے، وہ انشاء اللہ تجھے مل جائے گا۔ اور کیا چاہئے تجھے؟

تیرا شکر ہے ربا ..... ! پر بندہ تو محتاج ہے۔ کچھ نہ کچھ مانگتا ہی رہے گا۔ وہ بڑبڑائی۔ اس نے جواب میں یہ کہنے کی غلطی نہیں کی کہ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ یہ سبق تو اس نے نور بانو سے ہی سیکھا تھا۔ بندے کو بھی یہ کہنے کی غلطی نہیں کرنی چاہئے کہ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ ارے ..... ! بندہ تو محتاج ہے اپنے رب کا۔ اس کا اعلان کرتے رہنا چاہئے۔

اور بابا نے کہا تھا ..... کون جانے، تجھے بہو وہ ملے جو تجھے دل سے پسند ہو۔

اور یہ سچ تھا۔ اسے ایسی ہی بہو مل رہی تھی، اور وہ بھی بن مانگے۔

اس نے ذہن پر زور دیا۔

اور بابا نے کہا تھا۔ کون جانے، وہ تیرے بیٹے کو اس کا کھویا ہوا مرتبہ اور مقام دلانے والی ہو۔

مجھے تو نہیں معلوم کہ عبدالحق کا کوئی مقام اور مرتبہ تھا، جو کھو گیا ہے، اس نے سوچا۔

اور بابا نے کہا تھا ..... کون جانے، وہ اس کی تقدیر بدل دینے والی ہو۔
اولاد ہوگی تو تقدیر تو بدلے گی نا!

اور آخر میں بابا نے کہا تھا ... کون جانے، بس اللہ ہی جانے۔

وہ مطمئن اور پُرسکون ہوگئی۔ سچ تو ہے۔ کوئی نہیں جان سکتا۔ بس اللہ یہ جانتا ہے۔

اس کی خوشی کو کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بے قرار تھی کہ جلدی سے مغرب ہو تو وہ نماز کے بعد شکر کے نفل بھی پڑھے۔

❁ ❁ ❁

ارجمند تو اپنی خوشی میں کچن میں یوں گھسی کہ درمیان میں صرف نماز کے لئے ہی نکلی۔ شام کی چائے پر اس نے بالکل اہتمام نہیں کیا کہ اس کے بعد شاید کھانا ٹھیک سے نہ کھایا جائے۔

شام کی چائے باہر لان میں پی گئی اور وہاں سب موجود تھے۔ پرانے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔ لیکن ارجمند کو تو کھانے کی فکر تھی۔ وہ چائے پیتے ہی اندر جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اتنے برسوں کے بعد ملے ہیں، اور تم بات ہی نہیں کر رہی ہو۔'' نوربانو نے شکایتاً کہا۔ یہ بات آمد کے بعد سے اب تک وہ مسلسل محسوس کر رہی تھی کہ ایک بار ملنے کے بعد ارجمند سامنے ہی نہیں آئی ہے۔ اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا تھا۔

''کہیں تم خفا تو نہیں ہو ہم سے ....؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپی! میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں بھلا!''

اس پر عبدالحق کو لگا کہ ارجمند شاید اس سے خفا ہے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ خاموش رہا۔

''تو پھر ہمارے پاس بیٹھتی کیوں نہیں؟ باتیں کیوں نہیں کرتیں ہم سے؟'' نوربانو بولی۔

''رات کے کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے آپی!'' ارجمند نے جواب دیا اور جیسے رسی تڑا کر بھاگ نکلی۔

نوربانو کے لئے یہ تشویش کی بات تھی۔ اتنا سن کر بھی نہیں رکی ارجمند، کہیں کوئی بات تو نہیں۔

اس کے بعد تو وہ پریشان ہی رہی۔ اس کے منصوبے میں ارجمند کی خاص اہمیت تھی۔ اس کے بغیر تو کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اب تو وہ حمیدہ کے سامنے بات بھی منہ سے نکال بیٹھی تھی۔

اس کے بعد وہ تمام وقت اپنے کمرے میں بند اسی پر سوچتی رہی۔ ارجمند نے ایک بار بھی آ کر اسے نہیں پوچھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ منصوبہ بناتے ہوئے وہ سب سے اہم بات نظر انداز کر گئی تھی۔ ارجمند اسے سچ مچ بہت چاہتی تھی، اور وہ خود بھی اس سے ایسی ہی محبت کرتی تھی۔ ورنہ اپنی عزیز ترین متاع میں اس کے ساتھ ساجھے کا کیوں سوچتی؟ لیکن جب تک ارجمند سامنے تھی تو اور بات تھی۔ جب وہ یہاں سے فرار ہوگئی تو معاملات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ چھ سال کی دوری بہت ہوتی ہے، اور وہ بھی ایک بڑی ہوتی ہوئی بچی کے معاملے میں۔ جب وہ اسے چھوڑ کر گئی تھی تو وہ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، اور اب واپس آئی ہے تو وہ چودھویں جماعت پاس کرنے والی ہے۔ اس دوران وہ کالج میں بھی تو پڑھی ہے۔ عبدالحق کی طرح۔ اور وہاں لڑکے بھی ہوتے ہوں گے۔ ارجمند اس عمر میں تھی، جہاں لڑکیوں کو محض محبت سے محبت ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی اچھا لگنے لگتا ہے۔

نوربانو کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اس نے واقعی بڑی غفلت کی۔ اسے پہلے ہی سے ارجمند کو تیار کرنا چاہئے تھا۔ لیکن کیسے کرتی۔ وہ بچی ہی تو تھی اس سے ایسی بات کیسے کرتی؟

دراصل چھ سال کی دوری میں بھی وہ اسے وہی بچی لگی۔ آدمی کسی کو چھوڑ کر دور جاتا ہے تو کتنے ہی برس دور رہے، ان کی آنکھوں میں اس کی وہی آخری دید رہتی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو ارجمند کو دیکھ کر اسے جھٹکا کیوں لگتا؟ وہ تو حیران رہ گئی تھی اسے دیکھ کر۔ ارے .....! ارجمند تو جوان ہوگئی اور کتنی حسین ہے۔ اتنا لمبا قد۔ کالج میں کتنے ہی لڑکے اس کے خواب دیکھتے ہوں گے۔ اچھی تو وہ بھی

کو لگتی ہوگی۔ حسن کی تعری اور اس عمر میں، لڑکیاں تو موم ہو جاتی ہیں۔ کچھ عجب تو نہیں کہ اسے بھی کسی سے محبت ہوگئی ہو۔ اگر ایسا ہوگیا ہے تو معاملہ آسان نہیں۔

مگر اس کے اندر کہیں یہ اعتماد بھی تھا کہ اس صورت میں بھی وہ ارجمند کو رضامند کر لے گی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہیں سوچا کہ اس طرح وہ ارجمند کو اس کی بہت بڑی خوشی سے محروم کرے گی، بلکہ اسے بددیانتی میں بھی مبتلا کرے گی۔ اور یہ کہ یہ اس کی خودغرضی ہوگی۔

بہرحال وہ متردّد ہی رہی۔

لیکن جب کھانا لگا تو وہ حیران رہ گئی۔ ارجمند نے کئی طرح کے کھانے پکائے تھے۔ یہ سب کرنا تھا تو وہ کسی کو وقت کیسے دے سکتی تھی؟ اور یہ بھی اس کی محبت کا ہی ثبوت تھا۔

حمیدہ خود حیران تھی۔

''لڑکی.....! اتنا کچھ کرلیا تو نے.....؟''

اور عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

''اتنی بھوک لگ رہی ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کھاؤں؟''

''سب کچھ کھائیں آغا جی.....!''

''اتنا کھانا دیکھ کر تو بھوک ہی ختم ہوگئی میری۔''

''تو میری محنت رائیگاں گئی؟'' ارجمند نے اداسی سے کہا۔

حمیدہ نے عبدالحق کو خفگی سے گھورا۔ وہ پہلے ہی شرمندہ ہورہا تھا۔

''میں نے تو محاورۃً کہا تھا ارجمند!'' وہ جلدی سے بولا۔

''ورنہ اب تم دیکھنا، یہ تو کم پڑ جائے گا۔''

ارجمند بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔

''اس کی فکر نہ کریں آغا جی! میں اور لے آؤں گی۔''

اور جب کھانا شروع ہوا تو سبھی نے بہت اچھی طرح کھایا، اور سبھی نے تعریف کی۔

''بھئی! میں تو زیادہ ہی کھا گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''برسوں کا بھوکا تھا۔ برسوں سے ایسا کھانا نہیں کھایا تھا۔''

اس پر نور بانو اسے گھورنے لگی۔ عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''میں تو کھانا پکانا ہی بھول گئی اماں!'' نور بانو نے وضاحت کی۔

''طبیعت ہی اتنی خراب رہتی تھی۔''

''وہ تو نظر آرہا ہے۔'' حمیدہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''کیا حال ہوگیا ہے تیرا! پر تو فکر نہ کر۔ میں سب ٹھیک کردوں گی۔''

یوں موضوع بدل گیا۔

کھانے کے بعد نور بانو نے سرگوشی میں ارجمند سے کہا۔

''اب تو میرے پاس بیٹھو گی نا تم..... ؟''

''نماز پڑھ کر آتی ہوں آپی!''

''میں اپنے کمرے میں ہوں۔ خوب باتیں کریں گے ہم۔ میں تو ترس گئی ہوں تم سے باتیں کرنے کے لئے۔''

ارجمند خوشی سے مسکرائی۔

''میرا بھی یہی حال ہے آپی.....!''

❁ ❁ ❁

رات برسوں کے بعد ملنے والوں کی دو محفلیں سجیں۔ ایک حمیدہ کے کمرے میں، جہاں رابعہ، زبیر اور ساجد بھی تھے۔ دوسری عبدالحق کی خواب گاہ میں، جہاں بس نور بانو اور ارجمند تھیں۔

پہلے تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ارجمند نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''آپ بہت کمزور ہوگئی ہیں آپی! کراچی میں رہ کر صحت بہت خراب ہوگئی آپ کی۔ اس سے تو اچھا تھا آپ کراچی نہ جاتیں۔''

''یہ وہ بات نہیں پگلی.....!'' نور بانو نے آہ بھر کر کہا۔ اب وہ سوچی سمجھی گفتگو کرنے والی تھی۔

''یہ تو اندر کا روگ ہے میری گڑیا.....!''

"کیسا روگ آپی......! مجھے بھی نہیں بتائیں گی......؟"

"تم سے تو میں دل کی ہر بات کہہ سکتی ہوں۔ ایک تم ہی تو ہو۔ لیکن یہ تو کھلا روگ ہے۔"

"میں سمجھی نہیں آپی......!"

"مجھے اولاد کی بڑی آرزو ہے۔ کسے نہیں ہوتی۔ مگر اللہ کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اب یہ آرزو روگ بنی تو صرف عبدالحق صاحب کی خاطر۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کی نسل آگے نہ بڑھے، انہی پر ختم ہو جائے۔"

"اللہ نہ کرے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

"یہ روگ مجھے اندر ہی اندر چاٹ رہا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ! میں بہت دعا کرتی ہوں آپی!" ارجمند نے بڑے خلوص سے کہا۔

"مجھے لگا ہے کہ میرے اندر کوئی کمی ہے۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔"

"ایسی ناامیدی کی باتیں نہیں کرتے آپی!"

"یہی تو بات ہے ارجی! میں امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتی۔ لیکن میں حقیقت پسند بھی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے نصیب میں ماں بننا نہیں ہے۔"

"یہ ناامیدی نہیں تو اور کیا ہے؟" ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"میں ناامید کب ہوں۔ حقیقت سامنے رکھتی ہوں، اور مسئلے کا حل سوچتی ہوں۔ امید تو نہیں چھوڑی میں نے۔ میں ماں نہیں بن سکتی، لیکن مجھے اولاد مل سکتی ہے۔ میں نے بہت سوچا ہے اس پر۔ بس ایک ہی حل ہے۔ صرف تم ہی میری مدد کر سکتی ہو۔"

"میں تو بہت دعا کرتی ہوں آپی!" ارجمند نے سادگی سے کہا۔

"لیکن اس کے لئے دعا کے ساتھ اور کچھ بھی کرنا ہوگا تمہیں۔"

"میں آپ کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں آپی!"

"سوچ لو......! کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔"

عشق کا شین (حصہ چہارم) 233

"میرے لئے کرنا زیادہ آسان ہے کہنے سے۔ آپ بس مجھے یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ! تم کسی کو پسند کرتی ہو......؟ کسی سے محبت کرتی ہو......؟"

سوال اتنا اچانک تھا کہ ارجمند کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"جی......!" لیکن جی ہاں کہنے سے پہلے ہی اس نے خود کو روک لیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"جی نہیں آپی!"

سوال کرتے ہوئے نور بانو نے اس کے چہرے پر نظر رکھی تھی۔ اس نے ارجمند کے نہ کہنے کے باوجود وہ "جی ہاں" سمجھ لیا۔ اس نے جان لیا کہ بعد کی "جی نہیں" محض رسمی تھی۔ وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی۔ لیکن تھی وہ دھن کی پکی۔ ایک کم عمر لڑکی کو اس کی محبت سے ہٹانا آسان نہیں تھا، لیکن ناممکن بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ وہ اس کے لئے بہت ضروری تھا۔ اسے ہر صورت میں رضامند کرنا تھا۔

"تم کچھ بھی کر سکتی ہو میرے لئے......؟" اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

اس بار ارجمند نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی آپی......! میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

اپنے آنسوؤں پر نور بانو کو پورا کنٹرول تھا۔ وہ جب چاہتی، رو سکتی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔

"کیا ہو گیا آپی! ایسے نہ روئیں۔" ارجمند نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"میرا دل کٹتا ہے آپی!"

نور بانو کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"آپ تو کچھ کہہ رہی تھیں کہ آپ امید نہیں چھوڑتیں، اور آپ نے کہا کہ میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں، تو پھر رو کیوں رہی ہیں؟ حکم دیں مجھے۔"

"یہ سچ ہے کہ صرف تم ہی مجھے اولاد دلا سکتی ہو۔" نور بانو نے ہچکیوں کے

درمیان کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتی یہ بات ......!'' ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

''اولاد بازار میں ملتی ہوتی تو میں آپ کی گود بھر دیتی۔''

''تم اس کے باوجود میری گود بھر سکتی ہو۔''

''تو مجھے بتائیں تو ..... حکم تو کریں۔'' ارجمند نوربانو کی تیار کی ہوئی رو میں بہہ رہی تھی۔

''لیکن تم میری بہن ہو..... میری کھوئی ہوئی بہن ..... جو اللہ کی رحمت سے مجھے واپس مل گئی۔ اور جو کچھ میں تم سے چاہتی ہوں، وہ بہت بڑی خودغرضی ہے۔ میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟ تم سے اتنی بڑی قربانی......تمہارے وجود کی قربانی کیسے مانگ سکتی ہوں میں......؟''

''میں جو کہہ رہی ہوں آپ سے۔ میں کچھ بھی کر سکتی ہوں آپ کے لئے۔''

''تم اپنی محبت قربان کر سکتی ہو میرے لئے .....؟'' نوربانو نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

ارجمند کے ہوش اُڑ گئے۔ کیا آپی جانتی ہیں میری محبت کے بارے میں؟ اور قربانی؟ پھر اسے خیال آیا کہ اس کا دل اسے کیسے کیسے یقین دلاتا رہا ہے۔

''آپی! مجھے کسی سے محبت نہیں۔'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ہوتی تو بھی میں اسے آپ کے لئے قربان کر دیتی۔''

نوربانو کا یقین پختہ ہوگیا کہ ارجمند کسی سے محبت کرتی ہے۔ لیکن یہ اطمینان بھی ہوگیا کہ اب وہ اس کی بات نہیں ٹالے گی۔

''تمہیں میری خاطر ..... میری گڑیا ..... ! بہن ..... ! میری خاطر شادی کرنی ہوگی۔''

ارجمند کا چہرہ فق ہوگیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے نوربانو کو دیکھتی رہی۔ اس کے وجود میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

''ہاں......! تمہیں اپنے آغا جی سے شادی کرنی ہوگی۔''

ارجمند کے چہرے کا تاثر تیزی سے بدلا۔ اب وہاں حیرت ہی حیرت تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' وہ کہیں دور سے بول رہی تھی۔

نوربانو نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری خاطر میری جان .....!'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''یہی ایک صورت ہے گڑیا......! میں جانتی ہوں کہ میں تم سے بہت بڑی قربانی مانگ رہی ہوں۔ لیکن بہن سمجھتی ہوں تمہیں، تو یہ تم پر میرا حق بھی ہے۔ یہ مجھ پر احسان ہوگا تمہارا، جو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔''

ارجمند نے سنا تھا اور بالکل صاف سنا تھا۔ لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ شاید آپی سے کہنے میں غلطی ہوئی ہے یا پھر اس نے سننے میں۔

''یہ..... یہ کیسے ممکن ہے آپی!''

''کیوں ممکن نہیں؟'' نوربانو نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

''خدا گواہ ہے کہ میں تمہیں اپنی چھوٹی بہن گلنار کا مقام دیتی ہوں، اتنی ہی محبت کرتی ہوں تم سے۔ لیکن خدا کا شکر کہ تم گلنار نہیں ہو۔ میں اور تم چاہے سمجھیں، لیکن اللہ کے ہاں ہم سگی بہنیں تو نہیں ہیں۔ ورنہ تو میں تم سے یہ بات نہیں کہہ سکتی تھی، کیونکہ اللہ نے دو سگی بہنوں کو نکاح میں یکجا کرنا حرام کیا ہے مردوں پر۔''

تو یہ سچ ہے۔ ارجمند نے بے یقینی سے سوچا۔ یہ وضاحت ثابت کر رہی ہے۔ نہیں ..... یہ ضرور کوئی خواب ہے۔

نوربانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اس بے یقینی کو ہچکچاہٹ پر محمول کیا۔

''میں جانتی ہوں کہ تم نے کبھی اپنے آغا جی کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا ..... سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اور وہ تم سے بہت بڑے ہیں عمر میں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ وہ بہت اچھے ہیں۔ اور پھر تم مجھ پر احسان کر رہی ہو۔''

ارجمند اب ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ یہ کیسی اَن ہونی تھی۔ آپی خود اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کر رہی ہیں، اور کہہ رہی ہیں کہ یہ ان پر احسان ہوگا۔ یہ تو آغا جی پر کسی کی پرچھائیں بھی برداشت کرنے والی نہیں۔ اور یہ خود میرے دل کی مراد میری جھولی میں ڈال رہی ہیں۔ میرے اندر بیٹھے اللہ میاں نے یہی کہا تھا...... سب کچھ ہوگا، مگر اپنے مقررہ وقت پر۔ تو وہ اللہ میاں ہی تھے۔ اور وقت آ گیا۔

اس کی سوچوں نے نور بانو کو پریشان کر دیا۔

''میری خاطر...... میری بہن......! میری خاطر ہاں کر دو۔'' اس نے ارجمند کو جھنجوڑ دیا۔

ارجمند نے ان لمحوں میں یہ بات سمجھ لی کہ اسے آغا جان میں اپنی دلچسپی، ان کی محبت چھپانی ہے۔ ورنہ آپی کو تکلیف ہوگی۔ اللہ جس طرح سے عطا فرما رہا ہے، اسی طرح سے اسے قبول کرنا ہوگا۔ اور اظہار کی ضرورت بھی کیا ہے، جبکہ آغا جان اسے مل رہے ہیں۔

''مجھ پر احسان کر دو میری بہن......!'' نور بانو کا بس نہ چلا تو وہ رونے لگی۔

ارجمند سچ مچ تڑپ گئی۔ یہ تو ناشکرا پن ہوگا کہ اس کی جھولی منہ مانگی خوشیوں سے بھرنے والی نور بانو روئے۔ اس نے نور بانو کو لپٹا لیا۔

''احسان کیسا آپی! یہ تو آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھ پر مان کیا، بہن سمجھا، میں آپ کو انکار کر سکتی ہوں بھلا؟''

نور بانو خوشی سے ہنس دی۔

''میں آخری سانس تک تمہاری شکر گزار رہوں گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں آپی! یہ تو بہنوں کا معاملہ ہے۔ مگر مجھے ایک الجھن ہے۔ میں ہی کیوں؟ آغا جی اتنے اچھے ہیں۔ ان کے لئے کوئی کمی تو نہیں تھی۔ پھر میں ہی کیوں......؟''

نور بانو نے محبت سے اس کے رخسار تھپتھپائے۔

''تم بہت معصوم ہو پگلی! کچھ بھی نہیں سمجھتیں۔'' اس نے بے حد محبت سے کہا۔

''تمہارے آغا جی میرا بہت قیمتی خزانہ ہے۔ اس خزانے میں سے کسی کو ایک ذرّہ دینا بھی مجھے گوارہ نہیں۔ ان کی دوسری شادی کے مقابلے میں تو مجھے مرنا قبول ہوتا۔ لیکن اللہ نے مجھے تمہاری ایسی محبت دی ہے کہ اگر مجھے پتا چلے کہ اس میں تمہاری خوشی ہے تو پورا خزانہ تمہیں دے دوں۔ یہ تو خیر میں اپنی غرض کے لئے کر رہی ہوں۔ لیکن سچ کہہ رہی ہوں ارجی! دنیا میں ایک تمہی تو ہو، جس کے ساتھ میں ان کا ساجھا کر سکتی ہوں۔''

اللہ کے کام کیسے ہوتے ہیں، جس سے جو چاہے دلا دے کسی کو۔ ارجمند نے سوچا۔

''چلیں آپی! میں نے آپ کی بات مان لی۔ مگر مجھے یہ تو بتائیں کہ اس سے آپ کو اولاد کیسے ملے گی؟''

''ابھی تم یہ باتیں سمجھتی نہیں ہو۔'' نور بانو نے مربیانہ انداز میں کہا۔

''بس تم میرے کہنے پر عمل کرتی رہنا۔ سب کچھ ہو جائے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔'' وہ چند لمحے خاموشی سے کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔

''مگر ایک بات پہلے ہی بتا دوں۔ تمہیں اپنا بچہ مجھے دینا ہوگا۔''

ارجمند تو بیر بہوٹی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

''اور وہ بھی ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ لوگ یہی سمجھیں کہ وہ میرا بچہ ہے۔''

ارجمند پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ کیسے ممکن ہے، لیکن شرم سے نہ پوچھ سکی۔

''آپ جانیں آپی! میں تو بس وہی کروں گی جو آپ کہیں گی۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ خوش رہو میری بہن......! اتنی قربانی تو میری گلنار بھی نہیں دیتی میرے لئے۔'' نور بانو نے کہا۔ پھر کچھ یاد آیا تو وہ اداس ہوگئی۔

''اور گلنار کو تو بڑی آرزو تھی بھائی کی۔ وہ تو انہیں بھائی سمجھتی تھی۔'' وہ پھر بولی۔

"تم نے تو کبھی انہیں بھائی نہیں سمجھا نا.....؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"نہیں آپی.....!" ارجمند نے بے ساختہ کہا اور فوراً ہی گھبرا بھی گئی۔

"خدا کا شکر ہے.....!" نور بانو نے بے حد خلوص سے کہا۔

❁ ❁ ❁

ارجمند نے نور بانو کے پاس سے آتے ہی شکر کے دو نفل ادا کئے، اور وہ سجدے میں روتی رہی۔ اتنی بڑی نعمت جو اس طرح بے گمان ملی اور خیر کے ساتھ ملی، تو اس کے پاس اس کا شکر ادا کرنے کے لئے لفظ تھے ہی نہیں۔ اور آنسوؤں سے اچھا، سچا اور بلیغ ترجمان کوئی نہیں ہوتا۔

وہ ایسی خوش تھی کہ اس رات وہ سو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی سوچتی رہی۔ اپنی زندگی کے بارے میں۔ کہاں کہاں سے گزر کر وہ کہاں پہنچی تھی۔ زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے عبارت تھا۔

اسے یاد تھا کہ وہ نیلم بائی کے گھر کیسے پہنچی تھی۔ وہ معصوم بچی تھی۔ لیکن اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ ہر بات یاد تھی اسے۔ لیکن وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔

لیکن اب وہ سب کچھ سمجھ چکی تھی۔

اُردو ادب سے اسے لگاؤ تھا۔ کالج میں تعلیم کے دوران وہ کثرت سے مطالعہ کرتی رہی۔ لیکن جب اس نے غلام عباس کا شاہکار افسانہ "آنندی" پڑھا تو جیسے اس پر حجرۂ ہفت بلا کا در کھل گیا۔ اس ایک افسانے نے اس کی معصومیت کو آگہی میں تبدیل کر دیا۔ وہ افسانہ وہ بار بار پڑھتی رہی۔ ہر بار اپنی اور پھپھو کی زندگی کا نکتہ اس پر کھل جاتا۔

اس کا وہاں دم گھٹتا تھا۔ لیکن بہرحال اسے وہ گھر سمجھتی تھی۔ اب اسے پتا چلا کہ وہ طوائف کا کوٹھا تھا۔ اب اسے پتا چلا کہ پھپھو کے پاس آنے والے ان سے شادی کی امیدوار نہیں، ان کے جسم کے خریدار تھے۔ پھپھو ہر رات کس قیامت سے گزرتی تھیں، یہ سوچ کر اس کی روح تک میں زخم پڑ گئے۔ وہ بالا خانے پر سج سنور کر بیٹھی ہوئی لڑکیاں گاہکوں کو لبھاتی، بلاتی تھیں۔ تبھی تو پھپھو اسے وہاں نہیں

جانے دیتی تھیں۔ پھپھو اس کا اتنا خیال کیوں رکھتی تھیں؟ یہ بھی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اور اس نے جان لیا کہ پھپھو نے اسے اس دلدل سے محفوظ رکھنے کے لئے کتنی بڑی قربانی دی۔ ورنہ وہ جان دے دیتیں، وہ سب کچھ قبول نہ کرتیں۔

پہلے تو سارے منفی رخ اس پر کھلے۔ اسے خود سے بھی گھن آنے لگی۔

لیکن پھر دل میں رہنے والے اللہ میاں نے اسے مثبت انداز میں سوچنا سکھایا۔ پھپھو اس کوٹھے پر بھی نماز پڑھتی تھیں، قرآن پڑھتیں تھی، اور اور اسے پڑھاتی بھی تھیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہی تو تھی۔

اور کیسی عجیب بات تھی کہ اس نے پہلی بار آغا جی کو دیکھا تو وہ بالا خانے پر ان لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہیں اس نے ان کی تصویر بنائی تھی، اور وہیں سے وہ اس کی نگاہوں میں ایسے بسے کہ کبھی دور نہ ہوئے۔ اس روز وہ بہت ضد کر کے بالا خانے پر آئی تھی۔ ورنہ پھپھو اسے وہاں کبھی جانے ہی نہیں دیتی تھیں۔ یہ اللہ کا انداز تھا۔ کسی کو کسی سے ملانے کا۔ کوڑے کے ڈھیر پر دو پاک روحوں کی ملاقات۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ کوٹھے پر گزری ہوئی اس زندگی میں اللہ نے اپنی کتنی کھلی نشانیاں دکھائی تھیں اسے۔

پھر اسے اچھو میاں والا واقعہ یاد آیا۔ وہ کتنا ڈر گئی تھی۔ لیکن پھپھو نے اسے سمجھایا تھا کہ اچھو میاں برے آدمی نہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ غلطی سے ہوا۔ وہ کسی سے اس بات کا تذکرہ نہ کرے۔ اب وہ کسی حد تک اس واقعے کو بھی سمجھ سکتی تھی کہ وہ کس طرح کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اور اسے اچھو میاں کا اسے بیٹا کہہ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونا بھی یاد تھا۔ بعد میں تو وہ انہیں نانا کہنے لگی تھی۔ ویسے تو اس کوٹھے پر وہ واحد آدمی تھے، جو اسے اچھے لگتے تھے۔

پھر اس نے یہ معجزہ بھی دیکھا کہ اچھو میاں کیسے تبدیل ہو گئے۔ وہ ان دونوں کی ڈھال بن گئے۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ ان دونوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ بہت پہلے کوٹھا چھوڑ کر چلے گئے ہوتے۔ پھر تو یہ ہوا کہ اچھو میاں اس کے ساتھ بیٹھ کر پھپھو سے قرآن پڑھنے لگے۔ پھر انہوں نے نماز بھی شروع کر دی۔ کتنے خوب صورت ہو گئے تھے وہ۔ ان کے چہرے سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔

اور وہ بچی تھی۔ سمجھتی نہیں تھی، لیکن دیکھتی تھی کہ پھپھو کوٹھے پر کبھی رغبت سے کھانا نہیں کھاتی تھیں۔

پھر اس نے ایک اور معجزہ دیکھا۔ بوا ایک کونے میں پڑ گئیں اور ان کی حیثیت پھپھو کو مل گئی۔ اب وہ ہر چیز کی مالک تھیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ سونے لگیں۔ اب وہ اس کی وجہ بھی سمجھ سکتی تھی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے انہیں محفوظ کر دیا تھا۔ انہیں اس زندگی سے سے بچا لیا تھا، جس سے وہ چڑتی تھیں۔ اللہ نے کوٹھے پر ہوتے ہوئے بھی انہیں محفوظ کر دیا تھا۔

اس نے ان دنوں کا تصور کیا اور حیران رہ گئی۔ کوٹھے کی مالک بننے کے بعد پھپھو نے ہر دن وہاں ایسے گزارا تھا، جیسے کوئی خاتون خانہ، عشاء پڑھ کر وہ سو جاتیں۔ فجر کے وقت اٹھتیں، نماز پڑھتیں، قرآن پڑھتیں، پھر کرتوں کی سلائی کڑھائی۔ کھانا وہ خود پکاتی تھیں، اور رغبت سے کھاتی تھیں۔ کوٹھے سے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لیتی تھیں۔ کہتی تھیں، یہ حرام ہے۔ اللہ نے ہمارے لئے رزقِ حلال جاری فرما دیا ہے.....الحمد للہ!

اسے یاد تھا، کبھی کئی کئی دن تک گھر میں دال پکتی تھی۔ اور باقی لوگوں کے لئے تو باہر سے کھانا آتا تھا۔ وہ مزے مزے کے کھانے ہوتے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر گوشت کھانے کو ہڑکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پھپھو ہر چیز کی مالک ہیں۔ کوئی لڑکی کچھ بھی مانگے، اسے دیتی ہیں۔ مگر اپنے لئے گوشت بھی نہیں منگا سکتیں۔ ایسے میں پھپھو نے اسے سمجھایا تھا۔

اب وہ اللہ کی رحمت کو سمجھ سکتی تھی۔ وہ تو معجزہ ہی تھا۔ اللہ میاں نے طوائف کے کوٹھے کو پھپھو، نانا اور اس کے لئے گھر بنا دیا تھا۔ جہاں حرام کے سوا کچھ نہیں تھا، وہاں اللہ نے ان کے لئے رزقِ حلال جاری فرما دیا تھا۔ پھپھو مزدوری کرتی تھیں، اور نانا وہ کرتے دکان والے کو دے کر آتے تھے۔ اور وہ تینوں کوٹھے پر رہ کر بھی اللہ کا عطا کیا ہوا حلال رزق پاتے تھے۔

اور اس پر آغا جی کے معاملے میں اللہ نے کیسا کرم فرمایا تھا۔ دل کے ذریعے اس کی راہنمائی کی۔ وہ تو جانتی تھی۔ لیکن کسی کو بتاتی تو کوئی یقین نہ کرتا۔ وہ

چھوٹی ہی تو تھی، جب اسے آغا جی سے پہلی نظر میں محبت ہوئی اور پھپھو نے آغا جی کی تصویر دیکھ کر انہیں پہچان لیا کہ وہ اوتار سنگھ ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ہندو ہیں۔ تو اس نے کیسے یقین سے اس کی تردید کی۔ اس نے پورے یقین سے کہا کہ وہ مسلمان ہیں۔ کون تھا، جس نے اسے یہ بات بتائی تھی؟ اللہ! اور کون تھا، جو اس کے دل میں بیٹھ کر قدم قدم اس کی راہنمائی کرتا رہا۔ کون اسے بتاتا رہا کہ جب تک وہ سچی ہے اور پاک ہے، اس کے دل کی ہر بات سچی ہوگی۔ کون تھا؟ جس نے راستہ بتایا کہ پھپھو کی موت سے پہلے وہ آغا جی کے پاس پہنچ جائے۔ ورنہ خدانخواستہ وہ بھی کوٹھے کی زینت بن جاتی۔ یہ سوچتے ہوئے اسے جھرجھری آ گئی۔
اللہ آپ کا شکر ہے۔ وہ بڑبڑائی۔

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ پھپھو صرف اس کی خاطر، اسے بچائے رکھنے کے لئے وہ ذلت بھری زندگی گزارتی رہی تھیں۔ ورنہ وہ اتنی بہادر تھیں کہ مر جانا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اور اب وہ محسوس کر سکتی تھی کہ پھپھو اپنے آخری لمحوں میں پُرسکون ہوں گی۔ کیونکہ اس کی طرف سے وہ مطمئن ہوگئی تھیں۔

اور اب یہ صورتِ حال! یہ بھی تو معجزہ ہی تھا۔

وہ سوچتی تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آغا جی اسے کیسے مل سکتے ہیں؟ لیکن دل کہتا تھا کہ ایک مقررہ وقت پر ایسا ہوگا۔ اس کے سامنے تو ایسی کوئی صورت، ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔

اور اللہ نے آغا جی کے گھر میں اس کے لئے زندگی کتنی آسان کر دی۔ اسے دادی بھی مل گئیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ نے آپی کے دل میں اس کی محبت ڈال دی۔ وہ آپی کو ان کی اس بہن جیسی لگی، جسے وہ کھو چکی تھیں۔ تبھی تو وہ انہیں اتنی محبوب ہوگئی۔

ارجمند کم عمر تھی۔ لیکن اللہ نے اسے بہت سمجھ دار بنایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت آپی کیسی ہیں؟ آغا جی کے معاملے میں تو وہ ایسی تھیں کہ ان کے سر کا ٹوٹا ہوا بال بھی کسی کو نہ دیں۔ وہ تو دادی اماں سے بھی رقابت محسوس کرتی تھیں۔ لیکن اللہ نے انہیں اس کے لئے کیسا مہربان کر دیا کہ انہوں نے خود آغا جی سے ضد کی

کہ وہ اسے پڑھائیں۔ اور وہ اسے آغا جی کے ساتھ بے فکری سے اکیلا چھوڑ دیتی تھیں۔ حالانکہ یہ ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ الگ بات کہ آغا جی خود بہت نیک اور پاک نیت تھے۔

اللہ نے کیسے کیسے اس کی مدد کی۔ اسے مایوس بھی نہیں ہونے دیا، اور اس کی محبت کی معصومیت کو بھی داغ دار نہیں ہونے دیا۔ پھر اتنے برسوں کی دوری۔ اگر کوئی پہلے سے اسے بتا دیتا کہ ساڑھے چھ سال تک وہ آغا جی کو دیکھ بھی نہیں سکے گی تو شاید وہ صدمے سے ہی مر جاتی۔

اور اللہ نے اس سے کیا ہوا وعدہ پورا فرمایا، اور وہ بھی کس شان کے ساتھ۔

یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے کہ آپی جیسی عورت اس سے خوشامد کرے، وہ بھی اس لئے کہ وہ آغا جی سے شادی کر لے۔ ارے......! یہ تو اس کا خواب تھا، جو اسے امر محال لگتا تھا۔ بس وہ تو اللہ کے وعدے سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ وہ تو سوچتی تھی کہ آپی کے ہوتے ہوئے تو یہ ممکن ہی نہیں۔ اور یہ بھی اس کے وجود کی سچائی تھی کہ آپی کو کھونے کا وہ تصور بھی نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ ان کی زندگی کے لئے اور ان کی گود بھرنے کے لئے تو وہ خاص طور پر دعا کرتی تھی۔ اور اب آپی خود اس سے کہہ رہی تھیں کہ اسے ان کی خاطر...... ان کی خاطر آغا جی سے شادی کرنی ہے۔

یہ بات ان کی وہ سمجھ نہیں سکی تھی کہ وہ انہیں اولاد کیسے دے سکے گی؟ ماں بننے کا تصور تو اس وقت تنہائی میں بھی اس کے لئے ایسا تھا کہ اس نے سوچوں کی تمام کھڑکیاں بند کر کے حیا سے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے اس پر کیا سوچنا؟ اس نے سوچا۔ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں تو جیسا وہ کہیں گی، ویسا ہی کروں گی۔ آگے وہ جانیں۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اسے نیند ہی نہیں آئے گی۔ یہ خیال بہت تکلیف دہ تھا کہ یوں وہ تہجد سے محروم رہ جائے گی۔ اس کا دل کٹنے لگا۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کے وجود میں جیسے سکون کا کوئی جھرنا گرنے لگا۔ اس کی آنکھیں مندتی گئیں۔

اسے تو ایسا ہی لگا کہ وہ بمشکل پانچ منٹ سوئی ہے۔ شاید وہ بہت گہری

اور پُرسکون نیند تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو پتا چلا کہ وہ اپنے معمول کے مطابق پیدا ہوئی ہے۔

اللہ نے اسے تہجد سے محروم نہیں ہونے دیا۔

❁ ❁ ❁

”میں نے آج تک آپ سے کچھ نہیں مانگا......“ نور بانو نے کہا۔

”الحمدللہ! بغیر مانگے ہی تمہیں اس سے زیادہ مل گیا۔“ عبدالحق نے کہا۔

وہ ایسے کہنے والا نہیں تھا۔ لیکن سفر کی تکان، اور اس کے بعد سب لوگوں کے ساتھ بیٹھنا، باتیں کرنا، وہ اس وقت نیند سے بھرا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بس سو جانا چاہتا تھا۔

”مل گیا۔ لیکن محرومی تو پھر بھی ہے۔“

”محرومی......؟“

”ہاں! اولاد تو نہیں ملی مجھے۔“

”کہہ کر دیکھو، وہ بھی کہیں نہ کہیں سے لا دوں گا تمہیں۔“ نیند سے مجبور عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

”ویسے یہ محرومی صرف تمہاری نہیں، میری اور اماں کی بھی ہے۔ اور جو اللہ نہ دینا چاہے، میرا تو ایمان ہے کہ اس میں ہماری بہتری ہی ہوگی اور جو اللہ نہ دینا چاہے، وہ کہیں سے مل بھی نہیں سکتا۔“

”یہ آپ نے کیا کہا کہ کہیں سے بھی لا دیں گے......؟“

”بھئی......! ایسے بچے بھی تو ہوتے ہیں، جو ماں یا باپ سے، یا دونوں سے محروم ہو گئے ہوں۔ میں ایسا کوئی بچہ لے لوں گا، تم اسے پال لینا، تمہارا ارمان بھی پورا ہو جائے گا اور اس بچے کی محرومی بھی دور ہو جائے گی۔“

”مگر وہ آپ کا بچہ تو نہیں ہوگا۔“

”ہم اسے اپنا لیں گے تو وہ قانونی طور پر ہمارا بچہ ہی کہلائے گا۔“

”مگر ہمارا ہوگا تو نہیں۔ میرا مطلب ہے، وہ آپ کا بچہ تو نہیں ہوگا۔ وہ آپ کی نسل، تو نہیں بڑھا سکے گا۔“

عبدالحق کی سماعت میں ارجمند کی آواز گونجی ..... اَمْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ مَاتَمَنّٰی۔

''اب سب کچھ تو نہیں مل جاتا آدمی کو۔'' اس کے لہجے میں ہلکی سی اداسی تھی۔

''کوشش کرے تو مل ہی سکتا ہے۔'' نوربانو نے کہا۔

''کوشش تو بس حیلہ ہے۔ مرضی تو اللہ کی ہی چلتی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اسے خیال آیا کہ یہ بات تو شفق صاحب نے کہی تھی، اور اسی ضمن میں کہی تھی۔ اور انہوں نے کہا تھا کہ اولاد کے لئے حیلہ شادی ہے ..... یعنی اس کے لئے دوسری شادی۔ اور اسے یاد آیا کہ انہوں نے اس کے لئے دوسری شادی کی پیش گوئی بھی کی تھی۔ بلکہ ان کے حساب سے تو شاید کم وبیش یہ عرصہ بھی اس کی دوسری شادی کا تھا۔

اس نے سر جھٹکا، جیسے ذہن سے اس خیال کو جھٹک رہا ہو۔

''تو حیلے کے بغیر تو کچھ نہیں ہوسکتا نا!''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟ اللہ چاہے تو کچھ بھی ممکن ہے۔''

''کیسے.....؟''

''تم یہ بات نہیں سمجھ سکتیں۔'' عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

''بات کچھ اور ہو رہی تھی۔''

''ہاں.....! میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے آپ سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ آج کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے.....! اب مانگ بھی لو۔ مجھے بہت نیند آرہی ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ آپ دوسری شادی کرلیں۔''

عبدالحق کی آنکھوں سے نیند ہوا ہوگئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''کیا کہا تم نے.....؟''

''آپ نے غلط نہیں سنا ہے۔'' نوربانو نے بے حد اطمینان سے کہا۔

''میں آپ کی دوسری شادی کرانا چاہتی ہوں۔''

عبدالحق پھر سے لیٹ گیا۔

''اس پر کل فرصت سے بات کریں گے۔''

''نہیں.....! آپ ابھی ہاں کریں۔ صبح تو مجھے اماں کو جواب دینا ہے۔''

عبدالحق اس بار گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا.....؟ تم نے اماں سے بھی بات کر لی ہے.....؟''

''وہ تو سب سے بڑی ہیں، تو کیا انہیں نہ بتاتی.....؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ اماں تو خود بھی یہی چاہیں گی۔ لیکن یہ نوربانو کو کیا ہوگیا؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

''یہ کیا کھچڑی پکا رہی ہو تم.....؟''

''آپ کو کیا ہے؟ آپ تو بس ہاں کردیں۔''

''میں نے کہا نا کہ اس پر کل بات کریں گے۔''

''آپ سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔ صبح تو مجھے اماں کو خوش خبری سنانی ہے۔ ورنہ میری ناک کٹ جائے گی۔''

''وہ کیسے.....؟''

''اماں کہہ رہی تھیں کہ آپ نہیں مانیں گے۔ جبکہ مجھے اپنی محبت پر بڑا مان ہے، کہ آپ میری بات ٹال ہی نہیں سکتے۔''

''میں نے مان لیا، لیکن یہ کل صبح کا وقت کیا اوپر سے طے ہوا ہے.....؟''

عبدالحق جھنجلا گیا۔

''تین دن بعد شادی ہونی ہے۔ تو یوں وقت ضائع تو نہیں کیا جاسکتا۔''

اب بار عبدالحق کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا! تین دن میں شادی؟ رشتے بازار میں، دکانوں پر تو نہیں ملتے۔''

نوربانو حیرت انگیز طور پر پرسکون تھی۔

''یہ کوئی اچانک بات نہیں ہے صاحب! میں کراچی میں اس پر سوچتی رہتی ہوں۔ اور وہاں سے فیصلہ کر کے یہاں آئی ہوں۔ سب کچھ سوچ رکھا ہے میں

نے۔"

"سب کچھ سوچ کر فیصلہ کر چکی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ سب اختیارات تمہارے ہی پاس ہیں؟" عبدالحق نے تلخ لہجے میں کہا۔ اسے ہتک کا احساس ہو رہا تھا۔

"تو پھر مجھ سے پوچھ کیوں رہی ہو؟ میری کیا حیثیت ہے؟"

"میں تو آپ کے لئے ہی سوچتی رہی ہوں، اور آپ الٹا خفا ہو رہے ہیں مجھ پر۔"

"ایسا تو اماں نے بھی کبھی نہیں کیا میرے ساتھ!" عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

"حالانکہ ان کا تو حق تھا۔"

"بس ایک میرا ہی حق نہیں ہے آپ پر!"

"تم اماں سے اپنا موازنہ نہ کیا کرو۔ ہر ایک کا اپنا مقام ہوتا ہے۔"

عبدالحق کے لہجے کی سختی نے نور بانو کو احساس دلا دیا کہ اب آخری چال چلنی پڑے گی۔ وہ منہ پھیر کر لیٹ گئی۔

عبدالحق کو احساس ہوا کہ نور بانو کا جسم دھیرے دھیرے ہل رہا ہے۔ پھر سسکیاں بھی سنائی دینے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ عبدالحق گھبرا گیا۔ وہ اس کے آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ اس کی کمزوری تھی۔

"رو کیوں رہی ہو؟" اس نے اسے ہلایا۔

"اچھا.....! اٹھ کر بات تو کرو مجھ سے۔"

"مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں آپ! جب آپ کو ماننی ہی نہیں میری بات....."

"میں نے کب کہا کہ نہیں مانوں گا؟" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اسی وقت بات کرنا کیا ضروری ہے؟"

"اس کی وجہ میں نے بتا دی آپ کو۔" نور بانو نے بے رخی سے کہا۔

"بے شک! بتا دی، لیکن یہ تو نہیں بتایا کہ تین دن میں شادی کیوں

ضروری ہے؟"

نور بانو اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ایک مہینے کی چھٹی ہے آپ کی۔ جلدی تو کرنی ہے۔"

"یہ تمہیں سوجھی کیا ہے.....؟"

"ایک بات بتائیں.....! میں مر گئی تو آپ دوسری شادی کر لیں گے.....؟ میں جانتی ہوں، نہیں کریں گے۔ اس لئے یہ شادی مجھے ہی کرانی ہے۔"

"تم ایسی باتیں مت کرو۔" عبدالحق نے خفگی سے کہا۔

"مجھے واقعی ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"اچھا.....! یہ بتاؤ، تین دن میں شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"ہو جائے گی، آپ ہاں تو کریں۔"

"لگتا ہے، میرے لئے دوسری بیوی کا انتخاب تم کر چکی ہو۔" عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔

"جی ہاں.....! میں نے کہا نا کہ سب کچھ میں نے کراچی میں ہی سوچ لیا تھا۔"

عبدالحق کو غصہ آنے لگا۔ سوچ لیا، فیصلہ کر لیا اور اس سے بات کرنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ یہ کیسی حاکمیت ہے اس کے مزاج میں۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ اس سے محبت کتنی کرتی ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ خدانخواستہ..... اس سے آگے سوچا بھی نہیں گیا۔ تو میں دوسری شادی کبھی نہ کروں۔ تو اسے کتنی فکر ہے میری۔

"اچھا.....! تو کون ہے وہ بدنصیب جو تمہاری سوکن بننے والی ہے.....؟"

"سوکن کیوں؟ وہ تو میری بہن ہے۔ میرا ارمان پورا کرے گی۔ مجھے بیٹا دے گی، جو میرے نصیب میں نہیں۔"

"وہ ہے کون.....؟"

"اب بھی نہیں سمجھے! ارے.....! وہ میری ارجی ہے۔"

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔ پھر اس نے جھنجلا کر کہا۔

"پاگل ہوگئی ہو تم...! وہ میرے سامنے کی بچی... میں کتنا بڑا ہوں اس سے۔ یہ حق تمہیں کس نے دیا کہ اپنے ارمان کی خاطر کسی کی زندگی تباہ کر دوں؟"

"خود ارجمند نے۔ اس کی مرضی کے بغیر تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"تمہارے لحاظ میں... مروّت میں وہ چپ رہی ہوگی۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ؟"

"جی نہیں...! وہ ہنسی خوشی آمادہ ہے اس شادی پر۔" نور بانو نے کہا۔

"بس اب آپ ہاں کر دیں۔ صبح میں اماں کو بتا دوں گی۔ پھر تیاری شروع۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ بے قاعدہ کام مجھے پسند نہیں۔" عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

"سب سے پہلے تو میں اماں سے بات کروں گا۔ ان سے اجازت لوں گا۔"

"یہ تو میں پہلے ہی کر چکی ہوں۔ وہ بہت خوش ہیں۔"

"تم نے انہیں ارجمند کے بارے میں بتایا تھا...؟"

"ہاں...! اس پر تو وہ اور خوش ہوئیں۔"

"بہر حال...! مجھے اس سے اطمینان نہیں ہوگا۔" عبدالحق کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"وہ بھی تم سے محبت کرتی ہیں... بہت لحاظ کرتی ہیں تمہارا۔ میں خود ان سے پوچھوں گا اور ارجمند سے بھی..."

اس پر نور بانو ڈری کہ کہیں ارجمند بدل نہ جائے۔

"آپ کو لحاظ نہیں آئے گا اس سے بات کرتے ہوئے...؟"

"مجھ سے شادی کے لئے اس نے ہاں کی ہے تو لحاظ اور شرم کی کیا بات...؟ یہ ہم دونوں کا حق ہے کہ بات کریں۔"

"آپ کو نہ سہی، اسے تو شرم آئے گی۔"

"تو پھر میں تو یہ شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔ مجھے بات کرنے کی ضرورت

بھی نہیں۔"

"زندگی میں ایک چیز مانگی آپ سے، اس میں بھی یہ حیل و حجت!"

"تمہاری بات مان تو لی۔ لیکن اماں اور ارجمند سے بات کئے بغیر میں جواب نہیں دوں گا۔" عبدالحق نے کہا اور لیٹ گیا۔

"اب منظور ہو تو بتا دو...!"

"جو آپ کی مرضی...!" نور بانو نے بے دلی سے کہا۔

عبدالحق تو لمحوں میں سو گیا لیکن نور بانو کی نیند اُڑ گئی۔ کبھی کوئی چیز آسانی سے... اچھی طرح کیوں نہیں ملتی مجھے؟ اس نے سوچا۔ اب کل تک بے یقینی رہے گی کہ بات بنتی بھی ہے یا نہیں۔

صبح صادق کے قریب اسے نیند آئی۔

✿ ✿ ✿

حمیدہ سے بات کر کے تو عبدالحق حیران ہی رہ گیا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ پوتے کی آرزو کی وجہ سے وہ اس کی دوسری شادی کی خواہاں ہے۔ یہ بھی وہ جانتا تھا کہ ارجمند سے وہ بہت محبت کرتی ہے۔ لیکن اس درجے کی پسندیدگی کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"تو اجازت مانگ رہا ہے پتر! ارے یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔" حمیدہ نے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو اماں...! وہ تو بچی ہے ابھی۔"

"وہ بچی نہیں ہے، بڑی ہوگئی ہے۔ اس کا تو ایک رشتہ بھی آچکا ہے۔"

یہ عبدالحق کے لئے انکشاف تھا۔ وہ اصل بات بھول گیا۔

"کیسے لوگ تھے اماں...!"

"بہت اچھے لوگ تھے۔ لڑکا بھی بہت اچھا تھا۔ مجھے تو بہت پسند آیا تھا۔"

"تو پھر...؟"

"نکی نے مجھ سے خوشامد کی کہ میں انہیں منع کر دوں۔"

"انہوں نے ارجمند کو کہاں دیکھا تھا...؟"

"لڑکا اس کے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا، اور اسے پسند کرتا تھا۔ گھر والے بھی بہت اچھے اور مہذب لوگ تھے۔"

"تم نے مجھے بتایا بھی نہیں اماں......!" عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

"بات آگے بڑھتی تو بتاتی نا......! اب انکار کرنے کے لئے تجھ سے کیا مشورہ لیتی......؟"

"کیا بہت اچھا لڑکا تھا؟ بہت اچھے لوگ تھے؟"

"بہت خوب صورت اور تمیز دار لڑکا تھا۔ اس کی ماں اور بہن بھی بہت اچھی تھیں۔ وہ اتنے اچھے تھے پتر! کہ اگر مجھے تیرے لئے نکی کی آرزو نہ ہوتی تو میں نکی کو سمجھاتی کہ ایسے لوگوں کو انکار کرنا اچھا نہیں۔"

"لیکن اماں......! میرے لئے ارجمند کا تم نے سوچا بھی کیسے......؟ کوئی جوڑ ہے میرا اور اس کا......؟" عبدالحق نے احتجاج کیا۔

"سوچنا تو آدمی چاند کے لئے بھی ہے۔ یہ کب سوچتا ہے کہ وہ نہیں ملے گا۔ اور سوچے تب بھی آرزو تو کرتا رہتا ہے نا! اور جوڑ کی بھی تو نے اچھی کہی۔ مجھ سے پوچھ تو، چاند سورج کی جوڑی ہے تیری اور نکی کی۔"

"ارے......! میں اتنا بڑا ہوں عمر میں اس سے۔"

"عمر سے کچھ نہیں ہوتا پتر! جوڑ دیکھا جاتا ہے۔ عادل طبیعت ملائی جاتی ہے۔ اور اللہ رکھے، تو ابھی ادھیڑ عمر بھی نہیں ہوا۔ جوان ہے۔ یہ الگ بات کہ خود کو بہت بڑا سمجھتا ہے، بہت بڑا بنا لیا ہے تو نے خود کو۔"

"لیکن اماں......! ارجمند کا ہمارے سوا کوئی نہیں۔ لیکن وہ بھیڑ بکری تو نہیں کہ جس کھونٹے سے چاہو، باندھ دو۔"

"میں سمجھتی ہوں پتر! کہ نکی بھی خوش ہوگی اس رشتے سے۔"

"یعنی تم نے اس سے پوچھا بھی نہیں ابھی۔" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"نور بانو نے کہا کہ وہ نکی سے خود بات کر لے گی۔" حمیدہ کا انداز

مدافعانہ ہو گیا۔

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے اماں! میں نور بانو کو جانتا ہوں اور ارجمند کو بھی۔ نور بانو کو اپنی بات منوانا آتا ہے، اور ارجمند نور بانو کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتی، خواہ وہ اسے ناپسند ہو۔ وہ نور بانو سے بہت محبت کرتی ہے۔"

حمیدہ سوچ میں پڑ گئی۔

"بات تو تیری ٹھیک لگتی ہے پتر......!"

"اور اماں! ہم تو نہیں سمجھتے، لیکن ارجمند یقیناً خود کو ہمارا زیر بار سمجھتی ہے کہ ہمارا کوئی احسان ہے اس پر۔ اس کے بدلے میں وہ اپنے وجود کی قربانی بھی دے سکتی ہے۔ اور اماں......! یہ میں کبھی نہیں چاہوں گا......کم از کم اپنے لئے تو کبھی نہیں۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے پتر! پر مجھے یقین ہے کہ ارجمند اس رشتے سے خوش ہوگی...... بلکہ شاید اس کی خوشی ہی اس رشتے میں ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو اماں......!"

"بہت کچھ ایسا ہے پتر......! جو تو نہیں جانتا، میں جانتی ہوں۔" حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

"وہ میں سب کچھ تو تجھے بتا بھی نہیں سکتی۔ پر تو خود غور کر تو تجھے ایسا لگے گا کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔"

"میں سمجھا نہیں اماں......!"

"یہ معجزہ نہیں لگتا تجھے کہ نور بانو ضد کر کے تیری شادی کرائے۔ اور میں نے تو اس وقت دل میں سوچا تھا کہ تیری بیوی تو ایسی ہونی چاہئے، جیسی نکی ہے۔ اس وقت تو نکی بہت چھوٹی تھی۔ یہ جب کی بات ہے، جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی۔ میرے دل میں یہ خیال آیا تو میں نے سوچا کہ نکی تو بہت چھوٹی ہے۔ تو پتا ہے، میرے دل نے کیا کہا؟ بولا کہ لڑکیوں کو بڑے ہوتے دیر لگتی ہے کیا؟ اور پھر میرے دل سے یہ خیال کبھی نہیں نکلا۔"

عبدالحق حیرت زدہ سا حمیدہ کی بات سن رہا تھا۔

"پھر میں پوتے کی آرزو لے کر در در کی خاک چھانتی پھر رہی تھی کہ ایک بابا ملا۔ اس نے مجھ سے جو کچھ کہا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ نور بانو کا خود کچھ ایسا معاملہ ہے کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔ شاید کوئی کوتاہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی بہو کو لاؤں۔ پر نور بانو نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر بابا نے کہا کہ اس کے بغیر تو اللہ اس کی دعا بھی نہیں سنے گا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا پتر! کہ میں اس معاملے کو بھول جاؤں، نہ کچھ کہوں، نہ کچھ کروں، میری بہو خود میرے بیٹے کی دوسری شادی کرائے گی، اور اس سے کرائے گی جو مجھے پسند ہے۔ اب تو بتا پتر! کہ چھ سات سال تو نور بانو کے ساتھ کراچی میں رہا۔ اور اب آیا تو نور بانو نے خود ہی یہ سلسلہ شروع کر دیا۔ تو پتر! یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارجمند بھی یہی چاہتی ہوگی۔"

عبدالحق غور کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ عورتیں تو ہوتی ہی ضعیف الاعتقاد ہیں۔ بالآخر اس نے کہا۔

"لیکن اماں......! میں پوری طرح اطمینان کے بغیر یہ قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں؟ انجانے میں ارجمند کے ساتھ کوئی زیادتی ہوگئی تو تلافی بھی نہیں کر سکوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے پتر! تو اپنا اطمینان کر لے۔"

"تو تم ارجمند سے پوچھو نا......!"

"نا پتر......! میں اس سے نہیں پوچھوں گی۔"

"کیوں اماں......؟"

"ایک تو یہ کہ میرا دل مطمئن ہے۔ پھر بابا نے مجھے منع کیا تھا کہ میں کچھ بھی نہ کروں۔ بہو جو کرے، اسے کرنے دوں۔" حمیدہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اور ویسے بھی پتر! تیرا دل میرے کہنے سے بات کرنے پر بھی مطمئن ہونے والا نہیں۔ تو خود ہی پوچھ لے اس سے۔"

عبدالحق خوش ہوگیا کہ اماں نے اسے ارجمند سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ سچ تھا کہ خود بات کیے بغیر مطمئن ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

نور بانو ابھی سو رہی تھی۔ وہ ارجمند کو اسٹڈی میں لے گیا۔

"بیٹھو ارجمند! تم سے تو بات ہوئی ہی نہیں۔"

ارجمند سلیقے سے دوپٹہ سر پر لئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

اب بات کرنے کا وقت آیا تو عبدالحق کو احساس ہوا کہ یہ کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ کیسے بات کرے؟ کس طرح شروع کرے؟

"آپ کے لئے چائے لے آؤں آغا جی......!" ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

عبدالحق نے سوچا، یہ اسے مہلت مل رہی ہے۔ اتنی دیر میں لائحہ عمل طے کر لے گا۔

"ہاں ارجی! لے آؤ......!"

اور واقعی جب تک ارجمند چائے لے کر آئی، وہ سوچ چکا تھا۔ ارجمند نے اس کے سامنے چائے رکھی تو اس نے دھیرے سے شکریہ کہا۔

عبدالحق پہلے تو اس کی پڑھائی کے بارے میں پوچھتا رہا پھر اس نے کہا۔

"اماں بتا رہی تھیں کہ تمہارا ایک رشتہ آیا تھا۔ اماں کو اچھا لگا۔ لیکن تم نے انکار کر دیا۔"

"جی آغا جی......!" ارجمند نے سر جھکائے جھکائے کہا۔

"تمہارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا وہ......؟"

"وہ مجھ سے سینئر تھے۔ میرے ہم جماعت نہیں تھے۔"

"تم کالج میں اسے دیکھتی رہی تھیں۔ تمہیں اس کے بارے میں معلوم ہوگا۔ کوئی خرابی، کوئی برائی تھی اس میں......؟"

"جی نہیں......! وہ تو بہت اچھے انسان ہیں آغا جی......!"

"تو پھر تم نے انکار کیوں کیا......؟"

"جو آپ جانتے ہیں، وہ مجھ سے کیوں پوچھتے ہیں......؟"

عبدالحق گڑبڑا گیا۔

"میں کیا جان سکتا ہوں تمہارے بارے میں......؟ تقریباً سات برس تم

سے دور رہا ہوں۔"

"دور رہنے سے کچھ فرق پڑتا ہے آغا جی......؟" ارجمند نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

"فرق تو پڑتا ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"جب میں گیا تو تم بچی تھیں۔ اب ماشاء اللہ عاقل و بالغ ہو۔"

"میں تو جو تھی، اب بھی وہی ہوں۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ بچی ہوں یا عاقل و بالغ۔ رہی رشتے کی بات تو میں اچھے سے اچھے رشتے سے بھی انکار کر دوں گی۔"

"وجہ......؟"

"میں کسی بھی معاملے میں بددیانتی کی قائل نہیں۔ اور یہ تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔"

"لیکن میرے خیال میں تم اپنے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔"

"شکر ہے، آپ نے بددیانتی نہیں کہا۔ اور اپنے ساتھ زیادتی کرنے کا تو مجھے حق ہے۔" ارجمند نے اطمینان سے کہا۔

"اب یہ نکتہ نظر کا فرق ہو سکتا ہے، ممکن ہے، آپ زیادتی سمجھ رہے ہوں جسے، میرے نزدیک اس میں میری بھلائی ہو۔"

عبدالحق کو حیرت ہونے لگی۔ ارجمند پہلے بھی اپنی عمر سے بڑی تھی، اور اب بھی ہے۔ بلکہ تعلیم نے اسے اور نکھار دیا ہے۔ اسے بات کرنا آتی ہے۔ اپنا موقف موثر انداز میں پیش کر سکتی ہے۔ اور مدلل انداز میں اس کا دفاع بھی کر سکتی ہے۔

"لیکن تمہارا نکتہ نظر غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"جی یقیناً! لیکن اس سے کسی اور کو نقصان تو نہیں ہوگا۔"

"تمہیں تو ہو سکتا ہے۔"

"آپ مجھ سے وہ پوچھیں نا آغا جی......! جو درحقیقت پوچھنا چاہتے ہیں۔"

یہ عبدالحق کے لئے بلاواسطہ چیلنج تھا۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ واقعی وہ وقت برباد کر رہا ہے۔

"ٹھیک ہے ارجمند! میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے نوربانو کی احمقانہ بات کے جواب میں ہاں کر دی۔ یہ تمہاری اپنے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی؟"

"آپ کا خیال ہے کہ میں نے آپ سب کے احسانوں کے بوجھ کی وجہ سے ہاں کی ہے......؟"

"میرا یہی خیال ہے......!"

"یہ آپ کی زیادتی ہے میرے ساتھ۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں۔"

"بچپن میں آدمی نادان ہوتا ہے۔ بڑا ہوتا ہے تو شعور پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہ سمجھنے لگتا ہے ان نادانیوں کو۔"

"مجھے افسوس ہے کہ آپ اسے نادانی سمجھ رہے ہیں۔ دراصل بچی تو میں کبھی تھی ہی نہیں آغا جی! میرے دل میں جو جذبہ پیدا ہوا، وہ بہت سچا اور بے ساختہ تھا، اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت ہے۔ جبکہ میں اس وقت اللہ کو جانتی اور سمجھتی بھی نہیں تھی۔ لیکن جب سے اب تک کے ہر لمحے میں وہ بات ثابت ہوتی رہی۔ گستاخی معاف آغا جی، لیکن بڑے لوگوں میں یہ خامی ہوتی ہے۔ بچوں کی جو بات انہیں اچھی نہیں لگے، وہ اسے ان کی نادانی قرار دے کر نظرانداز کرتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کبھی بچے اپنی جگہ درست بھی ہو سکتے ہیں۔"

عبدالحق خود کو اس کے سامنے چھوٹا محسوس کرنے لگا۔

"تم نے میرے خیال کی اب بھی تردید نہیں کی۔" اس نے سنگین لہجے میں کہا۔

"میں جھوٹ سے ہمیشہ بچتی ہوں آغا جی! بس کبھی دوسروں کی خاطر سچ بولنے سے گریز کرنا پڑ جاتا ہے۔ مگر آپ سے میں پوری سچائی کے ساتھ بات کروں گی۔ آپی اگر مجھ سے جان بھی مانگیں تو میں انکار نہ کروں۔ لیکن اس معاملے میں ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو آپ کو معلوم ہے، ہے نا......؟" پہلی بار

اس نے نظریں اٹھا کر عبدالحق کی آنکھوں میں دیکھا۔

عبدالحق نظریں چرانے لگا۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور دوسری وجہ.....؟''

''میں واقعی بڑی ہوگئی ہوں آغا جی......! جو کچھ میں بچپن میں نہیں سمجھ سکی، اب سمجھ گئی ہوں۔ میں نے جان لیا ہے آغا جی......! کہ اللہ نے کتنی غلیظ جگہ سے نکال کر مجھے آپ تک پہنچایا...... وہ بھی آپ تک......'' اس نے زور دے کر کہا۔

عبدالحق ششدر رہ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ارجمند کو کبھی یہ بات معلوم ہو سکے گی۔

''اب میں سمجھ سکتی ہوں کہ آخری عرصے میں، جب پھپھو کے ہاتھ میں سب کچھ تھا، وہ بااختیار تھیں، اور انہیں نانا کا سہارا بھی حاصل تھا تو وہ بازار سے نکلیں کیوں نہیں؟ انہیں ڈر تھا کہ یہ داغ مٹنے والا نہیں۔ عمر بھر ان کا پیچھا کرے گا۔ انہیں کبھی عزت نہیں مل سکے گی، اور میں بھی داغدار ہو جاؤں گی۔ وہ صرف میری ہی وجہ سے تو زندہ تھیں۔ اور دیکھ لیں، مجھے آپ کو سونپنے کے بعد وہ دو دن بھی نہ جی سکیں۔'' ارجمند کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''آپ کو بتاؤں آغا جی......! کہ کوٹھے پر جب سب کچھ ان کے ہاتھ میں آیا تو انہوں نے کبھی اپنے یا ہمارے لئے وہاں سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔ وہ اس کوٹھے پر بیٹھ کر کرتے سیتی اور کاڑھتیں، اور اس محنت مزدوری کے پیسے سے وہ ہمیں رزقِ حلال کھلاتیں۔''

عبدالحق کو یاد آیا کہ عارف نے بھی کرتوں کا تذکرہ کیا تھا، جو نادرہ نے اس کے لئے کاڑھے تھے۔ اس کو اس معصوم اور کم عمر لڑکی پر پیار آنے لگا، جس نے زبردستی کی آگہی سے خود کو دکھی کر لیا تھا۔

''تو آغا جی......! وہ اللہ کی رحمت تھی، اس کی طرف سے امداد تھی۔ میں نے بچپن سے ہی اللہ کی تائید اور رحمت دیکھی ہے۔ میں یہاں ہوں تو یہ اللہ کی رحمت ہے۔ لیکن آغا جی......! اب پھپھو کا خوف مجھے منتقل ہوگیا ہے۔ میں کسی اجنبی گھر میں نہیں جا سکتی۔''

''تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا......؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''یہ بات تو گھر میں میرے سوا کسی کو معلوم نہیں۔''

''اردو ادب کا مطالعہ کرتی ہوں نا......!'' ارجمند نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

''اور وہ ماحول تو مجھے آج بھی یاد ہے۔''

''لیکن تمہاری بات اور ہے۔ تمہیں انشاء اللہ کبھی یہ طعنہ نہیں سننا پڑے گا۔ اس لئے اس خوف کی بنیاد پر فیصلے کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں آغا جی......! یہ تو ثانوی اور اضافی وجوہات ہیں۔ میں کہہ چکی ہوں کہ بنیادی اور اصل وجہ جو ہے میرے ہاں کرنے کی، وہ آپ جانتے ہیں، اور آپ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔''

''تو یہ تو بچپنا ہوا نا......! جذباتی فیصلہ ہوا نا......!''

''آپ شاید سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تو کچھ سوچا...... ایسا جو میری عمر کی بچی نہیں سوچ سکتی۔ اب میں جانتی ہوں کہ وہ اللہ کی طرف سے تھا۔ اسی لمحے اللہ نے مجھے یقین عطا فرمایا کہ آپ مجھے ملیں گے...... اس کے مقرر کردہ وقت پر۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند کے چہرے پر گلابی رنگ دوڑ گیا۔

''اس کے بعد سے ہر لمحے مجھے اللہ کی راہنمائی میسر رہی۔ آپ یقین نہیں کریں گے۔ لیکن اللہ میاں نے خود مجھ سے یہ بات کہی تھی۔''

''یہی تو بچپنا ہے۔ اللہ بندوں سے بات نہیں کرتا۔''

''پھپھو نے بھی یہی کہا تھا۔ بعد میں میں نے جس سے بھی یہ بات کی، اس نے یہی کہا...... دادی اماں نے بھی، اور آپی نے بھی......''

''تم نے انہیں بھی بتا دیا تھا......؟'' عبدالحق بری طرح گڑبڑا گیا۔

''نہیں آغا جی......! وہ بات تو میں نے پھپھو کے علاوہ کبھی کسی سے نہیں کہی۔ اور پھپھو نے مجھے آپ کے پاس لانے سے پہلے سمجھا دیا تھا کہ مجھے کبھی کسی سے بھی یہ بات نہیں کرنی۔ دادی اماں اور آپی کو کسی موقع پر میں نے یہ بتایا تھا کہ اللہ میاں مجھ سے بات کرتے ہیں۔ اس پر وہ دونوں ڈر گئیں۔ میں نے ان سے

بحث بھی نہیں کی۔"

"یہ تو بتاؤ کہ اللہ میاں تم سے کیسے بات کرتے ہیں ؟" عبدالحق اصل بات بھول کر متجسس ہو گیا۔

"میرے دل میں بیٹھ کر دل سے ... میری اپنی آواز میں۔" ارجمند نے سادگی سے کہا۔

عبدالحق کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔

"ننھی لڑکی! یہ تو آدمی کے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف سے ہو تو خیال، شیطان کی طرف سے ہو تو وسوسہ۔ لیکن دونوں میں تمیز کرنا بہت مشکل، تقریباً ناممکن ہے۔"

"نہیں آغا جی! یہ بہت آسان ہے۔ آدمی جھوٹ نہ بولے، اللہ کے احکامات پر عمل کرے، ان کی خلاف ورزی نہ کرے اور پاک صاف رہے تو دل پاک رہتا ہے۔ اس میں اللہ رہتا ہے اور آدمی کی راہنمائی کرتا ہے۔"

"یہ تمہیں کس نے بتایا ... ؟"

"اللہ میاں نے ... !"

"اسی طرح ... دل میں بیٹھ کر ... ؟"

"جی ہاں ... !"

"یہ تو گمراہ کن بات ہے ارجمند ... !"

"لیکن میں نے پھپھو پر ثابت کر دیا تھا۔"

"کیسے ... ؟"

ارجمند کھو سی گئی۔

"میں نے آپ کو دیکھا تو آپ کی تصویر بنائی۔ پھر وہ تصویر پھپھو کو دکھائی تو ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ... اوتار سنگھ ... انہوں نے مجھے بتایا کہ آپ ان کے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے اور ہندو ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ نہیں، آپ مسلمان ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ مجھے کیسے معلوم؟ تو میں نے انہیں بتایا کہ یہ بات مجھے اللہ میاں نے بتائی ہے۔ پھپھو نے یقین نہیں کیا۔ لیکن جب آپ ملے تو میری

بات سچی ثابت ہو گئی۔"

عبدالحق کو اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"اور میرے بارے میں تمہیں کچھ بتایا تھا اللہ میاں نے ... ؟" اس نے پوچھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانچنا چاہتا تھا۔

"جی ہاں ... ! بتایا تھا۔ لیکن وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔"

"اب میں اگر تم سے کہوں کہ تم نے نور بانو کی بات مان کر غلط فیصلہ کیا ہے تو ... ؟"

"سچ یہ ہے آغا جی ... ! کہ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ میں نے تو اللہ کے فیصلے پر سر جھکایا ہے، جبکہ اسی میں میری خوشی بھی ہے۔"

"یہ جان کر بھی کہ شاید خوشی تمہیں نہ مل سکے۔"

"میں سمجھی نہیں آغا جی ... !"

"تم جانتی ہو کہ میں نور بانو سے بہت محبت کرتا ہوں۔ شاید میں کسی اور سے محبت کر ہی نہیں سکتا۔ اسی لئے میں نے کبھی دوسری شادی کا سوچا بھی نہیں۔ اور مجھے اولاد ہونے یا نہ ہونے کی بھی پرواہ نہیں۔"

"میں جانتی ہوں، اور یقین کریں، یہ میرا وعدہ ہے کہ میں آپ سے کبھی کچھ بھی طلب نہ کروں گی۔"

"یہ کہنا بہت آسان ہے، عملی زندگی میں ایسا کر نہیں سکو گی۔"

"اللہ سے دعا کرتی رہی ہوں آغا جی ... ! انشاء اللہ میں ایسی ہی رہوں گی۔ اللہ نے اپنی رحمت سے مجھے شکر ادا کرنے والا بنایا ہے۔ میں نے اس کا بے پناہ فضل و کرم دیکھا ہے اور مجھے یاد بھی ہے۔ اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت پر شکر ادا کرنے کے بجائے میں شکایت کروں۔"

عبدالحق حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ پاکیزہ چہرے پر بچوں کی سی معصومیت، لیکن باتوں میں جہاں دیدگی، لہجے میں ایسی پختگی۔

"ایک بات کہوں آپ سے آغا جی! اسے گستاخی نہ سمجھئے گا۔ روئے زمین پر آپ میرے لئے سب سے محترم ہیں۔" ارجمند کے لہجے میں عقیدت تھی۔

"کہو.....! کیا بات ہے.....؟"

"آپ کے انداز میں ہچکچاہٹ ہے۔ آپ یہ نہیں چاہتے۔ مجھے ایسا لگا کہ آپ انکار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن نہیں کر سکتے۔ اس لئے یہ چاہتے ہیں کہ میں انکار کر دوں۔"

"میں تو تمہارا بھلا سوچ رہا ہوں۔"

"جب آپ مجھے سمجھتے جانتے ہی نہیں تو میرا بھلا کیسے جان سکتے ہیں؟ میری بات مانیں، آپ انکار کر دیں۔ بخدا مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"میں تمہیں بہت پسند کرتا ہوں ارجمند.....! لیکن میں نے تمہیں کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ تمہیں اس حیثیت سے قبول نہ کر سکا تو تمہارے لئے دکھ کا سبب بنوں گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اسے کیا جواب دوں گا۔"

"بس اتنی سی بات.....!" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔

"میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے، آپ کی کسی بات پر کبھی دکھ نہیں کروں گی انشاء اللہ! اور خدانخواستہ دکھ ہوا تو میں ابھی سے آپ کو اللہ کے سامنے اس سے بری قرار دیتی ہوں۔"

"تم نہیں جانتیں کہ تم کتنی بڑی بات کہہ رہی ہو؟"

"آپ نہیں جانتے کہ یہ میرے لئے کتنی چھوٹی بات ہے۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

"میں نے سمجھ لیا ہے کہ محبت صرف دینے کا نام ہے، لینے کا نہیں۔"

"میں اتنا محترم ہوں تمہارے لئے تو تم میرا کوئی حکم کیسے ٹال سکتی ہو؟"

"میں نے کب کہا ایسا.....؟"

"تو پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں اللہ میاں نے میرے بارے میں اور کیا بتایا تھا؟"

"مجھے وہ کہنا آپ کے سامنے اچھا نہیں لگے گا۔ آپ اصرار نہ کریں۔"

"میں تو تمہیں حکم دے رہا ہوں۔"

"پہلی بار آپ کو دیکھنے کے بعد آپ مجھے شہزادے لگنے لگے..... میرے شہزادے!" ارجمند جیسے کہیں بہت دور چلی گئی۔

"میں ہر وقت آپ کی تصویر بناتی رہتی تھی۔ اور ہر وقت اللہ سے دعا کرتی تھی کہ آپ مجھے مل جائیں۔ پھر ایک دن میں نے اللہ میاں سے شکایت کی کہ میں آپ سے ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں، اور آپ مجھے جواب تک نہیں دیتے، تو اس دن اللہ میاں نے پہلی بار مجھے جواب دیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ میرے دل میں رہتے ہیں اور وہیں سے مجھے جواب بھی دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک میں سچی اور پاک صاف رہوں گی، جھوٹ نہیں بولوں گی اور ان کا کہنا مانتی رہوں گی تو وہ میرے دل میں رہیں گے۔ اور بدل گئی تو میرے دل سے چلے جائیں گے۔

پھر میں نے ایک دن اللہ میاں سے کہا کہ آپ میرے شہزادے کو مسلمان کر دیں۔ میں ہندو سے شادی تو نہیں کر سکتی۔ اس پر اللہ میاں نے کہا کہ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ وہ مسلمان ہے..... بلکہ بہت اچھا مسلمان ہے۔"

"یہ کہا اللہ میاں نے..... میرے لئے.....؟" عبدالحق خوش ہو گیا۔

"جی آغا جی.....!"

"لیکن اصل بات تم نے ابھی نہیں بتائی ہے۔ وہ بتاؤ مجھے....."

"آپ بہت چالاک ہیں آغا جی.....! میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے کہنا اچھا نہیں لگے گا۔"

"مگر میرا حکم ہے۔"

"اچھا بتاتی ہوں۔" ارجمند نے بے بسی سے کہا۔

"مگر پہلے پس منظر بتانا پڑے گا۔"

"تو بتاؤ.....!"

"پھپھو نے میری کاپی دیکھی تو اس میں ہر صفحے پر آپ کی تصویر تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں کیا سوچتی ہوں۔ انہوں نے مجھے سمجھانے کے لئے کہا کہ وہ تم سے بہت بڑے ہیں۔ ان سے تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ میں نے یہی بات اللہ

میاں سے کہی تو ...'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اللہ میاں نے کیا جواب دیا ...؟ بتاؤ ...!'' عبدالحق نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اللہ میاں نے کہا کہ وہ تم سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ تم انہیں بڑا بناؤ گی۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا، پھر جیسے ہی اسے احساس ہوا تو اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

''آپ مجھ سے کیسی باتیں کروا رہے ہیں آغا جی ...!'' اس کے لہجے میں حیا میں لپٹی ہوئی شکایت تھی۔

لیکن عبدالحق تو سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے شفیق صاحب یاد آ رہے تھے.....

گمراہی کے عرصے کے پنڈت روپ سہائے، جنہوں نے اس کی پیدائش کے بعد اس کی جنم پتری بنائی، جن سے کراچی میں وہ ملا تھا۔ انہوں نے اسے کہا تھا کہ اس کی دو شادیاں ہیں۔ ان کی آواز اب بھی وہ سن سکتا تھا ..... انہوں نے کہا تھا، جس بیوی کی وجہ سے آپ دوسری شادی سے بچتے ہیں، عجب نہیں کہ اسی کی وجہ سے آپ کو دوسری شادی کرنی پڑے۔ اور یہی ہو رہا تھا۔ نور بانو نے ہی ارجمند کو منتخب کیا تھا اور وہ یہ اصرار اس کی شادی کرا رہی تھی۔

اور شفیق صاحب نے کہا تھا ..... دوسری بیوی آپ کی پہلی بیوی کا الٹ ہوگی، مزاج اور فطرت کے اعتبار سے بھی اور قسمت کے اعتبار سے بھی۔ اور وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے، لیکن دوسری بیوی کو آپ بس قبول کریں گے۔ یہ قسمت کے لحاظ سے الٹ ہونے کی بات تھی۔ پھر انہوں نے اور وضاحت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ... پہلی بیوی سے آپ کو عشق ہے، دوسری بیوی آپ سے عشق کرے گی، پہلی بیوی کا مزاج قابضانہ ہے، دوسری آپ کی قید میں رہنا پسند کرے گی، پہلی بیوی چاہے گی کہ آپ اسے خوش رکھیں، جبکہ دوسری بس آپ کو خوش رکھنا چاہے گی، وہ آپ کی خوشی کے لئے کچھ بھی کرے گی، پہلی بیوی لینے والی ہے اور دوسری صرف دینے والی ہوگی۔ اور ابھی ذرا پہلے ارجمند نے خود یہ بات کہی تھی کہ اس نے جان لیا ہے، محبت صرف دینے کا نام

ہے، لینے کا نہیں۔

اور شفیق صاحب نے کہا تھا ..... پہلی بیوی مطالبے کرنے والی ہے تو دوسری آپ سے کچھ بھی نہیں طلب کرے گی، حتیٰ کہ محبت بھی نہیں۔ پہلی بیوی سے اگر آپ کو کچھ بھی نہیں ملا تو دوسری آپ کو سب کچھ دے گی۔ اس سے آپ کو دو بیٹے ملیں گے۔ دوسری بیوی بہت مبارک، بہت صابر ہوگی ..... آپ کی طرح۔

آثار بتاتے تھے کہ ارجمند ایسی ہی ہے۔ وہ تو اس سے محبت بھی نہیں مانگ رہی ہے۔ وہ تو اللہ کو گواہ بنا کر مستقبل میں اس سے سرزد ہونے والی ہر کوتاہی، ہر زیادتی کو ابھی سے معاف کر رہی ہے۔

اور بھی شفیق صاحب نے کچھ کہا تھا ... پہلی بیوی کی وجہ سے آپ نے جو کچھ گنوایا، دوسری آپ کو وہ سب کچھ واپس دلائے گی۔

ایسا کیا ہے، جو نور بانو کی وجہ سے میں نے گنوا دیا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا۔ لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی۔

اس نے ذہن میں ارجمند کی آخری بات کو تازہ کیا۔ اس نے کہا ... اللہ میاں نے کہا کہ وہ تم سے شادی کے بعد بڑے ہوں گے۔ تم انہیں بڑا بناؤ گی۔

دونوں باتوں کا آپس میں اگر کوئی تعلق تھا تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ نور بانو سے شادی کر کے وہ کچھ چھوٹا ہو گیا ..... گھٹ گیا۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ اس پر سوچا جاتا۔

ارجمند نے دیکھا کہ وہ سوچوں میں گم ہے۔ اس نے سوچا۔ بات مکمل ہو چکی ہے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھی اور دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔

عبدالحق ایسا گم تھا کہ اسے احساس بھی نہیں ہوا۔

دروازے پر پہنچ کر ارجمند رکی۔

''آپ کو یاد ہے آغا جی ...؟'' اس نے عبدالحق کو پکارا۔

عبدالحق چونکا اور اس نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جب پہلی بار آپ مجھے یہاں لا رہے تھے، جب پھپھو مجھے آپ کے پاس لائی تھیں تو پھپھو سے جدا ہونے کے بعد میں رونے لگی تھی۔ تب آپ نے کیا

کہا تھا مجھ سے ... ؟"

عبدالحق نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ... ! مجھے یاد نہیں۔"

"آپ نے کہا تھا کہ آپ میرے آنسو برداشت نہیں کر سکتے۔ انہیں روکنے کے لئے آپ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"اچھا ... ! ایسا کہا تھا میں نے ... ؟"

ارجمند نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"اور میں نے کہا تھا، کچھ بھی؟ تو آپ نے کہا ... ہاں کچھ بھی، بس تم رونا کبھی نہیں۔"

عبدالحق کو وہ بات یاد آ گئی۔

"ہاں ... ! یاد آ گیا مجھے۔"

"تو میں نے آپ سے کچھ مانگا تھا۔ اور آپ نے جواب میں کہا تھا ... ابھی تو تم بہت چھوٹی ہو۔"

عبدالحق ذہن پر زور دینے لگا۔

"میں نے آپ کی بات مان لی۔ پھپھو کی موت کے علاوہ میں کبھی نہیں روئی۔ اکیلے میں بھی نہیں روئی۔ مجھے خوشی ہے کہ اب میں بڑی ہوگئی ہوں، اور اللہ نے آپ کے وعدے کی لاج رکھ لی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پلٹی چلی گئی۔

عبدالحق اس خالی جگہ پر نظریں جمائے ذہن پر زور دیتا رہا، جہاں ایک لمحہ پہلے ارجمند کھڑی تھی۔

پھر اچانک اسے یاد آ گیا ... ہر بات لفظ بہ لفظ یاد آ گئی۔ ہاں ... اس نے یہ کہا تھا کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ بس تم کبھی بھی نہیں رونا۔ ورنہ یہ میرے لئے بوجھ ہوگا۔ ارجمند نے ننھے بچوں کی طرح کہا تھا ... مجھ سے شادی کریں گے۔

اور اس نے حیرت سے گاڑی کی اگلی سیٹ پر اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی اس بچی کو دیکھا تھا۔ دو دوپٹے میں خود کو بہت اچھی طرح لپیٹ کر سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ لیکن تھی تو بچی ہی۔ تب اس نے انکار کرنے کے بجائے بے ساختہ کہا تھا ... ابھی تو تم بہت چھوٹی

ہو۔

وہ پورا منظر اب اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ارجمند نے اپنے آنسو ایسے پونچھے جیسے ہمیشہ کے لئے پونچھ رہی ہو۔ پھر اس نے نظریں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا تھا ... جی ٹھیک ہے۔ اب میں کبھی نہیں روؤں گی۔

اب وہ سمجھ گیا تھا۔ ارجمند نے اس کی بات کو وعدہ سمجھ لیا تھا اور اپنی طرف سے شرط پوری کر دی تھی۔ لیکن اس وقت اس نے تو اسے بچی کی بات ہی سمجھا تھا۔ نہ اہمیت دی تھی، نہ اسے سنجیدگی سے لیا تھا۔ لیکن اب دوسری شرط بھی پوری ہوگئی تھی۔ ارجمند بڑی ہوگئی تھی۔ اور وہ بات اللہ کی طرف سے پوری ہو رہی تھی ... اور وہ بھی کس انداز میں ... آسانی کے ساتھ۔ جسے سب سے بڑی رکاوٹ ہونا تھا، وہ خود ہی سب کچھ کروا رہی تھی ... نور بانو ... !

اس کے تمام وسوسے دور ہوگئے۔

وہ جو بنیادی طور پر یہ سمجھنے والا تھا کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے، اور اس میں بہتری بھی ہے، اس معاملے میں پہلی بار یہ سمجھ پایا کہ یہ سب کچھ تو اللہ کی طرف سے ہے، ورنہ تو وہ خود بھی چاہتا تو یہ ممکن نہ ہوتا۔ پہلی بار اس نے شفیق صاحب کی بات کو اہمیت دی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ اللہ سے راہنمائی طلب کرتے ہیں، اور اللہ جو چاہتا ہے، ان پر روشن کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ کی مرضی نہیں ہوتی تو انہیں زائچے میں اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

علم سارے کا سارا اللہ کا ہے!

جو وہ چاہے، وہ ہو کر رہتا ہے!

اس کی سمجھ میں آنے لگا کہ ارجمند کو اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔ بہت پاکیزہ ہے وہ۔ اور اس میں اب اسے کوئی شک نہیں رہا کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں، اس کی راہنمائی فرماتے ہیں۔ حالانکہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ارجمند سے کہا تھا کہ یہ گمراہ کن بات ہے۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔

یہ آدمی کی یادداشت کیسی ہوتی ہے۔ ارجمند کی اس بات کو اس سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔ ایک وہی تو تھا، جو پورے وثوق کے ساتھ اس کی تائید کر سکتا تھا

گواہی دے سکتا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا، اللہ کو اپنے اندر پایا تھا، حالانکہ وہ اس وقت جانتا نہیں تھا۔ وہ کون تھا، جو اندر رہ کر اس کی رہنمائی کرتا تھا، ذہن میں سوالات اٹھاتا تھا، تجسس کو ہوا دیتا تھا، اور پھر غور وفکر کے ذریعے درست جواب عطا کرتا تھا۔ وہ کون تھا، جس کے اشاروں پر دنیا کی ہر شے اسے وحدانیت کی گواہی دیتی نظر آتی تھی۔ وہ کون تھا، جس نے اسے بت پرستوں میں پیدا کیا، لیکن کبھی بت پرستی نہیں کرنے دی، مشرکوں میں پیدا کیا، لیکن شرک سے بچائے رکھا۔ وہ کون تھا، جس نے نور بانو کی آواز میں اسے قرآن کی قرأت سنوائی، اور اس کی محبت دل میں ڈالی۔ وہ کون تھا، جس نے اسے عربی زبان پڑھوائی۔ وہ کون تھا، جس نے سورۂ ملک کی وہ آیات اس پر کھولیں اور اسے ایمان سے نوازا۔ وہ کون تھا، جس نے اسے ساتوں آسمانوں کا جلوہ دکھایا۔ وہ کون تھا، جو بے خبری میں بھی اسے پاکی کے طریقے سکھاتا تھا۔ وہ کون تھا، جس نے ایمان سے بھی پہلے اسے کلمہ طیبہ سے نوازا تھا۔

ارے وہ اللہ ہی تو تھا، اور اس کے اندر موجود تھا۔

تو کیا اس نے یہ سمجھا کہ یہ عنایت صرف اس پر ہے۔ ارے وہ تو ہادی ہے، سب کے دلوں میں رہتا ہے۔ بس آدمی خود کو پاک رکھے، اللہ سے رجوع کرنے والا ہو اور اللہ کا فرمانبردار ہو۔

اور ارجمند ایسی ہی ہے۔ بلکہ جیسا وہ تھا، ارجمند اس سے بھی بہتر ہے۔

پہلی بار وہ مطمئن اور بے فکر ہوا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں بہتری ہے۔

اس نے سر گھما کر دیکھا اور حیران ہوا کہ ارجمند موجود نہیں ہے۔ پھر اسے اس کی آخری بات، اور اس کا جانا یاد آیا۔ وہ اتنا مستغرق رہا تھا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ ارجمند سے ہونے والی گفتگو بھی اسے خواب سی لگتی تھی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے اماں کو..... اور نور بانو کو بتانا تھا..... کہ وہ تیار ہے۔

❁ ❁ ❁

پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کیا نوکر ملازم اور کیا گھر کے لوگ، سب ایک دوسرے سے بڑھ کر خوش نظر آ رہے تھے۔ ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اور ساجد تو ابھی سے ارجمند کو چھوٹی چاچی کہہ رہا تھا۔

اب یہ نور بانو کی فطرت تھی۔ وہ کڑھنے لگی۔ کیا یہ سب لوگ اسی دن کے منتظر تھے؟ ان میں سے کسی کو میرا خیال نہیں آتا؟ اور ساجد .... اس نے کبھی مجھے محبت سے چاچی نہیں کہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال نہیں آئی کہ اس نے کبھی ساجد کو منہ ہی نہیں لگایا۔ وہ تو اسے ہمیشہ رکاوٹ سمجھتی رہی۔ اس نے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا رویہ بھی یاد نہیں کیا۔ بس اس پر یہ ثابت ہوگیا کہ یہ سب اس کے اور اس کی خوشیوں کے دشمن ہیں۔

لیکن ایک اچھی بات تھی۔ کہانی کے تین مرکزی کرداروں کا طرز عمل مختلف تھا۔ ارجمند تو جیسے خود میں سمٹ گئی تھی۔ نماز تو وہ پڑھتی ہی تھی مگر اس کی نمازیں، اور نماز کے بعد کی دعائیں، دونوں طویل ہوگئی تھیں۔ کچن میں وہ اپنے معمول کے مطابق گھسی رہتی۔ باقی وقت میں وہ زیادہ تر قرآن پڑھتی۔ اس تمام عرصے میں نور بانو کو اس کے چہرے پر مسکراہٹ نظر نہیں آئی۔ ساجد اسے چھوٹی چاچی کہہ کر چھیڑتا تو وہ اسے خفگی سے گھورتی اور پھر نظریں جھکا لیتی۔

نور بانو کو یقین تھا کہ ارجمند اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ وہ صرف اس کی بات مان کر، اس کی خوشی کے لئے ایثار کر رہی ہے۔

اور عبدالحق پہلے جیسا ہی تھا۔ نہ وہ خوش تھا، نہ اداس۔ پہلے کی طرح وہ اس کی فکر کرتا بات بات میں، اور اس کا خیال رکھتا۔ یہ الگ بات کہ نور بانو کو اس کا نارمل نظر آنا بھی اچھا نہیں لگا۔

''آپ تو بہت خوش نظر آ رہے ہیں اس شادی سے؟'' اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

اور عبدالحق بری طرح بھڑک گیا۔

''تم کیسی ناشکر گزار عورت ہو۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''خود ہی یہ کھیل رچایا، میری مرضی کے خلاف۔ اور اب چاہتی ہو کہ میں

بیٹھ کر روتا رہوں۔''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ ....'' نوربانو نے مدافعانہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔

لیکن عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں صرف تمہاری خاطر یہ شادی کر رہا ہوں۔ اب اگر تم نے ایسی کوئی بات کی تو یہ سب کچھ ختم سمجھنا۔''

نوربانو سہم گئی۔

''آپ تو خوامخواہ بھڑک گئے۔''

''تمہارا طنزیہ لہجہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' عبدالحق کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

''اور میری بات غور سے سنو! یہ جو تم نے شروع کیا ہے، یہ زندگی بھر کا کھیل ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ مجھے ارجمند کے حقوق کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔''

''آپ سے زیادہ اس کے حقوق کا خیال میں رکھوں گی۔''

''ابھی سوچ لو۔ اس شادی کے بعد یہ رویہ سامنے آیا تو اس کا نقصان تمہیں ہوگا، پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا۔''

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ سنجیدہ ہو گئے۔''

اور حمیدہ نے تو نوربانو کو حیران ہی کر دیا۔

جیسے ہی عبدالحق نے منظوری دی، حمیدہ نے اسے بلا لیا۔

''ہوگا وہی دھیے! جو تو چاہے گی۔'' حمیدہ نے اس سے کہا۔

''لیکن یہ تین دن والی بات آسان تو نہیں ہے نا! میرا تو خیال ہے، جمعے کا دن مبارک رہے گا۔''

نوربانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ گھر کی سب سے بااختیار ہستی اتنی عاجزی سے بات کر رہی تھی۔

حمیدہ نے اس کی نظروں کا کچھ اور ہی مفہوم لیا۔ وہ جلدی سے بولی۔

''میں نے تو صرف مشورہ دیا ہے۔ تو چاہے تو آج ہی کر دے نکاح۔

میں تو بس تیری خوشی میں خوش ہوں دھیے ....!''

''اماں ....! آپ ایسے بات نہ کریں۔ آپ کو تو حکم دینے کا حق ہے۔'' نوربانو نے تڑپ کر کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جمعہ ہی مناسب رہے گا۔ اور وقت ....؟''

''عصر اور مغرب کے درمیان کیسا رہے گا ....؟''

نوربانو حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ اب بھی حمیدہ مشورہ ہی دے رہی تھی، حکم نہیں!

''جی اماں ....! نہایت مناسب ہے۔''

تو اب دوسرے لوگوں کی خوشی سے نوربانو کو اتنا ناخوش نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اپنی فطرت کا وہ کیا کرتی۔ اس کے دل میں ان خوش ہونے والوں کے لئے بال آ گیا تھا۔ تاہم بار بار وہ خود کو یاد دلاتی کہ یہ سب کچھ اس کی اپنی مرضی سے، اس کے بھلے کے لئے ہی ہو رہا ہے۔ اس کا تو نفع ہی نفع ہے اس میں۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے۔ اسے تو اولاد ملنے والی ہے، ماں بننے کا اعزاز ملنے والا ہے، جو کسی طرح اسے نہیں ملنا تھا۔

زبیر گاؤں چلا گیا۔ وہاں اسے ڈاکٹر صاحب اور مولوی مہر علی صاحب کے علاوہ کچھ لوگوں کو مدعو کرنا تھا۔ اور مولوی صاحب کو تو نکاح پڑھانا تھا۔ یہاں صرف مسعود صاحب تھے، سو ان کے ہاں حمیدہ اور نوربانو چلی گئیں۔ مسعود صاحب کی لڑکیاں تو اس کے ساتھ ہی آ گئیں کہ کپڑوں اور زیورات کی خریداری میں نوربانو کا ساتھ دیں گی۔

گھر میں ایک طرح سے ہنگامی حالات کا نفاذ ہو گیا۔ لیکن مثبت انداز میں۔

مسعود صاحب کی بیٹیوں کے آنے سے نوربانو کو بہت فائدہ ہوا۔ ایک طرف تو ان سے مدد ملی اور دوسری طرف سے اس کی انا کو سکون ملا۔ ان دونوں کے نزدیک تو وہ بہت بڑی ہستی بن گئی تھی .... محبت اور ایثار کی معراج کی علامت۔

''آپ نے تو کمال کر دیا نور باجی......! کوئی بیوی ایسا نہیں کرتی۔''

رضوانہ نے کہا۔

''واقعی......! آپ نے تو مثال قائم کر دی۔'' شابانہ بولی۔

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ میں اتنی محبت بھری ہے۔''

''مجھے تو آپ اکھڑ سی لگی تھیں ہمیشہ۔''

''اتنا بڑا دل ہے آپ کا، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

گھر میں خوش ہونے والوں نے نور بانو کو جو زخم دیا تھا، رضوانہ اور شابانہ کی باتیں اس کے لئے مرہم بن گئیں۔ اس نے جیسا سوچا تھا، اس سے بھی بڑھ کر خریداری کی۔ ارجمند کے لئے ہر چیز وہ اعلیٰ درجے کی لائی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ اپنے کمرے میں تھی کہ ساجد گھبرایا ہوا اس کے پاس آیا۔

''دادی......! دادی......! جلدی سے چلیے میرے ساتھ۔'' اس نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوگیا پتر! خیر تو ہے......؟''

''چھوٹی چاچی رو رہی ہیں...... بہت رو رہی ہیں۔ میں نے بہت چپ کرایا، پر وہ روئے جا رہی ہیں۔ بہت برا حال ہوگیا ہے ان کا۔''

حمیدہ گھبرا گئی۔ کہیں رنگ میں بھنگ تو نہیں پڑ گیا۔ نکی نے مروت اور لحاظ میں ہاں کر دی ہو اور اب پچھتا رہی ہو۔ بے بس بچی، جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے، بے بسی سے رونے کے سوا کیا کر سکتی ہے۔

وہ اٹھی اور ساجد کے ساتھ چل دی۔

ساجد اسے گیسٹ روم میں لے گیا۔ وہاں ارجمند بیڈ پر لیٹی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ چہرے پر تھے اور جسم بری طرح لرز رہا تھا۔

حمیدہ اس کے پاس جا بیٹھی۔ ساجد کھڑا رہا۔ حمیدہ نے دھیرے سے ارجمند کو ہلایا۔

''نکی......! کیا ہوا میری نکی......!'' اس نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

ارجمند نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔

حمیدہ نے ایک نظر میں دیکھ لیا کہ اس کا بہت برا حال ہے۔ گیسٹ روم کی طرف تو کوئی آتا بھی نہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ ساجد نے اسے دیکھ لیا۔ ورنہ یہ یہاں روتے روتے مر جاتی۔ حمیدہ نے سوچا۔ اور ہو نہ ہو، بات یہی ہے کہ ارجمند اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ اگر ایسا ہے تو وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ کسی کے بھی خواب بچی کی زندگی سے اہم نہیں ہو سکتے۔

وہ ساجد کے سامنے بات نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے ساجد سے کہا۔

''تو جا پتر! میں اسے سنبھال لوں گی۔''

مگر چھوٹی چاچی کے لئے پریشان ساجد جانا نہیں چاہتا تھا۔

''جا تو یہاں سے۔ مجھے نکی سے بات کرنے دے پتر! سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اور کسی سے کچھ کہنا نہیں...... اماں سے بھی نہیں۔''

طبعاً فرمانبردار ہونے کی وجہ سے ساجد وہاں سے ٹل گیا۔ ورنہ اس کا دل نہیں مان رہا تھا۔

ارجمند اب بھی روئے جا رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

''نکی......! کیا ہوا تجھے؟ بول نا، کیا بات ہے؟'' حمیدہ نے اسے چمکارا۔

ارجمند کے ہونٹ لرزتے رہے۔ جسم ہچکیوں سے کانپتا رہا۔ وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

''تو غم نہ کر۔ میں ہوں نا تیری دادی! تیری مرتی ہوئی پھپھو نے تجھے میرے حوالے کیا تھا۔''

اس حوالے پر تو ارجمند کا گریہ اور بڑھ گیا۔ ہچکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں بدل گئیں۔

''تو مجھے بتا! تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دوں گی میں۔'' حمیدہ نے شفقت سے کہا۔

''شادی مروت میں نہیں ہوتی۔ تیری مرضی نہیں ہے تو یہ شادی میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔''

اس بات پر ارجمند کا ردعمل بہت واضح تھا۔ اس نے گریہ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت سی جھلکی اور پھر خوف۔ لیکن اس کا جسم اب بھی لرز رہا تھا۔ اور وہ کوشش کے باوجود بول نہیں پا رہی تھی۔

حمیدہ نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

"تو یہ شادی نہیں کرنا چاہتی؟ یہی بات ہے نا نکی ...؟"

ارجمند کے ہونٹ بے آواز ہلے۔ پھر اس نے بے بسی سے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

حمیدہ سمجھ نہیں سکی کہ سر کی وہ جنبش شادی کے حق میں ہے یا خلاف؟

"مجھے بتا! کیا تو اس شادی سے خوش ہے؟"

ارجمند نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔

حمیدہ نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن فوراً ہی پریشان بھی ہوگئی۔

"تو پھر کیا بات ہے پتری!"

ارجمند اپنی ہچکیوں پر اور جسم کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن یہ آسان نہیں تھا۔

"میں تیرے لئے پانی لاتی ہوں۔ پھر تو سکون سے مجھے بتانا کہ کیا بات ہے؟ ارے ! میں تیری دادی ہوں، کچھ بھی کر سکتی ہوں تیرے لئے۔"

ارجمند کو پھر رونا آ گیا۔ اس کا دل بہت نازک ہو رہا تھا۔

حمیدہ اس کے لئے پانی لے کر آئی تو وہ خود کو بڑی حد تک سنبھال چکی تھی، اور اب بیٹھی ہوئی تھی۔ حمیدہ نے اس کی طرف گلاس بڑھایا۔

"لے پتری! دو گھونٹ پی لے۔"

ارجمند نے پانی پیا اور گلاس کو سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

حمیدہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"مجھے پتا ہے نکی! کہ تو جھوٹ نہیں بولتی۔" اس نے کہا۔

"پھر بھی خاص طور پر کہہ رہی ہوں کہ اس وقت بالکل سچی بات کرنی ہے۔ مجھے صاف صاف بتا، کسی کی مروت اور لحاظ میں تو شادی کے لئے ہاں نہیں

کی ہے تو نے ....؟"

"نہیں دادی اماں! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو اس شادی سے خوش ہے نا ...؟"

"جی دادی اماں .....!"

حمیدہ کے دل سے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا۔

"تو پھر تو ایسے رو کیوں رہی تھی ....؟" اس نے محبت سے پوچھا۔

"سب لوگ یاد آ گئے تھے اماں ...!"

حمیدہ کا دل دکھنے لگا اس کے لئے۔

"اللہ نے انہیں واپس بلا لیا، اس کی مرضی! پر بدلے میں بھی تو تجھے کچھ لوگ دیئے ہیں نا.....!"

"جانے والے تو چلے گئے دادی! لیکن جو موجود ہے، وہ تو میری شادی میں شریک ہو جاتا۔"

"ایسا کون ہے نکی.....!"

"نانا .....! ان کو تو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"نانا ....؟" حمیدہ نے دہرایا، پھر ذہن پر زور دیتی رہی۔

"وہ جنہیں تیری پھپھو نواب صاحب کہہ رہی تھیں، اس دن اسپتال میں۔"

ارجمند کی آنکھیں پھر بھرنے لگی تھیں۔ اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اور تجھے پہلے کبھی ان کا خیال نہیں آیا ....؟"

"انہیں تو میں روز یاد کرتی ہوں دادی ....!"

"تو ان سے ملنے کے لئے کیوں نہیں گئی کبھی ....؟"

"کس کے ساتھ جاتی دادی اماں .....!"

"تو اپنے چاچا زبیر سے کہہ دیتی۔"

اب ارجمند اسے کیسے بتاتی کہ نانا داتا دربار میں رہتے ہیں، جہاں ہر

وقت ہجوم رہتا ہے۔

''آغا جی کے سوا انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔ آغا جی ہی انہیں پہچانتے بھی ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اور آغا جی تو اتنے برس کراچی میں رہے۔''

حمیدہ کا دل کٹنے لگا اس کے لئے۔

''تو فکر نہ کر۔ آج ہی تجھے ان سے ملوا دوں گی۔ ارے وہ تو تیرے سرپرست، تیرے ولی ہیں۔ وہی تیرا نکاح کرائیں گے۔ آنے دے عبدالحق کو۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

ارجمند رو دی۔ لیکن اس بار وہ خوشی کے آنسو تھے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق سے پہلے نور بانو واپس آگئی۔ حمیدہ نے اس سے بات کی۔

''یہ تو بہت اچھا ہوا'' نور بانو نے کہا۔

''وہ اس کے بزرگ ہیں۔ عبدالحق صاحب انہیں یہاں لائیں گے۔ وہ انیکسی میں رہیں گے اور ارجی بھی وہیں رہے گی۔ اب تو ہم اسے انیکسی سے ہی رخصت کرا کے لائیں گے۔''

حمیدہ بھی خوش ہوگئی۔

''یہ تو بہت اچھا رہے گا۔''

عبدالحق کے آنے پر اس سے بات ہوئی تو وہ شرمندہ ہوگیا۔

''یہ تو میری غیر ذمہ داری ہے۔ مجھے ان کا خیال کیوں نہیں آیا؟''

''دیر آید درست آید! اب آپ انہیں لے آیئے جا کر۔'' نور بانو نے کہا۔

''میں ابھی جا رہا ہوں۔''

''ٹکی کو ساتھ لے کر جا پتر.....!'' حمیدہ نے کہا۔

اس پہ عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''اب میں اسے ساتھ لے کر کہاں ڈھونڈتا پھروں گا انہیں۔''

''ڈھونڈنا کیسا؟ وہ اپنے گھر میں ہوں گے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''اور ڈھونڈنا بھی پڑے تو کیا، تو تو گاڑی میں جائے گا نا!''

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔ نواب صاحب کے ٹھکانے کے بارے میں بتاتے ہوئے اسے یہ ڈر ہوا کہ کسی طرح بات نہ کھل جائے۔

''لیکن اماں! ارجمند کو ساتھ لے کر جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میں جا کر انہیں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔''

مگر اس بار نور بانو آگے بڑھی۔

''آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ سات سال ہوگئے، ارجی ان سے نہیں ملی۔ یہ تو زیادتی ہے نا.....! انہیں یقیناً گلہ ہوگا اس بات کا۔ اب آپ جائیں اور ان سے کہیں کہ ارجمند کی شادی ہے، آپ میرے ساتھ چلیں، تو یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔ بھئی قاعدے کی بات تو یہ ہے کہ آپ پہلے ارجی کو لے جا کر ان سے ملائیں۔ وہ خوش ہوں گے۔ پھر معذرت کریں اور بتائیں کہ اس تمام عرصے میں آپ کراچی میں رہے۔ آپ کا عذر قابل قبول ہوگا ان کے لئے۔ پھر آپ..... بلکہ ارجی ان سے ساتھ چلنے کو کہے۔ یہ ہے عزت کی بات۔''

بات معقول تھی۔ عبدالحق نے دبی زبان سے کہا۔

''لیکن میں ارجمند کو ساتھ..... ذرا سوچو تو.....''

''باہر والوں کی بات چھوڑیں جی.....!'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''اور باہر کس کو پتا ہے کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے ارجی کے ساتھ۔ اور پتا بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ میں آپ کی بیوی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ اسے بھیج رہی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔''

اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے ارجمند کے لئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا مگر ارجمند گھوم کر دوسری طرف چلی گئی۔

''کیا ہوا.....؟'' عبدالحق نے پوچھا۔

''میں آگے بیٹھوں گی۔''

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں ارجمند بھی برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

''پیچھے بیٹھنے میں کیا حرج تھا ....؟''

''دیکھنے والے آپ کو ڈرائیور سمجھتے۔'' ارجمند نے محبوب لہجے میں کہا۔

عبدالحق نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی اور پھر حیرت سے اسے دیکھا۔

''یہ تمہیں کیسے پتا چلا ....؟''

''کالج میں لڑکیوں سے۔ اس کے بعد میں چاچا کے ساتھ کبھی پچھلی سیٹ پر نہیں بیٹھی۔''

''اوہ ....!''

داتا دربار کے پہلو والی سڑک پر عبدالحق نے گاڑی پارک کی۔ انجن بند کرنے کے بعد وہ ارجمند کی طرف مڑا۔

''اب یہاں ہجوم میں نواب صاحب کو ڈھونڈنا ہوگا۔ تم ساتھ نہ چلو تو بہتر ہے۔''

''جو آپ مناسب سمجھیں۔''

''میں گاڑی لاک کر کے جا رہا ہوں۔ تم شیشہ بھی نیچے نہ کرنا۔ ہلنا بھی نہیں یہاں سے۔''

''جی آغا جی ....! آپ فکر نہ کریں۔''

عبدالحق گاڑی سے اترا اور دروازہ لاک کرنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

❁ ❁ ❁

اچھو میاں مزار کے سامنے وسیع و عریض صحن کے درمیان اردگرد موجود ہجوم سے الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور وہ استغفار کر رہے تھے۔

سات سال پہلے وہ نادرہ کو دفنانے کے بعد اور ارجمند کو عبدالحق کے گھر چھوڑ کر سیدھے داتا دربار آئے تھے۔ تب سے وہ یہیں تھے۔ لگے بندھے معمولات تھے ان کے۔ فجر کے بعد قرآن پڑھتے، پھر صحن کے فرش کو صاف کرتے۔ پھر تسبیح

لے کر بیٹھ جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد بھوک لگتی تو باہر جا کر قطار میں لگ کر لنگر سے کھانا لیتے اور وہیں بیٹھ کر کھا لیتے۔ اس کے بعد پھر قرآن کی تلاوت اور پھر وہی تسبیح۔ یہی ان کا معمول تھے۔ نماز، قرآن اور تسبیح۔

کچھ ہی دنوں میں لوگ انہیں دیکھنے کے عادی ہوگئے۔ وہاں بہت سے لوگ ایسے تھے، جو مزار پر حاضری کے لئے باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ کچھ تو ہر روز آتے تھے، کچھ جمعرات کے جمعرات۔ اور لاہور کے قریبی شہروں میں رہنے والے بھی ماہ بہ ماہ آتے رہتے تھے۔ وہ سب انہیں پہچاننے لگے۔

ایک دن ایک شخص نے انہیں کاغذ کا ایک تھیلا دیا۔

''یہ کیا ہے ....؟'' اچھو میاں نے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''کپڑے ہیں آپ کے لئے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے ....؟''

''ضرورت ہے۔'' دینے والے نے زور دے کر کہا۔

''آپ کے کپڑے بہت میلے ہوگئے ہیں۔''

اچھو میاں نے سر جھکا کر اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی میلے ہو رہے تھے۔

''جزاک اللہ ....!'' انہوں نے تھیلا لیتے ہوئے کہا۔

انہوں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ حمام سے نکل کر اپنے میلے کپڑے بغل میں دبائے وہ دربار کی طرف جا رہے تھے کہ باہر بیٹھے ہوئے ایک فقیر نے انہیں پکار لیا۔

''یہ کپڑے مجھے دے جا بابا ....!''

وہ ہچکچائے۔

''تو تو اندر رہتا ہے۔ کہاں رکھے گا؟ یہ کپڑے مجھے دے دے۔ اللہ تجھے اور دے گا۔''

''دھلوا کر دے دوں گا۔''

"میں آپ ہی دھلوا لوں گا۔" فقیر نے کہا۔

اچھو میاں نے کپڑے اسے دے دیئے۔

اس دن کے بعد یہ بھی معمول بن گیا۔ ہر تیسرے چوتھے دن کوئی نہ کوئی انہیں جوڑا دے دیتا۔ وہ حمام جا کر نہاتے۔ نئے کپڑے پہنتے اور پرانے اسی فقیر کو دے دیتے۔ اس دن کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی لباس انہوں نے دوسری بار پہنا ہو۔ ہر بار وہ نیا کپڑا پہنتے تھے۔

"واہ میرے مالک......!" اچھو میاں نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔

"اتنے عیش تو میں نے باپ کی دولت اڑاتے ہوئے بھی نہیں کئے، جتنے آپ کرا رہے ہیں۔"

لوگوں کو ان کے بارے میں تجسس بھی ہونے لگا۔ وہ کسی سے بات تو کرتے ہی نہیں تھے۔ شاید اس لئے ان کی کشش بڑی گئی تھی۔

ایک دن کسی نے انہیں پیسے دینے چاہے تو انہوں نے انکار کر دیا۔

"لے لو...... ! رکھ لو......!"

"مجھے ضرورت ہی نہیں۔" انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"کبھی ضرورت پڑ بھی سکتی ہے۔"

"ضرورت پڑی تو مانگ لوں گا۔"

"کس سے مانگو گے......؟"

"اللہ سے...... اور کس سے مانگوں گا......؟ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔" انہوں نے بہت یقین سے کہا۔

"یہ کیسے کہہ سکتے ہو......؟"

"جانتا ہوں نا! بغیر مانگے دینے والا مجھے کسی بندے سے تو سوال نہیں کرنے دے گا۔"

اور دینے والے پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اچھو میاں تسبیح پڑھنے لگے تھے۔ وہ چند لمحے انہیں دیکھتا رہا، پھر خاموشی سے مزار کی طرف چلا گیا۔

ایک دن کسی نے کہا۔

"بڑے میاں! ابھی مزار میں نہیں دیکھا تمہیں۔"

"میں مزار میں جاتا ہی نہیں۔"

"دن رات اسی صحن میں پڑے رہتے ہو۔ اس کا مطلب ہے، کوئی ٹھکانا نہیں ہے......؟"

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آگے پیچھے کوئی نہیں ہے......؟"

"اعمال کے سوا آگے پیچھے ہوتا کیا ہے......؟"

"ٹھیک کہتے ہو۔ یہ تو سب کے ساتھ ہے۔ پر اندر کیوں نہیں جاتے مزار کے......؟"

"اپنی اوقات تو اس صحن کی بھی نہیں، تم اندر کی بات کرتے ہو۔ یہ تو مالک کا کرم ہے کہ اس نے یہاں پناہ دے دی۔"

وہ پوچھنے والا بھی کچھ حجتی تھا۔

"کرم تو اندر اور زیادہ ہے۔ کیوں خود کو محروم کرتے ہو......؟"

"کہا نا کہ اوقات نہیں ہے اپنی۔"

"مطلب کیا ہے اس بات کا......؟"

"ناپاک ہوں۔ پاک ہو جاؤں گا تو اندر بھی چلا جاؤں گا انشاء اللہ......!"

"تو جاؤ...... ! نہا دھو کر پاک ہو جاؤ۔"

"نہانے سے جسم کی غلاظت دھلتی ہے، روح کی نہیں۔ اعمال نہیں دھلتے نہانے سے۔"

"کمال ہے۔ لوگ تو پاک ہونے کے لئے اندر جاتے ہیں۔"

"ہر شخص کو اپنی غلاظت کا پتا ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹھیک کرتے ہیں، اور میں بھی ٹھیک کرتا ہوں۔"

"تو تمہیں کون پاک کرے گا......؟"

"کیسی بات کرتے ہو......؟" اچھو میاں نے برا مانتے ہوئے کہا۔

"پاک کرنے والا تو ایک ہی ہے۔" انہوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

"تمہیں کیسے پتا چلے گا اپنے پاک ہونے کا .....؟"

"پاک ہو جاؤں گا تو دل روشن ہو جائے گا۔ سب کچھ صاف نظر آنے لگے گا ..... اندر بھی اور باہر بھی۔"

"یقین سے محروم ہو۔ یقین ہوتا تو اندر جاتے اور پاک ہو کر باہر آتے۔"

"یقین دینے والا بھی تو وہی ہے۔" اچھو میاں نے پھر آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

ایک دن ایک پریشان حال عورت ان کے پاس آ بیٹھی۔

"میرے لئے دعا کرو بابا .....!"

"ہر روز دعا کرتا ہوں تمہارے لئے۔" اچھو میاں نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

"جانتے ہو نہیں مجھے، دیکھا ہے نہیں مجھے، اور کہتے ہو کہ ہر روز دعا کرتا ہوں۔"

"دعا کرنے کے لئے جاننا کب ضرورت ہے .....؟"

"تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ میری پریشانی کیا ہے.....؟"

"مجھے معلوم ہو نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پریشانی دور کرنے والے کو، ہر ضرورت پوری کرنے والے کو تو معلوم ہے۔"

"میرا دل نہیں مانتا۔" عورت نے کہا۔

"پہلی بار میں نے تم سے بات کی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم روز میرے لئے دعا کرتے ہو۔ کیوں کرتے ہو بھلا؟"

"اپنی غرض کے لئے کرتا ہوں۔"

"تمہاری کیا غرض ہے .....؟"

"توبہ کرو توبہ! غرض سے پاک، غنی اور بے نیاز تو بس اللہ کی ذات ہے۔ میں ہر روز اس سے دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ! تو یہاں آنے والوں میں سے ہر ایک

کی دعا قبول فرما لے۔ سب کی ضرورتیں پوری فرما دے۔ سب کی پریشانیاں دور کر دے اور سب کے طفیل میری بھی سن لے۔"

"یہ تو کوئی بات نہیں۔" عورت نے مایوسی سے کہا۔

"تم خاص طور پر میرے لئے دعا کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ اب خاص طور پر تمہارے لئے دعا کروں گا۔"

"کیا دعا کرو گے .....؟"

"وہی جو سب کے لئے کرتا ہوں۔"

"نہیں .....! میری تو خاص حاجت ہے۔ اس کے لئے دعا کرو۔"

"تو بتا دو! دعا میں کر دوں گا۔ آگے رب جانے۔"

"میرے گھر میں تنگی بہت ہے۔ میرے شوہر کے روزگار کی ترقی کے لئے دعا کرو۔ خوش حالی کے لئے دعا کرو۔"

عورت مطمئن ہو کر چلی گئی۔ اچھو میاں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔

ایک دن وہ تسبیح پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ تسبیح مکمل ہونے والی تھی، اور اچھو میاں کو ذکر کے دوران بولنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ انہوں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شخص کھڑا رہا۔

اچھو میاں نے تسبیح مکمل کی، پھر کھڑے ہو کر اسے تعظیم دی۔

"تم کیسے بداخلاق آدمی ہو۔ تسبیح پڑھتے رہے۔ میری بات کا جواب نہیں دیا۔" اس آدمی نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"مجبوری تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔"

"میری سمجھ میں تو نہیں آئی تمہاری مجبوری۔"

"تم اپنے باپ سے کچھ بات کر رہے ہو اور میں تمہیں پکاروں تو تم اپنی بات پوری کئے بغیر مجھے جواب دو گے .....؟ نہیں نا .....؟ کیونکہ یہ عزت اور احترام کی بات ہے۔ اب میں تو اللہ کے حضور تھا۔ تسبیح پوری کئے بغیر بولتا تو بے ادبی ہوتی۔"

"یہ تو خلوت کی بات ہے۔ جبکہ تم تو ہجوم کے درمیان بیٹھے ہو۔"

''اللہ تو ہر جگہ موجود ہے۔ جہاں آدمی اس سے لو لگا لے، وہ اس کے لئے خلوت ہی ہوتی ہے۔''

''کب سے یہاں بیٹھے ہو......؟''

''چند روز ہی ہوئے ہوں گے۔''

''تین چار سال سے تو میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' اس شخص نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''خوشی کے دن بہت تیزی سے گزرتے ہیں نا! مجھے تو یہ چند روز ہی لگتے ہیں۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ آدمی پابندی سے مسلسل ذکر کرتا رہے تو ذکر قلب میں جاری ہو جاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، لوگ تسبیح بھی پڑھتے رہتے ہیں، اور باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔''

''میرے قلب میں تو ذکر جاری نہیں ہوا۔'' اچھو میاں نے بڑی حسرت سے کہا۔

''اور ایسا ہو جائے تو بھی میں درمیان میں نہ بولوں۔''

''کیوں بھئی......؟''

''اپنا اپنا نکتہ نظر ہے۔ دیکھو، اگر اللہ کے فضل سے میرے دل میں ذکر جاری ہو جائے اور میں ایسا کروں تو کچھ لوگ تو مجھے ڈھونگی سمجھیں گے کہ میں دکھاوا کر رہا ہوں۔ اس میں تو میرا کوئی نقصان نہیں۔ لیکن کچھ لوگ اس غلط فہمی میں پڑ جائیں گے کہ میں کسی مقام پر ہوں۔ اور ایسا ہے نہیں تو اس میں میرے لئے نقصان ہے۔ اور پھر دل میں ذکر جاری ہو تو ہاتھ میں تسبیح رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''ایک بات پوچھوں تم سے......؟ یہ بتاؤ، تم ذکر کیا کرتے ہو......؟''

''یہ تو بندے اور خدا کے درمیان معاملہ ہے۔ کسی کو کسی سے نہیں پوچھنا چاہئے۔''

''ہجوم میں بیٹھ کر کرو گے تو ہر شخص کو تم سے پوچھنے کا حق ہے۔''

اچھو میاں لاجواب ہو گئے۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔

''تو یہ میرا حق ہے کہ میں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو، تمہارا حق ہے۔'' اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر میں تمہارے بھلے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ممکن ہے، کوئی کام کی بات تمہیں بتا دوں اور وہ تمہارے دل کو لگ جائے۔ نہ لگے تو اللہ کی مرضی ہے۔ کیونکہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہی ہے۔''

اچھو میاں نے چونک کر اسے دیکھا۔ عمر تو اس کی زیادہ نہیں تھی۔ گہری سیاہ گھنی اور خوش نما داڑھی اور چہرے پر پاکیزگی۔ پیشانی پر ایسی چمک تھی کہ نگاہ نہیں پڑتی تھی۔ ان کا دل اس کی طرف کھنچنے لگا۔

''ذکر کیسا، بس دو کلمے ہی پڑھتا ہوں میں۔'' انہوں نے شرمندگی اور عاجزی سے کہا۔

''دن میں شکر اور رات کو اور صبح کے وقت استغفار۔''

''دن میں شکر کیوں......؟''

''اللہ نے معاش کی فکر سے آزاد کر کے یہ فرصت عطا فرمائی ہے۔ اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔ اصل میں گناہ گار ایسا ہوں کہ دن رات استغفار کروں تو بھی کم ہے لیکن دن کو اللہ نے معاش کی فکر کے لئے بنایا ہے۔ اب اس میں اللہ نے فرصت دی تو شکر لازم ٹھہرا۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں تو جتنی بھی کرو کم ہیں...... شکر بھی اور استغفار بھی۔ سو بے حساب ہی کرنا چاہئے۔ تم دن میں چالیس ہزار بار شکر کرو اور رات میں چالیس ہزار بار استغفار، تو بھی کم ہے۔ حساب کرنے سے چیزوں کی قدر کم ہوتی ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے۔ حساب رکھنا چھوڑ دو۔ بس شکر و استغفار کرو تو کون جانے کہ رب اسے بے حساب مان لے۔''

''آپ کی بات دل کو لگتی ہے۔'' اچھو میاں نے شکر گزاری سے کہا۔

''اور پھر سوچو، رب بھی تمہاری طرح حساب کرنے لگے تو کیا ہو۔ مگر وہ بے حساب دیتا ہے۔ تو تمہیں بھی شکر بے حساب کرنا چاہئے۔ اور تمہیں تو اس کی نعمتوں کا علم ہی نہیں ہے...... بیشتر کا، اور اپنے گناہوں کا سوچوں، تو مجھے معلوم ہے

کہ وہ اتنے کثیر ہیں کہ میں انہیں یاد بھی نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی جانتا ہوں کہ جن گناہوں کا اپنے مجھے علم ہی نہیں، وہ تو معلوم گناہوں سے ہزاروں گنا زیادہ ہیں۔ تو استغفار بھی بے حساب ہی ضروری ہے۔ اب بے حساب کچھ کرنے کی تو اپنی بساط ہی نہیں ہے۔ بس اتنا کر سکتے ہیں کہ گنتی چھوڑ دیں۔ اب اللہ کی رحمت اسے بے حساب مان لے، یہ کوئی بڑی بات نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ......!" اچھو میاں نے تسبیح سمیٹ کر جیب میں رکھ لی۔

"اب اسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا کبھی۔"

"اب ایسا بھی نہیں کرو۔ آدمی کی فطرت ہے کہ گنتی کے بغیر کبھی خوش نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں تو مال ہی شمار کرتا رہتا ہے۔"

"تو پھر کیا کروں میں......؟"

"ایک تسبیح بتاتا ہوں۔ جب سورج عین سر پر ہو اور جب سورج غروب ہونے کو ہو، ستر بار سید الاستغفار پڑھ لیا کرو۔" یہ کہہ کر اس شخص نے انہیں سید الاستغفار یاد کرا دیا۔

"اب یہ یاد رکھنا۔ اس سے استغفار کا وزن بڑھتا ہے۔"

"جی...... ٹھیک ہے......!"

"میں تمہیں اور بھی کچھ بتاتا۔ اللہ کے کچھ نام، چند آیات......"

"مجھے تو استغفار کے لئے یہ وقت بھی کم ہی لگتا ہے۔"

"ایک بات کہوں! اللہ کے ہاں تعداد اور مقدار سے زیادہ اہمیت اخلاص کی ہے۔ کون جانے، کوئی دل کی، روح کی گہرائی سے ایک بار استغفر اللہ کہے اور اللہ اس کے کل گناہ بخش دے۔ لیکن اللہ کو بندے کا گناہ گاری کا شدید احساس اور اس پر شرمندگی اور فکرمندی بھی اچھی لگتی ہے۔ ہر ایک کا اپنا طریقہ ہوتا ہے، اپنے مزاج اور فطرت کے مطابق۔ دنیا میں جتنے بھی راستے ہیں، شاید اس سے بھی زیادہ راستے انسان کے سامنے ہوتے ہیں، اور ہر راستہ اسے اللہ تک پہنچاتا ہے۔ اب کوئی اتنی آسانی پر بھی نہ پہنچے اس تک تو اس کا نصیب۔ اچھا یہ بتاؤ، استغفار سے کب

فرصت ملے گی تمہیں؟"

"وہ کہاں مل سکتی ہے۔ گناہ کب چھوڑتے ہیں آدمی کو۔" اچھو میاں نے آہ بھر کر کہا۔

"یہ جو تم کر رہے ہو، یہ تو غیر معمولی ہے نا! میں اس کی بات کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ تو عمر رائیگاں کا ہے۔ جس دن مجھے پتا چل گیا کہ اللہ نے کامل بخشش فرما دی ہے، مجھ غلیظ کو دھو کر پاک کر دیا ہے، وہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہوگا۔"

"تو کیسے پتا چلے گا اس کا......؟"

"وہ میں نے اللہ پاک سے ایک شرط لگا لی ہے۔ وہ پوری ہوگی تو مجھے پتا چل جائے گا۔"

"اللہ سے شرطیں بھی لگاتا ہے کوئی......؟"

"ہاں......! مجھ جیسے گناہ گار ہی لگا سکتے ہیں۔ اطاعت شعار تو چوں بھی نہیں کرتے اس کے سامنے۔"

"دلچسپ بات ہے۔ مگر دل کو لگتی ہے۔" اس شخص نے کہا۔ پھر پوچھا۔

"شرط کیا ہے تمہاری......؟"

"کسی اور کو کیوں بتاؤں؟" یہ تو میرا اور اس کا معاملہ ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ نہ بتاؤ......!" اس شخص نے کہا اور چلا گیا۔

اس دن سے اچھو میاں کے معمولات بدل گئے۔ تسبیح صرف دو وقت ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ باقی وہ اپنا کام خاموشی سے کرتے رہتے تھے۔ لیکن انہیں احساس ہوتا تھا کہ الحمد للہ اور استغفر اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل رہا ہے اور وہ ہلکے پھول ہوتے جا رہے ہیں۔

باہری دنیا میں ایک ارجمند انہیں یاد آتی تھی اور دوسرا عبدالحق۔ وہ ان دونوں کے لئے باقاعدگی سے دعا کرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کا دل مچلتا کہ عبدالحق کے گھر جائیں اور ارجمند کو دیکھیں۔ اب تو وہ بڑی ہوگئی ہوگی۔ لیکن وہ اب مزار کی

حد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے تھے، اور اس بات کا انہیں یقین تھا کہ وہ اللہ کی امان میں ہے۔

کوئی ایک سال ہوا ہوگا کہ ایک عورت سیدھی ان کے پاس آئی اور ان کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے سلام کیا، انہوں نے سلام کا جواب دیا۔

''آپ نے مجھے پہچانا نہیں بابا....؟''

''نہیں....! میرا خیال ہے، میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' اچھو میاں نے کہا۔ انہوں نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کے لباس اور ظاہری وضع قطع سے امان جھلکتی تھی۔ چہرے پر بھی خوش حالی کی چمک اور رنگ تھا۔ لیکن آنکھوں میں پریشانی اور اضطراب تھا۔

''میں نے تم سے ضد کر کے دعا کے لئے کہا تھا، یاد نہیں....؟''

وہ اچھو میاں کیسے بھول سکتے تھے۔ ایک ہی عورت تو ایسی تھی۔

''اوہ.....تو تمہاری دعا قبول ہوگئی۔''

''میری دعا کہاں قبول ہوئی؟ تم نے کی تو قبول ہوگئی۔''

''یہ سب اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔ میں اپنے لئے جو دعا کرتا ہوں، وہ تو قبول نہیں ہوئی اب تک۔ سمجھ رہی ہو نا! سب اس کی طرف سے ہے۔''

''تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔'' عورت نے بے دلی سے کہا۔

''تم اب تک وہ دعا کرتے ہو میرے لئے....؟''

''ہاں.....! بلاناغہ، وعدہ جو کیا تھا۔''

''اب چھوڑ دو وہ دعا۔''

''ہاں! لگتا ہے، تمہیں اللہ نے سب کچھ دے دیا۔ سب دلدر دور ہوگئے تمہارے۔''

''دلدر تو اور بڑھ گئے بابا....!''

''دیکھنے میں تو خوش حال ہی لگتی ہو۔''

''خوش حال تو ہوں۔ مگر یہ سمجھ گئی کہ خوش حالی صرف روپے پیسے سے نہیں ہوتی۔ خوش حالی تو اندر کی خوشی سے ہے، باہمی محبت سے ہے، اندر کے اور گھریلو

سکون سے ہے۔''

''بڑی تلخ ہوگئی ہو۔ ہوا کیا ہے تمہارے ساتھ.....؟''

''اللہ نے کرم فرمایا، تنگی دور کی، بلکہ دولت کی برسات کر دی۔ شوہر میرا تنگ دل بھی نہیں ہے۔ مجھے اور بچوں کو سب کچھ دے رکھا ہے اس نے۔ زندگی کی ہر آسائش فراہم کی ہے۔ لیکن اب نہ وہ میرے لئے پہلے جیسا ہے، نہ بچوں کے لئے۔''

''مصروفیت بڑھ گئی ہوگی۔'' اچھو میاں نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں.....! وہ عیاشی میں پڑ گیا ہے۔ دوسری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ کئی کئی دن گھر نہیں آتا۔''

''مگر تم نے جو مانگا تھا، وہ تو تمہیں مل گیا۔ اب کیوں ناخوش ہو....؟''

عورت رونے لگی۔

''وہ تنگ دستی اس خوش حالی سے اچھی تھی۔ تنگی کی وجہ سے ہم لڑتے تھے۔ لیکن ہمارے درمیان محبت تھی۔ بچے چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترستے تھے۔ لیکن تمیز دار اور کہنا ماننے والے تھے۔ اب گھر میں محبت نہیں، میں شوہر کی توجہ سے محروم ہوں۔ ادھر بچے بدتمیز اور نافرمان ہوگئے ہیں۔ میں آسائشوں کا کیا کروں۔ انہیں تو شوہر اور بچوں کے ساتھ بانٹنے پر خوشی ملتی ہے۔ میں تو اکیلی ہوگئی بالکل، میں تو لٹ گئی۔''

''مجھے دکھ ہوا یہ سن کر۔'' اچھوں میاں نے تاسف سے سر ہلایا۔

''مگر کوئی نہیں سمجھتا کہ اللہ نے جو کچھ اسے دیا ہے، وہ اس کے لئے بہتر ہے۔ اب محروم ہونے کے بعد وہ تنگ دستی تمہیں اچھی لگ رہی ہے۔''

''آپ اب بھی میرے لئے وہی دعا کرتے ہیں بابا....؟''

''ہاں....!''

''اب وہ دعا چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دوں گا۔''

''اب میرے لئے بس یہ دعا کرو کہ میرا شوہر مجھے واپس مل جائے.....

پہلے جیسا ہو جائے۔''

عورت اتنی دل برداشتہ ہو رہی تھی کہ اس سے اصرار بھی نہیں کیا گیا۔ بس یہ کہہ کر چلی گئی۔

اچھو میاں دیر تک سوچتے رہے۔ وہاں برسوں انہوں نے بازار میں گزارے، اور اب یہاں مزار میں۔ زندگی کا ایک ہی عام روپ انہوں نے دیکھا۔ زندگی صرف خواہشوں کے پیچھے بھاگنا، ان کے حصول کے لئے تگ و دو کرنا تھا۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔ اور خواہش کیسی ہی ہو، جائز ہو یا ناجائز، فائدہ پہنچانے والی ہو یا ضرر رساں، آدمی اس کے پیچھے باؤلا ہو جاتا ہے۔ خواہشیں پوری نہ ہو تو اللہ کی طرف لپکتا ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ ہر خواہش پوری ہو جانے پر حقیر اور بے معنی لگنے لگتی ہے۔ اس کی جگہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے وہ کوئی اور خواہش کرنے لگتا ہے، اور پھر اس کے لئے وہی دیوانگی۔ آہ ...! اب سمجھ میں آیا زندگی کی بے سکونی کا راز۔ خواہشوں کے سامنے سپر ڈالنا ہے۔ شاید ہی بھی آزمائش ہے۔ آدمی خواہشوں کو نظر انداز کرے تو زندگی پُرسکون ہو جاتی ہے۔ قناعت اختیار کرے تو زندگی خوب صورت ہو جاتی ہے۔ جو مل گیا، اسے نعمت سمجھا اور اس پر اللہ کا شکر ادا کیا، یہ ہے سچی خوشی کا راز، جو آدمی کے باطن سے ابھرتی ہے۔ اس میں روح کی طمانیت ہے۔

وہ سب کچھ دیکھ کر آئے تھے، اور جہاں سے وہ ہو کر آئے تھے، اور جہاں وہ آئے تھے، انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ خود نہیں آ سکتے تھے۔ اللہ انہیں لے آیا تھا ... جانے کیوں؟ مگر اس جانے کیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے بارے میں کوئی تجسس زیبا نہیں کہ تجسس شیطان کا اکساوا ہے، اور اس کا حاصل غرور، جو شیطان کی صفت ہے۔ جانے کیوں کیسا؟ کریمی کا کوئی سبب نہیں ہوتا۔ کریمی کے لئے کسی اہلیت کی ضرورت نہیں۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے، اور بس! اللہ کی رحمت کو کسی جواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ان کے وجود میں سنسنی سی ابھری۔ یہ احساس ہوا کہ انہوں نے بہت اہم نکتہ سمجھ لیا ہے، کوئی بہت اہم بھی پا لیا ہے۔ اور یہ انہیں ہر شخص کو بتانا چاہئے ...

ساری دنیا کو بتانا چاہئے۔ یہ بنی نوع انسان کی امانت ہے۔

لاحول ولا قوۃ ...... انہوں نے بلند آواز میں بے ساختہ کہا، اور خود بھی چونک گئے۔ ارے ......! یہ شیطان کبھی نہیں چوکتا۔ کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا؟ اللہ نے یہ بھید مجھ گناہ گار پر کھولا، اس کی رحمت، مگر میرے لئے کھولا۔ میں ایک فرد ہوں، حقیر، گناہ گار زندگی کے روئے زمین پر پھیلے ہوئے بے کراں صحرا میں ریت کا ایک بے نشاں ذرّہ، جو کسی کو دکھائی بھی نہیں دیتا ...... سوائے میرے ربّ کے۔ تو میں ہوں کیا؟ ایک فرد! میں کوئی مصلح نہیں۔ میرا یہ کام نہیں، میں کسی کو کیا سمجھا سکتا ہوں، میں تو خود بھی نہیں سمجھ سکتا اس کی رحمت کے بغیر۔ اور اس نے کتنے انبیاء بھیجے، کتنے پیغمبر بھیجے، زندگی کے تمام بھید کھولنے کے لئے ...... ہر اہم نکتہ سمجھانے کے لئے، لیکن کتنے لوگ سمجھ پائے؟ اکثریت نے تو بس انہیں جھٹلایا ہی۔ یہ دنیا، اس کے تمام لوازمات، ساری نعمتیں جو اللہ نے مسخر کر دیں آدمی کے لئے، یہی آدمی کو غفلت میں ڈالتی ہیں، اسے طاقت کا، خودمختاری کا احساس دلاتی ہیں۔ ایسے میں وہ سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہتا۔

یہ بہت بڑا سوال ہے کہ زندگی کیا ہے؟

اور اس کا بہت چھوٹا سا جواب ہے ...... اللہ سے تعلق!

لیکن اس تعلق کے حوالے، اس کی جہتیں بے شمار ہیں۔ تم بندے ہو اور وہ معبود ہے، تو اس کی عبادت کرو۔ تم غلام ہو اور وہ آقا ہے تو اس کی اطاعت کرو۔ سرکشی اور گناہ تمہاری فطرت میں ہے اور وہ غفور الرحیم ہے تو اس سے مغفرت طلب کرو۔ تم سراسر محتاج ہو اور وہ غنی ہے تو سب کچھ اسی سے مانگو۔ اپنی ہر ضرورت کے لئے اسی کی طرف دیکھو، اسی سے مدد چاہو۔ تمہاری ہر سانس اور ہر دھڑکن اور کائنات کی ہر شے اس کے قبضہ قدرت میں ہے تو جو چاہئے، صرف اس سے مانگو۔ نہ ملے تو اس سے دست بردار ہو جاؤ کہ وہی تو سب کچھ جانتا ہے، اور وہی سب سے بڑھ کر تم سے محبت کرتا ہے، وہی سب سے بڑھ کر ...... تم سے بھی بڑھ کر تمہاری بہتری کی فکر کرتا ہے۔ تم سرکش سہی، لیکن اس کی غلامی کے تصور کو اپنے قلب و ذہن

میں زندہ رکھو کہ آقاؤں کا آقا ایک وہی تو ہے، جو سرکش غلاموں کو بھی بخش دیتا ہے۔ نہ یقین آئے تو اپنی دنیا کے چھوٹے آقاؤں کو دیکھ لو کہ وہ تمہاری ذرا سی سرکشی کو بھی معاف نہیں کرتے۔ تو اس کی غلامی کرو اور زمین میں اس کے خلیفہ بن جاؤ۔ نعمتیں تمہاری غلام بن جائیں گے اور تمہیں ان کی پرواہ بھی نہیں رہے گی۔ غلامی کا محض تصور بھی اپنے قلب و ذہن میں قائم رکھو لے تو عجب نہیں کہ وہ خوش ہو کر تمہیں یہ سب سے بڑا شرف عطا فرما دے ... اپنی غلامی کا۔ اور اس نے اہتمام فرمایا، اپنے غلاموں کے لئے ایسی جنتیں آراستہ کر دیں، جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے، اور سرکشوں کے لئے دوزخ بنا دی کہ جیسے اعمال کرو، ویسا صلہ پالو، اور وہ بھی ابدی زندگی میں۔ تم اپنی فطری سرکشی اور اپنے نفس کی غلامی کے باوجود اس کی غلامی کے تصور کو زندہ رکھو تو عجب نہیں کہ وہ تمہیں جنت کا مستحق بنانے کے لئے اچھے اعمال عطا فرما دے۔ بلکہ اس کی رحمت تو ایسی ہے کہ خوش ہو جائے تو بغیر اعمال کے ہی تمہیں جنت نصیب فرما دے۔ تم اس کی غلامی کا تصور تو رکھو، موہوم سا ہی سہی۔ اور اپنی بے بسی کو، اپنے بے حیثیت ہونے کو تو سمجھو۔ اللہ سے تعلق تو قائم رکھو۔

وہ عجیب سی کیفیت تھی۔ اچھو میاں، اچھو میاں ہی نہیں رہے تھے۔ ان کے اندر جیسے کوئی اور بیٹھا ہوا تھا۔

اللہ سے تعلق ... !

عبادت تو لازمی ہے کہ بندگی ہے۔ دل سے ایمان لانا نظریاتی عبادت ہے۔ اور نماز عملی عبادت۔ اللہ کے احکام ماننا بھی عملی عبادت، اور جو نعمتیں اس نے عطا فرمائیں، ان کا شمار تو دور کی بات ہے، تمہارے لئے ان کا ادراک بھی ممکن نہیں۔ تو ان کا شکر ادا کرتے رہو۔ لیکن یہ زبانی شکر بھی محض نظریاتی ہے، اور دنیا کو اللہ نے دارالعمل بنایا ہے۔

اب حقیقت یہ ہے کہ تمہارے پاس جو نعمت بھی ہے، خواہ ظاہری طور پر اُسے تم نے خود حاصل کیا ہو ... اپنی محنت، طاقت یا تدبر سے ... درحقیقت وہ اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اور اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ وہ تو تم سے تمہارے جسم

کے اعضاء کا بھی حساب لے گا۔ تو عملی شکر، یہ ہے کہ اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو اس کے احکام کے خلاف استعمال نہ کرو۔ بلکہ اس کے احکام کے مطابق استعمال کرو۔ کسی چیز کو اپنی ملکیت نہ سمجھو۔ وہ اللہ کی امانت ہے تمہارے پاس، اور ایک مخصوص مدت کے لئے ہے، جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ تو اللہ سے ڈرو اور شکر ادا کرتے رہو۔

اور تمہارے پاس نفس ہے، جو گناہوں پر اکساتا ہے، ہوس جس کے خمیر میں ہے، یہ جان رکھو کہ جیسے تم سانس لیتے ہو، ویسے ہی گناہ کرتے ہو۔ گناہ تو تم غیر شعوری طور پر بھی کرتے ہو، بے خبری میں بھی کرتے ہو، اور خود کو پاک و صاف سمجھتے رہتے ہو۔ تو اس کے لئے ضروری ہے کہ استغفار کرتے رہو۔ بے خبری میں بھی استغفار کرو، کیونکہ بے خبری میں گناہ بھی تو کرتے ہو۔ اللہ استغفار کی برکت سے تمہیں دھوتا، پاک کرتا رہے گا۔ تمہیں بھاری نہیں ہونے دے گا۔ تم ہلکے رہو گے۔

یہ ہے زندگی ... !

مگر تم تو خواہشوں کے پیچھے بھاگتے رہے، جیسے کتا ہڈی پر لپکتا ہے، اس سے زیادہ رفتار سے تم خواہشوں پر لپکتے رہے ... اچھے برے کی تمیز کئے بغیر۔ حالانکہ اللہ نے خواہشوں کے حصول کے بعد بھی تمہیں اپنی نشانی دکھا دی۔ ناجائز خواہش نے تمہیں بس ایک پل کی خوشی دی۔ اس کے بعد طویل مدت تک کا تاسف، بے لذتی اور بے کیفی۔ تمہیں بتا دیا گیا کہ اللہ کے حکم سے باہر جو کچھ بھی ہے، اس کی لذت اور خوشی بے حد عارضی ہے۔

اچھو میاں کو گزری یاد آئی۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے رہے۔ ان کی داڑھی تر ہوگئی۔ چہرہ بھیگ گیا۔ قمیص کا دامن تر ہو گیا۔ پھر اچانک انہیں قرار آ گیا، جیسے دکھتے، دہکتے ہوئے دل پر کسی نے ٹھنڈے مرہم کا پھایہ رکھ دیا ہو۔

زندگی کیا ہے، وہ کسی کو کیا بتائیں گے اور کون سمجھے گا۔ پیغمبروں کے ہوتے ہوئے امتیں تباہ کر دی گئیں۔ قرآن موجود ہے، سب کچھ بتانے کے لئے۔

مگر پڑھے والوں کو بھی نہیں پتا چلتا کہ زندگی کیا ہے۔

یہ تو اللہ کی کریمی ہے ان پر...... اور ان کے لئے۔

اللہ نے جو کچھ بھی انہیں دیا، وہ استحقاق کے بغیر دیا ہے۔ اور جو کچھ استحقاق کے بغیر ملا ہو، اس کا حساب تو دینا پڑتا ہے۔ اب جس کا سرے سے کوئی استحقاق ہی نہ ہو، اس کے حساب کی طوالت کا کیا کہنا۔

ان پر تھرتھری چڑھ گئی۔

اس دن کے بعد ان کے شکر میں اور گہرائی آگئی۔ ان کے استغفار میں شامل گریہ وزاری میں اور اضافہ ہوگیا۔ وہ اللہ سے گڑگڑا کر، رو رو کر دعا کرتے کہ انہیں بخش دیا جائے، انہیں دھو کر پاک کر دیا جائے۔

اور ابھی بیس دن پہلے انہیں لگا کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر لی اور انہیں بخش دیا۔ ایسے وہ ماننے والے کب تھے۔ لیکن اللہ نے ان کی شرط بھی پوری کر دی۔ ارے......! وہ کیسے ناز برداری کرتا ہے اپنے گناہ گار بندوں کی۔

اس روز وہ ستون سے ٹیک لگائے سیّد الاستغفار کی تسبیح کر رہے تھے۔ تسبیح مکمل کر کے انہوں نے جیب میں رکھی ہی تھی کہ ایک شخص ان کے پاس چلا آیا۔ وہ کلین شیو تھا اور پینٹ شرٹ پہنے تھا۔

وہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''حضرت آپ کا نام اشرف علی ہے......؟'' اس نے بے حد ادب سے پوچھا۔

اچھو میاں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''جی ہاں! مگر آپ مجھے کیسے جانتے ہیں......؟''

''میں آپ کو جانتا ہوتا تو آپ کا نام پوچھتا بھلا!''

''تو پھر......؟''

''مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ اس وقت مجھے یہاں ملیں گے۔ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہوں اور ایسی تسبیح ہوگی آپ کے ہاتھ میں۔ میں کب سے آپ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر حکم تھا کہ تسبیح پوری ہونے سے پہلے آپ سے بات نہ کروں۔ پھر آپ سے

آپ کے نام کی تصدیق کروں۔''

''یہ کس نے بتایا تھا آپ کو......؟'' اچھو میاں اب بھی حیران تھے۔

''میں تو انہیں بھی نہیں جانتا۔''

''اور پھر بھی ان کے کہنے پر یہاں میری تلاش میں دوڑے آئے......؟''

''بات ہی ایسی تھی۔ خیر اسے چھوڑیں۔ یہ بتائیں، بیعت اللہ شریف جائیں گے آپ......؟''

اچھو میاں کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں آیا۔

''یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں آپ......؟''

''جی ہاں......! یہ پوچھنے ہی کے لئے آیا ہوں آپ کے پاس!''

یقین آیا تو اچھو میاں اضطراری طور پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر انہیں خیال آیا تو مایوسی سے بولے۔

''مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اسے چھوڑیں۔ میرے سوال کا جواب دیں!''

''جواب کیسا؟ چلئے......!'' اچھو میاں نے اس شخص کا ہاتھ تھام لیا۔

''ارے ارے......! اب ایسا تو نہیں ہوتا۔'' وہ شخص بوکھلا گیا۔

''ابھی تو میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔''

''کون بدبخت انکار کرے گا وہاں جانے سے؟ میری تو یہی ایک آرزو ہے زندگی میں۔''

''تو سمجھ لیں، آپ کی آرزو پوری ہونے کا وقت آگیا ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہوگا......؟'' اچھو میاں تو اب ایسے بے قرار تھے کہ انہیں چین ہی نہیں تھا۔

''سب کچھ میں کروں گا، آپ فکر نہ کریں۔ یہ بتائیں، انٹرنیشنل پاسپورٹ ہے آپ کے پاس......؟''

اچھو میاں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھے۔ بات بات پر ایسا لگتا کہ یہ نہیں ہوگا۔

"کوئی بات نہیں! پہلے ہمیں آپ کا پاسپورٹ بنوانا ہوگا ..... وہ بھی ارجنٹ۔"

"مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ چلیں میرے ساتھ۔"

اچھو میاں اس کے ساتھ چل دیئے۔ رہ رہ کر انہیں خیال آتا کہ کہیں وہ کوئی نوسر باز تو نہیں۔ پھر سوچتے، ان کے پاس ہے کیا کہ کوئی نوسر باز ان پر اپنا وقت ضائع کرے۔

برسوں بعد وہ مزار کی حدوں سے باہر نکلے۔ باہر جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ پہلے سے زیادہ بھیڑ تھی راہ گیروں کی۔ تانگے اور رکشے تو خیر تھے ہی، لیکن گاڑیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

وہ شخص سب سے پہلے تو انہیں فوٹو گرافر کے پاس لے کر گیا۔ وہاں زندگی میں پہلی بار انہوں نے تصویر کھنچوائی۔ تصویریں دو دن بعد ملنی تھیں۔ پھر وہ پاسپورٹ آفس گئے۔ وہاں سب لوگ اس شخص کو جانتے تھے، اور اس کا احترام کرتے تھے۔ اس بات سے اچھو میاں کے دل کو اطمینان ہوا۔

وہاں سے اس شخص نے کچھ فارم لئے اور اچھو میاں سے پوچھ کر وہ فارم بھرے۔ پھر فارم پر کئی جگہ ان سے انگوٹھا لگوایا۔

"یار محسن صاحب! میرے کام کا کیا ہوا.....؟" ایک کلرک نے اس شخص سے پوچھا۔

"مجھے یاد ہے۔ ہو جائے گا انشاء اللہ.....!"

واپسی میں وہ شخص انہیں ایک بڑے مہنگے ریسٹورینٹ میں لے گیا۔ اچھو میاں نے اس کے اصرار کے باوجود کھانے کی کسی چیز کا نام نہیں لیا۔ بالآخر اس شخص نے خود ہی کئی طرح کے سالن منگوا لئے۔

برسوں کے بعد اچھو میاں نے پُرتکلف کھانا کھایا۔ ورنہ وہ تو بس لنگر کی دال اور چنوں والے چاولوں اور زردے کے عادی تھے۔ انہیں اچھا لگا۔ لیکن وہ بہرحال تکلف کر رہے تھے۔

"اچھی طرح کھایئے اشرف صاحب !"

"میں اچھی طرح ہی کھا رہا ہوں۔" اچھو میاں نے کہا۔

"آپ مجھے یہ تو بتایئے کہ یہ سب کیا ہے.....؟"

"آپ آم کھایئے! پیڑ کیوں گنتے ہیں؟"

"تجسس کی وجہ سے۔ میں جانتا ہوں کہ اس بھری دنیا میں کوئی مجھے نہیں جانتا۔ پھر آپ کیسے میرے پاس آئے؟ کیسے مجھے پہچانا؟ کسی نے تو آپ کو بتایا ہوگا میرے بارے میں؟ کون ہو سکتا ہے وہ؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے.....؟"

"یقین کریں ایسا ہی ہے۔"

"اچھا.....! مجھے اپنے بارے میں بتائیں۔"

"میرا نام محسن ہے۔ میں پاسپورٹ آفس میں کام کرتا تھا۔ پھر میں نے نوکری چھوڑ دی۔ باہر کے کچھ ملکوں میں میرے دوست ہیں۔ تو میں نے یہاں لوگوں کو غیر ملک بھیجنے کا کام شروع کر دیا۔ حج کا سیزن آتا ہے تو لوگوں کے پاسپورٹ بنوانے میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ عام لوگوں کو تو پاسپورٹ بنوانا بہت مشکل کام لگتا ہے۔ میری اچھی آمدنی ہو جاتی ہے اس کام میں۔ بس یہ ہے کہ سعودی عرب کا معاملہ بن جائے تو میں کہیں کا کہیں پہنچ جاؤں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ سعودی، پاکستانیوں کو منہ ہی نہیں لگاتے۔ ان کا جھکاؤ ہندوستان کی طرف رہتا ہے۔ مگر ابھی کچھ بہتری شروع ہوئی ہے۔ سعودی عرب نے کچھ لوگ مانگے ہیں وہاں کام کرنے کے لئے۔"

اچھو میاں کو لگا کہ ان کی خوشی چھننے والی ہے۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔"

"جو کام وہ چاہتے ہیں، وہ آپ کو آتا ہے۔" محسن نے مسکرا کر کہا۔

"آپ مزار میں صحن کی صفائی تو کرتے ہیں نا؟"

اچھو میاں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو یہ کام آپ بیعت اللہ شریف میں نہیں کر سکتے؟"

اچھو میاں کو لگا کہ خوشی سے ان کا دل بند ہو جائے گا۔ ان سے بولا بھی نہیں گیا۔ بس مضطربانہ انداز میں سر ہلانے لگے۔

"اب اس کام کے لئے تو مسلمان ہی بلائے جا سکتے ہیں نا! تو مجھے یہ کام مل گیا۔ چالیس بندے چاہئیں وہاں کے لئے۔"

"مجھ تک کیسے پہنچے آپ......؟"

"آپ یقین نہیں کریں گے۔" محسن نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ بتائیں تو....."

"رات میں نے خواب دیکھا۔ خواب میں ایک شخص تھا، بہت پاکیزہ صورت، جوان، چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی، پیشانی چمکتی ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا، اچھا کام ملا ہے تمہیں۔ مگر میرا ایک کام کرو تو عمر بھر کامیاب رہو گے۔ میں نے پوچھا، کیا کام ہے؟ وہ بولا ..... آؤ میرے ساتھ۔ وہ مجھے مزار میں لے گیا اور مجھے آپ کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ کہنے لگا، انہیں اچھی طرح پہچان لو۔ کل دوپہر بارہ بجے یہاں آنا، یہ تمہیں یہیں ملیں گے۔ تسبیح پڑھ رہے ہوں گے، تسبیح کے دوران نہ چھیڑنا انہیں۔ تسبیح پڑھ لیں تو بات کرنا۔ سب سے پہلے ان کے بیت اللہ شریف جانے کا بندوبست کرنا ہے تمہیں۔ اور سب کچھ خود ہی کرنا، خرچہ بھی کرنا، ان کی خدمت بھی کرنا، جو خرچ کرو گے، عمر بھر ملتا رہے گا۔

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا۔ لیکن گیارہ بجے مجھے بے چینی ہونے لگی۔ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مزار پر آنے کا۔ لیکن بے چینی بڑھتی گئی۔ پھر میرے قدم خود بخود اٹھنے لگے۔ میں بھی چل دیا۔ سوچا تھا کہ کوئی نہیں ملے گا اور میں دعا کر کے واپس آ جاؤں گا۔ مگر وہاں تو آپ سچ مچ موجود تھے۔ بس پھر میں نے خواب کی ہدایات پر عمل کیا۔ اتنی سی بات ہے۔"

"تو میں کب جاؤں گا......؟" اچھو میاں نے بے قراری سے پوچھا۔

"پندرہ بیس دن تو لگیں گے۔ ابھی پاسپورٹ بنے گا۔ پھر میں کاغذات جمع کراؤں گا۔ اس کے بعد جب بھی ٹکٹ ملا، آپ کی روانگی۔ لوگ بحری جہاز سے

جاتے ہیں، بہت دن لگتے ہیں سفر میں۔ لیکن آپ کو سعودی حکومت ہوائی جہاز کا ٹکٹ دے گی۔"

"اب واپس چلیں!"

اچھو میاں داتا دربار واپس آ گئے۔ ان کی عجیب کیفیت تھی۔ کبھی وہ سب کچھ سچ لگتا اور کبھی خواب۔ اب وہ تنہائی کے گوشے ڈھونڈنے لگے۔ لیکن پھر انہیں خیال آتا کہ وہ شخص انہیں ڈھونڈتا ہوا اسی جگہ آئے گا۔ انہوں نے وہی جگہ پکڑ لی۔ نظریں تو وہ ویسے ہی کم اٹھاتے تھے، مگر اب تو وہ نظریں اٹھانا بھول ہی گئے۔ آنکھیں ہر وقت بھری رہتیں۔ دل جیسے اندر سے پگھلتا رہتا۔ ہر آہٹ پر وہ سمجھتے کہ ان کا محسن آ گیا۔ لیکن نظر نہ اٹھائی جاتی۔

ایک ہفتہ ہو گیا اور وہ نہ آیا، تو وہ مایوس ہو گئے۔

"میرے ایسے نصیب کہاں؟" وہ بڑبڑاتے۔

"کہاں بیت اللہ شریف کی جاروب کشی اور کہاں میں گناہ گار، میں تو اس قابل ہی نہیں ہوں۔ اللہ کا شکر کہ اس نے چند روز کی خوشی دے دی۔"

لیکن آٹھویں دن وہ آ گیا۔

"پاسپورٹ بن گیا ہے آپ کا....."

"آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں انتظار کرتا رہا آپ کا۔" اچھو میاں جیسے پھٹ پڑے۔ ان کے لہجے میں شکایت تھی۔

محسن نے حیرت سے انہیں دیکھا، پھر شرمندگی سے بولا۔

"یہ تو خیال ہی نہیں رہا تھا مجھے۔ میں نے تو آپ کو زحمت سے بچا لیا۔ آپ کی تصویریں بس فارم پر لگائیں۔ اب پاسپورٹ بن گیا تو آپ کو لینے آیا ہوں۔ معاف کر دیں مجھے۔" اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اچھو میاں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیے۔

"ارے نہیں.....! آپ تو میرے محسن ہیں۔"

وہ محسن کے ساتھ گئے۔ اپنا پاسپورٹ لیا۔ دوپہر کا کھانا پھر محسن نے انہیں کھلایا۔ پھر کچھ فارم بھرے اور کئی جگہ ان کا انگوٹھا لگوایا۔

''اب سب کچھ مکمل ہو گیا ہے۔ بس آپ کا ٹکٹ آنے کی دیر ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔''

رخصت ہوتے وقت محسن نے کہا۔

''آپ حکم کریں تو میں روز آیا کروں۔''

''نہیں! اب مجھے خیال آیا ہے کہ آپ کی تو بہت مصروفیت ہوگی۔''

''جی ہاں ...! بھاگ دوڑ کا کام ہے۔''

''بس اب آپ میرے لئے خوش خبری ہی لے کر آیئے گا۔''

اس کے بعد ان کے دل کو قرار آ گیا۔ اب تو وہ سراپا شکر تھے۔ ان کی ہر سانس شکر تھی۔ ارے..... کیسا کریم ہے میرا رب! کیسی عطا ہے اس کی۔ جو چاہے عطا فرما دے، جیسے چاہے عطا فرما دے اور جہاں سے چاہے عطا فرما دے۔ ارے .....کیسی محبت کرنے والا ہے۔ مجھ حقیر گناہ گار کے لاڈ اٹھاتا ہے۔ میں کیا، میری اوقات کیا؟ بے کراں صحرا میں گزوں، ٹنوں ریت کے نیچے دبا ہوا ایک ذرہ بے نشان، اور اس کی توجہ!

انہیں یاد تھا، مزار میں بیٹھ کر وہ استغفار کرتے، ہونٹ ہلتے، لیکن اپنے دل سے نکلنے والی روتی ہوئی صدا، پکار صرف وہی سن سکتے تھے۔ وہ تو ایک چیخ تھی جو ان کے سینے میں گونجتی تھی۔ لگتا تھا کہ سینے کی دیوار توڑ کر باہر نکل آئے گی ..... اے اللہ......! مجھے معاف کر دے، بخش دے، میں غلیظ ہوں اور تو ہی تو پاک کرنے والا ہے۔ اپنی بے پایاں رحمت کے پانی سے دھو کر پاک کر دے مجھے۔

پھر ایک رات انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ مزار کے صحن میں بیٹھے استغفار کر رہے ہیں، اور کوئی پکار کر کہتا ہے ..... بخش تو دیا گیا تجھے۔ پر تو سمجھتا ہی نہیں۔

انہوں نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔

تو تو اندر کی آواز بھی نہیں سنتا۔ اس بار انہیں احساس ہوا کہ وہ آواز ان کے اندر سے آئی ہے۔

سنتا ہوں۔ لیکن یقین نہیں آتا مجھے۔ انہوں نے بلند آواز میں پکارا۔

تو یقین کیسے کرے گا؟ تجھے اس کی رحمت پر یقین نہیں؟

کیوں نہیں، ایک اس پر تو یقین ہے۔

تو پھر؟

وہ مجھے اپنے گھر بلائے گا تو میں مانوں گا کہ اس نے مجھے بخش دیا ہے۔

رحمت پر یقین ہے اور شرطیں لگاتا ہے اس سے؟

یہی تو ثبوت ہے میرے یقین کا۔ انہوں نے بڑے مان سے کہا۔ ورنہ میری اوقات کیا۔ اس کی رحمت ہی تو حوصلہ دلاتی ہے۔

اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ اس دن سے ان کا پچھتاوا، ان کا استغفار اور ان کی بے چینی اور بے یقینی، سب بڑھ گئی۔ انہوں نے اس خواب کی نشانی کو اپنی نشانی بنا لیا۔ جس دن وہ انہیں بخشے گا، پاک کرے گا، انہیں اپنے گھر بلا لے گا۔

اور اب وہ انہیں اپنے گھر بلا رہا ہے..... وہاں، جہاں اس کے بلاوے کے بغیر کوئی نہیں جا سکتا۔

وہ مطمئن ہو گئے۔ بات اللہ کی مرضی کی ہے تو فکر کیسی؟ اپنا تو اس میں کچھ ہے نہیں۔

اور کل رات محسن خوش خبری لے کر آیا تھا۔ ان کا ٹکٹ مل گیا تھا۔ اتوار کو شام پانچ بجے ان کی روانگی تھی۔

''اب آپ ہوٹل چل کر رہیں۔'' محسن نے ان سے کہا تھا۔

محسن نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ آپ کا کوئی نہیں ہے؟''

''لیکن میں تو کسی کا ہوں۔ اور یہاں سے جانے کے بعد نہیں رہوں گا۔''

''قاعدہ یہ ہے کہ اب سعودی حکومت کی طرف سے آپ کی رہائش ان کے ذمے ہے۔ آپ کو ہوٹل میں ہی ٹھہرنا ہوگا۔''

''کوئی صورت نکالئے......!''

''چلیں، ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کی شام یہاں آؤں گا اور آپ کو ہوٹل لے جاؤں گا۔''

"یہ مجھ پر احسان ہوگا آپ کا۔"

محسن نے جیب سے سو کے دس نوٹ نکالے اور ان کی طرف بڑھائے۔

"یہ رکھ لیں......!"

"نہیں......! مجھے کچھ نہیں چاہئے۔" اچھو میاں نے کہا۔

"اور مجھے ضرورت بھی نہیں۔"

"یہ سرکاری ہے۔ سعودی حکومت کی طرف سے ہے۔ اور آپ کو ضرورت بھی ہے۔ جس سے ملنے جائیں گے، اس کے پاس خالی ہاتھ جائیں گے......؟"

اچھو میاں نے نوٹ جیب میں رکھ لئے۔

اس رات وہ سو نہیں سکے۔ یہ سوچتے رہے کہ شکر کیسے ادا کریں۔ کوئی طریقہ ہے اس کا۔ سینے سے دل نکال کر رکھ دیں۔ مگر نہیں...... جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ ارے...... اپنے پاس ہے کیا......؟ اور اسے تو چاہئے بھی کچھ نہیں۔ تو پھر کیا کریں؟

آخر میں انہوں نے بے بسی سے کہا۔ اے اللہ! میری اس بے بسی کو ہی قبول کر لے۔

اور دل کو قرار آ گیا!

صبح سے ہی وہ سوچ رہے تھے کہ ارجمند سے ملنا ہے۔ اللہ نے یہ کرم بھی فرما دیا تھا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں تھے۔ لیکن جانے کا سوچتے تو انہیں گھراہٹ ہوتی۔ انہیں گھر یاد بھی ہوگا یا نہیں! بھٹک گئے تو؟ اور کون جانے، اب وہ لوگ اس گھر میں رہتے ہی نہ ہوں۔ اتنے برسوں یہاں رہتے ہوئے وہ شہر کو بھول ہی گئے تھے۔ شہر کے خیال سے انہیں گھبراہٹ ہوتی تھی۔

جانا تو ہے، لیکن کیسے جائیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس سفر پر جا رہے ہوں، جس سے واپس نہ آنے کی دعا ان کی ہر سانس کرتی ہو، اور وہ ارجمند سے ملے بغیر چلے جائیں، یہ تو آخری دید والا معاملہ ہے۔

لیکن یہ اعتماد ان میں نہیں تھا کہ وہ اس دروازے پر پہنچ جائیں گے، جسے سات برس پہلے انہوں نے نادرہ کے کہنے پر تلاش کیا تھا۔ گومگو کی اس کیفیت میں

دوپہر ہوگئی۔

انہوں نے سوچا، سیّد الاستغفار کی تسبیح پڑھ لی جائے، پھر دیکھیں گے۔

وہ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے، نظریں جھکائے پڑھ رہے تھے کہ بالکل اچانک...... نہ جانے کیسے ان کی نظر اٹھ گئی۔ اور نگاہ اٹھاتے ہی انہیں عبدالحق نظر آیا، جو متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

اچھو میاں اسے آواز دینے ہی والے تھے کہ انہیں خیال آ گیا۔ وہ تسبیح پڑھ رہے تھے، اور اس کے دوران وہ بولتے نہیں تھے۔ وہ تڑپ گئے۔ انہیں خیال آیا کہ عبدالحق تو اب انہیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ اس نے انہیں داڑھی میں کب دیکھا تھا۔

ایک ثانیے میں اچھو میاں نے سب کچھ سمجھ لیا۔

انہوں نے سر جھکایا اور تسبیح پڑھنے لگے۔ اس دوران وہ ہر خیال کو ذہن سے جھٹکتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں ان پر استغراق کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ سب کچھ بھول گئے۔

تسبیح پوری کرکے انہوں نے اسے جیب میں رکھا اور عبدالحق کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ ایک ننھے سے لمحے کو انہیں مایوسی ہوئی، پھر اس مایوسی میں سے ایسا یقین ابھرا کہ وہ حیران رہ گئے۔ مایوسی! ارے...... یہ تو شکر کا مقام ہے۔ انہوں نے خود سے کہا۔ تمہیں یقین نہیں تھا کہ تمہیں معافی مل سکتی ہے، اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ تم نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اس کے مہمان بن سکتے ہو، اس نے تمہیں یہ شرف بھی عطا فرما دیا۔ اب تم نے سوچا کہ ارجمند سے کیسے ملو گے تو اس نے عبدالحق کو بھیج دیا تمہارے لئے۔ اور تم ڈر رہے ہو، مایوس ہو رہے ہو!

وہ اٹھے۔ انہوں نے سوچا کہ اب انہیں خود عبدالحق کو تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن نہیں! یہ سوچ کر وہیں بیٹھ گئے۔ تم اسے تلاش نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ تمہیں تلاش کر سکتا ہے۔ اللہ کو ملوانا ہے تو وہ ملوا دے گا۔

وہ بیٹھ گئے۔ لیکن اب ان کی نظریں اٹھی ہوئی تھیں، آتے جاتے لوگوں کو

ٹٹول رہی تھیں۔ اندر ایک امنڈتی ہوئی بے تابی تھی، جسے وہ تھپک کر پُرسکون کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خاصی دیر ہوگئی، اور عبدالحق انہیں نظر نہیں آیا تو ان کے اندر کی کشمکش بڑھ گئی۔ انہیں اٹھنا ہوگا، اسے تلاش کرنا ہوگا۔ لیکن کیا ضمانت ہے کہ تلاش کرنے سے وہ انہیں مل جائے گا۔ وہ پورا لاہور چھان ماریں تو بھی ضروری نہیں کہ وہ مل جائے۔ اور اللہ چاہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے مل جائے۔ کیا یہیں بیٹھے بیٹھے کوئی ان کی حاصلِ عمر آرزو پوری کرنے کے لئے خود انہیں ڈھونڈتا ہوا نہیں چلا آیا۔ اتنا دیکھنے کے بعد بھی ...

اور اسی لمحے انہیں عبدالحق نظر آ گیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کا بے بسی سے دم گھٹ رہا تھا۔ اتنے ہجوم میں کیسے تلاش کرے نواب صاحب کو..... اور کہاں تلاش کرے؟ اس نے ایک بار ہی تو انہیں دیکھا تھا۔ صرف ایک دن کے لئے۔ ہلکا سا خاکہ تھا ان کا اس کے ذہن میں اور درمیان میں سات برس۔ جانے کتنے بدل گئے ہوں گے وہ؟

اس کے دل میں مایوسی اترنے لگی۔ کیا وہ ناکام واپس جائے گا؟ کیا ارجمند عمر بھر تڑپتی......

اسی لمحے کسی نے اسے پکارا۔

''عبدالحق صاحب.....!''

اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک ستون کے پاس ایک بوڑھا شخص کھڑا ہوتا نظر آیا۔ اس کی گھنی اور لمبی سفید داڑھی تھی اور سر کے بال بھی بالکل سفید تھے۔ مگر وہ اس کے لئے اجنبی تھے، اور یہ بھی ضروری نہیں تھا کہ انہوں نے ہی اسے پکارا ہو۔ وہاں تو بہت سے لوگ تھے۔

وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

لیکن بوڑھا شخص تیزی سے اس کی طرف چلا آیا۔

''السلام علیکم عبدالحق صاحب!''

عبدالحق نے سلام کا جواب دیتے ہوئے غور سے انہیں دیکھا۔ پہلے تو شناسائی کی کوئی جھلک اسے نظر نہیں آئی۔ پھر اچانک اس کی یادداشت میں بسے دھندلے سے نقوش اس چہرے پر کھلنے ملنے لگے۔

اچھو میاں نے اسے لپٹا لیا۔ پھر اس کی پیشانی چومنے لگے۔

''خدا کی قسم! مجھے آپ کی ضرورت تھی اس وقت۔''

''آپ..... نواب صاحب.....؟''

''ہاں.....! اور میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔''

''اور میں آپ کو ڈھونڈ رہا تھا۔''

''مجھے آپ کے گھر آنا تھا۔ لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے یاد ہوگا، اور میں وہاں پہنچ سکوں گا۔''

''اور میں آپ کو گھر لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

''سبحان اللہ.....! کیا شان ہے میرے ربّ کی۔''

اچھو میاں عبدالحق کے ساتھ چل دیئے۔ لیکن گاڑی میں ارجمند کو بیٹھے دیکھا تو وہ رو دیئے۔ ان کے لئے خود پر قابو رکھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ عبدالحق نے ان کے لئے دروازہ کھولا۔ پھر اس نے اگلی نشست کا دروازہ کھولا اور ارجمند سے کہا۔

''تم بھی اب پچھلی سیٹ پر بیٹھو گی نواب صاحب کے ساتھ!''

''لیکن آغا جی.....! میں.....'' ارجمند نے رندھی ہوئی آواز میں احتجاج کیا۔

''یہ میرا حکم ہے۔ اور تمہیں میرا حکم ماننا سیکھ لینا چاہئے اب۔''

''وہ تو مجھے پہلے ہی آتا ہے۔'' ارجمند نے اترتے ہوئے دبی زبان میں کہا۔

عبدالحق بہت ہلکی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ارجمند پچھلی سیٹ پر کسی ننھی سی بچی کی طرح اچھو میاں سے لپٹی ہوئی تھی۔ دیر تک وہ دونوں ہی روتے رہے۔ پھر ارجمند ان سے علیحدہ ہوگئی۔

''آپ کو میرا کبھی خیال نہیں آیا نانا.....!'' اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''ایک تمہارا ہی تو خیال تھا۔ ہر روز دعا کرتا تھا تمہارے لئے۔''

''کبھی ملنے نہیں آ سکتے تھے......؟''

''کہا تو تھا کہ میں تو نہیں آؤں گا۔ تمہیں ملنا ہو تو آ جانا۔''

''میں تو آ ہی نہیں سکتی تھی نانا......! آغا جی کے سوا کوئی لانے والا نہیں تھا اور آغا جی کا ٹرانسفر ہو گیا۔ برسوں یہ کراچی میں رہے۔ ابھی تین دن پہلے ہی تو آئے ہیں۔''

''بیٹا......! یہ ملنا ملانا بھی اللہ کے حکم سے ہی ہوتا ہے۔ اب دیکھ لو، آج میں تمہارے پاس آنا چاہتا تھا، اور سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ شاید گھر میں تلاش نہیں کر سکوں گا کہ عبدالحق صاحب آ گئے۔''

اس پر ارجمند چونکی۔

''آپ تو آنے والے نہیں تھے۔ آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟''

اچھو میاں نے اسے تفصیل بتائی۔

''تو اب میں اتوار کو جا رہا ہوں...... کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔''

''ایسے نہ کہیں نانا......!''

''اسی میں میری خوشی ہے بیٹا! اللہ کرم فرمائے تو وہیں مرنا، وہیں دفن ہونا چاہتا ہوں۔''

اگلی سیٹ پر بیٹھا عبدالحق حیران تھا۔ بازار میں، کوٹھے پر رہنے والے نواب صاحب اور یہ مقام! اور پھر یہ ٹائمنگ!

اچھو میاں نے ایک جگہ گاڑی رکوا کر مٹھائی لی۔ وہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہتے تھے، اور اللہ نے تو انہیں جھولی بھر کر دیا تھا۔

✿ ✿ ✿

اچھو میاں اور ارجمند انیکسی میں تھے۔ آنسو بھی ختم ہو چکے تھے اور باتیں بھی۔ دونوں نے نادرہ کو بہت یاد کیا تھا۔

پھر حمیدہ، نور بانو اور رابعہ کے ساتھ آئی۔ رابعہ کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ وہ اس نے ارجمند کو دیا۔ ارجمند تو گلنار ہو گئی۔ اچھو میاں نے یہ منظر دیکھا۔

لیکن ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ارجمند کا ردِعمل سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔

''اور آپ کیسے ہیں بھائی جی......!'' حمیدہ نے بیٹھتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''کہاں رہے اتنے دن! ہم لوگ یاد بھی نہیں آئے؟''

''بس! کیا عرض کروں بہن! مصروفیت ہی ایسی تھی۔'' اچھو میاں نے کہا۔ پھر بولے۔

''آپ لوگوں کا احسان تو میں اتار ہی نہیں سکتا۔ البتہ عمر بھر دعا کروں گا آپ کے لئے۔ بیٹا نے بتایا کہ وہ پڑھ رہی ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھائی جی! خود پر بھی کوئی احسان کرتا ہے۔ اس کی پھپھو نے اسے میرے سپرد کیا تھا، تو یہ میری ذمہ داری ہے۔'' حمیدہ نے کہا۔

''لیکن سچ پوچھیں تو آپ کا والا مقام ہمارا نہیں ہے۔ آپ ہی تو اس کے باپ کی جگہ ہیں۔''

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حمیدہ نے کہا۔

''اس وقت تو بھائی جی! میں آپ کے در پر سوالی بن کر آئی ہوں۔''

''در بھی آپ کا ہے، اور میں بھی آپ کا ہوں بہن! پر میرے پاس ہے کیا؟''

''میں آپ سے آپ کی ارجمند کو اپنے عبدالحق کے لئے مانگ رہی ہوں۔''

یہ بات تو اچھو میاں کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ وہ تو سناٹے میں آ گئے۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ بچی ارجمند کب سے یہ آس لگائے ہوئے ہے۔ اور وہ سوچتے تھے کہ یہ اَن ہونی ہے۔ لیکن اللہ تو ان پر خوشیاں برسا رہا تھا۔

حمیدہ نے ان کی خاموشی کا اور مطلب لیا۔

''آپ کو یہ بات بری لگی بھائی جی......!''

''نہیں بہن! اچھی بات کیسے بری لگتی ہے۔ لیکن عبدالحق صاحب کی تو شادی ہو چکی ہے نا......؟''

حمیدہ کچھ کہنے والی تھی، لیکن نور بانو بول اٹھی۔

"جی ...! میں ان کی بیوی ہوں، نور بانو ...!"

اچھو میاں نے حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ بھی یہاں موجود ہے۔ پھر اسے دیکھ کر انہیں مزید حیرت ہوئی۔ عبدالحق کے ساتھ اس کا کوئی جوڑ ہی نہیں تھا۔ اور انہوں نے تصور میں ارجمند کو عبدالحق کے ساتھ دیکھا۔ ان کی جوڑی بہت اچھی تھی ... بہت خوب صورت۔

"میں نے ارجمند کو ہمیشہ اپنی سگی بہن سے بڑھ کر چاہا ہے۔" نور بانو نے وضاحت کی۔ اچھو میاں کی خاموشی نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اس کا اعتماد ہل گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا ترتیب دیا ہوا کھیل خراب ہونے والا ہے۔

"جی ...! مجھے بتایا ہے ارجمند نے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، دراصل میری امی اور بہنوں کو دہلی میں ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔ میں سمجھتی ہوں، اللہ نے اس کے صلے میں ارجمند کو مجھے دیا ہے۔"

ارجمند اتنی دیر میں وہاں سے ہٹ چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کیا بات ہونے والی ہے۔

"تو آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ آپ کے شوہر کی شادی ارجمند سے ہو ...؟" اچھو میاں نے نور بانو سے پوچھا۔

"ہرگز نہیں ...! بلکہ یہ میری تجویز ... میرے اصرار پر ہی ہو رہا ہے۔"

اچھو میاں سوچ میں پڑ گئے۔ یہ بات انہیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

"اللہ گواہ ہے کہ ارجمند میرے لئے سگی بہن جیسی ہے۔ اور میں اسے ایسے ہی رکھوں گی۔ کبھی دل بھی میلا نہیں ہونے دوں گی اس کا۔" مایوسی کی وجہ سے نور بانو روہانسی ہوگئی۔

"اور عبدالحق صاحب کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔" اس نے ملتجیانہ نظروں سے حمیدہ کو دیکھا۔

"اب بھائی جی ...! ہمیں خالی ہاتھ نہ لوٹائیے گا۔" حمیدہ نے عاجزی

سے کہا۔

"ارے نہیں بہن ...! میں آپ کو انکار کر سکتا ہوں بھلا ...؟ لیکن میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" اچھو میاں نے کہا۔

"عبدالحق نے بتایا تھا مجھے۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ اللہ نے بہت نوازا ہے آپ کو۔ ہمارے لئے دعا کرتے رہئے گا۔"

"جی ضرور ...!" اچھو میاں بولے۔

"اور یہ تو اللہ کا فضل عظیم ہے کہ جانے سے پہلے وہ اس فرض سے بھی سبک دوش کرا رہا ہے مجھے۔"

"تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے ...؟"

"دیکھئے ... مجھے ہفتے کی شام تک جانا ہے۔" اچھو میاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو جمعے کا نکاح رکھ لیں ...!"

"جی ... بہت مناسب ہے ...!"

"بہتر ہوگا کہ آپ ارجمند سے بھی پوچھ لیں ...!"

"اس کی ضرورت نہیں بہن ...! میں اس کا بڑا ہوں۔ مجھے فیصلے کا حق ہے، اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس فیصلے سے اختلاف نہیں کرے گی۔"

"بس تو ٹھیک ہے، جمعے کے دن عصر مغرب کے درمیان نکاح۔ اور ہفتے کی دوپہر ولیمہ، تاکہ آپ بھی شریک ہو لیں۔"

"جی، بہت مناسب ہے ...!"

نور بانو نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔

❋ ❋ ❋

گاؤں سے ڈاکٹر صاحب آ گئے تھے اور مولوی مہر دین بھی۔ مسعود صاحب کی بچیاں پہلے ہی آئی ہوئی تھیں۔ گھر میں رونق ہوگئی۔ زرینہ اور مسعود صاحب کی لڑکیاں انیکسی میں آ گئیں، جہاں ارجمند موجود تھی۔ وہاں ڈھولک بجنے لگی۔ شادی کے گیت گائے جانے لگے۔

اچھو میاں باہر لان میں آ بیٹھے۔ وہ خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔ ایسی خوشی دیکھنا تو کجا، اس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اور وہ سچ مچ انہیں مل گئی تھی۔ ایک بیٹی، اسے وداع کرنے کا اعزاز اور وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ تہی دامن نہیں ہیں۔

عبدالحق گھر سے نکلا۔ انہیں بیٹھے دیکھا تو ان کی طرف چلا آیا۔

''کیسے ہیں نواب صاحب...... ! کیا ہو رہا ہے ......؟''

''تمہیں یاد کر رہا تھا بیٹے...... !'' اچھو میاں نے پہلی بار اسے بیٹا کہا۔

''کوئی حکم ......؟''

''اب تمہارے سوا میرا کون ہے ......؟ کئی کام ہیں ضروری۔''

''تو مجھے بتائیں نا ......!''

''ایک تو یہ کہ تم مجھے بازار لے چلو ......! کچھ خریداری کرنی ہے۔''

''تو چلیں ......! میں گاڑی نکالتا ہوں۔''

پانچ منٹ بعد عبدالحق ڈرائیو کر رہا تھا، اور اچھو میاں اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔

''اللہ کا شکر کہ اس نے یہ سعادت بھی نصیب فرمائی۔'' اچھو میاں نے کہا۔

''...... کہ جانے سے پہلے میں ارجمند کی طرف سے بھی بے فکر ہو جاؤں۔''

''بے شک نواب صاحب! اللہ بڑا کریم ہے۔''

''تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''جی فرمائیے ......!''

''یہ نہ سمجھنا کہ میں محبت کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تم بہت خوش نصیب ہو۔ ارجمند کی صورت میں اللہ نے تمہیں ایک بیش بہا خزانہ عطا فرمایا ہے۔ وہ کتنی اچھی ہے، اللہ نے اسے کتنا اچھا بنایا ہے، یہ بات پوری طرح تو شاید ہی کبھی کوئی سمجھ سکے۔ اور وہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے، اس کا بھی میں بس اندازہ

ہی کر سکتا ہوں۔ پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔''

عبدالحق شرمندہ ہونے لگا۔

''جی نواب صاحب......!''

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم بھی اس سے محبت کرنا، وہ سب کچھ اسے دینے کی کوشش کرنا، جو وہ چاہتی ہے۔''

''انشاء اللہ! اسے سب کچھ ملے گا نواب صاحب......!''

''نہیں سمجھے میری بات! اسے دنیا میں کچھ بھی نہیں چاہئے۔ تمہاری محبت کے سوا۔ کوشش کرنا کہ وہ اسے ملتی رہے۔ اس کی کوتاہیوں سے درگزر کرنا، اس کے ساتھ نرمی برتنا، سختی کبھی نہ کرنا، کوئی محرومی نہ دینا اسے۔ اس لئے نہیں کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔'' یہ کہتے کہتے اچھو میاں کی آواز بھرا گئی۔

''بلکہ اس لئے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے ...... اتنی کہ شاید کم ہی لوگوں کو ایسی محبت نصیب ہوئی ہوگی۔''

''انشاء اللہ! ایسا ہی ہوگا نواب صاحب!''

''اس نے دنیا میں دنیا کی کسی چیز کی آرزو نہیں کی ...... تمہارے سوا۔ اور یہ اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس نے تمہیں ملا دیا۔ اور انشاء اللہ اس سے تمہیں نیک اور سعادت مند اولاد ملے گی۔ تمہاری نسل اللہ کی فرمانبرداری کے راستے پر آگے بڑھے گی۔ رات میں نے جو خواب دیکھا، وہ صاف اور واضح ہے۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ انشاء اللہ اس سے تمہیں دو بیٹے ملیں گے، جن کی وہ بہت اچھی تربیت کرے گی۔ بس تم اس کا دل نہ دکھنے دینا کبھی۔''

عبدالحق حیران تھا۔ کراچی میں شفیق صاحب نے اس سے یہی بات اپنے کے حوالے سے کہی تھی، اور اب نواب صاحب اپنے خواب کو حوالے سے کہہ رہے تھے۔ دو بیٹے ...... کیا یہ ممکن نہیں کہ بیٹا نور بانو سے ہو؟

اچھو میاں نے بازار میں گاڑی رکوا دی۔

وہ سب سے پہلے مردانہ ملبوسات کی دکان پر گئے۔

''بیٹے! اپنے لئے بہت اچھے کپڑے پسند کرو۔ وقت نہیں ہے، ورنہ میں

تمہیں شیروانی سلوا کر دیتا۔ لیکن بہت اچھے کپڑے خریدنا۔ تکلف نہ کرنا۔"

عبدالحق کے دل میں گزشتہ روز سے ہی یہ بات تھی کہ اسے نواب صاحب کو کچھ دینا ہوگا کہ وہ اپنا بھرم رکھ سکیں۔ اب بھی وہ جیب میں دو ہزار روپے ڈال کر لایا تھا۔ اس نے کہا۔

"میں تکلف نہیں کروں گا۔ بس اتنا کہہ دیں کہ آپ مجھے بیٹا سمجھے ہیں نا!"

"یہ کوئی کہنے کی بات ہے میاں! پہلے بھی سمجھتا تھا، اور اب تو دوسری طرح سے بھی تم میرے لئے بیٹے ہی ہو۔"

"تو میں ایک بیٹے کا فرض نبھا رہا ہوں۔ مجھے روکئے گا نہیں۔" یہ کہہ کر عبدالحق نے دو ہزار روپے ان کی طرف بڑھا دیئے۔

اچھو میاں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیئے۔

"ان کی ضرورت نہیں بیٹے! پیسے میرے پاس بہت ہیں۔"

"اب یہ غیریت کی بات ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں احتجاج تھا۔

اچھو میاں نے جیب سے نوٹ نکال کر اسے دکھائے اور بولے۔

"دیکھو، رب کا کرم ہے۔ اسے سب معلوم ہے۔ وہ پہلے ہی سے بندوبست کر دیتا ہے اپنے بندوں کے لئے۔ مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ مجھے جانے سے پہلے بیٹی کو وداع کرنا ہے۔ لیکن اس نے مجھے اس سے پہلے ہی نواز دیا۔ خود دیکھ لو۔"

عبدالحق یوں مایوس ہوا، جیسے کسی نعمت سے محروم ہو گیا ہو۔

"لیکن میں سچ مچ تمہیں بیٹا سمجھتا ہوں۔" اچھو میاں نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

"اور میں اس شادی میں اپنے تمام ارمان پورے کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے کمی پڑی تو میں تم سے مانگ لوں گا۔ بیٹے ہو نا!"

"جی...... ٹھیک ہے......!"

اچھو میاں نے اسے کپڑے، جوتے...... ہر چیز دلائی۔ پھر وہ عورتوں کے

ملبوسات کی دکان پر گئے۔ وہاں انہوں نے اس کے لئے ایک بہت اچھا جوڑا خریدا۔ پھر چار جوڑے عام سے خریدے۔

"بیٹی کو بھی تو کچھ دینا چاہئے۔" انہوں نے جیسے خود سے کہا۔

پھر انہوں نے ارجمند کے لئے سونے کا ایک سیٹ لیا۔ وہ بھاری تو نہیں تھا، لیکن بہت نازک اور خوب صورت تھا۔

خریداری مکمل کر کے وہ گاڑی میں آ کر بیٹھے۔ عبدالحق نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"مجھے دنیاداری کا کچھ پتا نہیں۔" اچھو میاں نے کہا۔

"لیکن یاد آتا ہے کہ نکاح کا کھانا لڑکی والوں کی طرف سے ہوتا ہے۔"

عبدالحق نے اس سے کچھ کہا نہیں۔ بس شکایتی نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ اچھے باورچی کہاں ملیں گے۔ میں خود تو بس لنگر کا کھانا پکوا سکتا ہوں۔" اچھو میاں نے کہا۔

"تم ہی مجھے لے چلو تو کل کے لئے کھانے کا آرڈر دے دیں۔"

عبدالحق نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ گاڑی میں آ کر بیٹھے۔

"اب کہاں چلنا ہے......؟" عبدالحق نے ان سے پوچھا۔

"بس...... اب گھر چلو۔"

اپنی انیکسی میں پہنچ کر اچھو میاں نے اپنی جیب چیک کی۔ اسے کہتے ہیں برکت۔ انہوں نے دل میں خود سے کہا۔ آخری کام کے لئے بھی معقول رقم بچی تھی ان کے پاس۔ اللہ کیسے ضرورتیں پوری کرتا ہے، آدمی کی۔ لیکن انہیں عبدالحق کی مایوسی بھی یاد تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے لئے بھی کچھ کرنا ہے۔

رات کو حمیدہ انیکسی میں چلی آئی۔ نور بانو اور رابعہ بھی اس کے ساتھ تھیں۔ وہ ارجمند کے لئے سہاگ کا جوڑا اور دوسری چیزیں لے کر آئی تھیں۔

"بھائی صاحب! ہم نے ولیمہ ہفتے کے دن کا رکھا ہے۔" حمیدہ نے

اچھوں میاں سے کہا۔

"جی.....! بہت مناسب ہے۔ لیکن مجھے پانچ بجے چلے جانا ہے۔"

"اسی لئے ہم نے ولیمہ دوپہر کا رکھا ہے۔"

اچھو میاں کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

"بہت بہت شکریہ میری بہن.....!"

❁ ❁ ❁

جمعے کی نماز پڑھنے وہ داتا دربار گئے۔ وہ تو اکیلے جانا چاہ رہے تھے۔ لیکن عبدالحق نے کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ہی نماز پڑھے گا۔

نماز کے بعد وہ باہر نکلے، اور انہوں نے لنگر کے لئے چار دیگوں کا آرڈر دیا۔ باورچی نے انہیں ایک بینچ پر بٹھا دیا۔

"آپ بھی لو گے بابا جی.....!"

"کیوں نہیں.....؟" اچھو میاں نے کہا۔

"کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں بابا جی.....! جو خود نہیں کھاتے۔"

"میں نے تو اپنی بہترین زندگی میں کھانا ہی یہیں کھایا ہے بیٹے" اچھو میاں نے سادگی سے کہا۔

"اس سے اچھا کھانا کہیں نہیں ملا مجھے۔"

انہوں نے عبدالحق کے ساتھ وہیں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ باورچی کے لڑکے نے آواز لگائی۔

"ہاں بھئی.....! لنگر آیا ہے..... آجاؤ.....!"

اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں قطار لگ گئی۔

عبدالحق نے دیکھا، اچھو میاں رو رہے تھے۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

❁ ❁ ❁

نمازِ عصر کے بعد نکاح ہوا۔ عورتیں رسمیں کرتی رہیں۔ مردوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ پھر لان میں ہی کھانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس کے بعد ارجمند کو ٹیکسی سے رخصت کرا کے گھر میں لے جایا گیا۔

اچھوں میاں اس روز بھی نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جمعے کی نماز سے واپس آنے کے بعد عبدالحق ان کے وہ کپڑے لے کر ان کے پاس آیا تھا اور اچھو میاں نے بغیر کسی ردّ و قدح کے انہیں قبول کرلیا تھا۔

انہوں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اپنا آپ انہیں بہت اچھا لگا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہے تھے، جیسے ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے ہوں۔

"اب مجھے شکر کے سوا کیا کام ہے میرے رب!" انہوں نے دھیرے سے اللہ کو پکارا۔

"تیرا شکر ہے میرے معبود! تیرا شکر ہے۔ اب میں تیرے در پہ پہنچنے کو بے تاب ہوں۔"

❁ ❁ ❁

وہ سہاگ رات تھی۔

مگر ارجمند بہت بے چین تھی۔ تمام وقت لڑکیوں نے اسے گھیرے رکھا تھا۔ اب بالآخر اسے حجلۂ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ پورے کمرے کو اور سیج کو گلاب کے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اور یہ سب کچھ آپی نے خود کیا تھا۔

بے شک اللہ بڑی قدرت والا ہے۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی تو اس کا دل جیسے بے قابو ہوگیا۔ دھڑکنیں تھیں کہ لگتا تھا، سینے میں کوئی تیز رفتار پنکھا چلا دیا گیا ہے۔

دروازہ بند ہونے کی آواز ..... پھر اپنی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ ..... اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

پھر مسہری پر کوئی بیٹھ گیا ..... وہ اس کے آغا جی تھے۔

"السلام علیکم.....!" آغا جی نے کہا۔

اس نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔

عبدالحق اس شادی کے بارے میں اب تک فلسفیانہ انداز میں سوچتا رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ ارجمند بچی ہے، وہ اس سے بہت بڑا ہے۔ وہ سوچتا تھا کہ

نوربانو نے اس پر یہ سب کچھ تھوپ دیا ہے۔ لیکن ارجمند کا کہنا تھا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور وہ اس کی تردید کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ ارجمند کے ساتھ ازدواجی زندگی کا تصور نہیں کر پایا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں جاتا تھا اس سے۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ جو کچھ نوربانو کے ساتھ اس کا تعلق ہے، وہ ارجمند کے ساتھ تو کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ جبکہ اب یہ ارجمند کا حق ہوگا۔ اور وہ حق نہیں ادا کرے گا تو اللہ کے ہاں جواب دینا پڑے گا۔ یہ سب سوچ کر وہ پریشان ہوتا رہا تھا۔ سچ یہ ہے کہ بس یہ شادی ہو رہی تھی، لیکن اس کے دل میں اس خوشی کا نام و نشان بھی نہیں تھا، جو شادی کا لازمہ ہے۔ شادی کا تو مطلب ہی خوشی ہے۔

لیکن حجلۂ عروسی کی اپنی فضا ہوتی ہے۔ اور نکاح کے رشتے میں ویسے ہی اللہ کی طرف سے تائید ہوتی ہے۔ یہ بات اسے معلوم نہیں تھی۔ دروازہ بند کرتے ہوئے وہ حیران تھا کہ یہ اتنا وقت وہ کیسے گزارے گا، کیا کرے گا وہ؟

مگر گلابوں سے مہکتا ہوا وہ کمرہ، اور سرخ گلابوں کی وہ متحرک گھڑی......

ایک لمحے میں وہ بدل گیا۔ اب وہ جیسے کوئی شوخ اور بے فکرا نوجوان تھا۔

''اب یہ گھونگھٹ تو مجھے ہی اٹھانا پڑے گا۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

جواب ہلکی سی کسمساہٹ کی شکل میں آیا۔

''اور وہ تم مجھے ایسے اٹھانے نہیں دو گی۔ کہو گی، پہلے مجھے منہ دکھائی دیں۔''

ارجمند نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''گونگی ہو گئی ہو کیا؟ بولنا نہیں آتا؟'' عبدالحق نے اسے چھیڑا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ میری منہ دکھائی تو آپ ہیں۔'' ارجمند نے دھیمی آواز میں کہا۔

''اور اگر میں کہوں کہ تم خود ہی گھونگھٹ اٹھا دو تو .....؟''

''میں انشاء اللہ آپ کا کوئی حکم کبھی نہیں ٹالوں گی۔''

''تم نے تو میری ذمہ داری بڑھا دی۔'' عبدالحق نے کہا۔ اس کی شوخی ہوا

ہوگئی۔ وہ بے حد سنجیدہ ہو گیا۔

''اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں کبھی تمہیں کوئی غلط اور ناروا حکم دوں۔ گھونگھٹ بھی میں اٹھاؤں گا اور منہ دکھائی بھی دوں گا۔'' عبدالحق نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی اور پھر اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔

وقت جیسے ساکت ہو گیا۔ کائنات کی ہر چیز ٹھہر گئی۔ عبدالحق مبہوت ہو کر ارجمند کو دیکھتا رہا، جس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر پپوٹے یوں تھرتھرا رہے تھے، جیسے پلکوں کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔ وہ ایسا بے مثال حسن تھا کہ عبدالحق نے کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا ... بے داغ، متناسب۔

کوئی کسی کو کتنا ہی دیکھے، اور چاہے بے شرمی سے دیکھے، پوری طرح نہیں دیکھ سکتا ... چاہے عمر بھر دیکھتا رہے۔ چہرے پر حجابات ہوتے ہیں ... ان دیکھے حجابات۔ جب آدمی اللہ کے حکم کے مطابق کسی کو اپناتا ہے اور استحقاق کے ساتھ اسے دیکھتا ہے تو وہ حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ عبدالحق نے تو ارجمند کو نظر بھر کر بھی کم ہی دیکھا تھا.... اور وہ بھی بچی سمجھ کر۔ لیکن جانتا تھا کہ وہ بہت خوب صورت ہے۔ مگر اب اور بات تھی۔ اب تو وہ حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے۔ سبحان اللہ .....!

اور اسی لمحے اسے نوربانو کا خیال آیا۔ نوربانو بھی بہت حسین ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔ مگر حسن کا موازنہ ممکن نہیں۔ اللہ نے اپنی جگہ ہر انسان کو، مرد ہو یا عورت، خوب صورت بنایا ہے۔ ہر ایک کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ خوب صورتی اس شخصیت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ اس لئے موازنہ ممکن نہیں۔

وہ نہیں سمجھ سکا کہ دراصل وہ نوربانو کا دفاع کر رہا ہے۔ جو اس کے نزدیک دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ اور وہ اسے اس مقام سے نیچے نہیں لانا چاہتا تھا۔ نوربانو اس کے دل کی آرزو تھی، جبکہ ارجمند اس پر تھوپی گئی تھی۔

اس کے باوجود وہ بے پناہ کشش محسوس کر رہا تھا۔ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔

کچھ بناؤ سنگھار کی وجہ سے بھی خوب صورت لگ رہی ہے یہ۔ اس نے

دل میں سوچا۔

''اچھا.....! آنکھیں تو کھولو۔'' اس نے کہا۔

پلکیں اٹھیں، پھر نظر اٹھی، مگر صرف ایک پل کو۔ اور فوراً ہی جھک گئی۔

بغیر کسی ارادے کے عبدالحق نے ارجمند کا ہاتھ تھاما اور غور سے اسے دیکھنے لگا۔ گلابی، خوب صورت، نازک، ترشا ہوا ہاتھ۔ جلد ایسی شفاف کہ لگے آر پار دیکھ رہے ہیں۔

اس نے بڑی نزاکت سے اس ہاتھ کو چوم لیا۔

ارجمند کا پورا جسم مرتعش ہو گیا۔ وہ لجا کر دہری ہوگئی۔

اللہ نے آدمی کو ایسا ہی بنایا ہے۔ مرد اپنی دانست میں کتنا ہی بے طلب ہو، عورت کی پسپائی اس کے اندر پیش قدمی کے جذبے کو ابھارتی ہے۔ عبدالحق نے بھی قدم آگے بڑھایا۔

لیکن ارجمند نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔

''مجھے ایک اجازت دیں گے آغا جی.....!'' اس نے بڑی لجاجت سے کہا۔

عبدالحق نے اپنی مایوسی اور بدمزگی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''بولو.....! کیا بات ہے.....؟''

''سب نے گھیر رکھا تھا۔ جیسے تیسے میں نے نماز تو پڑھ لی تھی۔ مگر سب کے سامنے پوری نماز نہیں پڑھ سکی تھی۔ اجازت دیں تو اب پڑھ لوں؟''

اور عبدالحق پر جیسے کسی نے یخ بستہ پانی کی پوری بالٹی انڈیل دی۔ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ اسے خیال ہی نہیں آیا، اور یہ لڑکی ...

''اس کے لئے اجازت مانگوں گی مجھ سے ....؟''

''جی .... کیونکہ یہ فرض نماز نہیں ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ ایسا ہوگا بھی نہیں۔ آپ کے وقت سے پہلے ہی نماز پڑھ لیا کروں گی میں۔''

''ضرور پڑھو.....! شکر کے نفل تو مجھے بھی ادا کرنے ہیں۔'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

ارجمند اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ چند لمحے بعد اس نے پکارا۔

''آ جائیے آغا جی! وضو کر لیجئے۔''

عبدالحق باتھ روم میں گیا تو وہ لوٹا ہاتھ میں لئے کھڑی تھی۔

''بیٹھئے اور وضو کیجئے۔''

عبدالحق نے حیرت سے دیکھا۔

''لاؤ.....! لوٹا مجھے دو۔ میں وضو کر لوں گا۔ روز کرتا ہوں۔''

''اتنے کنجوس نہ بنیں۔ آپ کے اجر میں کوئی کمی تھوڑا ہی ہوگی۔ البتہ مجھے فائدہ ہو جائے گا۔''

وہ پانی ڈالتی رہی، اور وہ وضو کرتا رہا۔ وضو کرنے کے بعد اس نے کہا۔

''جزاک اللہ.....! یہ بتاؤ، کسی اور کو ایسے وضو کرایا ہے کبھی.....؟''

''دادی اماں کو روز کراتی ہوں۔''

عبدالحق نے واپس آ کر شکر کے نفل پڑھے۔ اتنی دیر میں ارجمند بھی نماز شروع کر چکی تھی۔ نماز سے اٹھ کر وہ بستر پر جا لیٹا، اور ارجمند کو دیکھتا رہا۔ اسے حیرت ہوئی کہ ارجمند نے دو دو کر کے چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر وہ اٹھ کر چلی آئی۔

عبدالحق نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ پاکیزہ اور کہیں زیادہ خوب صورت لگ رہا تھا۔ بناؤ سنگھار کے بغیر وہ زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

''اب سکون ہو گیا تمہیں.....!''

''جی.....! ایک معمول ابھی باقی رہ گیا ہے۔'' ارجمند نے مہین سی آواز میں کہا۔

''پھپھو کے لئے روز سورۃ الملک پڑھتی ہوں۔''

سورۂ ملک کا سن کر وہ تڑپ گیا۔

''تو بلند آواز میں پڑھو۔ میں بھی سنوں گا۔''

ارجمند نے سورۂ ملک کی تلاوت شروع کی، اور عبدالحق پر ایک کیفیت سی طاری ہوگئی۔ ارجمند نے سورۃ مکمل بھی کر لی۔ مگر وہ گم صم بیٹھا رہا۔ ارجمند نے بھی

اسے اسی حال میں رہنے دیا۔ بس اسے غور سے دیکھتی رہی۔

بالآخر عبدالحق کی محویت ختم ہوئی۔ اس نے چونک کر ارجمند کو دیکھا۔

''جزاک اللہ .....! تمہاری قرأت بہت اچھی ہوگئی ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہ سب اللہ کا فضل ہے۔''

عبدالحق کے ذہن میں ایک بات تھی، اور اس بات کی وجہ سے ایک ہچکچاہٹ تھی۔ وہ بات اسے ارجمند سے کرنی تھی۔ اب وہ اس کے لئے مناسب الفاظ، مناسب پیرایہ تلاش کر رہا تھا۔

''ارجمند.....! ایک بات کہوں! تم برا تو نہیں مانو گی .....؟''

''میں انشاء اللہ کبھی آپ کی کسی بات پر برا نہیں مانوں گی۔'' ارجمند نے زور دے کر کہا۔

''دیکھو! میرے دل میں تو کبھی تمہارا خیال نہیں تھا .....''

''جانتی ہوں۔'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی یاس تھی۔

''لیکن یہ تو آپ کی نیکی کی دلیل ہے۔''

''اور یہ رشتہ قربت کا ہے۔ جب تک قلبی اور ذہنی قربت نہ ہو، ہر قربت بے معنی ہوتی ہے۔ تو میں تمہیں جاننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میری کہانی کے ہر صفحے پر آپ ہی آپ ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔

''بالکل شروع میں کچھ مٹی مٹی سی یادیں ہیں ..... امی اور بابا کی ..... دادی اور چاچو کی ..... سب لوگوں کی ..... بہت دھندلی یادیں، جو حقیقت نہیں، خواب لگتی ہیں۔ پھر وہ کوٹھا، جہاں مجھے گانا بھی سکھایا جاتا تھا اور رقص بھی۔ میں بہت چھوٹی تھی تب۔ اور وہاں پھپھو کے سوا کوئی نہیں تھا۔ پھپھو بہت مجبور، بہت دکھی تھی۔ وہ بہت کڑھتی تھیں۔ وہ مجھ سے بہت باتیں کرتی تھیں، جو اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ مگر اب میں انہیں سمجھ سکتی ہوں۔ وہ صرف مجھے بچانے کے لئے زندہ تھیں، ورنہ مر جاتیں۔ اور وہ صرف میرے لئے دعائیں کرتی تھیں۔

پھر نانا ہمیں مل گئے۔ تھے تو وہ وہاں پہلے ہی سے، مگر ہمارے نہیں تھے۔

اللہ نے رحمت کی تو وہ ہمارے ہوگئے۔ پھر اللہ نے رحمت کی اور آپ مجھے نظر آ گئے۔ پھر اللہ نے رحمت کی اور پھپھو کو اختیار مل گیا ..... کیوں اور کیسے؟ یہ شاید میں کبھی نہیں سمجھ سکوں گی۔ بس میں اتنا جانتی ہوں کہ ہم جہاں رہتے تھے، وہاں رزقِ حلال کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لیکن اللہ نے اپنے فضل سے ہمارے لئے وہاں بھی رزقِ حلال جاری کر دیا تھا۔

میں بے خبر اور بے فکر تھی۔ میرا کام ہی کیا تھا؟ قرآن پڑھنا، نماز پڑھنا، آپ کے بارے میں سوچنا اور آپ کی تصویر بنانا اور آپ کے بارے میں اللہ سے باتیں کرنا۔

پھر اللہ نے رحمت کی۔ میں آپ کے پاس آ گئی۔ آپ کے توسط سے اللہ نے مجھے بہت محبت کرنے والے لوگ عطا فرمائے۔ پھپھو چلی گئیں۔ نانا دور ہوگئے۔ مگر آپ مجھے مل گئے۔ یہ ہے میری مختصر سی محدود زندگی کی کہانی۔ ہر کہانی میں بہت سے کردار ہوتے ہیں، مگر مرکزی کردار ایک ہی ہوتا ہے آغا جی! اور میری کہانی کا مرکزی کردار صرف آپ ہیں۔ اور ہر کہانی کا ایک عنوان ہوتا ہے۔ میری کہانی کا عنوان ہے اللہ کی رحمت، اللہ کا فضل۔ میں نے کبھی اللہ سے آپ کو نہیں مانگا کہ اس میں آپی دکھی ہوں گی اور میں آپی کے لئے صحت، تندرستی اور بڑی عمر کی دعا کرتی رہی۔ مجھے حق نہیں تھا اللہ سے آپ کو مانگنے کا۔ اب اس کی رحمت کہ آپ مجھے مل گئے، اور وہ بھی کچھ کھوئے بغیر۔ کسی کو دکھ پہنچے بغیر۔ اللہ نے آپی سے ہی سب کچھ کرا دیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس شادی پر رضامند کرنے کے لئے آپی نے کیسی کیسی خوشامد کی میری۔ میں دل میں سوچتی اور حیران ہوتی کہ اللہ کی شان ہے۔ اس کے لئے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سر کاٹ کر آپی کے قدموں میں رکھ سکتی ہوں، اور وہ الٹا میری خوشامد کر رہی ہیں۔

یہ اللہ کا کرم ہے۔ ورنہ آپ کو تو کبھی میرا خیال نہیں آتا۔ آپی نے ہی آپ کو مجبور کر دیا نا .....! ورنہ آپ کے مسودے میں تو میرا نام بھی نہیں تھا۔''

عبدالحق شرمندہ سا، سر جھکائے سن رہا تھا۔ یہ کیسی محبت ہے؟ وہ حیران تھا۔

''مجھے آپ کے سوا کبھی کچھ نہیں چاہئے تھا اور اب بھی مجھے کچھ نہیں چاہئے، کیونکہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ مجھے تو آپ کی محبت بھی نہیں چاہئے۔ وہ جو میں آپ سے محبت کرتی ہوں، وہ میرے لئے بہت کافی ہے۔ بس میں آپ کی خوشی چاہتی ہوں ... وہ سامانِ زیست جس میں آپ کی خوشی ہو۔''

وہ خاموش ہوئی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''میں تمہیں ہر خوشی دینے کی کوشش کروں گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اتنی غیریت سے بات کیوں کرتی ہو؟ جس بندھن میں ہم بندھے ہیں، وہ اللہ کے نام کا بندھن ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کوئی محرومی ہو۔''

''میں نے تو بس اللہ کا فضل ہی دیکھا ہے۔ الحمد للہ کوئی محرومی نہیں دیکھی۔''

''ایک بات بتاؤ ... ! تم نے کہا کہ تم نے پوری نماز نہیں پڑھی تھی۔ اور یہ جو تم نے باقی نماز پڑھی ... دو دو کر کے چھ رکعت، یہ تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''یہ مجھ سے نہ پوچھئے آپ ...!'' ارجمند شرم سار نظر آنے لگی۔

''کیوں ...؟ میاں بیوی میں تو کوئی پردہ نہیں ہوتا۔''

''جو معاملہ بندے کا اللہ کے ساتھ ہو، اس کی تو اور بات ہوتی ہے۔''

''تو تم بتانا نہیں چاہتیں ...؟''

''مجھے لگتا ہے کہ بتاؤں گی تو کوئی نقصان ہو جائے گا میرا۔''

عبدالحق کو خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ کبھی دوسروں کے معاملات میں تجسس نہیں کرتا تھا۔ تجسس تو اس کی فطرت میں تھا ہی نہیں۔ لیکن اس وقت وہ تجسس سے بے حال تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ عشاء کی نماز ارجمند پوری پڑھ چکی ہے۔ تو پھر یہ چھ رکعت ... !

''میری خاطر نقصان نہیں گوارہ کر سکتیں تم ...!''

''کیوں نہیں کر سکتی، کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن اپنی نظروں میں چھوٹی ہو جاؤں گی میں۔''

عبدالحق خاموش ہو گیا۔

ارجمند کو وہ خاموشی ناراضی لگی۔

''آپ ناراض ہو گئے مجھ سے ...؟''

''نہیں ... ! ناراضی کی کیا بات ہے ...؟ پورا وجود ... سب کچھ تو کوئی ی کو نہیں دیتا۔''

''مگر میں تو ایسی ہی ہوں۔ پورا وجود، اپنا سب کچھ سونپ دوں گی آپ و۔ چلئے! یہاں سے ہی شروع کرتے ہیں۔''

عبدالحق متوقع نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

وہ چند لمحے خاموش رہی، کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''میں بچی تھی آغا جی ... ! معصوم بچی ... جب آپ کی آرزو میرے دل ں پیدا ہوئی۔ میں دنیا کے بارے میں ... امکانات کے بارے میں ... اسباب ے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ بس میرے اللہ کا دیا ہوا یقین تھا کہ آپ جھے ملیں گے۔ اور میرا ایمان تھا اس پر۔ ہم عام لوگوں کا شاید سب سے پختہ ایمان، چپن میں، اور زیادہ سے زیادہ لڑکپن میں ہی ہوتا ہے۔ بعد میں تو ہم خود کو دنیا کے ظام کے مطابق ڈھال لیتے ہیں، اور ایمان گھٹتا جاتا ہے۔ تو میرا ایمان تھا کہ ایسا و رہے گا۔ کیسے ہوگا؟ اس سے مجھے غرض نہیں تھی۔ پھپھو سوچتی تھیں کہ ایسا نہیں و سکتا، کیونکہ وہ امکانات پر نظر ڈالتی تھیں۔

اور جب یہ ہو گیا، میں اس گھر میں آ گئی تو میرا ایمان اور پختہ ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آدمی بس اللہ کا حکم مانے ... اور اپنی مرضی کو نظر انداز کر کے مانے تو وہ اس کی ہر بات مانتا ہے۔ جو وہ مانگے، اسے دیتا ہے۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ بس اللہ ہی ایسا ہے، جس کے لئے کچھ بھی ان ہونی نہیں ہے۔ اس کی قدرت سے کچھ بھی نہیں ہے۔

مجھے اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے مجھے دوزخ سے نکال کر جنت یں بھیجا ہے۔ میں تو بس یہ سوچ کر خوش تھی کہ اللہ نے وعدہ پورا کیا اور مجھے آپ سے ملا دیا۔ اب میں عمر بھر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ تاہم میں نے یہ سبق سیکھ لیا کہ اس کے حکم کے خلاف نہیں کرنا چاہئے۔ یہ مجھے بعد میں پتا چلا کہ انسان کے لئے یہ

کتنا مشکل کام ہے۔ جب میں پڑھتے ہوئے چپکے چپکے آپ کو دیکھنا چاہتی تھی اور دل روکتا تھا۔ اللہ نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے۔

پھر ایک دن میری سمجھ میں آیا کہ میں ناسمجھی اور بے خبری کے عالم میں ایک جہنم میں رہ رہی تھی، جہاں سے اللہ نے کرم فرما کر مجھے نکال دیا۔ یہاں سے مجھ پر سوچوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ اللہ نے کرم فرمایا کہ میری خواہش کے مطابق مجھے آپ تک پہنچا دیا۔ لیکن اس سے بڑا جو کرم فرمایا، وہ یہ تھا کہ مجھے اس جہنم سے رہائی دلا دی۔ مگر اس سے میں بے خبر رہی۔ تب میں نے سوچا کہ اگر اللہ نے مجھے وہاں سے نہ نکالا ہوتا تو کیا ہوتا؟ یہ سوچ کر میری روح تھرا گئی۔ میری سمجھ میں آیا کہ پھپھو ہمیشہ ناخوش کیوں رہتی تھیں۔ میری سمجھ میں آیا کہ وہاں ان پر کیا گزرتی رہی، اور وہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ سچ مچ میں بہت ڈر گئی۔ میں نے آپ کے حوالے سے تو شکر ادا کیا تھا لیکن اس حوالے نہیں کیا تھا۔

میں غور کرتی رہی۔ میری سمجھ میں آیا، پھپھو کہتی تھیں .... اللہ تم پر بہت مہربان ہے۔ تم کبھی نہیں جان سکو گی کہ اس نے تمہیں کیسے کیسے دکھوں سے بچا لیا ہے۔ نہ جاننے میں ہی تمہاری بہتری ہے۔ بس تم اللہ کا شکر ادا کرتی رہا کرو۔

آپ کے جانے کے بعد بہت سی باتیں میری سمجھ میں آئیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان پر آپ سے بات کروں، آپ کی راہنمائی طلب کروں۔ لیکن آپ بہت دور تھے۔ اور سب سے بڑا راہنما ساتھ تھا۔ اس نے ہی راستہ دکھایا۔

میری سمجھ میں ایک بات آئی۔ مسئلہ یہ ہے کہ آدمی بڑا بے خبر ہے۔ وہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ جیسے مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس جہنم سے نکال کر اللہ نے مجھے کروڑوں مصائب سے بچایا ہے، ویسے ہر روز وہ میری لاکھوں ضرورتیں پوری کرتا ہوگا۔ لاکھوں نعمتیں عطا فرماتا ہوگا۔ عنایات کرتا رہتا ہوگا۔ لیکن مجھے پتا نہیں چلتا ہوگا۔ کبھی پتا چلتا بھی ہوگا تو اس کی اہمیت سمجھ میں نہیں آتی ہوگی۔ بندہ یہ تو کبھی دیکھ اور سمجھ نہیں سکتا کہ یوں ہو جاتا تو کیا کیا ہوتا اور کب تک ہوتا، اور یوں نہ ہوتا تو کیا کیا ہوتا اور کب تک ہوتا۔ شاید پوری زندگی ہوتا رہتا۔ کیونکہ یہ سب کچھ تو صرف وہ جانتا ہے، جس کے پاس مکمل علم ہے اور جو ہر چیز جانتا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی

پتا چلتا کہ ہمارے اپنے دل میں اور دماغ میں کیا کیا پل رہا ہے۔ سچ ہے، بندہ تو بے خبر ہے۔ اور پتا چلے بھی تو کتنا پتا چل سکتا ہے۔ اللہ تو ہر ہر پل ہماری ہزاروں ضرورتیں ایسے پوری کرتا رہتا ہے کہ ہمیں نہ ضرورت کا پتا چلتا ہے اور نہ اس کے پورے ہونے کا۔ سانس کو ہی لے لیجئے۔ ہم کب سوچتے ہیں کہ یہ سانس اللہ نے دی، اور یہ باہر نکالی۔ نہ ہوتا تو زندگی ختم تھی۔

مجھ پر بے بسی طاری ہونے لگی آغا جی! میں سمجھ گئی کہ شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ لیکن شکر ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔ پھر میں نے سوچا، اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ناممکن قرار دے کر شکر کا خیال ہی دل سے نکال دیا جائے۔ تو پھر کیا کروں؟ دل نے کہا، دو رکعت نمازِ شکر ادا کیا کر...... اللہ کی عطا کی ہوئی معلوم، نامعلوم تمام نعمتوں پر، اس کی تمام عنایات پر، اس کی عطا کی ہوئی ہر امداد اور ہر تحفظ پر۔ پھر اس سے اپنے لئے شکر کی توفیق اور شکر گزاری مانگا کر۔

اس پر مجھے قرار آ گیا۔ دل کو سکون ہوا اور بے بسی کا احساس کم ہو گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ یہ اللہ کی طرف سے راہ دکھائی گئی ہے۔ اب اس پر عمل کرنا میرا کام ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ عشاء کے بعد ہر روز دو رکعت شکر کے لئے پڑھوں گی۔

''پھر مجھے ایک اور خیال آیا۔ مجھے اپنی ضرورتوں کا علم ہی کب ہے۔ بعض اوقات تو ایک لمحے بعد کی ضرورت کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کا کرم ہے کہ وہ ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ اور سب سے بڑی ضرورت تو یہ ہے کہ میں گناہوں سے بچوں، اللہ کی نافرمانی نہ کروں، اس کا حکم مانوں۔ اور اللہ بغیر مانگے بھی میری تمام ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ تو کیوں نہ ہر روز دو نفل برائے حاجات ادا کر کے اس سے دعا کروں کہ وہ میرے اگلے روز کی تمام حاجتیں عزت کے ساتھ پوری فرمائے۔ مجھے اپنی نافرمانی سے، گناہوں سے بچائے اور مجھے اپنا فرمانبردار بنائے۔ دعا بندگی بھی ہے اور اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ تو یوں یہ چار رکعتیں اللہ کے فضل سے میرا روز کا معمول بن گئیں۔''

عبدالحق سن سا بیٹھا سنتا رہا تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ارجمند

خاموش ہوگئی ہے۔ خاصی دیر بعد وہ چونکا۔

''مگر تم نے تو ابھی چھ رکعتیں ادا کی ہیں۔'' اس نے کہا۔

ارجمند کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔

''اب اسے رہنے دیجئے نا.....!'' اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

''اب پوری بات ہی بتا دو نا.....!''

ارجمند کی نظریں جھک گئیں۔

''آج دو رکعتیں آپ کے ملنے پر شکر کی بھی تو ہوئی تھیں۔''

عبدالحق کو کبھی اس لڑکی پر محبت نہیں آئی تھی، بلکہ وہ سوچتا تھا کہ شادی کے بعد اس سے محبت کیسے کرے گا؟ لیکن اس کی بات سن کر نہ جانے کہاں سے اس کے اندر محبت کا سمندر اُمنڈ پڑا۔ اس نے محبت سے اسے لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجمند.....!''

''یہ تو اللہ کا فضل ہے۔'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

عبدالحق کے ذہن میں کوئی یاد سی سرسرائی۔ لیکن وہ اسے گرفت میں نہ لے سکا۔

''تم مجھے اللہ کے فضل سے ملی ہو۔ میں تمہارا مستحق نہیں تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ کبھی ہو بھی نہیں سکوں گا۔''

''ایسی باتیں نہ کریں.....شرمندہ کرنے والی۔ اسی لئے تو میں بتانا نہیں چاہ رہی تھی آپ کو۔''

''تم مجھے ہر روز یاد کرتی تھیں۔''

''ہر روز نہیں، ہر وقت۔ لیکن میں آپ کے دور جانے سے خوش تھی۔ میری آزمائش آسان ہوگئی تھی نا! اس لئے، لیکن آپ نے تو کبھی یاد نہیں کیا ہوگا مجھے؟''

''خیال تو آتا تھا کبھی کبھی، لیکن ایک دن میں نے بڑی شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔ وہ تہجد کا وقت تھا۔ تہجد کے بعد میں قرآن پڑھنے بیٹھا تھا کہ اللہ کی رحمت ہوئی اور بارہا کی پڑھی ہوئی آیات اچانک سمجھ میں آنے لگیں۔''

''کون سی آیات تھیں.....؟'' ارجمند نے پوچھا۔ اس کی آنکھیں اچانک چمکنے لگی تھیں۔

''میں نے انہیں اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ لیکن الحمد للہ میں انہیں کبھی بھولا نہیں۔ وہ سورۂ بقر کی آیات تھیں۔''

''٦٧ سے ٧١ تک۔'' ارجمند نے مداخلت کی۔

''جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ کا حکم ہے کہ وہ ایک گائے قربان کریں۔''

''ہاں.....! تمہیں کیسے معلوم.....؟'' عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

''مجھ سے بھی اللہ نے ان آیات پر غور کروایا تھا اور اپنی رحمت سے مجھ پر واضح کر دی تھیں۔ بہت دیر تک میں بار بار پڑھتی اور الجھتی۔ اس وقت میں نے سوچا، کاش آپ یہاں ہوتے تو شاید مجھے سمجھا دیتے۔''

''میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ کاش تم ساتھ ہوتیں تو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی۔''

''اور پھر میری سمجھ میں انشاء اللہ کی اہمیت آئی۔ آخر میں اللہ نے خود فرمایا کہ بالآخر انہوں نے ذبح کر دیا اسے، اگرچہ نہ لگتا تھا کہ وہ ایسا کریں گے۔''

''ہاں! اگرچہ انشاء اللہ کہتے ہوئے بھی وہ حجت ہی کر رہے تھے۔ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔''

''انشاء اللہ تو بس ان کے منہ سے نکل گیا تھا۔''

دونوں حیران تھے کہ ایک دوسرے کی بات پوری کر رہے ہیں۔

''اس پر مجھے سورۂ قلم کی آیات یاد آئی تھیں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''مجھے بھی..... وہی نا، جن میں باغ والوں کا حصہ ہے۔''

''جنہوں نے اپنے باغ سے پھل توڑنے کا ارادہ کیا، لیکن انشاء اللہ نہیں کہا۔''

''اور ان کا باغ اجڑ گیا۔''

''اور اللہ نے بتایا کہ دنیا کا عذاب ایسا ہوتا ہے۔ اور آخرت کا عذاب تو

کہیں بڑھ کر ہے۔"

"اس میں تسبیح کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔"

"ان آیات کو پڑھ کر میں نے سیکھا کہ ہر نقصان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا چاہئے۔"

"میں نے بھی آغا جی....."

"پھر اذان ہوئی اور میں نماز کے لئے اٹھا....."

"لیکن میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا کہ دنیا کا ہر نقصان، ہر محرومی اور ہر عذاب درحقیقت اللہ کی رحمت ہے۔" ارجمند جیسے از خود رفتگی کے عالم میں تھی۔

"کمال ہے، یہی خیال مجھے بھی آیا تھا، اور اس کی وضاحت اس آیت نے کی تھی..... ایسا ہوتا ہے عذاب..... اور عذابِ آخرت تو کہیں بڑھ کر ہے۔ میں نے سمجھا کہ دنیا کا عذاب اللہ کی تنبیہ ہے، سمجھانا ہے، تاکہ آدمی آخرت کے بڑے عذاب سے بچ جائے۔ اس لحاظ سے یہ اللہ کی رحمت ہے۔"

"اور اسی روز نماز کے بعد اللہ نے رحمت فرمائی اور ھذا من فضل ربی کی اہمیت میری سمجھ میں آئی۔" ارجمند نے کہا۔

"سورۂ نمل کی آیات کے حوالے سے بات کر رہی ہو نا.....!"

"جی آغا جی.....! جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ کوئی ہے جو ملکہ سبا کا تخت میرے سامنے حاضر کر دے۔"

"ہاں! وہی..... اسی دن میں نے بھی یہ نکتہ سمجھا تھا۔"

"مجھے تو وہ تاریخ بھی یاد ہے آغا جی.....! چار اکتوبر۔"

"تاریخ تو مجھے یاد نہیں۔ لیکن میری ڈائری سے پتا چل جائے گا۔" عبدالحق نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ بچوں کی سی ہیجانی کیفیت سے دوچار تھا۔

عبدالحق ڈائری لے کر آیا۔ اس نے صفحہ کھولا۔

"چار اکتوبر ہی ہے۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"مجھے دکھائیے!"

ارجمند نے پوری تفصیل پڑھی، پھر بولی۔

"یہ ایک ہی دن کی بات ہے۔ اور میں نے بھی اسی ترتیب سے سوچا تھا۔"

"اور ایک بات بتاؤں! یہاں ایک بار قرآنی آیات پر تم سے بات ہوئی تھی۔ تم سے بہت کچھ سمجھا تھا میں نے۔ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ تو اس روز کراچی میں مجھے وہ بات یاد آئی اور میں نے سوچا، کاش اس وقت تم میرے ساتھ ہوتیں تو میرے اندر سے کسی نے کہا..... چلو، مل کر سمجھتے ہیں....."

"آپ یقین نہیں کریں گے آغا جی.....! اس صبح مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ میرے سامنے بیٹھ کر مجھے سمجھا رہے ہوں۔ بس آپ نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن آپ کی آواز سن رہی تھی۔"

عبدالحق نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن جان لیا کہ یہ لڑکی اس کے لئے اللہ کی رحمت ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے اسے روز شکر ادا کرنا اور اللہ سے قضائے حاجات کی دعا کرنا سکھایا ہے۔ اللہ اپنے بندے کو اس کے توسط سے بڑائی کی طرف لے جا رہا ہے۔

اب کہیں کسی طرح کی دوری نہیں تھی..... نہ قلبی، نہ ذہنی..... ایک پاکیزہ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کی تھی..... اس کی اپنی..... اللہ کی طرف سے بیش بہا تحفہ! رات پردہ پوش! عبدالحق نے زیرلب کہا اور لائٹ آف کر دی۔

✿ ✿ ✿

نور بانو نے سب کچھ خود ہی کیا تھا۔ مگر اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بھاری کام کیا ہے۔ رات کو وہ ویسے ہی دیر سے سونے کی عادی تھی لیکن اس رات تو لگ رہا تھا کہ اسے نیند آئے گی ہی نہیں۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے کیا کر دیا..... اور کیسے کر دیا۔ اب پہلی بار اس پر اس کی معنویت کھل رہی تھی۔ یہ تو زندگی بھر کا سودا تھا۔ اس نے عبدالحق میں کسی کو شریک کر لیا تھا..... اس نے! خود اس نے!!

اس وقت وہ حمیدہ کے کمرے میں تھی..... حمیدہ کے بستر پر، اور ارجمند اس کی خواب گاہ میں تھی..... عبدالحق کے ساتھ..... اس کے بستر پر۔

نہیں! اس نے جلدی سے تصحیح کی۔ اس کے بستر پر نہیں، اپنے نئے بستر پر۔ اور ہر اعتبار سے اس کا اہتمام خود اس نے کیا تھا، اور بڑے شوق سے کیا تھا۔ ضد کر کے اس نے عبدالحق کو بھی منایا اور ارجمند کو بھی۔ یہ باطنی اہتمام تھا۔ اور پھر اس نے اپنی خواب گاہ میں نئی مسہری کا اہتمام بھی کیا تھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے پتری!'' حمیدہ نے اسے ٹوکا تھا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو اماں......!'' اس نے کہا تھا۔

''وہ کنواری لڑکی ہے۔ کہیں بھی شادی ہو سکتی تھی اس کی۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جاتا اسے۔ میری محبت میں اس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے دھیے! پر میں تو مسہری کی بات کر رہی ہوں۔ نئی مسہری کی کیا ضرورت ہے؟''

''وہ نئی نویلی دُلہن میرے بستر پر کیوں سوئے؟ اس کے لئے تو نیا بستر ہونا چاہئے۔'' اس نے تنک کر جواب دیا تھا۔

''ہاں! یہ بات تو ٹھیک ہے تیری۔ تو تو بہت عقل مند ہے نور بانو!''

''سب تم سے ہی سیکھا ہے اماں!'' نور بانو نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔

مگر اب وہ تڑپ رہی تھی۔ وہ سب کچھ کرتے ہوئے اپنی فطرت کو بھول گئی تھی۔ مگر فطرت حالات کے تحت وقتی طور پر دب تو جاتی ہے، ختم کبھی نہیں ہوتی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہاں حمیدہ کے ساتھ ہے، اور وہاں ارجمند عبدالحق کے ساتھ۔ اور ارجمند ایک تو کم عمر اور اس پر ایسی حسین کہ اتنی حسین لڑکی اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ اب عبدالحق اسی کا ہو جائے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ وہ خود ہی اس کی ذمہ دار ہے۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن حمیدہ کی وجہ سے اٹھی نہیں۔

یہ میں نے کیا کر دیا۔ اس نے سوچا۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑ ڈالا میں نے۔

پھر اسے یاد آیا کہ یہ اس نے کوئی ایثار کیا ہے، نہ غلطی کی ہے۔ یہ تو سوچ سمجھ کر کیا ہے اس نے۔ یہ تو سودا ہے۔ اور اس سودے میں اسے اولاد ملے گی، جبکہ

اس کے نصیب میں اولاد تھی ہی نہیں۔ اسے تو شکایت کا، جلنے کڑھنے کا کوئی حق ہی نہیں۔ اس معاملے میں سبھی فائدے میں رہے، عبدالحق بھی، حمیدہ بھی اور وہ خود بھی۔ خسارے میں تو بس ایک ارجمند ہے...... بے چاری۔

اس خیال نے اس کے جلتے تپتے دل پر جیسے برف کا پھایا رکھ دیا۔

مگر وہ سکون بس تھوڑی دیر کا تھا۔ حسد تو اس کی فطرت میں تھا۔ وہ تو بے سبب بھی حسد کر سکتی تھی کسی سے۔ جبکہ یہاں تو حسد کا بہت بڑا سبب بھی موجود تھا۔

خوابگاہ میں کیا ہو رہا ہوگا؟ اس خیال نے اس کے دماغ میں بچھو کی طرح ڈنک مارا۔ اور تن بدن میں آگ سی دہک اٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھے اور جا کر دروازہ پیٹ ڈالے۔ چلا کر کہے کہ بس کرو، ختم کرو یہ کھیل۔

لیکن نہیں! وہ یہ نہیں کہہ سکتی۔ یہ کھیل شروع اس نے ہی کیا تھا۔ لیکن ختم کرنے کا اختیار اسے نہیں تھا۔

اسے اپنی سہاگ رات یاد آ گئی۔

وہ بہت قیمتی، خوش کر دینے والی یادیں تھیں۔ وہ ان سے کچھ دیر بہلی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اب یہی کچھ ارجمند......

اور آگ پھر بھڑک اٹھی۔

اس نے کروٹ بدلی اور حمیدہ کو دیکھا۔ شاید وہ سو چکی تھی۔ لیکن وہ خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حمیدہ اس کی بے قراری دیکھے۔ وہ دم سادھے لیٹی، اسے تکتی رہی۔

اس کا تصور بے لگام ہو رہا تھا۔ خواب گاہ کے مناظر اس کے تصور میں پھر رہے تھے۔ اپنے بستر پر اسے انگارے بچھے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بار بار خود کو یاد دلاتی کہ اس نے ایک بہت بڑی نعمت کو پانے کے لئے ایک نسبتاً چھوٹی نعمت کھوئی ہے...... لیکن نہیں! کھوئی کہاں، صرف بانٹی ہے۔ مگر یہ خیال بس تھوڑی دیر اسے بہلاتا تھا، اس کے بعد پھر وہی بھڑکتی ہوئی آگ۔ اور بہلاوے کے یہ دورانئے بھی سکڑتے جا رہے تھے۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ سو چکی ہے تو وہ اٹھی اور کمرے سے نکل

آئی۔

پورے گھر میں سناٹا تھا۔ سب سو رہے تھے۔ پھر بھی وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں چلتی اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی، جو اب ارجمند کی خواب گاہ تھی۔ کئی بار وہ دروازے سے پلٹی ..... شرمندہ ہو کر، مگر پھر دروازے کی طرف کھنچی چلی گئی، جیسے وہاں اس کے لئے کوئی مقناطیسی کشش ہو۔

بالآخر وہ جھکی اور اس نے دروازے سے کان لگا دیا۔

اگلا لمحہ شدید حیرت کا تھا۔

اندر صرف ایک ہی آواز تھی..... ارجمند کی آواز۔ اور اس آواز میں ایک تسلسل تھا۔ لفظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

نور بانو سیدھی کھڑی ہوئی اور اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس بات کا اسے بڑی شدت سے احساس تھا کہ اگر کسی نے اسے دروازے سے کان لگائے دیکھ لیا تو اس کی بڑی سبکی ہوگی۔

یہ بات طے تھی کہ سب لوگ سو رہے ہیں۔ لیکن کوئی کسی بھی وقت، کسی ضرورت کے تحت اٹھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ عبدالحق خود ہی کسی ضرورت کے تحت دروازہ کھول کر باہر آئے۔ ایسا ہوا تو وہ اسے منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔

لیکن آدمی تجسس پر قابو پانا نہ سیکھے تو تجسس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ آدمی ہر خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ وہ پھر دروازے پر جھکی، اور کان لگا دیا۔ وہی ارجمند کی آواز! وہ مسلسل بول رہی تھی ..... اور ایک خاص آہنگ میں۔

اس بار اس نے سماعت پر زور دیا اور حیران رہ گئی۔ ارجمند قرآن پڑھ رہی تھی۔

نور بانو کے ذہن میں کئی سوالات نے سر اٹھایا۔ کیا عبدالحق سو چکا ہے؟ کیا عبدالحق نے ارجمند کو قبول نہیں کیا؟ شادی کی تو صرف اس کی مروت میں؟ اور اب مایوس ارجمند قرآن پڑھ رہی ہے؟

اس کا پہلا ردِعمل تو خوشی کا تھا۔ مگر پھر اسے مایوسی ہوئی۔ یوں تو اس کا

منصوبہ ناکام ہو جائے گا۔

وہ واپس حمیدہ کے کمرے میں چلی آئی اور بستر پر لیٹ گئی۔ لیکن اب وہ مایوس تھی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا اس کی قربانی رائیگاں جائے گی؟

اس سے زیادہ دیر لیٹا نہیں گیا۔ وہ پھر کمرے سے نکلی اور خواب گاہ کی طرف گئی۔ اس بار اندر سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس بار عبدالحق کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

اب کے وہ بستر پر آ کر لیٹی تو قدرے مطمئن تھی۔ لیکن ذرا دیر بعد پھر وہی کیفیت ..... وہی انگاروں کا بستر، وہی دل کی جلن۔

اب کیا عمر بھر یہی ہوتا رہے گا.....؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن اس کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اس رات وہ بار بار جیتی اور مرتی رہی۔ نہ جانے کس وقت اسے نیند آئی۔ اور وہ نیند بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ ہذیانی نیند تھی وہ۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ سونے کے لئے لیٹی تو بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس کا ایک خواب پورا ہو گیا تھا، اور اس تعبیر میں اس کا دوسرا خواب چھپا تھا۔ جس انداز میں اللہ کی طرف سے پہلے خواب کو تعبیر ملی تھی، اس سے لگتا تھا کہ انشاء اللہ دوسرے خواب کو بھی تعبیر مل جائے گی۔

عام طور پر وہ لیٹتے ہی سو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت تو اس خوشی نے اس کے اندر ہیجان سا بھر دیا تھا، اور ہیجان میں بھلا نیند کہاں آتی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ اللہ کی شان، کچھ کرنا تو دور، اسے کچھ کہنا بھی نہیں پڑا۔

اس بے خوابی میں بے سکونی نہیں تھی، بلکہ لذت تھی۔ وہ ایک ایک لمحے کو جی بھر کے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ عبدالحق کی اس شادی سے سبھی خوش تھے۔ مسعود صاحب اور ان کی بچیاں بھی، زبیر اور رابعہ بھی، اور گاؤں سے آنے والے لوگ بھی۔ اور ساجد کی خوشی کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ وہ تو چھوٹی چاچی ... چھوٹی چاچی کرتے نہیں تھک رہا تھا۔ بلکہ اس سے تو حمیدہ کی سمجھ میں

ایک بات آئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ ساجد ارجمند کو پہلے سے چھوٹی چاچی کہتا رہا ہے۔ دو تین بار تو اس کے سامنے بھی اس نے چھوٹی کہا...... اور رک گیا۔ اس کی تفتیش پر بولا کہ نکی کو اردو میں چھوٹی کہتے ہیں۔

لیکن کیوں......؟ ساجد نے یہ چھپانے کی کوشش کیوں کی؟ اس کا ایک ہی جواب تھا، اور وہ سامنے تھا۔ ارجمند نے اسے منع کیا ہوگا۔ لیکن کئی بار اس کے اور رابعہ کے سامنے ساجد کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا چھوٹی چاچی...... تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اکیلے میں ارجمند کو چھوٹی چاچی کہتا ہوگا۔ یعنی ارجمند نے اسے اس کی اجازت دے رکھی ہوگی کہ وہ اکیلے میں اسے ایسے پکار سکتا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کہ ارجمند کو یہ اچھا لگتا تھا، اور اس کا مطلب تھا کہ ارجمند بہت پہلے سے عبدالحق کو پسند کرتی ہے۔

حمیدہ کو خود پر غصہ آنے لگا۔ اتنی سمجھدار بنتی ہوں اور سامنے کی بات بھی نہیں سمجھ سکی۔ اسے وہ دن یاد آیا جب ارجمند نے اس لڑکے سے ملنے جانے کی اجازت مانگی تھی، اور وہ ڈر گئی تھی کہ شاید ارجمند اس لڑکے کو پسند کرنے لگی ہے۔

اب سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ بے وقوف تھی۔ ارجمند ایسی لڑکی نہیں تھی کہ اس لڑکے سے ملنے جانے کے لئے اجازت لیتی، جسے وہ پسند کرتی ہو۔ وہ تو اسے سمجھانے کے لئے، منع کرنے کے لئے، اپنا انکار اس پر واضح کرنے کے لئے، تاکہ بات وہیں ختم ہو جائے۔ اگر اسے اس لڑکے میں دلچسپی ہوتی تو ملنے کے بجائے وہ اسے کہہ دیتی کہ وہ رشتہ بھیج دے۔ ارجمند ایسی ہی تھی۔

مگر وہ لڑکا اسے کتنا چاہتا ہوگا کہ ارجمند کے انکار کے باوجود اس نے رشتہ بھیجا۔ اور جب یہ نوبت آئی تو ارجمند نے اس سے مدد چاہی...... صاف کہہ دیا کہ انکار کر دیں، مجھے شادی نہیں کرنی۔ اور اس کے لئے کتنی خوشامد کی تھی اس نے۔

تو یہ عبدالحق کے لئے تھا!

اور لڑکا کتنا اچھا تھا...... بلکہ وہ لوگ ہی بہت اچھے تھے۔ اور عبدالحق کو پانے کا تو ارجمند نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔ پھر بھی بغیر امکان کے اتنا اچھا رشتہ چھوڑ دینا۔ کتنی محبت کرتی ہوگی وہ عبدالحق سے۔

حمیدہ کو ارجمند پر پیار آنے لگا۔

اور پھر جس دن وہ اپنی مرحوم پھپھو اور بچھڑے ہوئے نانا کو یاد کر کے رو رہی تھی، اور وہ ڈر گئی تھی کہ شاید ارجمند نے مروّت میں ہاں کر دی ہے، تو اس نے صاف تو بتا دیا تھا۔

میں پھر بھی نہیں سمجھی۔ شاید بوڑھی ہوگئی ہوں بہت، عقل کام نہیں کرتی۔

اب وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا خواب محض اس کا خواب نہیں تھا، وہ ارجمند کا بھی تھا، وہ ساجد کا بھی تھا، رابعہ کا بھی تھا...... بلکہ سب کی خوشی دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ وہ سب کا خواب تھا...... اجتماعی خواب...... اور اجتماعی خواب تو طاقت ور ہوتے ہی ہیں۔ ان کی تعبیر ضرور ملتی ہے۔

خوشی اور پریشانی میں ایک بات مشترک ہوتی ہے۔ نیند اڑ جاتی ہے۔ پھر یہ تو حمیدہ کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ لیکن وہ آنکھیں بند کئے لیٹی رہی۔ کم از کم جسم تو بے آرام نہ ہو۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ نوربانو بھی جاگ رہی ہے۔

شادی سے پہلے تو نوربانو اس کے ساتھ سوتی رہی تھی۔ لیکن شادی کے بعد کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ کو یاد تھا کہ وہ جلدی سوتی تھی، اور گہری پُرسکون نیند لیتی تھی۔ عبدالحق سے شادی کے بعد ایک تبدیلی آئی تھی، یہ کہ وہ بہت دیر تک سونے لگی تھی۔ اس کا سبب یہی رہا ہوگا کہ وہ دیر سے سوتی ہوگی۔ اب بری عادتیں آسانی سے کہاں چھوٹتی ہیں۔

حمیدہ نے یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا کہ یہ نوربانو کا روز کا معمول ہوگا۔ تاہم اس نے یہ ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ وہ خود بھی جاگ رہی ہے۔ اس نے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

ذرا دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ یقیناً سو جاتی۔ لیکن بستر پر بھونچال کی سی کیفیت تھی۔ نوربانو بار بار کروٹ بدل رہی تھی۔ بلکہ اسے کروٹ بدلنا تو نہیں کہا جا سکتا۔ وہ تو ایک بے چینی سی تھی...... بلکہ اس سے بھی بڑھی ہوئی کوئی چیز۔

کیا یہ روز اسی طرح کرتی ہوگی؟ حمیدہ نے سوچا۔ تو عبدالحق کیسے سوتا ہوگا؟

حمیدہ سیدھی ہوگئی۔ تجسس اسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ نور بانو کو دیکھے اور اس کی کیفیت کو سمجھے۔

نور بانو مسلسل کروٹیں بدلتی رہی۔ حمیدہ نے پلکوں کی جھری سی بنا لی تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن کچھ دیر میں وہ اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئی۔

نور بانو نے اس کی طرف کروٹ لی اور اسے دیکھنے لگی۔ حمیدہ نے اپنا ہاتھ ایسے رکھا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کی کلائی کی اوٹ میں تھیں۔ وہ کلائی کو ذرا سرسرکا کر نور بانو کو دیکھ سکتی تھی۔

نور بانو ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ نے پلکوں کی جھری بند کر لی۔ ذرا دیر بعد اس نے پھر پلکوں کی جھری سی بنائی۔ نور بانو نے اس وقت سے کروٹ نہیں لی تھی۔ لیکن اب وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ پل پل اس کے چہرے کے رنگ بدل رہے تھے۔ حمیدہ کو ڈر لگنے لگا۔

خوف کے باوجود حمیدہ اسے دیکھتی رہی۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی کیفیت سمجھ سکتی تھی۔ اور وہ پل پل بدلتی کیفیت تھی۔ ابھی برہمی، ابھی بے بسی ..... اور پچھتاوا تو بہت نمایاں تھا۔

دو تین بار تو ایسا لگا کہ نور بانو بستر چھوڑ کر اٹھ جائے گی۔ لیکن اس نے بہت کوشش کر کے خود کو روک لیا۔ پھر وہ دوبارہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔

حمیدہ نے آنکھوں کی جھری پھر بند کر لی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ عورت تھی ..... اور نور بانو کے مزاج کو تو وہ خوب پہچانتی تھی۔ ابھی ذرا دیر پہلے ہی تو وہ حیران ہو رہی تھی کہ نور بانو نے کیسے عبدالحق کی ارجمند سے شادی کرا دی۔ وہ تو ایسی تھی کہ عبدالحق کا سایہ بھی کسی کے ساتھ نہ بانٹے۔

وہ اب بھی نہیں سمجھی تھی کہ یہ اَن ہونی کیسے ہوگئی۔ بس اللہ کا حکم ہی تھا۔ ورنہ نور بانو ایسی نہیں تھی۔

کچھ دیر سکوت رہا۔ پھر بستر کی جنبش نے بتایا کہ نور بانو بستر سے اٹھ رہی ہے۔

حمیدہ نے آنکھیں کھولیں اور نور بانو کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

اب یہ بات سمجھنا تو حمیدہ کے لئے مشکل نہیں تھا کہ نور بانو کس آگ میں جل رہی ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ سکتی تھی کہ نور بانو کہاں جا رہی ہے۔ وہ اس کے پیچھے جانا چاہتی تھی، لیکن جانتی تھی کہ یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وہ اسے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ یہ بات کہ حمیدہ نے اسے دیکھ لیا ہے، نور بانو کو اور بھڑکا دے گی۔

حمیدہ کے دل میں ہول اٹھنے لگے۔ وہ نور بانو کو جانتی تھی۔ جب وہ حسد کا شکار ہوتی تو آنکھوں کی ہی نہیں، عقل کی بھی اندھی ہو جاتی تھی۔ یہ ناممکن نہیں کہ ابھی وہ جا کر عبدالحق کے کمرے کا دروازہ پیٹ ڈالے۔ ہنگامہ مچا کر رکھ دے۔ اتنے مہمان موجود ہیں۔ تماشا بن جائے گا۔

حمیدہ پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ اللہ سے دعا کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ گڑگڑا کر اللہ سے دعا کرتی رہی۔ اس کی ساعت رات کے سکوت میں کسی ہنگامے کی منتظر تھی۔

لیکن اسے نور بانو پر ترس بھی آ رہا تھا۔ وہ عورت تھی۔ سمجھ سکتی تھی کہ نور بانو پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس کا شوہر کسی اور کے ساتھ سہاگ رات گزار رہا تھا۔ ایک عورت کے لئے یہ وقت آسان نہیں ہوتا۔ اور پھر نور بانو!

اللہ نے حمیدہ کی دعا سن لی۔ آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر نور بانو کمرے میں داخل ہوئی اور آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ لیکن وہ کچھ پرسکون بھی نظر آ رہی تھی۔

مگر وہ بھی لمحوں کی بات تھی۔ اس کے تاثرات پھر پل پل بدلنے لگے۔ ایک بار پھر وہ اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

اس بار حمیدہ دہل گئی۔ نور بانو کا دوسری بار جانا اس بات کی دلیل تھا کہ اب اس کا ضبط جواب دے گیا ہے۔ اب تو اس کے جسم کا ہر رواں عافیت کے لئے

دعا کر رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے شور شرابا ہو جائے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس بار نور بانو جلدی واپس آ گئی اور وہ اس بار زیادہ مطمئن تھی۔

مگر اس بار بھی وہ سکون لمحوں کا تھا۔ پھر وہی پل پل بدلتی کیفیت، پھر وہی کروٹیں۔ لیکن حمیدہ کے لئے یہ بات خوش آئند تھی کہ نور بانو بہر حال اس کے کمرے میں تھی۔

جانے کتنی دیر کے بعد نور بانو سوئی۔ پھر حمیدہ کو بھی نیند آ گئی۔ لیکن وہ اپنے معمول کے مطابق فجر کے وقت اٹھ گئی۔ نیند کی کمی سے اسے چکر آ رہے تھے۔ اس نے سوچا، کوئی بات نہیں، بعد میں سو جائے گی۔ نماز قضا کرنا تو ٹھیک نہیں۔

اس نے آنکھیں ملیں اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ نور بانو بے سدھ، بے خبر سو رہی ہے اور اس کے چہرے پر سکون ہے۔

وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہی تھی کہ ارجمند کمرے میں آ گئی۔ اس نے اسے سلام کیا۔ حمیدہ نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد حیرت سے کہا۔

''ارے بکی.... ! تو اٹھ بھی گئی....؟''

''مجھے تو اٹھے ہوئے دیر ہو گئی دادی اماں!'' ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو وضو کرانے آئی ہوں۔''

❁ ❁ ❁

اچھو میاں بہت خوش تھے۔ لیکن نیند انہیں کسی طرح نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹے کروٹیں بدلتے رہے۔ پھر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

وہ کبھی بہت زیادہ نہیں سوتے تھے۔ کوٹھے پر تو انہیں کبھی اچھی نیند ہی نہیں آئی تھی۔ ہاں داتا دربار کے صحن میں انہیں اتنی اچھی نیند آتی تھی کہ وہ ہمیشہ تازہ دم اٹھتے تھے۔

تو اب یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے تشویش سے سوچا۔ شاید یہ ہے کہ ان کے معمول میں فرق آیا ہے۔ وہ اپنے معمول کے مطابق ذکر بھی نہیں کر سکے۔ اللہ

سب جانتا ہے، اللہ معاف کرنے والا ہے۔ ان کو گھٹن کا احساس ہونے لگا۔

وہ تسبیح کرنے لگے۔ لیکن دو گھنٹے بعد بھی نیند ان کی آنکھوں سے اتنی ہی دور تھی۔

اچانک بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

یہاں سب کچھ، ہر چیز اس ماحول کے برعکس تھی، جس میں سونے کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ وہاں وہ بے شمار لوگوں کے درمیان، اللہ کے شامیانے کے نیچے، صحن کے فرش پر سوتے تھے۔ اور اللہ کی شان کہ سردی ہو یا گرمی، وہ فرش ان کے لئے مہربان تھا۔ سخت سردی میں بھی وہ اس ٹھنڈے فرش پر سوتے تھے اور جسم پر ایک چادر کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ تکیہ اپنے ہاتھوں کا ہوتا تھا۔

یہاں نرم آرام دہ بستر تھا اور تنہائی تھی۔ وہ ان دونوں کے ہی عادی نہیں تھے۔ نیند کیسے آتی۔

انہیں لان کا خیال آیا۔ وہ باہر چلے آئے۔

ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر لیٹنا انہیں بہت اچھا لگا۔ لیکن نیند انہیں وہاں بھی نہیں آئی۔ انہوں نے سوچا، وہ فرش کے عادی ہیں، اور یہاں بنچ کی صورت میں اس کا متبادل بھی موجود ہے۔ چنانچہ وہ بنچ پر لیٹ گئے۔

لیکن نیند اب بھی ان کی آنکھوں سے دور تھی۔ بلکہ ایک عجیب سی بے چینی سی تھی، جیسے دل انہیں کچھ سمجھا رہا ہو، اور وہ اسے سمجھ نہ پا رہے ہوں۔

کچھ دیر وہ سوچتے اور الجھتے رہے۔ پھر اچانک جیسے روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا، اور بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

یہ تو شکر کی رات ہے، اور میں اسے ضائع کر رہا ہوں۔ انہوں نے خود [illegible]نی کی۔ پھر ان پر جیسے دریچے سے کھلتے گئے۔ اپنی پوری زندگی انہیں ان دریچوں [illegible] نظر آئی۔ وہ کیا تھے، انہوں نے خود کو کیا بنا لیا۔ کن پستیوں میں گر گئے۔ ...کا دیا ہوا سب کچھ دے کر وہ گناہ میں گناہ خریدتے رہے۔ یہاں تک کہ تہی... ت ہو کر گناہوں کی دلدل میں اتر گئے۔

پھر اللہ نے صرف اپنی کریمی سے کہ کرم اس کا شیوہ ہے، ورنہ ان کا کوئی

حق نہیں تھا، انہیں سہارا دیا۔ انہیں راستہ دکھایا۔ انہیں نادرہ اور ارجمند ملیں، اور پھر اللہ نے طوائف کے کوٹھے پر انہیں ان نعمتوں سے نوازا، جو لوگوں کو عزت اور عافیت کے گھروں میں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ اس کوٹھے پر انہوں نے نماز پڑھی، قرآن پڑھا، اللہ کے حکم کے مطابق رمضان کے مبارک مہینے گزارے، اور انہیں رزقِ حلال عطا فرمایا۔ یہی نہیں، آگے کے لئے ان کی راہ بھی متعین کر دی۔

یہ سب یاد کرتے ہوئے ان پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اتنا کسے ملتا ہے؟ اللہ نے تو ان پر بے حساب فضل فرمایا تھا۔

ارجمند کے روپ میں اللہ نے انہیں واحد تعلق اور رشتہ عطا فرمایا تھا۔ ورنہ ان کا تو دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ پھر اسے عبدالحق کے گھر چھوڑ کر وہ داتا دربار آ گئے۔ وہاں کیسے عیش کرائے اللہ نے انہیں۔ ان کی ہر ضرورت عزت کے ساتھ پوری کی۔ انہیں بے فکری اور فرصت عطا فرمائی کہ وہ سب کچھ بھول کر اللہ کے حکم کے مطابق بس اسی کے ہو رہیں۔ پھر اس نعمت سے استفادہ نصیب فرمایا کہ انہیں شکر و استغفار کی توفیق عطا فرمائی۔

اب ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

وہ کیا تھے؟ ان کی اوقات کیا تھی؟ سر سے پاؤں تک غلاظتوں میں لتھڑا ہوا ایک حقیر اور عاجز بندہ، جسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ کبھی معزز اور پاک ہو سکتا ہے۔ اور عالم یہ تھا کہ وہ اللہ سے شرط لگا بیٹھے۔ بے اوقات ہوتے ہوئے انہوں نے اپنی توبہ کی قبولیت کے لئے اس کی ایک نشانی متعین کر لی کہ انہیں اپنی توبہ قبول ہونے کا، اپنی غلاظتوں کے دھلنے کا یقین جب آئے گا کہ وہ بے نیاز انہیں اپنے گھر بلا لے۔

اور ربِ کریم کی عنایت کہ اس نے اپنے گناہ گار بندے کی یہ شرط بھی پوری فرما دی۔ کون ایسا مان رکھتا ہے کسی کا۔ دنیا کا ہر رشتہ آدمی کو اس کی اوقات کے مطابق نوازتا ہے۔ بس وہ ربّ ہے بے حساب دینے والا۔

ارے..... اس نے مجھے اپنے گھر بلایا ہے۔ وہ بڑبڑائے۔ اور کس شان سے بلایا ہے۔ اجازت نامہ بھی اس کا اور فراخی کے ساتھ زادِ راہ بھی اس کی عطا۔

اور اعزاز کتنا بڑا۔ اپنے در کی پاسبانی عطا فرما دی۔ اپنے گھر کا خدمت گار، صفائی کرنے والا بنا دیا۔ کوئی گندا غلیظ آدمی کیسے صفائی کر سکتا ہے اس کے گھر کی۔ تو گویا اس نے پاک کر دیا کہ پاک کرنا بس اسی کی تو صفت ہے۔

اب آنسو ان کی آنکھوں سے دھاروں بہہ رہے تھے۔

اور اپنے گھر بلانے سے پہلے اس نے ایک اور بہت بڑا اعزاز عطا فرما دیا۔ دنیا میں آدمی کا اعتبار رشتوں سے ہوتا ہے، جس سے وہ برسوں پہلے محروم ہو چکے تھے۔ اسی نے انہیں اپنی رحمت سے وہ اعتبار بھی عطا فرما دیا۔ عبدالحق خود انہیں لینے کے لئے آیا کہ اس بچی کی شادی ہو رہی تھی، جس کا دنیا میں کوئی ایک رشتہ دار بھی نہیں بچا تھا۔ اور وہ انہیں نانا کہتی اور سمجھتی تھی۔

اور یہی نہیں، اس نے انہیں وہاں عزت اور وقار کے ساتھ جانے کے لئے ان کی تہی دامنی بھی دور فرمائی۔ انہوں نے بہت کچھ تو نہیں دیا، لیکن اس بچی کو خالی ہاتھ بھی رخصت نہیں کیا۔ ایک باپ جو کچھ کر سکتا ہے، وہ اللہ کی مدد سے ان کے لئے ممکن ہوا۔

اب ان کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

زندگی کیا ہے؟ کسی نے ان سے سرگوشی میں پوچھا۔

اپنے آغاز سے لے کر انجام تک، صرف اور صرف اللہ کا احسان۔ انہوں نے بلا جھجک جواب دیا۔ وہ مجھے پیدا نہ فرماتا تو میں کچھ بھی نہ ہوتا.... محض عدم۔ نہ دنیا کی نعمتوں میں کوئی حصہ ہوتا میرا اور نہ آخرت کی بے بہا نعمتوں میں کسی حصے کا کوئی امکان۔ اور آخرت کی نعمتیں بھی اگر ملیں تو اس کا فضل ہی ہوگا کہ وہ مجھے میرے گناہوں پر بخشے گا تو ہی کچھ ملے گا۔ اعمال کا حساب ہوا تو صرف خسارہ ہی کا مجھے۔ اور یہاں جو برائیوں سے بچایا، دور کیا، راہ دکھائی، ہدایت سے نوازا، نیک اعمال جو بھی نصیب ہوئے، سب اس کا فضل۔

احسان ہی احسان۔ انہوں نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔ فضل ہی فضل۔

دیر تک وہ روتے رہے۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو انہوں نے سوچا، اس رات کے اختتام پر ان کے لئے ایک

نیا دن ہے..... اللہ کی رحمت سے ایک بڑا دن، دوپہر میں ولیمہ ہوگا، اور شام کو وہ چلے جائیں گے۔ پھر انہیں روانہ ہونا ہے..... اللہ کے گھر کی طرف۔ اور وہاں رہیں گے۔ اللہ کی چاکری کریں گے اور انشاء اللہ وہیں مریں گے اور اس پاک سرزمین پر ہی دفن ہوں گے۔

ان پر پھر تھرتھری چڑھ گئی۔ وہ کیسا دینے والا ہے۔ مجھ سیاہ کار کو بھی کچھ دے دیا..... میری سوچ، میرے خوابوں اور خیالوں اور تصور کی حدوں سے بھی بہت آگے تک۔ اور میں سونے کی فکر کر رہا ہوں۔

وہ اٹھے اور جاءنماز لانے کے لئے انیکسی کی طرف چل دیئے۔

یہ تو شکر کی رات ہے۔ اور اب تو ہر سانس شکر کی سانس ہونی چاہئے۔ وہ سوچ رہے تھے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق بہت گہری، بہت آسودہ نیند میں تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔ زمین آسمان، دنیا کی ہر چیز ہل رہی تھی، گھوم رہی تھی۔ وہ جیسے گر رہا تھا۔ گھبراہٹ نے اس گہری نیند میں نقب لگانی شروع کی۔

زلزلہ وقفے وقفے سے آ رہا تھا۔ یہ وقفے شاید اسے اٹھنے کی مہلت دینے کے لئے تھے۔ اسے احساس تھا کہ وہ سو رہا ہے۔

پھر نیند ٹوٹنے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے جھنجھوڑ رہا ہے۔ لیکن نیند ایسی تھی کہ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"کیا زلزلہ آ رہا ہے.....؟"

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ کیسا سوال ہے؟ اس نے سوچا۔

"نہیں آغا جی.....!" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر میں ہل کیوں رہا ہوں؟" وہ اب بھی نیند میں تھا۔

"اس لئے کہ میں آپ کو ہلا رہی ہوں۔"

"کیوں ہلا رہی ہو؟" عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"کیونکہ آپ کو جگانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں جگانا چاہتی ہو۔ ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ میں ابھی اٹھنا نہیں چاہتا۔"

"مگر آپ کا جاگنا ضروری ہے۔"

"چھوڑ دو مجھے۔ سو جاؤ! اور مجھے بھی سونے دو۔"

"ایک بار اٹھ جائیں، پھر چاہے سو جایئے گا۔"

"کیوں میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ سونے دو مجھے۔" عبدالحق نے غصے سے کہا۔

"یہ میرا فرض ہے آغا جی! آپ ایک بار اٹھ جائیں۔"

"کس نے عائد کیا ہے یہ فرض تم پر.....؟" عبدالحق کا لہجہ بہت خراب تھا۔

"اللہ نے.....!"

اور عبدالحق کو ایسا لگا، جیسے اس کے جسم پر کسی نے کوڑا رسید کیا ہو۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ لیکن نیند ایسی تھی کہ اس کی نظر دھندلا رہی تھی۔ اسے اپنے اوپر جھکی ارجمند نظر آئی۔

"کیا بات ہے ارجمند!" اس بار اس کا لہجہ نرم تھا۔

"فجر کا وقت ہے آغا جی! اور آپ کو غسل کرنا ہے۔"

عبدالحق پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس کی نیند ہوا ہوگئی۔ اس نے زیر لب کلمہ پڑھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے تو لگ رہا تھا کہ جیسے زلزلہ آ گیا ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے افسوس ہے آغا جی! لیکن آپ کی نیند اتنی گہری تھی کہ مجھے جھنجھوڑنا پڑا آپ کو۔" ارجمند کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

"کیسی نیند ہے، اٹھا ہی نہیں جا رہا ہے۔ آنکھ ہی نہیں کھل رہی ہے کسی طرح سے۔" عبدالحق نہایا۔

"اس کا علاج ہی غسل ہے۔" ارجمند نے کہا۔

"آپ باتھ روم چلے جایئے۔ بالٹی میں کنکنا پانی موجود ہے۔ اس سے نہایئے گا۔"

"لیکن کیوں؟ یہ موسم سرما تو نہیں ہے۔"

"صبح سویرے ایسے ہی پانی سے نہانا چاہئے۔ بس میں نے اتنا گرم پانی ملایا ہے کہ خنکی ختم ہو جائے ٹھنڈے پانی کی۔"

عبدالحق باتھ روم میں چلا گیا۔

نہاتے ہوئے تمام وقت وہ ارجمند کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کم عمر تھی لیکن کتنی مضبوط۔ اسے یاد تھا کہ نوربانو نے کبھی اسے فجر کے لئے نہیں جگایا۔ بلکہ کبھی تو اسے گمان ہوتا تھا کہ وہ چاہتی ہی نہیں کہ وہ فجر کے لئے اٹھے۔ رات کو وہ کوشش کرتی تھی کہ اسے جگائے رکھے...... زیادہ سے زیادہ۔ اسے یاد تھا کہ نوربانو سے شادی کے بعد اس کی فجر مستقل قضا ہونے لگی تھی۔ وہ تو پھر ملازمت کا آغاز ہوا تو اس کا معمول بحال ہوا۔

عبدالحق نے سر جھٹکا۔ میں خواہ مخواہ بدگمانی کر رہا ہوں۔ اس نے سوچا۔ اپنی کوتاہی اور غفلت کا دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانا کتنی بری بات ہے۔

مسجد میں نواب صاحب پہلے ہی سے موجود تھے۔ واپسی میں دونوں ساتھ ہی گھر واپس آئے۔

"رات کیسی گزری نواب صاحب!"

"الحمد للہ......! اللہ کے فضل و کرم کے سائے میں...... بہت اچھی۔"

اچھوں میاں نے سادگی سے کہا۔

"آج آپ کی روانگی ہے......؟"

"الحمد للہ......!"

اچھو میاں ٹیکسی کی طرف جانے لگے تو عبدالحق نے انہیں ٹوک دیا۔

"میرے ساتھ گھر ہی چلئے نا! ٹیکسی تو بس ارجمند کا گھر تھا۔ جہاں سے وداع ہونا تھا۔ ورنہ تو یہ گھر آپ کا ہی ہے۔"

"جانتا ہوں۔" اچھو میاں مسکرائے۔

"لیکن کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے ٹیکسی ہی مناسب رہے گی۔"

"بہتر ہے۔ جو آپ کی خوشی!"

اچھو میاں کو اس کے لہجے میں کچھ آزردگی سی محسوس ہوئی۔

"کوئی تکلف نہیں ہے بیٹے! البتہ گھر میں میں تکلف ضرور کروں گا، اور وہ آرام نہیں مل سکے گا، جس کی......"

عبدالحق شرمندہ ہوگیا۔

"آپ کی بے آرامی میں نہیں چاہتا۔ لیکن آج آپ رخصت ہو جائیں گے۔ ارجمند آپ کی کمی محسوس کرے گی۔ میں چاہتا تھا کہ آپ ناشتہ ہمارے ساتھ کرتے۔"

اچھو میاں خوش دلی سے ہنس دیئے۔

"تو یوں کہو نا بیٹے! نعمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ ناشتہ تو کرنا ہی ہے۔"

ناشتے کی میز پر گھر کے تمام افراد موجود تھے، سوائے نوربانو کے۔ باقی سب لوگ تو اس کے دیر سے اٹھنے کے عادی تھے۔ لیکن اچھو میاں کو اس کی غیر موجودگی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ تو پہلے ہی حیران ہو رہے تھے کہ ایک بیوی اپنے شوہر کی دوسری شادی کیسے کرا سکتی ہے۔ یہ تو بڑے ظرف کی بات ہے۔ لیکن ایک حد سے آگے تو ظرف بھی جواب دے جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا۔

عبدالحق کو نوربانو کی غیر موجودگی پر کھسیاہٹ ہو رہی تھی۔

"نوربانو کی طبیعت خراب رہتی ہے پچھلے کئی سال سے۔" اس نے اچھو میاں سے کہا۔

"رات کو نیند بڑی دشواری سے آتی ہے۔ پھر نیند پوری کرنا بھی ضروری ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اچھو میاں نے جواب دیا۔ دل میں وہ سوچ رہے تھے کہ شوہر کے ساتھ سونے والی بیوی کے لئے اس سے دور رہ کر سونا کتنا مشکل

ہوتا ہوگا۔ اور خاص طور پر اس صورت میں کہ اسے معلوم ہو کہ اس کا شوہر اپنی دوسری بیوی کے ساتھ ہے۔ چاہے وہ شادی خود اس نے کرائی ہو۔

انسانی ظرف کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے۔

ان کے دل میں نور بانو کی عزت اور بڑھ گئی۔

اور اس گھر کے سبھی لوگ اچھے تھے۔ ہر اعتبار سے یہ ایک مکمل اور مثالی گھرانا تھا۔ ان کی باہمی محبت کو کسی اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو خوشبو کی طرح خود ہی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی۔ ایک شفیق، مہربان اور نرم خو ماں، دو بیٹے، دو بہوئیں اور ایک پوتا۔ اور وہاں ارجمند ایک نئی نویلی دلہن کی طرح نہیں تھی۔ وہ گھر کا ایک فرد تھی، جس کی موجودگی کے وہ سب عادی تھے۔ سب کے انداز میں اس کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن اچھو میاں کو ساجد کی محبت پسند آئی۔ کیسی محبت سے وہ ارجمند کو دیکھتا تھا، اور کیسے اسے چھوٹی چاچی کہہ کر پکارتا تھا۔ بے شک ارجمند اس کے لئے پہلے سے جانی پہچانی تھی۔ لیکن اس نئے رشتے کی پکار میں کوئی نامانوسیت نہیں تھی۔ جیسے وہ پہلے ہی اسے اس طرح چھوٹی چاچی کہہ کر پکارتا رہا ہو۔

اچھو میاں کو نہیں معلوم تھا کہ یہ حقیقت ہے۔

انہوں نے تو یہ دیکھا کہ اس گھر میں ارجمند کو کیسے چاہا جاتا ہے۔ انشاء اللہ یہ ہمیشہ یہاں خوش رہے گی۔

اور ان کا دل سکون سے بھر گیا۔

❁ ❁ ❁

اچھو میاں انیکسی چلے گئے۔ حمیدہ نے عبدالحق اور ارجمند سے کہا۔

''جاؤ! تم دونوں بھی گھنٹے دو گھنٹے آرام کر لو۔ صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔''

''لیکن دادی اماں! گاؤں کے مہمان اور تایا......''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''نسیمہ ہے نا! اور میں بھی ہوں۔ ہم انہیں ناشتہ کرا دیں گے۔ ویسے بھی نئی نویلی دلہنیں اپنی پہلی صبح اٹھ کر ناشتہ نہیں بناتیں۔ وہ تو تجھے دیکھ کر حیران

ہوتے۔'' اس کے لہجے میں محبت تھی۔

''جا پتر عبدالحق! اسے لے جا۔'' وہ عبدالحق کی طرف مڑی۔

عبدالحق خود بھی تنہائی چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سی باتیں وضاحت طلب تھیں۔

''ٹھیک ہے اماں!'' اس نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے نرمی سے ارجمند کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

''چلو ارجمند......!''

حمیدہ ان دونوں کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کیسی چاند سورج کی جوڑی ہے۔ اللہ تیرا شکر ہے۔ وہ خوشی سے گنگنائی۔

❁ ❁ ❁

بند کمرے کی تنہائی میں عبدالحق نے ارجمند سے کہا۔

''تمہیں میرے آرام اور بے آرامی کی کوئی پرواہ نہیں۔'' اس کے لہجے میں بے رخی تھی۔

ارجمند کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''وہ آغا جی، میں تو مہمانوں کے خیال سے......''

''میں اس وقت کی بات نہیں کر رہا ہوں۔'' عبدالحق نے کہا۔

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''تو پھر......؟''

''جس طرح صبح تم نے مجھے جگایا۔ میں اس کی بات کر رہا ہوں۔''

''آپ اس پر خفا ہیں آغا جی......!''

عبدالحق نے دانستہ کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک خاص مقصد کے تحت ایک خاص تاثر چھوڑتے ہوئے بات کرنا چاہتا تھا...... ناراضی کا تاثر!

''وہ تو میری ذمہ داری تھی آغا جی!'' ارجمند نے مہین سی آواز میں کہا۔

''تو مجھے بے آرام کرنا، میری نیند خراب کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔''

عبدالحق نے ترش لہجے میں کہا۔

"آپ کی بہتری کی خاطر آغا جی!" اب ارجمند کے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

"کیسی بہتری؟ کس بہتری کی بات کر رہی ہو تم......؟"

"فرض نماز کی بہتری آغا جی! فرض نماز چھوٹ جاتی تو آپ کا خسارہ تھا۔"

"اس کی جواب دہی تمہاری تو نہیں، میری ہے۔"

"جی......! بے شک، لیکن ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ دوسرے مسلمان کو نماز کے وقت پر یاد دلائے۔"

"بس یاد دلانا ہی تو ذمہ داری ہے۔ اصرار تو نہیں۔ اصرار سے اکراہ بھی پیدا ہو سکتا ہے، جو بڑا خسارہ ہے۔"

ارجمند ایک دم بچوں کی طرح رونے لگی۔

"میں نے تو آپ کو محبت کی وجہ سے ایسا کیا آغا جی......!" یہ کہتے ہوئے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ رونا بھول کر ایک لمحے کو وہ لجا کر رہ گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اب اللہ نے اظہارِ محبت کا حق اسے دے دیا ہے۔ اس بار وہ بولی تو اس کے لہجے میں خود اعتمادی تھی۔

"اسی لئے خاموشی سے آپ کا خسارہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"اتنی محبت کا دعویٰ ہے اور پھر بھی تم نے میری نیند خراب کی......؟"

"میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا آغا جی! کہ محبت بہت مشکل ہوتی ہے۔"

ارجمند نے گہری سانس لے کر کہا۔

"صرف محبوب کو خوش دیکھنا اور اسے خوش رکھنا، اس کی ہر بات ماننا، اسے سب کچھ دینا...... یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ کوئی بھی کر سکتا ہے۔ محبت تو محبوب کی بہتری دور...... بہت دور تک دیکھنا اور اس کا خیال رکھنا ہے۔ بعد کے بڑے آرام کے لئے اسے لمحہ موجود میں تکلیف دینا اصل محبت ہے، جو آسان نہیں۔ جب میں آپ کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی، اور آپ سوتے ہوئے اتنے اچھے لگ رہے تھے کہ کئی بار میرا جی چاہا کہ آپ کو سونے دوں۔ میرا دل بھی دکھ رہا تھا آپ کو

جگاتے ہوئے۔ لیکن میں نے وہ تکلیف گوارہ کر لی۔ آپ کی فجر کی نماز کا معاملہ تھا۔"

عبدالحق اچانک مسکرا دیا۔ ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے مان لیا کہ تم واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔" عبدالحق نے کہا۔

"اب میں خود تم سے کہہ رہا ہوں کہ نماز کے لئے تم جس طرح چاہو، مجھے جگا سکتی ہو۔"

"شکریہ آغا جی! جزاک اللہ......!" دیر کے بعد ارجمند کے چہرے پر پریشانی کی جگہ خوشی نظر آئی۔

"ایک بات بتاؤ! تمہارے لئے میری محبت دنیا کی ہر چیز سے اہم ہے؟"

"اللہ کے حکم اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے بعد۔"

"مجھے تمہارا یہ جواب بھی اچھا لگا۔ تم بہت اچھی ہو ارجمند......! درحقیقت میں تمہارا اہل نہیں تھا۔"

"جی نہیں......! اللہ نے مجھے آپ کے لئے...... صرف آپ کے لئے اتنا اچھا بنایا ہے۔ مگر مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ میں واقعی اتنی اچھی ہوں۔"

عبدالحق کسی گہری سوچ میں تھا۔ بالآخر اس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم بچوں کی تربیت بہت اچھی کرو گی۔"

ارجمند شرم سے گلنار ہو گئی۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!"

"تم کم عمر ضرور ہو ارجمند! لیکن ناسمجھ نہیں۔" عبدالحق نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

"تم زندگی کے بارے میں سوچتی بھی ہو، اور بہت کچھ جانتی بھی ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ اب میرا اور تمہارا تعلق اور رشتہ کس نوعیت کا ہے۔ یہ ازدواجی زندگی کا بہت اہم معاملہ ہے۔"

ارجمند نے نظریں اٹھا اسے دیکھا۔ اب وہ اپنی عمر سے بڑی لگ رہی

تھی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں آغا جی.....!" اس نے بڑی متانت سے کہا۔

"یہ تو مجھے یقین تھا کہ آپ مجھے ضرور ملیں گے۔ لیکن میں اس پر کبھی سوچتی نہیں تھی۔ لیکن میں جانتی تھی کہ آپ کے لئے اولاد کتنی اہم ہے۔ میں آپ کے اور آپی کے لئے اس سلسلے میں بہت دعا کرتی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ ایسا ہوگا۔ اور میں سوچتی تھی کہ جب ایسا ہوگا تو میں آپ کے بچے کو بہت وقت دوں گی۔ اسے بہت اچھی اچھی باتیں سکھاؤں گی۔ سچ یہ ہے کہ میں اس کی تربیت کے بارے میں سوچتی تھی۔"

"ایسا ہوتا تو تم اسے کیا سکھاتیں؟" عبدالحق نے تجسس سے پوچھا۔

ارجمند نے ایک لمحہ سوچا، جیسے کچھ یاد کر رہی ہو، پھر وہ حیران نظر آنے لگی۔

"کمال ہے! میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ میں اسے صرف محبت کرنا سکھاؤں گی۔ صرف محبت ہی تو شخصیت بناتی ہے۔"

عبدالحق کو بھی حیرت ہوئی۔

"یہ خیال تمہیں کیسے آیا.....؟"

"آپ کو دیکھ کر!" ارجمند نے کہا اور پھر شرما گئی۔

"مجھے دیکھ کر.....؟" عبدالحق کی حیرت اور بڑھ گئی۔

"جی ہاں! میں چھوٹی سی تھی، جب آپ کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی مجھے احساس ہوا کہ آپ سراپا محبت ہیں۔ آپ کے وجود میں صرف اور صرف محبت ہے۔ بعد میں جب آپ کو دیکھا تو پوری طرح سمجھ گئی کہ محبت آپ کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے، اساس ہے آپ کی شخصیت کی۔ اور آپ کی شخصیت بہت خوب صورت ہے۔ میں سوچتی تھی، آپ کے بچے کو آپ جیسا بناؤں گی۔"

عبدالحق ہمیشہ کی طرح اپنی تعریف سن کر شرمندہ ہوگیا۔ لیکن وہ متجسس بھی تھا۔

"صرف محبت..... یہ تو بچکانہ بات ہے۔"

"نہیں آغا جی.....! میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتی کہ آپ محبت کو نہیں جانتے۔ شاید یوں ہے کہ آپ سراپا محبت ہیں، لیکن محبت پر غور نہیں کرتے۔"

"چلو! تو تم مجھے محبت کے بارے میں سمجھاؤ۔" عبدالحق نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

"آپ کو یہ چھوٹا منہ بڑی بات لگی ہے نا آغا جی!" ارجمند نے افسردگی سے کہا۔

عبدالحق کو زیادتی کا احساس ہونے لگا۔

"ارے نہیں.....! یہ بات نہیں....."

ارجمند نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"اور یہ سچ بھی ہے۔ دیکھیں نا، آپ کو اللہ نے محبت سے بنایا ہے۔ آپ سراپا محبت ہیں تو آپ کو محبت کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے سوچنا پڑتا ہے۔ سمجھتی میں آپ کو دیکھ کر ہوں۔ آپ محبت کو چھوٹی چیز سمجھتے ہیں۔ لیکن جتنے رنگ محبت میں ہیں، دنیا کے کسی جذبے میں نہیں۔ اور سارے کے سارے اوصافِ حسنہ کے، اور خوب صورت ترین رنگ ہیں۔ سوچیں تو ہر اچھا اور علوی جذبہ محبت کی شاخ پر پھوٹتا ہے۔ نرمی، تحمل، ایثار، سخاوت، اچھا گمان، درگزر، سچائی، احسان شناسی، عزت اور احترام، ہمدردی، لفظوں کی تہذیب، دعا اور نہ جانے کیا کیا۔ یہ سب محبت سے پھوٹنے والے رنگ ہیں۔ محبت جیسے دھنک ہے..... اچھے اوصاف کے تمام رنگوں کا منبع....."

عبدالحق بہت غور سے سن رہا تھا۔

"یہ لفظوں کی تہذیب کا کیا مطلب ہے؟"

"اپنی مشکل ترین بات کو سخت، مکروہ اور جارح الفاظ سے پاک کر کے، اچھے لفظوں اور دل نشیں پیرائے میں بیان کرنا۔"

عبدالحق نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ کیا یہ خواب ہے؟ یہ اتنی کم عمر لڑکی..... اور اتنی بڑی باتیں۔

"جیسے آپ کرتے ہیں۔" ارجمند نے اپنی بات مکمل کی۔

عبدالحق پھر شرمندہ ہوگیا۔

''میں کہاں، ابھی تمہارا مضحکہ اڑا رہا تھا۔ اور اس سے تمہارا دل بھی دکھایا۔''

''نہیں آغا جی! آپ نے میرا مضحکہ نہیں اڑایا۔ آپ عملی آدمی ہیں نا! اللہ نے آپ کو عمل سے نوازا ہے۔ آپ پر اللہ کا فضل ہے کہ آپ کو کبھی سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ آپ کا ردِعمل مضحکہ اڑانا نہیں تھا۔ وہ حیرت تھی اور تجسس تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔ یہ اچھا گمان ہے، جسے حسن ظن کہتے ہیں۔'' عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہرحال محبت کی بڑائی میری سمجھ میں آ گئی۔ لیکن آدمی نفرت بھی تو کرتا ہے۔''

''دنیا میں ہر جذبے کی ایک ضد بھی ہوتی ہے آغا جی! جیسے محبت کی ضد نفرت، احسان شناسی کی ضد احسان فراموشی۔ لیکن آدمی محبت کو توانا کر لے تو ان سے محفوظ رہتا ہے۔ میں نے یہ سبق سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص سے محبت کرتے تھے، خواہ وہ زمین کے کسی دور دراز کے خطے میں رہتا ہو، خواہ وہ ان پر ایمان نہ لایا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کے لئے دعا کرتے تھے، ان کے لئے بھی جو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا سے، اللہ کی آپ کے توسط سے عطا کی ہوئی روشنی پاتے رہیں گے۔''

''تو تم میرے بچے کو صرف محبت کرنا سکھاؤ گی۔ مگر کس سے......؟''

''سب سے بڑھ کر اللہ سے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، پھر قرآن حکیم سے اور اس کے بعد آپ سے۔''

''اور باقی دنیا......؟''

''جب وہ محبت کرنا سیکھ لے گا تو پھر سب سے محبت کرے گا۔''

عبدالحق مسحور ہوگیا۔ یہ تو اس کا خواب تھا۔

''مجھے یقین ہوگیا کہ تم میرے بچے کی بہت اچھی تربیت کرو گی۔'' اس نے کہا۔

''تم اسے محبت کرنا سکھانا، مگر اپنے بچے کو نفرت کرنا بھی سکھانا۔''

ارجمند اتنی حیران ہوئی کہ شرما بھی نہیں سکی۔

''نفرت......! وہ کیوں آغا جی......!''

''اس لئے کہ تمام جذبے انسان کے لئے فطری ہیں۔ تم نہیں سکھاؤ گی، تب بھی وہ کرے گا تو۔ اور خود کرے گا تو بے سمت ہوگا۔''

''مگر نفرت تو بری چیز ہے آغا جی......!''

''اب میں تمہیں وہ بتاتا ہوں، جو سمجھتا ہوں۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''محبت کا آغاز پسندیدگی سے ہوتا ہے اور نفرت کا ناپسندیدگی سے۔ کچھ ہمیں پسند ہوتا ہے اور کچھ ناپسند۔ پسندیدگی بڑھتی ہے تو محبت بنتی ہے اور ناپسندیدگی بڑھتی ہے تو نفرت۔''

''واقعی......! یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''کوئی فطری جذبہ، علوی ہو یا سفلی، ہر حال میں اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ البتہ اس کی سمت کی ہوتی ہے۔''

''وضاحت کیجئے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں۔'' ارجمند نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

''سمت سے کیا مراد ہے آپ کی۔''

''نماز پڑھنا نیک عمل ہے نا!''

ارجمند نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر تم قبلے کی طرف پیٹھ کر کے نماز پڑھو تو وہ نیکی ہوگی۔''

ارجمند جھرجھری لے کر رہ گئی۔

''استغفراللہ!'' اس نے گھٹی گھٹی سرگوشی میں کہا۔

''ڈر گئیں نا! یہ ہے سمت، آدمی اللہ کی طرف رخ، رکھے تو مثبت جذبہ

ارفع ہو جائے گا۔ نہیں تو وہ خراب بھی ہو سکتا ہے۔ گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ نے کچھ جانوروں کا گوشت ہمارے لئے حلال کر دیا۔ لیکن ذبیحے کے بغیر وہ بھی حرام ہے۔ اور ذبیحہ کیا ہے؟ اس پر اللہ کا نام لینا۔ کچھ سمجھیں؟"

"جی..... کچھ کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔" ارجمند کے لہجے میں احترام تھا۔ اور وہ عبدالحق کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"اب محبت ہی کو لو۔ تم نے ابھی کچھ دیر پہلے اس کی عظمت بیان کی۔ بالکل درست ہے۔ کسی نے اللہ کے لئے، اس کی خاطر کسی سے محبت کی تو یہ عبادت ہے۔ اور اپنے نفس کے لئے کی، لیکن اللہ کے حکم کے مطابق کی تو وہ اچھی ہے۔ لیکن اپنے نفس کے لئے کی اور اللہ کے حکم کے خلاف کی تو وہ برائی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ آدمی اپنے ہر عمل میں، ہر لمحہ اللہ کو شریک رکھے تو سب ٹھیک ہے۔"

"یہ ممکن ہے کہ سفلی جذبہ بھی اچھا بن جائے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ بس ہر چیز میں اللہ کی شمولیت ہو، اس کی محبت اور اس کی رضا ہو۔"

"اس کی کوئی مثال.....؟"

"احسان شناسی بہت اچھی بات ہے۔ اللہ کا حکم بھی ہے۔ اب کسی نے مجھ پر احسان کیا۔ بعد میں کسی موقع پر اس نے اللہ کو، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یا اس کے کلام کو برا کہا تو میں اسے اس پر منع کروں گا، کرتا رہوں گا۔ وہ نہ مانے گا تو اس کا احسان بھول کر اپنی بساط اور حیثیت کے مطابق اس سے لڑوں گا۔ یہ احسان فراموشی ہوگی، لیکن اللہ کے ہاں نیکی ہوگی۔ اس لئے کہ درحقیقت اس کا احسان اللہ کی طرف سے تھا۔ دشمنی اچھی چیز نہیں۔ لیکن میں اللہ کی خاطر کسی سے دشمنی کروں تو نیکی ہے۔"

"میں سمجھ گئی!" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔

"نفرت شیطان سے اور اس کے چیلوں سے اور اس کے اعمال سے، اللہ کے لئے، اللہ کی خاطر۔"

"بالکل درست.....!"

"الحمدللہ! اللہ نے آپ کو کتنی اچھا، کتنا سمجھ دار بنایا ہے۔"

"یہ سب اللہ کا فضل ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"تو نفرت بھی بری چیز نہیں۔" ارجمند نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"لیکن ارجمند! نفرت کا ہدف انسان کو نہیں ہونا چاہئے۔"

"کیا مطلب.....!"

"نفرت صرف شیطان سے اور اس کے اعمال سے۔"

"تو جو انسان شیطان کی پیروی کرے....."

"نفرت برے آدمی سے نہیں کرنی، برائی سے کرنی ہے۔ یہی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھایا ہے۔"

"تو پھر شیطان سے نفرت کیوں آغا جی.....!"

"اس لئے کہ اس کے بارے میں اللہ فیصلہ کر چکا، اعلان کر چکا۔ باقی سب کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ کون بخشا جائے گا؟ اور کون نہیں بخشا جائے گا؟"

"کیوں آغا جی.....!"

"اللہ جب چاہے، جسے چاہے، ہدایت دے دے۔ جب چاہے، کسی کی اصلاح کر دے۔ اور اسے بھلائی کی توفیق دے دے۔ ہم اس کے بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ ہمیں تو ان کے لئے خیر کی دعا کرنی چاہئے۔ یہی سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔" ارجمند نے خوش ہو کر کہا۔ اب وہ عبدالحق کو تفاخرانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

عبدالحق نے کھسیا کر نظریں چرائیں۔

چند لمحے دونوں خاموش رہے۔ پھر عبدالحق نے کہا۔

"تمہیں نیند تو نہیں آ رہی ہے ارجمند!"

"جی نہیں آغا جی.....!"

"چاہو تو کچھ دیر سو سکتی ہو۔"

"میری نیند تو پوری ہو چکی۔"

"تو پھر ایک کام کرو۔ تم جا کر اپنی آپی کو جگا دو۔ ورنہ وہ سوتی ہی رہیں گی۔ انہیں یاد دلاؤ آج گھر میں تقریب ہے۔"

"جی بہت بہتر.....!" ارجمند اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔

عبدالحق نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر لی۔

"کیا بات ہے؟ ڈر لگ رہا ہے ان سے؟"

"جی نہیں.....!"

"تو پھر کیا بات ہے.....؟"

"آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اب اس کے لہجے میں بھی جھجک تھی۔

"کہو! کیا بات ہے.....؟"

"میری ایک بات مانیں گے.....؟"

"اب اس کا انحصار تو بات پر ہے۔" عبدالحق نے کہا۔ پھر جلدی سے اضافہ کیا۔

"لیکن تمہیں اس طرح جھجکنے کی ضرورت نہیں۔ اب تمہارا مجھ پر حق ہے۔ تم مجھ سے کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ کوئی بات بھی کر سکتی ہو۔"

ارجمند نے ایک پل کو نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ منہ سے اب بھی کچھ نہیں کہا۔

"کہو نا.....! کیا بات ہے.....؟"

"آپ آپی سے یہ بات کبھی نہ کہئے گا۔"

"کون سی بات.....؟"

"یہ کہ..... یہ کہ میں آپ سے....." اس سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

"ارے..... کہو بھی.....!" عبدالحق جھنجلا گیا۔

"یہ کہ میں آپ سے بہت پہلے سے محبت کرتی ہوں۔ بلکہ آپ انہیں یہ بھی نہیں بتائیے گا کہ اب....."

عبدالحق کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ تو میں کبھی بتا ہی نہیں سکتا۔ ایک تو اس لئے کہ یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کیا جا سکتا۔ شوہر اور بیوی کے درمیان جو معاملات ہوتے ہیں، وہ بہت ذاتی ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہوگا۔ میں نور بانو کو جانتا ہوں۔ میرا تو کچھ نہیں جائے گا، لیکن وہ تمہاری زندگی اجیرن کر دے گی۔ تم بے فکر رہو۔"

لیکن ارجمند سہم گئی تھی۔

"تو میں آپی پر یہ ظاہر کروں کہ مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے؟"

"یہ تو غیر فطری بات ہوگی۔ اب اتنا ڈرنے کی ضرورت بھی نہیں۔" عبدالحق نے اسے تسلی دی۔

"کبھی وہ کوئی ایسی ویسی بات کرے تو اسے یاد دلا دینا کہ اس کی خوشامد کے نتیجے میں، اور صرف اس کی خاطر تم نے یہ شادی کی تھی۔"

"یہ..... یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں ان سے.....؟"

"کیوں نہیں کہہ سکتیں.....؟"

"اس لئے کہ یہ جھوٹ ہوگا۔"

"تو پھر سچ بتا دینا۔ کہہ دینا کہ اس گھر میں آنے سے پہلے ہی تم مجھ سے محبت کرتی تھیں۔" عبدالحق نے جھنجلا کر کہا۔

ارجمند کا چہرہ فق ہو گیا۔

"سچ ہے، تم ابھی بچی ہی ہو۔" عبدالحق نے لہجہ نرم کر لیا۔

"نادان لڑکی! اتنا بھی نہیں سمجھتیں کہ جو سچ بولنے میں ٹنٹے کا ڈر ہو، اس کا اظہار اچھا نہیں ہوتا۔ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا ہے۔"

"جی.....! میں سمجھ گئی۔" اس بار ارجمند کے لہجے میں شکرگزاری تھی۔

"بس! اب تم جاؤ اور نور بانو کو جگا دو۔"

ارجمند چلی گئی۔

عبدالحق بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ ارجمند کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شفیق صاحب کی کہی ہوئی ہر بات سچ ثابت ہوئی تھی۔ ارجمند نور بانو کا بالکل الٹ تھی۔ وہ

سیدھی سادی لڑکی تھی۔ چالاکی اور مکاری اس میں نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ اندر سے سچی تھی۔ نوربانو کی طرح ہر حال میں اپنا مقصد حاصل کرنا اسے نہیں آتا تھا۔ وہ بس اللہ پر بھروسہ کرتی تھی۔

پہلی بار عبدالحق کو احساس ہو رہا تھا کہ محبت کیا چیز ہے۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ارجمند کی محبت دیکھنے سے پہلے وہ محبت سے واقف ہی نہیں تھا۔ محبت اس کے نزدیک محض ایک خیال تھا، ایک تصور، لیکن ارجمند نے محبت کا عملی رخ اس پر واضح کر دیا تھا۔ اب وہ کہہ سکتا تھا کہ اس نے محبت دیکھی ہے۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خود اس نے بھی محبت کبھی نہیں کی۔

اسے شفیق صاحب کی ایک اور پیش گوئی یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ دوسری بیوی سے اس کے دو بیٹے ہوں گے۔

صحیح معنوں میں ابھی بار اس شادی کی معنویت اور اہمیت اس پر روشن ہوئی۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو اسے یہ خواب ہی لگتا تھا۔

مگر اس وقت اولاد کے امکان کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے وجود میں روشنی سی ہوگئی۔ اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا جو اس کے لئے بہت انوکھی اور نئی تھی۔ اگرچہ اب بھی وہ اسے دور راز کار لگ رہی تھی۔ اس کے باوجود اس خوشی کا اپنا ایک منفرد رنگ تھا۔

اس نے رات شکر کے دو نفل پڑھے تھے۔ مگر اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ کتنی کم تھے۔ کیونکہ اس وقت تو اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے کتنی اور کیسی کیسی نعمتیں ملی ہیں، اور وہ بھی کوشش کئے بغیر ... بلکہ مانگے بغیر۔

اس کے دو بیٹے ہوں گے، یہ خیال ہی اس کے لئے بے حد خوش کن تھا۔ اس کی، اس کے باپ کی نسل آگے بڑھے گی۔ یہ اللہ کے فضل و کرم سے ایمان کے ساتھ ان کی تیسری نسل ہوگی۔ اور اسے یقین ہوگیا تھا کہ ارجمند اس کے بچوں کی اچھی طرح تربیت کرے گی، انہیں بہت اچھا مسلمان بنائے گی۔ شفیق صاحب نے سچ کہا تھا، ارجمند دینے والی ہے۔ وہ محبت کرتی ہے، صلہ نہیں چاہتی۔ وہ تو اللہ کا

بہت بڑا انعام ہے۔

عبدالحق نے سوچا کہ اب وہ پورے شعور اور احساس کے ساتھ شکر کے نفل ادا کرے گا۔

❁ ❁ ❁

''کون ہے بھئی! کیا مصیبت ہے؟'' نوربانو نے چڑچڑے پن سے کہا۔ وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اور اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ نیند پوری کر کے ہی اٹھتی تھی، ورنہ اس پر چڑچڑا پن طاری رہتا تھا۔

''میں ہوں اچھی آپی ..... آپ کی ارجمند ...!''

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

''تم اور اتنے سویرے ...؟''

''سویرا کہاں کا آپی! دس بجنے والے ہیں۔''

''تو نیند کہاں پوری ہوئی ہوگی تمہاری۔''

''میں تو اپنے وقت پر ہی اٹھ گئی تھی آپی!''

''یعنی فجر سے بھی پہلے؟''

''جی آپی ...!''

نوربانو کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔

''اس کا مطلب ہے، کچھ بھی نہیں ہوا'' اس نے وحشت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا نہیں ہوا آپی ...!'' اس کی بات ارجمند کی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔

نوربانو جھنجلا گئی۔ ایک تو نیند پوری نہیں ہوئی تھی، اور اسے رات کے معاملات یاد آ گئے۔

''ارے وہی ..... جس کے لئے میں نے عبدالحق صاحب سے شادی کرائی ہے تمہاری۔''

ارجمند کا چہرہ ہلال بھبھوکا ہوگیا۔ اس نے دونوں ہاتھ سے چہرہ چھپا لیا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپی؟''

اچانک نور بانو کو کرنٹ سا لگا۔ اسے یاد آیا کہ وہ حمیدہ کے کمرے میں سوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ حمیدہ نظر نہیں آئی تو اس نے سکون کی سانس لی۔

''ارجی! مجھے بتاؤ کہ رات کیا کچھ ہوا...... ؟ سب ٹھیک ہے نا......؟''

''ہاں آپی! سب ٹھیک ہے۔''

''عبدالحق صاحب تمہارے پاس آئے تھے نا......؟''

''جی آپی...... ! وہ وہیں سوئے تھے۔''

نور باد دانت پیسنے لگی۔

''تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہی ہو؟ تمہیں یاد ہے، میں نے تم سے کچھ مانگا تھا؟''

ارجمند کا چہرہ پھر تمتما اٹھا۔

''مجھے یاد ہے آپی! لیکن وہ تو اللہ کی مرضی پر ہے۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے......''

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم یہ بتاؤ کہ رات کیا کیا ہوا؟''

ارجمند نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''آپی! ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔ یہ بے حیائی ہوتی ہے۔ اور اللہ کو بے حیائی بہت ناپسند ہے۔''

''بے حیائی کی اس میں کیا بات ہے......؟'' نور بانو تنک کر بولی۔

''اللہ کے حکم کے مطابق نکاح ہوا ہے تمہارا۔ جو کچھ بھی ہو، وہ جائز اور حلال ہوگا۔''

ارجمند کو پہلی بار صحیح معنوں میں نور بانو کے دل کی سختی کا اندازہ ہوا۔ اس کے لفظوں میں درشتی بھی تھی اور پھوہڑ پن بھی، ایک ایسی بے پرواہی جو جہالت کی نشان دہی کر رہی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے دوسروں کے سامنے بیان کرنا صریحاً بے حیائی ہے آپی!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''ایسی باتیں نہ کرتے ہیں نہ پوچھتے ہیں۔''

''اتنے برسوں میں تم تو ملانی بن گئی ہو میری ارجی!'' نور بانو نے بڑے ... سے کہا۔

''ذرا اس کی وجہ بھی بتا دو۔''

''ایسی باتوں سے دل میں برے خیال، ذہن میں بری سوچیں پیدا ہوتی ہیں۔ تصور بے لگام ہوتا ہے۔ دل، دماغ، اور نظر سب کچھ خراب ہو جاتا ہے۔ ...خیالات آدمی پر چڑھائی کر دیتی ہیں، جن کے سامنے وہ ٹھہر نہیں سکتا۔ اللہ اسے بچا لے تو اور بات ہے۔ آدمی میں حیا نہیں رہتی، اور حیا نہ ہو تو آدمی مومن کبھی نہیں بن پاتا۔''

نور بانو اندر ہی اندر جھنجلا رہی تھی۔ وہ کچھ جاننا چاہتی تھی۔ اس کی عجیب کیفیت تھی۔ یہ صورتِ حال اس کے لئے دو دھاری تلوار تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ جو کچھ اس نے چاہا تھا، وہ ہوا یا نہیں۔ جواب نفی میں ملتا تو اسے افسوس ہوتا، کیونکہ اس میں اس کی اسکیم کی ناکامی تھی۔ اور جواب اثبات میں ملتا تو اسے خوشی ملتی، امید بندھتی، لیکن اندر ایک کبھی نہ بجھنے والی آگ دہک اٹھتی۔ وہ سوچ رہی تھی، یہ کیسا ... کیا ہے میں نے؟ جس میں ہر طرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔

اس پر یہ ملانی لڑکی، جو کچھ بتا کر ہی نہیں دیتی۔

اس نے سوچا، جھنجلاہٹ کا کچھ فائدہ نہیں۔ نرمی سے بات کر کے ہی کچھ حاصل ہوگا۔ ویسے جس طرح سے ارجمند نے بے حیائی کی بات کی تھی، اس سے تو ثابت ہو رہا تھا کہ بات بن گئی ہے۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ عبدالحق صاحب نے رد تو نہیں کر دیا؟'' اس نے پیرایہ بدل کر پوچھا۔

''نہیں آپی......! لیکن وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ورنہ وہ شاید ... کے قریب بھی نہ آتے۔'' یہ کہتے ہوئے ارجمند نے نظریں جھکا لیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے، لیکن عبدالحق کا کہنا تھا کہ فتنہ نہیں کھڑا ہونا چاہئے۔

نور بانو خوش ہوگئی۔ دونوں اطلاعات مثبت تھیں۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"کیا کیا جتن کئے ہیں میں نے ان سے اپنی یہ بات منوانے کے لئے۔ خیر، یہ بتاؤ تمہیں وہ کیسے لگے.....؟"

"میرے نزدیک، میرے لئے تو وہ پہلے دن والے ہی آغا جی ہیں آپی ... اور ہمیشہ ویسے ہی رہیں گے۔" ارجمند نے اس بار پوری سچائی سے کہا۔

"وہ ایک بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ارے..... میں تم سے ان کی دوسری حیثیت کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" نوربانو نے شوخ لہجے میں کہا۔

"وہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، اور سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ یہ شادی تو صرف آپ کی وجہ سے ہوئی ہے آپی!" ارجمند نے اس بار بھی پورا سچ بولا۔

"ورنہ آغا کو تو مجھ میں کوئی دلچسپی تھی ہی نہیں۔ انہوں نے تو آپ کی محبت میں یہ بہت بڑی قربانی دی ہے۔" اس نے لہجے میں تاسف سمونے کی کوشش کی۔

نوربانو اور خوش ہوگئی۔ مگر یہ افسوس بھی ہونے لگا کہ اس نے اپنی غرض کی خاطر ایک نہیں، دو افراد کو استعمال کیا ہے۔

"تم بہت اداس لگ رہی ہو۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"لگتا ہے، عبدالحق صاحب نے تمہیں بہت مایوس کیا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں آپی!" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔ لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔

"میں نے تو جب آپ کی بات مانی تھی، تبھی یہ سمجھ لیا تھا کہ مجھے کوئی امید نہیں رکھنی۔ میرا کام تو صرف دینا ہے، اور الحمدللہ میں اس میں خوش رہتی ہوں۔"

ارجمند نے کچھ ایسے لہجے میں بات کہی کہ نوربانو کا دل کٹ کر رہ گیا۔

اس نے ارجمند کو لپٹا لیا۔

"یہ تمہارا مجھ پر احسان ہے۔ میں تو تمہیں کبھی اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اللہ سے دعا کرتی ہوں۔"

"احسان کی بات نہ کیجئے آپی! میرا سرمایہ تو آپ کی دعائیں ہیں۔"

"بس تم میری آرزو پوری کر دو۔"

"یہ میرے بس کی بات نہیں آپی! سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" ارجمند نے کہا۔ پھر اس کے لہجے میں الجھن در آئی۔

"لیکن آپی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ممکن ..."

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

"ٹھیک ہے آپی!"

"اب تم جاؤ، اور مجھے سونے دو۔" نوربانو نے کہا اور پھر لیٹ گئی۔

"آپ بھول رہی ہیں آپی کہ میں آپ کو اٹھانے کے لئے آئی تھی۔"

"لیکن کیوں ...؟ ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔"

"آج گھر میں تقریب ہے آپی ...! آپ کا ابھی اٹھنا بہت ضروری ہے۔"

"کیوں ...؟"

"آپ نظر نہ آئیں تو لوگ سمجھیں گے کہ اب آپ اپنے فیصلے پر پچھتا رہی ہیں۔ بلکہ کچھ تو یہ بھی سوچیں گے کہ یہ سب شاید آپ کی مرضی کے خلاف ہوا ہے، گویا یہ آپ پر ظلم ہے۔ پھر وہ لوگ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہ تو میرے ساتھ زیادتی ہوگی آپی! میں نے تو صرف آپ کے خاطر ....."

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" نوربانو نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم چلو ..... میں آتی ہوں۔"

❁ ❁ ❁

ولیمے کی تقریب بھی خیر و خوبی نمٹ گئی۔

اب مرحلہ اچھو میاں کے رخصت ہونے کا تھا۔ عبدالحق نے گاڑی نکالی۔

اس دوران حمیدہ نے انہیں ایک سفری بیگ لا کر دیا۔

"یہ کیا ہے ...؟" اچھو میاں نے حیرت سے کہا۔

"اس میں کچھ چیزیں ہیں آپ کے لئے۔ ہم سب کی طرف سے۔"

"مگر مجھے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"یہ ہماری ضرورت ہے۔ آپ اتنی اچھی جگہ جا رہے ہیں، ہم سب کو یاد رکھئے گا۔"

"میرے پاس یاد رکھنے کے لئے آپ سب کے سوا ہے ہی کون......؟"

"اور یہ آپ کا حق بھی ہے۔ آخر آپ ہمارے سمدھی ہیں۔"

اچھو میاں نے بیگ لے لیا۔

انہیں چھوڑنے کے لئے ارجمند بھی ساتھ گئی۔ عبدالحق نے اس بار بھی ان دونوں کو پچھلی نشست پر بٹھایا تھا۔

"آپ واپس کب آئیں گے نانا......!" ارجمند نے راستے میں ان سے پوچھا۔

"سچ کہوں بیٹا! تو میں واپس آنا ہی نہیں چاہتا۔ آگے جو اللہ کی مرضی......!"

"آپ کو مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں......؟" ارجمند کے لہجے میں شکایت تھی۔

"اتنی محبت ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ اللہ کے دربار میں بیٹھ کر تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور دعائیں کرتا رہوں گا تمہارے لئے۔"

عبدالحق نے گاڑی روک دی، اور پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

ارجمند اچھو میاں سے لپٹ گئی۔

"آپ مجھے بہت یاد آئیں گے نانا......!"

"میں بھی تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا میری بچی......!"

"میرا دل رونے کو چاہ رہا ہے نانا......!"

"تو رو لو میری بچی! آنسو تو بڑی نعمت ہوتے ہیں۔"

"میں روتی اور اتنا روتی کہ روتے روتے مر جاتی۔ لیکن میں نہیں روؤں گی نانا......!"

"کیوں بیٹا......!"

"ایک تو مجبوری ہے کہ وعدہ خلافی نہیں کر سکتی۔" یہ کہتے ہوئے ارجمند

نے عبدالحق کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

"دوسرے آپ اتنی اچھی جگہ جا رہے ہیں کہ رونا ناشکرا پن ہوگا۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو بیٹا!" اچھو میاں نے بڑی محبت سے کہا۔

"اچھا......! اب ہم چلتے ہیں۔ فی امان اللہ......! ہمارے لئے دعا کرتی رہنا۔"

"فی امان اللہ نانا جان......!"

عبدالحق نے دروازہ کھولا اور اچھو میاں بیگ لے کر نیچے اترے۔ بیگ نیچے رکھ کر انہوں نے عبدالحق کو لپٹا لیا۔

"میری ارجی کا خیال رکھنا بیٹے......! اور اپنا بھی۔" انہوں نے کہا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ بس ہمارے لئے دعا کرتے رہیں۔"

"فی امان اللہ......!"

"فی امان اللہ......!"

کار میں بیٹھی ارجمند اور باہر کھڑا عبدالحق انہیں جاتا دیکھتے رہے۔ دروازے پر پہنچ کر اچھو میاں پلٹے، انہوں نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر مڑ کر دروازے میں داخل ہو گئے۔

کار کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا تھا۔ ارجمند اتری۔

"اب میں آگے بیٹھوں گی۔"

"شکریہ ارجمند......!"

واپسی جاتے ہوئے عبدالحق نے اس سے پوچھا۔

"تو تم میرے وعدے کی وجہ سے نہیں روئیں؟"

"جی......! آپ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، تو میں وعدہ خلافی کیسے کر سکتی ہوں......" اس کی آواز بھرا گئی۔

عبدالحق نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"میں تمہیں اجازت دے رہا ہوں، تم رو سکتی ہو۔" اس نے محبت سے

''جی نہیں ...! میں وعدہ خلافی کرنا ہی نہیں چاہتی۔'' ارجمند نے کہا۔

''اس کا تعلق تو میری زندگی سے ہے۔''

عبدالحق کو اس پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ کیسی سچی اور مضبوط لڑکی ہے یہ۔ اس نے سوچا۔ اس پر ہر طرح سے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

❁ ❁ ❁

جس وقت ارجمند نے نور بانو سے پوچھا تھا کہ یہ کیسے ہوگا، تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا تھا، یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ لیکن وہ اس پر پورے دن سوچتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔ واقعی یہ کیسے ممکن ہے۔ اور اس نے بچوں کی سی اس سوچ کے تحت اپنے شوہر کو کسی اور کے سپرد کر دیا۔ یہ تو بڑی نادانی کی اس نے۔ کہتے ہیں، چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔ یہ تو چاند سے بھی بڑا معاملہ تھا۔ چاند کو تو کبھی کبھی گھٹا بھی چھپا لیتی ہے۔ لیکن حاملہ عورت کا پیٹ کہاں چھپتا ہے؟

اور یہاں تو اسے ایک نہیں، دو ان ہونیاں درپیش تھیں۔ یعنی اسے ارجمند کا پیٹ چھپانا تھا اور خود کو حاملہ دکھانا تھا۔ یہ کیسے ہوگا، یہ کیسے ہو سکتا ہے، پورے دن وہ یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوتی رہی۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عبدالحق اور ارجمند کی شادی کرانے سے پہلے اس اسکیم پر غور تو کیا ہوگا۔ اور وہ اسکیم قابل عمل بھی ہوگی۔ ورنہ وہ اتنا بڑا داؤ کیوں کھیلتی۔ داؤ بھی کیسا؟ مہابھارت میں راجا نل نے اپنی پتنی درو پدی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ یہاں اس نے اپنے محبوب شوہر کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اور یہ بہت بری بات تھی۔ کیونکہ راجا نل درو پدی سے اتنی محبت نہیں کرتا تھا، جتنی وہ عبدالحق سے کرتی تھی۔ دوسرے راجا نل ایک دنیادار تھا۔ مردوں کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے۔ مردوں کے نزدیک ایک دو نہیں، بہت سی چیزیں اہم ہوتی ہیں۔ بچے، دولت، اقتدار اور جانے کیا کیا۔ بے شک ان کے لئے عورت بھی اہم ہوتی ہے، مگر صرف وہ جو مجبور ہو ... اور مجبور بھی وہ، جسے وہ دور سے دیکھ کر آہیں بھرتے اور سپنے دیکھتے ہوں، چھو نہیں سکے ہوں۔ بیوی اہم چیزوں کی فہرست میں سب سے نیچے ہوتی ہے۔

اسی لئے تو راجا نل نے رانی درو پدی کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ اس کی باری مالی دولت کے سامنے بے حقیقت تھی۔

لیکن عورتوں کا معاملہ مختلف ہوتا ہے۔ ان کا مرد، ان کا شوہر ان کے لئے کائنات کی سب سے اہم چیز ہوتا ہے۔ اور اگر وہ ان کا محبوب بھی ہو، تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ عورت کے سامنے ساری دنیا کی دولت بھی رکھ دی جائے تو وہ اس کے بدلے میں اپنے شوہر کی پرچھائیں تک کسی دوسری عورت کو دینا گوارہ نہیں کرتی۔

میں نے یہ کیسے کر لیا؟ اس نے حیرت سے وحشت سے سوچا۔ کیا سمائی تھی میرے دماغ میں؟

اور راجا نل ہار گیا تھا ... راجا نل نہیں ہارا تھا، درو پدی نیلام ہو گئی تھی۔

تو کیا وہ بھی ہار جائے گی۔

یہ خیال ہی اس کے لئے روح فرسا تھا۔

یہ فیصلہ کرتے وقت اس نے کیا سوچا تھا؟ کچھ تو سوچا ہوگا۔ اتنا بڑا فیصلہ یوں ہی تو نہیں کر لیا ہوگا اس نے۔ اور اس نے سوچا کہ بچہ ارجمند کا ہوگا، لیکن اس کا ہو جائے گا۔ یہ بات قابل عمل کیسے ہو سکتی ہے؟ نطفہ بیج ہی کا کوئی بیج تو نہیں کہ ایک کیاری سے نکالا اور دوسری کیاری میں بو دیا۔ بلکہ ایسے میں تو بیج بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی۔ سب دیکھیں گے کہ وہ مشرقی افق سے طلوع ہوا ہے۔ اس کا دعویٰ کون سنے گا، کون مانے گا کہ یہ چاند درحقیقت مغربی افق سے طلوع ہوا ہے۔

اسے یاد ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اس سلسلے میں کوئی قابل عمل منصوبہ بنایا تھا۔

تو پھر اس نے یوں ہی اپنے شوہر کو داؤ پر لگا دیا۔

اس کا جواب البتہ اسے مل گیا۔

اس کے پاس کوئی اور چارۂ کار تھا ہی نہیں۔ وہ بہت لڑی تھی۔ قدرت

نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بالآخر اسے ہار جانا ہے۔ اس کے جیتنے کا تو کوئی امکان تھا ہی نہیں۔

قدرت نے تو اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ حمیدہ اسے کسی بابا کے پاس لے جانا چاہتی تھی...... اولاد کے سلسلے میں۔ اور اس نے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے کہ جو کچھ اسے معلوم تھا، وہ حمیدہ نہیں جانتی تھی۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ جو وہ جانتی ہے، وہ حمیدہ کو بھی معلوم ہو۔ اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ ماں کبھی نہیں بن سکتی کہ یہ اس کی مقبول دعا ہے۔

تو اس کے انکار پر برہم ہو کر حمیدہ نے اسے چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اس سے تعاون نہیں کرے گی تو وہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ اس نے چیلنج کیا تھا کہ عبدالحق اس کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔

وہ جانتی تھی کہ حمیدہ سچ کہہ رہی ہے۔ عبدالحق ایسا ہی تھا، اور پھر حمیدہ کا مطالبہ معقول بھی ہوتا۔

یعنی اسے ہار جانا تھا۔ شاید وہ بس چند روز ہی کی مہلت تھی۔

لیکن فوری طور پر اللہ کی طرف سے مدد آ گئی۔ سان نہ گمان، ایک دم سے عبدالحق کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ بات ٹل گئی اور وہ بچ گئی۔

لیکن اس یقینی شکست کا خدشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ حمیدہ وہاں رشتہ تیار رکھے گی۔ اور وہ چند روز کے لئے بھی لاہور جائیں گے تو حمیدہ عبدالحق کی دوسری شادی کرا دے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لاہور کے نام سے بھی ڈرنے لگی۔ لیکن ان کا لاہور نہ جانا نہ صرف غیر فطری تھا، بلکہ ناممکن بھی تھا۔

لیکن اس نے اس ناممکن کو ممکن بنائے رکھا ...... وہ بھی ایک دو نہیں، سات برس تک۔ کیسی کیسی مکاریاں کیں اس نے۔ بلکہ شاید اس کے نتیجے میں اس نے ایک خوف ناک بیماری پال لی۔ جس درد سے تڑپنے کی وہ اداکاری کرتی تھی، اس سے بھی خوف ناک درد اسے سچ مچ ہونے لگا۔ ایسا درد کہ اسے اپنی موت صاف اور سامنے نظر آنے لگی۔

تب وہ خود سے ہی ہار گئی۔ ایسا درد اور تنہائی۔ وہ خود ہی لاہور جانے کے لئے تڑپنے لگی۔ لیکن وہاں وہی خدشہ درپیش تھا۔ اس کے لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہ کام حمیدہ کو کیوں کرنے دے، خود ہی یہ شادی کرا دے۔ سہرا بھی اس کے سر بندھے گا، اور سبھی اس کی عظمت کو سلام کریں گے۔ اس میں یہ بھی تھا کہ ارجمند دنیا میں وہ واحد ہستی تھی، جس سے وہ سچ مچ محبت کرتی تھی۔ اور ارجمند بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ وہ اس کے لئے کوئی بھی قربانی دے سکتی تھی اور عبدالحق سے شادی کر کے اس نے یہ بات ثابت بھی کر دی۔

وہ جانتی تھی کہ ارجمند اس سے ہر ممکن تعاون کرے گی۔ سوال یہ تھا کہ ہونے والا بچہ ارجمند کا نہیں، بلکہ اس کا ہے، یہ وہ دنیا کو کیسے دکھا سکے گی۔

مایوسی کی آخری حد کو چھونے کے بعد اس کے اندر ایک یقین ابھرا۔ ارجمند کی وجہ سے یہ دور از کار امکان کسی نہ کسی طرح حقیقت میں بدل سکتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ قدرت پہلے کی طرح پھر اس کی مدد کرے۔

وہ جیسے مایوس ہوئی تھی، ویسے ہی مطمئن بھی ہو گئی۔

اب اسے دوسرے محاذ کی فکر کرنی تھی۔ یہ محاذ بھی آسان نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی اپنی شکل و صورت معمولی ہے، جبکہ ارجمند تو یقیناً حسین ترین لڑکیوں میں سے ہے۔ یہ مرد ہوتے ہی دل پھینک ہیں۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ارجمند جیسی حسین بیوی کو پا کر عبدالحق اسی کا ہو جائے اور پرانی بیوی کو دل سے نکال پھینکے۔ اگرچہ یہ مسئلہ محض چند روز کا ہے۔ چھٹیاں ختم ہوں گی اور عبدالحق کراچی چلا جائے گا۔ پھر کہاں وہ اور کہاں ارجمند۔ بے شک وہ خود بھی عبدالحق کی قربت سے محروم رہے گی۔ لیکن یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔

اس نے سوچ لیا کہ اب اسے ہر چال بہت سوچ سمجھ کر چلنی ہے۔

✿ ✿ ✿

وہ عبدالحق کے لئے بڑی آزمائش کی رات تھی۔

نواب صاحب کو رخصت کر کے آنے کے بعد وہ زندگی کے اس نئے موڑ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں کے دوران اس پر زندگی کی بڑی

بڑی حقیقتیں آشکار ہوئی تھیں۔ ایک اچھی بیوی کو کیسا ہونا چاہئے، یہ اس نے ارجمند کو دیکھ کر سمجھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ نور بانو اچھی بیوی ہرگز نہیں ہے۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ نور بانو کی محبت اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ اس میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن دل کے ایک گوشے میں ارجمند کی محبت کا ننھا سا کلا بھی سر اٹھا رہا تھا۔

وہ حقیقت پسند آدمی تھا۔ دونوں بیویوں کا موازنہ کرنا فطری بات تھی۔ اور موازنے کا نتیجہ بالکل صاف اور واضح تھا۔ وہ طبعاً نزاکت اور خوب صورتی کو پسند کرنے والا تھا۔ ارجمند ایسی لڑکی تھی کہ عبدالحق نے ایسا حسن کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ظاہری حسن کے معاملے میں اس کا اور نور بانو کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

عبدالحق کو اعتراف کرنا پڑا کہ نور بانو میں اس کے لئے ایک خاص اور غیر معمولی کشش ہے۔ ورنہ عام اور غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ کسی اعتبار سے بھی نہ تو خوب صورت ہے اور نہ ہی نازک۔

اب پتا چلے گا کہ میری محبت کس درجے کی ہے؟ اس نے سوچا۔

اور ارجمند باطنی اعتبار سے بھی بہت خوب صورت تھی۔ اللہ کا خوف اور اس کی شخصیت کا جزو اعظم تھا۔ یعنی ظاہری طور پر وہ جتنی حسین تھی، باطنی طور پر اس سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ جبکہ نور بانو کی فطری کمزوریوں سے وہ خوب آگاہ تھا۔ بلکہ بعض سے تو وہ نالاں تھا۔ اگر اسے نور بانو سے محبت نہ ہوتی تو وہ ان کمزوریوں کو کبھی برداشت نہ کر پاتا۔ دوسری طرف وہ دین سے اور اللہ سے تقریباً بے تعلق ہی تھی۔ شادی کے بعد وہ نماز اور قرآن سے دور ہوگئی تھی۔ یہ بات عبرت ناک بھی تھی اور عبدالحق کو اس پر شرم بھی آتی تھی۔ اکثر وہ سوچتا کہ وہ تو باقاعدگی سے نماز اور قرآن پڑھتی تھی۔ شادی کے بعد دور ہوئی تو یقیناً اس میں اس کا کوئی قصور ہے۔

لیکن ایک بات عبدالحق کی سمجھ میں آگئی۔ کسی کو خوش الحانی کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے سن کر یہ رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ وہ دین دار بھی ہے۔ کسی کا بہت اچھا قاری یا حافظ محض ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ بہت اچھا

مسلمان بھی ہے۔ اللہ نے قرآن کو انسانوں کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے اتارا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ نہایت خوش الحانی سے پڑھ لیا جائے، دوسروں کو سنا دیا جائے اور اس کے بعد اسے چوم کر طاق پر رکھ دیا جائے۔ ہدایت اور راہنمائی تو اس وقت حاصل ہوگی، جب آپ سمجھ کر پڑھیں اور غور کریں۔ اور بات صرف زبان کی نہیں، اہل زبان تو قرآن کی ہر آیت کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی اللہ نے حکم دیا کہ اسے پڑھو اور اس پر غور کرو۔ اس لئے کہ بات صرف مفہوم کی نہیں، لفظوں میں چھپی ہوئی ان حکمتوں کی ہے، جنہیں جستجو کرنے والے قیامت تک ڈھونڈتے رہیں گے، لیکن پوری طرح نہیں سمجھ پائیں گے۔ قرآن کے بارے میں خود اللہ نے فرمایا۔ وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ ○ تو اب ایسے میں عربی زبان سے ناواقف شخص اسے توتے کی طرح دہراتا چلا جائے اور اسے مطلب ایک لفظ کا بھی معلوم نہ ہو تو دوسروں کی تو بات الگ، خود اسے ہی کیا فائدہ پہنچے گا؟

نور بانو کی محبت اس کے لئے بہت قیمتی تھی۔ اس محبت کا اس پر بڑا احسان تھا۔ بنیادی طور پر وہ محبت اسے نور بانو کی آواز سے ہوئی تھی۔ لیکن اس آواز نے اس پر رحمتوں کے، راہِ حق کے کتنے دروازے کھول دیئے تھے۔ وہ آواز اسے عربی زبان کی طرف لے گئی تھی۔ اس آواز نے اسے عربی زبان کی محبت سونپی تھی۔ اور اسی آواز میں سورۂ ملک سن کر ہی اس پر ایمان کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے عربی نہ سیکھی ہوتی، اور وہ ان آیات کا مطلب نہ سمجھتا تو کیسے اس نے اس کلام کے برحق ہونے کی گواہی دی تھی۔

بے شک، نور بانو کی محبت نے اس پر زندگی کا سب سے بڑا احسان کیا تھا، اس کو کائنات کی سب سے بڑی نعمت دلوائی تھی۔ شاید اس لئے وہ اس کی ناقابل برداشت باتیں بھی برداشت کر لیتا تھا۔

اس محبت کی اساس بہت مضبوط تھی۔

لیکن وہ آواز، جس کی محبت نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا، شادی کے بعد اس آواز میں قرآن سننے کو وہ ترس گیا تھا، وہ دنیا بھر کی باتیں کرتی تھی، لیکن قرآن نہیں پڑھتی تھی۔

اسی سورۂ ملک کی قرأت اس نے گزشتہ رات ارجمند کی آواز میں سنی تھی۔
اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ارجمند سے سورۂ ملک سن چکا تھا۔ مگر وہ سات برس پہلے کی بات تھی، اور جب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ پہلی بار بھی اسے دل میں اعتراف کرنا پڑا تھا کہ ارجمند کی قرأت نور بانو کی قرأت سے زیادہ اچھی ہے۔ لیکن گزشتہ رات کی تو بات ہی اور تھی۔ فرق اس کی سمجھ میں واضح طور پر آ گیا تھا۔ پہلی بار وہ محض قرأت تھی، جبکہ گزشتہ رات ارجمند کی آواز اور لہجے کا اتار چڑھاؤ اس سورۂ مبارکہ کی ہر ہر آیت سے پوری طرح ہم آہنگ تھا۔ اللہ کی بے مثال قدرت کا بیان کرنے والی آیات میں اس کے لہجے میں دبدبہ تھا، جو سننے والے کے دل کو اپنے رب کے حضور سجدہ ریز کر دینے والی عاجزی سے معمور کر دیتا تھا۔ اور جہنم اور اہل جہنم کا بیان کرنے والی آیات میں اس کے لہجے میں دل کو لرزا دینے والی ہیبت اور تنبیہ تھی۔ اور جنت اور اللہ کے انعامات کے بیان والی آیات میں لہجے میں نرمی، مٹھاس اور خوش خبری تھی۔ احساس ہوتا تھا کہ تلاوت کرنے والا ہر آیات کا مفہوم سمجھ رہا ہے۔
عبدالحق ماضی میں، دہلی کی اس مبارک رات کی طرف چلا گیا۔
اسے یاد تھا کہ اس نے سورۂ ملک کی ابتدائی آیات سنیں۔ عربی اس نے پڑھی اور سیکھی تھی۔ ان آیات کا ہلکا سا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرا۔ انہیں پوری طرح سمجھنے کے لئے اس نے نور بانو سے دوبارہ ان آیات کو پڑھنے کو کہا..... اور وہ بھی ٹھہر ٹھہر کر۔ پھر اس نے ان کا مفہوم سمجھا، ان کی حقانیت اس پر روشن ہوئی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔
لیکن گزشتہ رات کا تجربہ مختلف تھا۔ سنتے ہوئے مفہوم تو وہ سمجھ ہی رہا تھا۔ لیکن ارجمند کی آواز اور لہجے کا اتار چڑھاؤ جیسے اس نے آیات کے مفہوم کی گہرائی سے روشناس کرا رہا تھا۔ اس کے جسم کے اندر اور باہر کی کیفیات ان مفاہیم کے تابع ہوگئی تھیں۔
یہ بہت واضح فرق تھا، جس سے انکار ممکن نہیں تھا۔ ارجمند یہاں بھی نور بانو سے بہت آگے تھی۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں نور بانو کی محبت چاند کی طرح تھی۔ جبکہ ارجمند کی محبت محض ایک ٹمٹماتے ہوئے دیے کی طرح تھی۔
کچھ بھی ہو، نور بانو، نور بانو ہی ہے۔ اس سے صرف محبت کا نہیں، احسان کا رشتہ بھی تو ہے..... اور احسان بھی کتنا بڑا احسان! اس نے سوچا۔
لیکن ایک بات اور واضح ہوگئی۔ اولاد اس کے لئے بہت اہم تھی۔ نور بانو کی محبت کی خاطر وہ اس اہمیت کو خود سے بھی چھپا کر رکھتا تھا۔ لیکن اب ایک مضبوط امکان سامنے آنے پر وہ اہمیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔
اور یہ رات نور بانو کی رات تھی۔

***

نور بانو کے لئے بھی وہ بہت اہم رات تھی۔
اس کی کیفیت ایک ایسے جرنیل کی سی تھی، جس نے یقینی طور پر ہاری جانے والی جنگ میں مکمل شکست سے بچنے کے لئے صلح کر لی ہو۔ اب اسے یہ جائزہ لینا تھا کہ ریاست کے کون سے علاقے صلح کے نتیجے میں اس کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور کون سے علاقوں پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے۔
وہ خواب گاہ میں یوں داخل ہوئی، جیسے وہ کوئی اجنبی علاقہ ہو، جہاں دشمن گھات لگائے بیٹھے ہوں۔
لیکن عبدالحق کا ردِعمل بہت حوصلہ افزا تھا۔
اس نے بے تابی سے نور بانو کو لپٹا لیا۔ اس کی گرفت میں بڑی شدت، بڑی گرم جوشی تھی۔
نور بانو کا اعتماد بحال ہونے لگا۔
''مجھے تم سے محبت ہے، اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔'' عبدالحق کے لہجے میں بھی بے تابی تھی۔
نور بانو کا اعتماد اور بڑھ جانا چاہئے تھا۔ لیکن اس کی شکی طبیعت نے اسے کھٹکا دیا۔ یہ جملہ تو عبدالحق کبھی کہتا ہی نہیں تھا..... اس کے بے حد اصرار پر بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا تھا کہ لفظ پامال ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے اظہار خوب صورت

اور نازک جذبوں کو ارزاں کر دیتا ہے۔ لیکن آج وہ بغیر فرمائش، لفظوں سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔ اس کا کوئی سبب تو ہوگا۔

''یہ آپ مجھ کو یقین دلا رہے ہیں یا خود کو.....؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق گڑبڑا گیا۔

''کیا مطلب.....؟''

''بھئی.....! کسی نہ کسی کو تو یقین دلا ہی رہے ہوں گے.....؟''

''یقین دلانے کی ضرورت تو تب ہو، جب اس میں شک ہو۔'' عبدالحق نے سنبھل کر کہا۔

''اور کم از کم مجھے تو اس میں شک نہیں ہے۔ تمہیں ہو تو ہو۔''

نور بانو کو بروقت خیال آ گیا۔ اس اہم رات میں تلخی کی گنجائش نہیں۔ اس نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ مجھے بھی اس میں کوئی شک نہیں۔ بس مجھے یہ بات غیر معمولی لگی۔ آپ پہلے کبھی منہ سے کہتے نہیں تھے یہ بات۔''

''پہلے کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں۔''

''تو اب کیسے ہو گیا؟''

''تم نے محبت میں ساجھا کیا تو پتا چلا مجھے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ نہ جانے کب سے تم سے دور ہوں۔ تڑپ رہا تھا تمہارے لئے۔''

نور بانو خوش ہو گئی۔ لیکن اسے حیرت بھی ہوئی۔ عبدالحق کہاں ایسی باتیں کرنے والا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کا عبدالحق کی دوسری شادی کرانے کا فیصلہ عمل انگیز ثابت ہو رہا ہے۔

اس نے عبدالحق کے سینے پر سر رکھ دیا۔

''سنو.....! تم پہلے مجھے سورۂ ملک سنا دو۔''

نور بانو یہ سن کر ہمیشہ کی طرح بدمزہ ہو گئی۔ جب نفس کی آندھی چل رہی ہو وجود میں تو ایسی باتیں کہاں اچھی لگتی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اس بار بھی

عبدالحق کو بہلایا۔

''جلدی کیا ہے ایسی..... ابھی دل کی کچھ باتیں کرنی ہیں آپ سے۔ پھر سنا دوں گی۔''

''نہیں.....! پہلے سناؤ! باتیں کرنے کو تو پوری رات پڑی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''پتا ہے، مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے میں پہلی بار تم سے ملنے والا ہوں، سنسنی سی دوڑ رہی ہے جسم میں۔''

نور بانو کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔''

''اچھا.....! تم سورۂ ملک سناؤ نا.....!''

''بعد میں سن لیجئے گا۔''

''ابھی کیوں نہیں.....؟''

''مجھے وضو کرنا پڑے گا۔''

''کیوں.....؟ تمہیں تو سورۂ ملک یاد ہے۔''

''اب کچھ اٹکنے لگی ہوں۔ ایسے میں بغیر دیکھے، پڑھنا اچھی بات نہیں۔''

''تو وضو کر لو۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟''

''آلکس آتی ہے۔'' نور بانو نے بڑی ادا سے کہا اور انگڑائی لی۔ یہ وہ انگڑائی تھی، جو سادہ دل اور صالح عبدالحق کے دل کی دنیا کو زیر و زبر کر دیتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اسے لپٹا لے گا، اور فرمائش ٹل جائے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔

''وضو میں آلکس.....؟ بری بات.....!'' عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

لیکن اس میں بھی اصرار واضح تھا۔

''جاؤ.....! وضو کر کے آؤ۔''

نور بانو وضو کے لئے چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو بہت دکھ ہوا۔ ایک لڑکی جو ہر روز باقاعدہ قرآن کی تلاوت کرتی تھی، جو اس سے اس کی محبت کی وجہ تھی، اب قرآن سے اتنی دور ہو گئی کہ جو سورتیں اسے یاد تھیں، وہ بھی بھول گئی۔ چلو، کوئی بات نہیں۔ رجوع کر لے گی تو اللہ اپنے فضل سے بحال فرما دے گا۔ لیکن یہ کیا کہ وضو سے اکسانے لگی۔ وضو تو پاکی ہے۔ اللہ کی رضا تو اس میں ہے کہ آدمی ہر وقت باوضو رہے۔ وضو سے بھاگنا تو پاکی سے دوری ہوئی۔

کیا اس کا ذمہ دار وہ ہے؟ یہ خیال اسے رہ رہ کر ستا رہا تھا۔

نور بانو وضو کر کے واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا، اور رحل تھی۔ اس نے قرآن پاک کو رحل پر رکھا اور تلاوت شروع کر دی۔

مگر وہ بے روح قرأت تھی۔ جلدی جلدی اس نے سورۂ مکمل کی اور قرآن پاک اور رحل رکھنے کے لئے چلی گئی۔

عبدالحق اداس تھا۔ گزشتہ رات اس نے کیسی روح پرور قرأت سنی تھی، اور آج .....!

یہ تو بہت بڑا زیاں تھا۔

وہ بستر پر دراز ہو گیا۔

نور بانو نے لائٹ آف کی اور آ کر اس کے ساتھ لیٹ گئی۔

لمحے خاموشی اور سکوت میں دبے پاؤں گزرتے رہے۔ نور بانو حیران تھی کہ عبدالحق نے کوئی پیش قدمی نہیں کی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اس نے کہا تھا کہ وہ ایسی سنسنی سے دوچار ہے، جیسے وہ ان کی پہلی رات ہو۔ تو یہ کیا ہو گیا؟

وہ اس کے دکھ اور اداسی کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے ہی لئے تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ عبدالحق کے سینے پر رکھ دیا۔

برف کے نیچے سویا ہوا آتش فشاں دہک اٹھا۔ وہ اس لمس کا اسیر تھا..... غلام تھا۔

لیکن نور بانو کا کھیل کچھ اور تھا۔ اس نے عبدالحق کو روک دیا۔

''میں آپ سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تو کرو نا.....!'' عبدالحق نے مخمور لہجے میں کہا۔

''ایک بات بتائیں۔ کل کی رات کیسی گزری؟''

اور عبدالحق کو جیسے بجلی کی کسی ننگے تار نے چھو لیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم.....؟''

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی.....'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''یہ تو ہے ہی بری بات.....! اور تم اسے برا بھی نہیں سمجھ رہی ہو.....؟''

''کیا برائی ہے اس میں.....؟''

''یہ بے حیائی ہے.....!''

''میاں بیوی کے درمیان ایسا کچھ نہیں ہوتا۔'' نور بانو نے بے پرواہی سے کہا۔

''تم حیا کا مفہوم ہی نہیں سمجھتی ہو۔''

''مجھے جاہل نہ سمجھیں۔ میاں بیوی کی خلوت میں شیطان بھی داخل نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شیطان داخل نہیں ہو سکتا تو انسان کیسے داخل ہو سکتا ہے؟''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''میرا مطلب یہ ہے کہ تم بھی کیسے داخل ہو سکتی ہو؟''

''بیوی ہوں نا! اس لئے۔ اور میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔''

''اور میاں بیوی کے درمیان بے حیائی جائز ہے؟'' عبدالحق کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''ان کے درمیان جو کچھ بھی ہو، وہ بے حیائی نہیں۔''

''غلط سوچ ہے تمہاری۔ وہاں بھی کچھ ممنوعات اور مکروہات ہیں۔''

''میں تو آپ سے بس اتنا پوچھ رہی ہوں کہ کل رات کیسی گزری آپ

کی؟ ارجمند کیسی لگی آپ کو؟'' نور بانو نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ایک بات بتاؤ! اللہ نے مرد کو چار شادیوں کی اجازت دی ہے نا ......!''

''بے شک ......! بالکل دی ہے۔''

''لیکن کیا اسے یک وقت، ایک ہی خلوت میں دو بیویوں کے ساتھ شب بسری کی اجازت بھی دی ہے......؟''

نور بانو سناٹے میں آ گئی۔ چند لمحے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔ مگر تھی وہ بہت ہی پکی۔ چند لمحے بعد بڑے سکون سے بولی۔

''میں نے ایسا کرنے کو تو نہیں کہا آپ سے۔''

''جو کام عملاً نہیں کیا جا سکتا، اس کے متعلق بات کرنا، اس کا بیان بھی بے حیائی ہے۔''

''رشوت لینا گناہ ہے، تو کیا اس کے بارے میں بات کرنا بھی گناہ ہے......؟''

''اگر اس میں ترغیب ہو تو بالکل گناہ ہے۔ ہاں نصیحت کے لئے ہو تو اور بات ہے۔'' عبدالحق اس کی کٹ حجتی پر کڑھ رہا تھا۔ اسے شدت سے غصہ آ رہا تھا، اور وہ اسے برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''لیکن تم وہاں کیوں گھس رہی ہو؟ جہاں شیطان بھی داخل نہیں ہو سکتا۔''

''میں کوئی شیطان تو نہیں ہوں۔'' نور بانو نے مسکراتے ہوئے حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا۔

''وہاں کسی انسان کا داخل ہونا اس سے بھی بڑی بات ہے۔''

''میں تو بس آپ سے پوچھ رہی ہوں۔''

''اپنی خلوت کے بارے میں بات کرنے والا بھی بے حیا ہوتا ہے اور پوچھنے والا بھی۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''دنیا پوچھتی ہے اور دنیا بتاتی ہے۔ مرد اپنے دوستوں کو اور لڑکیاں اپنی سہیلیوں کو بتاتی ہیں۔''

''برا کرتے ہیں۔ یہ بے حیائی ہے، اور بے حیائی گناہ کی بہت بڑی

ترغیب ہوتی ہے۔ وہ گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے ان لوگوں میں شمار کیا۔''

''آپ نے تو بات کا بتنگڑ بنا دیا۔'' نور بانو نے تیزی سے پینترا بدلا۔

''میں تو آپ سے بس یہ پوچھ رہی تھی کہ ارجمند کیسی لگی آپ کو......؟''

عبدالحق نے بھی بات کو ختم کرنا مناسب سمجھا۔

''ارجمند کوئی اجنبی تو ہے نہیں میرے لئے۔'' اس نے کہا۔

''پہلے سے جانتا ہوں میں اسے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔''

''وہ تو ہے۔ میں بیوی کی حیثیت سے پوچھ رہی ہوں۔ اب کیسی لگی وہ آپ کو......؟''

''ایک دن میں تو فیصلہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔''

''مگر اس کا ساتھ تو اچھا لگا آپ کو......؟''

بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی تھی۔ نور بانو کے دماغ میں کوئی بات پھنس جاتی تو نکلتی ہی نہیں تھی۔

''میرے لئے اچھا کیا اور برا کیا......؟'' اس نے بے زاری سے کہا۔

''میں نے تو تمہارے کہنے پر شادی کی ہے۔ اب جو بھی ہو۔''

نور بانو خوش ہو گئی۔

''آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں، جیسے میں نے آپ کے ساتھ کچھ برا کر دیا۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''ارے......! کہیں اس بے چاری کو محروم تو نہیں رکھا آپ نے......؟''

بات پھر وہیں آ گئی۔

''الحمد للہ! میں اللہ کے احکام کے ساتھ کھیل نہیں کرتا۔'' عبدالحق نے بھنا کر کہا۔

نور بانو کو احساس ہو گیا تھا کہ عبدالحق کی طبیعت مکدر ہو گئی ہے۔ لیکن وہ اسے دور کرنا بھی جانتی تھی۔ عبدالحق کے سلسلے میں تمام ہنر آتے تھے اسے، ذرا ہی

دیر میں عبدالحق موم ہو گیا۔

پھر عبدالحق سو گیا۔

لیکن نور بانو جاگ رہی تھی۔ اسے اب نتائج اخذ کرنا تھے اور ان کا تجزیہ کرنا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک ہی بات ایک طرف تو اس کے لئے سکون بخش تھی تو دوسری طرف اس کے اندر آگ بھڑکا دیتی تھی۔

اس کے لئے اس بات کی بہت اہمت تھی کہ عبدالحق اور ارجمند ملیں۔ یہ نہ ہوتا تو اس کا کھیل ہی ٹھپ ہو جاتا۔ پھر اسے اولاد کہاں سے ملتی؟ تو وہ مطمئن تھی کہ امکان کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اس پر جہنم کا دروازہ بھی کھل گیا تھا۔ وہ تصور میں عبدالحق کو ارجمند کے ساتھ دیکھ رہی تھی ..... اور تصور اس کا بے لگام تھا۔ جب آگ اسے جھلسانے لگتی تو وہ اس بچے کا تصور کرتی جو اس قربت کے نتیجے میں آئے گا، جو ارجمند کی کوکھ سے پیدا ہوگا، لیکن کہلائے گا اس کا۔ اس کی خاطر تو وہ کچھ بھی برداشت کر سکتی ہے۔

وہ ویسے ہی دیر سے سوتی تھی۔ اوپر سے یہ ادھیڑ پن۔ پھر نیند آئی بھی تو معمول کے مطابق گہری نیند نہیں تھی۔ اس کی پریشان خیالی اسے نیند میں خواب بن کر ستاتی رہی۔

پھر شاید کسی خواب ہی کی وجہ سے اس کی نیند اچٹ گئی۔ اس کی آنکھ کھلی، لیکن ایسے کہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پہلو کی طرف ہاتھ بڑھایا ..... عبدالحق کو چھونے کے لئے۔ لیکن بستر خالی تھا ..... نہ صرف خالی، بلکہ وہ اسے ٹھنڈا بھی محسوس ہوا۔ جیسے عبدالحق کو بستر سے اٹھے دیر ہو گئی ہو۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔

اس نے روشنی کی اور کلاک میں وقت دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چار بجے تھے۔ اس نے بستر کو یوں دیکھا، جیسے اس کی اس طرح دیکھنے سے واں کسی طرح عبدالحق نمودار ہو جائے گا۔ لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔

اس کے وجود میں ایک دم سے آگ بھڑک اٹھی۔ تو اب یہ بھی ہوگا۔ وہ بڑبڑائی۔

وہ اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ اس کا رخ حمیدہ کے کمرے کی طرف تھا۔ اپنے اندر کی آگ پر وہ اس سوچ کا پانی ڈال رہی تھی کہ ارجمند اسے حمیدہ کے ساتھ سوتی ملے گی۔

لیکن حمیدہ کے کمرے پر نظر ڈالتے ہی اس کے جسم میں جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ گیا۔ غم و غصہ اتنا شدید تھا کہ اس کے جسم کا پور پور کانپ رہا تھا۔ قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں یکجا ہوں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کہاں ہوں گے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اضافی بیڈ روم کی طرف بڑھی۔

اس کی توقع کے عین مطابق دروازہ بند تھا۔ تو یہاں رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔

آخری حد تک خود پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے دروازے کے لٹو کو نرمی سے تھاما اور بڑی آہستگی سے گھمایا۔

اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ لٹو گھوم گیا۔ دروازہ مقفل نہیں تھا۔

یعنی وہ خلوت کے تقدس کی باتیں کرنے والے کی خلوت میں داخل ہونے جا رہی تھی۔ اس کا تصور پھر بے لگام ہونے لگا۔

اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ حیران رہ گئی۔ وہاں ارجمند نماز پڑھ رہی تھی۔

تو عبدالحق صاحب کہاں ہیں؟ اس کمرے کے علاوہ اور کہاں ہو سکتے ہیں وہ؟

وہ اندر داخل ہوئی اور باتھ روم کی طرف بڑھی۔ باتھ روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ پلٹی۔

اسی لمحے ارجمند نے سلام پھیرا۔ نور بانو پر نظر پڑی تو وہ متوحش ہو گئی۔

''کیا ہوا آپی! خیر تو ہے..... ؟''

''عبدالحق صاحب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ نہ جانے کہاں چلے گئے؟''

ارجمند کو اس کے لہجے میں پریشانی سے زیادہ وحشت محسوس ہوئی۔ پھر

نور بانو کے چہرے کے تاثر سے بھی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اسے نور بانو پر ترس آنے لگا۔

''نماز کے لئے گئے ہوں گے آپی!'' اس نے دلاسہ دینا چاہا لیکن خود ہی تردید بھی کر دی۔

''لیکن نہیں! ابھی تو اذان میں کچھ دیر ہے۔''

وحشت ایسی تھی کہ نور بانو کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ ارجمند نماز پڑھ رہی تھی۔

''تم کب سو کر اٹھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی ذرا دیر پہلے۔''

''کیوں......؟ نیند نہیں آ رہی تھی کیا......؟''

ارجمند لاکھ سمجھ دار سہی، لیکن صالح بھی تھی اور معصوم بھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ صبح چار بجے اٹھنا اس کا معمول ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ جتانے کے مترادف ہوتا کہ وہ باقاعدگی سے تہجد پڑھتی ہے۔ چنانچہ اس نے کہا۔

''نیند تو ٹھیک آئی تھی آپی! آج بس ذرا کچھ جلدی آنکھ کھل گئی۔''

''عبدالحق صاحب کی کمی محسوس ہو رہی ہوگی۔'' نور بانو نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں آپی!'' ارجمند نے کھسیا کر کہا۔

نور بانو کو زیادتی کا احساس ہو گیا۔ اس نے جلدی سے موضوع بدلا۔

''پتا نہیں کہاں چلے گئے اتنی رات کو؟''

''گھر میں ہی ہوں گے۔'' ارجمند نے کہا اور سوچا، رات کیسی، یہ تو صبح کا وقت ہے۔

''پورا گھر چھان مارا ہے میں نے۔''

''اپنے کمرے کے باتھ روم میں بھی دیکھا؟''

''نہیں......!''

''تو پریشان نہ ہوں۔ وہیں ہوں گے وہ۔''

نور بانو باہر نکلی اور اپنے کمرے کی طرف گئی۔ ادھر وہ کمرے داخل ہوئی اور ادھر عبدالحق باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر آیا۔

اس کی شکی طبیعت نے پر رنگ دکھایا۔ ارجمند کو کیسے معلوم تھا کہ یہ باتھ روم میں ہوں گے۔ اس نے سوچا۔ ہو نہ ہو، یہ دونوں ملے ہوں گے۔ اس نے ایک پل بھی یہ نہیں سوچا کہ وہ خود اچھی نیند نہیں سوئی تھی۔ عبدالحق نے اگر دروازہ کھولا ہوتا تو وہ جاگ گئی ہوتی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ارے......! تم جاگ رہی ہو...... اور وہ بھی اس وقت......؟''

نور بانو کوئی جلی کٹی بات کہنے والی تھی۔ لیکن اس نے بروقت خود کو روک لیا۔

''ہاں......! نیند اچٹ گئی...... نہ جانے کیوں......؟''

''اور تم آ کہاں سے رہی ہو......؟''

''آپ کو تلاش کرنے نکلی تھی۔'' نور بانو نے بے ساختہ کہا۔

''مجھے......؟ میں تو غسل کر رہا تھا۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔ پھر اچانک ہی ایک لمحے میں بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

''اوہ......! میں سمجھ گیا۔ تمہاری آنکھ کھلی ہوگی، اور یہ دیکھ کر کہ میں بستر پر نہیں ہوں، تمہیں فوراً شک ہوا ہوگا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم سیدھی اماں کے کمرے کی طرف گئی ہوگی۔ وہاں تمہیں ارجمند بھی نظر نہیں آئی ہوگی، اور پھر تم پاگل ہو گئی ہوگی۔ تم نے......''

''ایسا کچھ نہیں ہوا۔'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

مگر عبدالحق رکا نہیں۔

''...... تم نے ایک ایک کمرہ چیک کیا ہوگا، اور بالآخر ارجمند تمہیں نماز پڑھتی ملی ہوگی۔''

نور بانو اپنی تردید بھی بھول گئی۔

"یہ آپ کو کیسے معلوم ہے؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ اس کا روز کا معمول ہے۔ مگر تم تو اپنی شکی فطرت سے مجبور ہو۔"

"یہ اتنی بڑی بات کیسے کہہ رہے ہیں آپ ....؟" نور بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

"ایسے کہ اگر تمہاری آنکھ کھلی اور تم نے مجھے بستر پر نہ پایا تو اوّل تو اس میں پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں۔ اور اگر تمہیں پریشانی ہوئی بھی تو فطری طور پر سب سے پہلے تمہیں باتھ روم کو چیک کرنا چاہئے تھا۔ لیکن جب آدمی شک کی آگ میں جل رہا ہو تو سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے تم کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے وہاں تلاش کرنے کے لئے دوڑ گئیں، جہاں تمہیں اندیشہ تھا کہ میں موجود ہوں گا۔"

نور بانو لپکی اور اس سے لپٹ گئی۔

"بے بات کا افسانہ بنانا کوئی آپ سے سیکھے۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔ وہ جانتی تھی کہ عبدالحق نے اسے آر پار دیکھ لیا ہے، اور اب اس تاثر کو زائل کرنے کی اور کوئی صورت نہیں۔

لیکن عبدالحق نے نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔

"میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔ اب تم سکون سے لیٹ کر سو جاؤ۔"

نور بانو نے غور سے اسے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ طنز نہیں کر رہا ہے۔

"ویسے اگر تم غسل کر لو تو بہتر ہے۔" عبدالحق نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

نور بانو نے ایک انگڑائی لی اور بستر پر دراز ہو گئی۔ پہلے نیند تو پوری کر لوں۔ وہ بڑبڑائی۔ غسل تو ہوتا رہے گا۔

اور اس بار وہ بے سدھ ہو کر سوئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو لاہور آئے پندرہ دن ہو چکے تھے۔ اب صرف پندرہ دن کی چھٹیاں باقی تھیں۔ مہمان داری ختم ہو چکی تھی۔ زندگی نئے معمولات اختیار کر چکی تھی۔

حمیدہ بہت خوش تھی۔ وہ باقاعدگی سے شکر کے نوافل ادا کر رہی تھی۔ ارجمند اس کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ ایسی ہی بہو کی تو اسے آرزو تھی۔ وہ اللہ کا جتنا شکر ادا کرتی کم تھا۔

پھر اسے گزشتہ رات بابا کا خیال آیا، جس نے اس کی راہنمائی کی تھی، اور اسے خوش خبری سنائی تھی۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اسے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ جا کر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے۔

لیکن ایک بات عجیب ہوئی تھی۔ بڑی خوش خبری بھی اسے مل گئی تھی، جس کی وہ برسوں سے منتظر تھی۔ لیکن توقع کے برعکس خوش خبری ارجمند کی طرف سے نہیں، نور بانو کی طرف سے آئی تھی۔ بہرحال اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ بلکہ یہ تو اور خوشی کی بات تھی۔ کون جانے، اسے ایک ساتھ دو پوتے ملیں۔

نور بانو نے اسے خوش خبری سنائی تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

"ایک خوش خبری ہے اماں .... ! بہت بڑی خوش خبری۔ بوجھو تو جانوں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

اور حمیدہ کے نزدیک خوش خبری تو بس ایک تھی۔ سو اس نے جھٹ سے کہا۔

"ارجمند کے ہاں ...."

"نہیں اماں ....!"

حمیدہ مایوس ہو گئی۔ اور کسی خوش خبری سے اسے کیا غرض تھی۔

"تو پھر ....؟" اس نے بے دلی سے پوچھا۔

"سوچو اماں .... ! ایسی خبر ہے کہ سنو گی تو نہال ہو جاؤ گی۔"

حمیدہ کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن نور بانو کا دل رکھنے کے خیال سے وہ منہ لٹکائے چہرے پر غور و فکر کا تاثر سجائے بیٹھی رہی۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے تو کچھ نہیں سوجھ رہا ہے بیٹی!"

"اللہ نے میری نیک نیتی، میری قربانی قبول کر لی اماں! اور مجھے اس کا بہترین صلہ دے دیا۔"

"کیا مطلب......؟"

"میں ماں بننے والی ہوں اماں!"

حمیدہ چند لمحے بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں......! تمہیں خوشی نہیں ہوئی......؟"

"ارے......! اس سے بڑی اور خوشی کیا ہوگی۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا ہے۔ سچ کہہ رہی ہے تو......؟"

"ہاں اماں......! بالکل سچ......!"

حمیدہ نے اسے لپٹا لیا۔

"سچ کہتی ہو، اتنی خوشی تو مجھے ارجمند کی خوش خبری سے بھی نہ ہوتی۔" اس نے بڑی سچائی سے کہا۔

"کیسی آرزو تھی مجھے کہ تیری گود ہری ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔"

اس لمحے حمیدہ کے خلوص اور محبت نے نور بانو کے دل کو چھو لیا۔

"اللہ کرے، ایسا ہی ہو پتری! لیکن کسی اور کو ابھی نہ بتانا۔ دیکھ نا! کبھی کبھی بے قاعدگی بھی تو ہو جاتی ہے۔"

"بس تمہیں بتایا ہے اماں......! اور ان کو۔ ویسے مجھے یقین ہے، میرے معاملات میں آج تک کبھی بے قاعدگی نہیں ہوئی۔ ایک ہفتہ اوپر ہو چکا ہے اماں......!"

"اللہ کا شکر ہے پتری!" حمیدہ نے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا۔

"عبدالحق تو بہت خوش ہوا ہوگا؟"

"بہت زیادہ اماں......! بچوں کی طرح خوش ہو رہے تھے وہ تو۔"

"اللہ مبارک کرے بیٹی......!"

حمیدہ کا ویسے ہی بابا کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔ اس خوش خبری کے بعد تو وہ راسخ ہو گیا۔ اس نے نسیمہ کو بلایا۔

"نوریز سے کہو کہ گاڑی نکالے۔"

"کہاں جائیں گی بیگم صاحبہ......!"

"بابا کے پاس......!"

راستے میں اس نے مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے لیا۔

بڑے کمرے میں بہت ہجوم تھا۔ اس بار اسے کوئی رعایت نہیں ملی۔ چار گھنٹوں کے بعد کہیں اس کی باری آئی۔

وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوئی اور بابا کو سلام کیا۔ بابا نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

"مبارک ہو! تجھے تیرے دل کی مراد مل گئی۔ یہ اچھی بات ہے کہ تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہے۔ میرا شکریہ ادا کرنے کے لئے آئی ہے۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

"اللہ نے بندے کا شکریہ ادا کرنے کا بھی تو حکم دیا ہے بابا......!"

"یہ اور بھی اچھی بات ہے۔" بابا نے خوش ہو کر کہا۔

"تجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اس نے تجھے اچھا بنایا ہے۔"

"اس کا کرم ہے بابا......!" حمیدہ نے کہا۔ پھر جھجکتے ہوئے بولی۔

"میں مبارک باد کی مٹھائی لائی ہوں بابا......!"

"ٹھیک ہے، ادھر لا۔"

حمیدہ نے ڈبہ بابا کو دے دیا۔ بابا نے ڈبہ کھولا، ایک لڈو نکالا اور اس میں سے تھوڑا سا اپنے منہ میں رکھ لیا۔ باقی لڈو اس نے حمیدہ کی طرف بڑھایا۔

"لے......یہ تو کھا لے۔ اللہ تجھے خوش رکھے اور اپنے پیاروں میں شامل فرمائے۔"

حمیدہ نے وہ لڈو منہ میں رکھ لیا۔

اسی لمحے بابا کی خدمت گار عورت کمرے میں آئی۔

"کیا حکم ہے بابا......!"

بابا نے مٹھائی کا ڈبہ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ لے جا! خود بھی کھانا اور سب لوگوں کو بھی کھلانا۔"

عورت ڈبہ لے کر باہر چلی گئی۔ حمیدہ نے شرمندگی سے کہا۔

"مٹھائی اتنی زیادہ تو نہیں ہے بابا......!"

"نیت اچھی ہو تو ہر چیز میں برکت ہوتی ہے۔ تو فکر نہ کر۔ سب کو حصہ ملے گا۔"

"اللہ نے بڑا کرم فرمایا ہے بابا......!" حمیدہ نے کہا۔ "لگتا ہے کہ مجھے ایک ساتھ دو پوتے ملیں گے۔"

بابا ایک لمحہ خاموش رہا، پھر بولا۔

"پوتے تو انشاء اللہ تجھے دو ہی ملیں گے۔ لیکن دس برس کے وقفے سے۔"

"میں سمجھی نہیں بابا......!"

"تجھے کیا ضرورت ہے سمجھنے کی......؟ کھیل تو جاری ہے۔ نیچے والے اپنا کھیل رہے ہیں۔ کھیلنے دے انہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کا ناؤ تیرتی رہے گی، بلکہ بھی لگ جائے گی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ دیا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔"

حمیدہ کا دل پریشان ہو گیا۔ بابا کی بات میں جو اشارہ تھا، وہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

"تو پریشان نہ ہو۔ تو آم کھا، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا! آپ میرے اور میرے پیاروں کے لئے دعا کرتے رہیں گے نا......؟"

"انشاء اللہ......! اور ہاں......! اگلی بار مت آنا۔ اب میں تجھ سے کبھی نہیں ملوں گا۔"

"کیوں بابا......! ناراض ہو گئے ہو......؟"

"نہیں......! ناراض نہیں ہوں۔ بس جو کہہ دیا، وہ مان لے۔"

حمیدہ سلام کر کے باہر نکل آئی۔

گھر واپس جاتے ہوئے وہ بابا کی بات پر غور کرتی رہی۔ ایک بات کا اسے یقین ہو گیا...... یہ کہ نور بانو جھوٹ بول رہی ہے۔ لیکن کیوں؟ اور اسے اتنے بڑے جھوٹ کو وہ کیسے نبھا سکے گی؟ یہ بات کسی طرح اس کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ چاند چڑھتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے۔

پھر اسے بابا کی بات یاد آئی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔

لیکن کیوں......؟ کیسے اور کب تک......؟

اور بابا نے آخر میں کہا تھا، جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ حمیدہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ وہ بڑی کم ظرف ہے۔ اس سے رہا نہیں گیا، اور جیسے ہی اسے ارجمند کی طرف سے مثبت اشارے ملے، اس نے عبدالحق اور حمیدہ کو خود سے منسوب کر کے وہ خوش خبری سنا دی۔

عبدالحق کی خوشی کی تو کوئی حد نہیں تھی۔ وہ تو جیسے ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔

ارجمند کو تو اس نے پکا کر دیا تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ کسی سے کچھ نہیں کہے گی۔ لیکن درحقیقت اس نے بے صبرے پن سے کام لیا تھا۔ ایک تو یہ معاملہ کسی طرح بھی آسان نہیں تھا، بلکہ نہایت پیچیدہ تھا۔ اس پر اس کی کم ظرفی۔ عبدالحق کے جانے میں ابھی بارہ دن باقی تھے، اور اس کی تاریخ صرف تین دن کے فاصلے پر تھی۔ اسے وہ کیسے چھپا سکے گی۔

اس کے دل میں ہول اٹھتے رہے۔ وہ مسکرانا تک بھول گئی۔ دو دن باقی رہ گئے تھے۔ پھر اچانک اللہ کی طرف سے مدد آ گئی۔

گاؤں سے آنے والی ایک بری خبر اس کے لئے امداد بن گئی۔ دل کا دورہ پڑنے سے اچانک ڈاکٹر محمد واسطی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اکبر اور فرزانہ کی شادی کے

بعد ان لوگوں کے لئے ڈاکٹر صاحب کی حیثیت گھر کے فرد کی سی تھی۔ عبدالحق تو ان کا بہت ہی زیادہ احترام کرتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو اسے ان سے بہت محبت تھی۔ جس صورت حال میں انہوں نے زرینہ کو اپنی بہو کی حیثیت سے قبول کیا، وہ اسے کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں، انہوں نے اس کے بے عزتی کے احساس کو زائل کرنے کے لئے اپنا وہ زخم اس کے سامنے کھول دیا، جسے لوگ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ وہ بہت عالی ظرف، بہت بڑے انسان تھے۔

روانگی کا مرحلہ آیا تو حمیدہ نے عبدالحق سے کہا۔

''نکی کو یہیں رہنے دے پتر! اس کا وہاں جانا مناسب نہیں۔''

''کیوں اماں ......؟''

''نئی نویلی دلہن ہے، اور وہ موت کا گھر ہے۔''

''یہ سب بے کار کی باتیں ہیں، ہندوانہ توہمات ہیں اماں!'' عبدالحق نے اختلاف کیا۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا کہ وہ حمیدہ کی بات ردّ کرے۔ لیکن اس وقت اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''موت کوئی چھوت کی، لگنے والی بیماری نہیں ہوتی۔ وہاں ہماری فرزانہ بھی ہے، جسے ڈاکٹر صاحب نے باپ کی محبت دی تھی۔ وہ ان کے صدمے سے نڈھال ہو رہی ہوگی۔ ارجمند اور نوربانو سے مل کر اس کا غم ہلکا ہوگا۔ اور پھر ہم یہاں ارجمند کو کس کے پاس چھوڑ کر جائیں گے۔ یہاں ملازموں کے سوا تو کوئی ہوگا نہیں۔''

حمیدہ نے اختلاف نہیں کیا۔ بات معقول تھی۔ وہ سب حق نگر کے لئے روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے حق نگر کے لئے اتنا کچھ کیا تھا کہ وہ عبدالحق کے بعد وہاں کے سب سے زیادہ چاہے جانے والے آدمی تھے۔ پوری آبادی وہاں امنڈ آئی تھی۔ عبدالحق سے ملنے والوں کا بھی ہجوم تھا۔ برسوں کے بعد وہ وہاں آیا تھا۔

وہیں نوربانو کے ایام شروع ہو گئے۔ وہ خوش تھی کہ بغیر کسی تردّد اور پریشانی کے اس کا پردہ رہ گیا۔

تین دن گزارنے کے بعد واپسی کی بات ہوئی۔ حمیدہ نے صاف انکار کر دیا۔

''میں تو عدت کے پورے دنوں میں صفیہ کے ساتھ رہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''اس اتنے بڑے دکھ میں اسے اکیلا کیسے چھوڑ دوں میں ......؟''

یہ نوربانو کے لئے اور بڑی خوشی تھی۔ بغیر کچھ کئے اس کی ایک اور مشکل خودبخود آسان ہو گئی تھی۔ حمیدہ کی موجودگی میں بہرحال پیچیدگیاں تو پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن یہ کانٹا خودبخود نکل گیا تھا۔

عبدالحق اس معاملے میں بحث نہیں کر سکتا تھا۔

نوربانو نے کہا۔

''میں بھی کم از کم ایک ہفتہ یہاں رکوں گی۔ ورنہ زرینہ بالکل اکیلی رہ جائے گی۔''

حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کیا یہ وہی خودغرض لڑکی ہے؟ آج یہ دوسروں کی فکر کر رہی ہے۔ بہرحال اسے خوشی ہوئی۔

''تم جانتی ہو کہ میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔'' عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

''نو دن بعد میری واپسی ہے۔''

''میں دو دن پہلے آجاؤں گی، آپ فکر نہ کریں۔''

''تو ہم بھی یہیں رک جاتے ہیں۔ ساتھ ہی چلیں گے۔'' عبدالحق نے کہا۔

یہ نوربانو کو کیسے گوارہ ہوتا۔ اس طرح تو ایک بڑی آسانی الٹا بڑی دشواری میں تبدیل ہو جاتی۔

''جی نہیں ...... ! آپ ارجی کو لے کر واپس جائیں گے۔ وہ بے چاری نئی نویلی دلہن ہے۔ اسے گھمائیں، پھرائیں، سیر کرائیں۔ اس کے ساتھ بہت اچھا وقت گزاریں۔''

اس لمحے حمیدہ کو لگا کہ نور بانو سچ مچ ماں بننے والی ہے، اور اتنی بڑی خوشی ملی ہے تو اس میں ظرف بھی پیدا ہوگیا ہے۔ ویسے ارجمند سے تو وہ سچ مچ بہت محبت کرتی تھی۔ لیکن ایسی محبت!

''لیکن نور بانو......'' عبدالحق نے کچھ کہنا چاہا۔

''میں اب کچھ نہیں سنوں گی۔'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''شادی میں نے ہی کرائی ہے اور ارجی میری ذمہ داری بھی ہے۔''

''نور بانو ٹھیک کہہ رہی ہے پتر!'' حمیدہ نے بھی تائید کی۔ یوں فیصلہ ہوگیا۔

نور بانو بہت خوش تھی۔ اس کی مشکل بھی آسان ہوگئی تھی، اور اس نے اعلیٰ ظرفی کی مثال بھی قائم کر دی تھی۔

❁ ❁ ❁

وہ ایک ہفتہ ارجمند کی زندگی کا سب سے خوش گوار اور یادگار عرصہ تھا۔

اس ہفتے کے ایک ایک لمحے میں عبدالحق اسی کے ساتھ تھا۔ وہ باہر تفریح کے لئے بھی گئے۔ انہوں نے قرآن پر بات کرتے ہوئے بھی وقت گزارا۔ ان کے باہمی تعلق میں اس قدر تنوع تھا کہ اکتاہٹ یا بے زاری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اس ایک ہفتے میں عبدالحق کی سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔ اس پر یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ اپنی کم عمری کے باوجود ارجمند ایک مثالی بیوی ہے، جو اپنے شوہر کی آخرت کی ہر لمحہ فکر کرتی ہے، ہر لمحہ خیال رکھتی ہے۔ لیکن اس نے یہ بات بھی سمجھ لی کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو اس کے تصور میں عکس نور بانو کا ہی ابھرتا تھا۔

اسے خوشی تھی کہ وہ اپنی محبت میں سچا نکلا۔

کراچی سے کلکٹر صاحب کا فون آیا۔ انہوں نے اسے یاد دلایا کہ اسے مقررہ تاریخ پر آفس پہنچنا ہے۔

''آپ بے فکر رہیں جناب! میں انشاء اللہ پہنچ جاؤں گا۔ میں وعدہ کرتا

ہوں تو پورا بھی کرتا ہوں۔ البتہ اللہ کو منظور نہ ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

''دیکھو! یہ ہیں حیلے بہانے کی باتیں۔'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''جی نہیں سر......! یہ حقیقت ہے۔ بندہ اتنا ہی کر سکتا ہے، جتنا اس کا اختیار ہے۔ اصل چیز اللہ کی مرضی اور منظوری ہے۔''

''یہی تو خرابی ہے ہمارے ہاں......!'' کلکٹر صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی مجھے حیلہ ساز یا جھوٹا سمجھے۔'' عبدالحق نے سرد لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔

''کہیں تو میں اپنا استعفیٰ بھجوا دوں آپ کو۔''

''ارے بھئی......! برا مت مانو۔'' کلکٹر صاحب نے جلدی سے کہا۔

''لوگ اللہ کے نام کو اسی طرح اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اب کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ یہ کسی کی پیشانی پر تو نہیں لکھا ہوتا۔''

''میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔ دوسروں سے میرا کوئی واسطہ نہیں، آپ فرمائیں، کیا حکم ہے میرے لئے؟''

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' کلکٹر صاحب نے کہا اور فون رکھ دیا۔

ان کی قربتوں کا ایک ہفتہ پورا ہوگیا تھا۔ نور بانو بھی گاؤں سے واپس آ گئی تھی۔

ارجمند سے اکیلے میں ملی تو نور بانو نے اس سے پوچھا۔

''کیسا وقت گزارا ارجی!''

''جی......! اللہ کا شکر ہے۔''

نور بانو احسان جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔

''وہاں میرا رکنا کچھ ایسا ضروری نہیں تھا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن میں جان بوجھ کر رک گئی... تمہاری خاطر، کہ تمہیں ان کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع مل جائے۔''

''میں آپ کی **احسان** مند ہوں آپی......!'' ارجمند نے تشکر سے کہا۔

''بہنوں کے درمیان احسان کیسا......؟'' نور بانو بولی۔ **پھر فوراً** ہی وہ

مطلب کی بات پر آ گئی۔

''اب ان کے جانے میں صرف دو دن ہیں۔''

ارجمند اس کا مطلب سمجھ گئی۔

''اور یہ دو دن صرف آپ کے ہیں آپی.....!'' اس نے کہا۔

''نہیں.....! اصولاً تو ان میں سے ایک تمہارا ہے۔''

''آپ مجھے پہلے ہی میرے حق سے زیادہ دے چکی ہیں۔''

''پھر وہی بات.....! میں نے کہا نا کہ بہنوں کے درمیان حساب کتاب نہیں ہوتا۔''

''وہ تو آپ کر رہی ہیں۔ میں تو محبت اور خوشی سے یہ آپ کو دے رہی ہوں۔''

''سچ کہو.....! تمہیں ملال تو نہیں اس کا.....؟''

''آپ کی خاطر تو میں اپنی عمر بھر کی باریاں آپ کو دے سکتی ہوں آپی.....!'' ارجمند نے پوری سچائی سے کہا۔

نور بانو نے اسے لپٹا لیا۔

''تم بہت اچھی بہن ہو میری۔''

❁ ❁ ❁

نور بانو بہت خوش تھی۔ قدرت نے اس کے لئے تمام معاملات آسان دیئے تھے۔ حمیدہ کا کانٹا بھی دور ہو گیا تھا۔ اب وہ پُراعتماد تھی کہ اسے اتنے بڑ... فریب کو بھی وہ کامیابی سے نبھا سکے گی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ارجمند اس کی مٹھی میں تھی۔

اس رات عبدالحق کو بھی بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ ایک لمبی جدائی درپیش ہے۔ وہ جوش سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اسے احساس ہو رہا تھا کہ نور بانو کا دھیان کہیں اور لگا ہے۔

''نور.....! میں کراچی میں اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''یا تم میرے ساتھ چلو یا ارجمند کو بھیج دو۔''

نور بانو یہ سن کر بھڑک گئی۔

''صاف صاف کہیں نا کہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں آپ.....!''

''نہیں.....! میری پہلی ترجیح تو تم ہو۔'' عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

نور بانو کے لئے یہ ممکن ہوتا تو وہ ضرور ایسا ہی کرتی۔ لیکن اس کا اور ارجمند کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔

''مگر یہ ممکن نہیں ہے عبدالحق صاحب!'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر ایسی حالت میں.....''

عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ارجمند کو میرے ساتھ بھیج دو۔''

''آپ اتنا اصرار کیوں کر رہے ہیں.....؟''

''بیوی کی موجودگی میں شوہر کا اس سے دور ہونا کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ اللہ کا حکم بھی ہے کہ اسے اس آدمی آزمائشوں اور فتنوں سے محفوظ رہتا ہے۔''

اس پر نور بانو کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ تو ویسے ہی شکی طبیعت کی تھی، اور عبدالحق نے بڑی بات کہی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ سب کچھ بھول کر عبدالحق کے ساتھ چلی جائے۔ لیکن اس طرح تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔ اس کا کھیل ہی چوپٹ ہو جاتا۔

''میں بلا جھجک ارجمند کو آپ کے ساتھ بھیج دیتی۔'' اس نے لہجے میں محبت سموتے ہوئے کہا۔

''لیکن مجھے ارجمند کی بہت ضرورت ہے، اور یہ بات تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میں کتنی خودغرض ہوں۔''

''خیر یہ تو غلط ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ تو سب لوگ ہیں۔ پھر ارجمند کی ایسی کیا ضرورت ہے؟''

ارجمند کی اہمیت تو وہ عبدالحق کو نہیں بتا سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے بے حد اداس لہجے میں کہا۔

"میرا پہلا پہلا موقع ہے۔ میں خوفزدہ بھی ہوں۔ ایسے میں لوگوں کی تعداد کی اہمیت نہیں ہوتی۔ اپنے قریبی لوگوں کا، محبت کرنے والوں کا سہارا چاہئے ہوتا ہے۔ اب اماں تو چار ساڑھے چار مہینے گاؤں میں رہیں گی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ارجمند کو میں اپنی سگی بہنوں کی طرح چاہتی ہوں۔ ایسے میں وہی ایک سہارا ہوگی میرے لئے۔"

عبدالحق قائل ہوگیا۔ اپنی بات کی سچائی تو نوربانو اس کے نزدیک ارجمند سے اس کی شادی کرا کے ثابت کرا چکی تھی۔ نوربانو کی بات بالکل درست تھی۔ اماں کی غیر موجودگی میں ارجمند ہی نوربانو کے لئے سب کچھ تھی۔

"چلو ٹھیک ہے.....!" اس نے خوش دلی سے کہا۔

لیکن قربت کے لمحوں میں ایک بار پھر عبدالحق کو تنہائی کا احساس ہونے لگا۔ نوربانو کا دھیان واقعی کہیں اور تھا۔

"کیا بات ہے نور.....! کوئی اور بوجھ بھی ہے تمہارے ذہن پر.....؟"

نوربانو نے عبدالحق سے اہم ترین بات کرنی تھی اور وہ موقع نکالے بغیر وہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اب موقع مل رہا تھا۔

"جی ہاں.....! ہے تو، لیکن بہت خوش گوار اور خوب صورت بوجھ۔"

"تو اسے بھی ہلکا کر دو۔"

"میں اپنے اور آپ کے بچے کے بارے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

عبدالحق مسکرا دیا۔

"یہ تو مجھے بھی بہت اچھا لگے گا۔ کرو نا.....!"

"میں چاہتی ہوں کہ وہ ایسا ہو کہ دنیا میں اس جیسا دوسرا بچہ نہ ہو۔"

"تم کیسا دیکھنا چاہتی ہو اسے.....؟"

"بہت خوب صورت، بہت حسین.....!"

عبدالحق پر ارجمند اور نوربانو کا فرق پھر واضح ہونے لگا۔ دونوں واقعی ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ نوربانو دنیا دار تھی، سو وہ ظاہری حسن کے بارے میں ہی سوچ سکتی تھی۔ جبکہ ارجمند کو بچے کی تربیت کی فکر تھی۔ اس کا مقصد اسے اچھا مسلمان بنانا

تھا۔

"اور آپ کیا چاہتے ہیں.....؟" نوربانو نے اسے چونکا دیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ وہ تم جیسا ہو۔"

"تو پھر خوب صورت کہاں سے ہوگا وہ۔ میں تو ایسی ہی ہوں، واجبی سی۔"

"کبھی میری نظر سے دیکھو خود کو۔"

"مگر میں چاہتی ہوں کہ میرے بچے کو دشمن بھی دیکھے تو اسے خوب صورت کہنے پر مجبور ہو۔"

"تو اس کے لئے دعا کرو۔"

"دعا کے ساتھ کوشش بھی تو ضروری ہوتی ہے۔"

"کیسی کوشش.....؟"

"عورت بے فکر اور خوش رہے۔ اچھے ماحول میں رہے، جہاں گرد و پیش خوب صورت ہو، تاکہ اس کی سوچیں بھی خوب صورت ہوں۔ کہتے ہیں، ہر چیز، ہر سوچ کا عکس پڑتا ہے بچے پر۔"

"ارے.....! یہ سب تمہیں کس نے بتا دیا.....؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"سب جانتی ہوں پہلے سے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ ایسا ماحول بنا لینا۔"

"مجھے مری کا خیال آتا ہے۔" نوربانو نے خواب ناک لہجے میں کہا۔

"کیا میں مری نہیں جا سکتی.....؟"

"کیوں نہیں.....!" عبدالحق نے کہا۔ لیکن اس کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

"مگر وہاں طبی سہولتوں کی بہت کمی ہوگی۔"

نوربانو وہاں جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہاں شمریز کا پورا گھرانا موجود تھا، جو اس کے راز کو راز نہیں رکھتا۔ اس نے تو مری کا تذکرہ ایک خاص مقصد کے تحت

چھیڑا تھا۔ بات وہ عبدالحق سے ہی کہلوانا چاہتی تھی۔

اور اس کا مقصد پورا ہوگیا۔

''لیکن ایبٹ آباد بہت مناسب رہے گا۔'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔

''بہت ہی خوب صورت جگہ ہے۔ فوج کا شہر ہے۔ وہاں تمام طبی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ ہمارا بنگلہ بھی ہے وہاں۔''

''سوچ لیں......!''

''سوچنے کی کیا بات ہے......؟ نوریز وہاں تم لوگوں کے ساتھ رہے گا۔''

''ایسی حالت میں نوریز کا سامنا......''

''پگلی ہوتم تو...... وہ سرونٹ کوارٹر میں رہے گا۔ باہر کے کام کرے گا۔ سنبھالنے کے لئے عورتیں بھی مل جائیں گی تمہیں۔ چاہو گی تو لیڈی ڈاکٹر گھر پر آجائے گی۔ کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی تمہیں۔ میں نوریز سے کہہ کر تمہارے ا ارجمند کے بینک اکاؤنٹ بھی کھلوا دوں گا وہاں۔''

''بس تو ٹھیک ہے۔ آپ کے جاتے ہی ہم ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔''

''اتنی جلدی کیا ہے......؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں تمام وقت وہاں گزارنا چاہتی ہوں۔''

''چلو...... ٹھیک ہے۔''

''ایک بات بتائیں۔ آپ نے یہ خوش خبری کسی کو سنائی ہے؟''

''نہیں......! تم کیوں پوچھ رہی ہو......؟''

''کسی کو بتایئے گا نہیں، اماں کہہ رہی تھیں، نظر بھی لگ جاتی ہے۔''

''میں ایسا بتانے والا کہاں؟ مجھے تو شرم آتی ہے۔''

یوں نوربانو کو رابعہ اور زبیر کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔ ورنہ وہ سوچتی کہ زبیر بھائی کو تو وہ پردہ کرنے کے بہانے سے روک دے گی لیکن رابعہ کے اس کے پاس کوئی توڑ نہیں تھا۔

اب ایک مرحلہ اور رہ گیا تھا۔

''آپ ہمارے بغیر اتنے عرصے رہ لیں گے......؟'' اس نے پوچھا۔

''جب موقع ملے گا، میں تم سے ملنے کے لئے آجایا کروں گا۔''

''نہیں......! یہی تو میں نہیں چاہتی۔''

عبدالحق نے حیرت سے اور صدمے سے اسے دیکھا۔

''کیوں بھئی......! یہ تو ظلم ہوگا۔''

''مجھے اس پر معاف کر دیجئے گا۔'' نوربانو نے شرمندہ نظر آنے کی کوشش کی۔

''دراصل میں نے منت مانی تھی کہ اللہ نے مجھ پر یہ کرم فرمایا تو میں ماں بننے سے پہلے آپ کے سامنے نہیں آؤں گی۔''

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ اس کی کوئی تُک ہی نہیں تھی۔''

''غلطی ہوگئی۔ چلیں کوئی بات نہیں۔ میں منت توڑ دوں گی۔ میں خود بھی آپ کے بغیر کہاں رہ سکتی ہوں۔ اصل میں تو یہ میں نے خود پر ظلم کیا ہے۔''

عبدالحق نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

''عہد شکنی اور زیادہ بری بات ہے۔ اب منت مانی ہے تو اسے نبھاؤ گی۔''

''جی بہت بہتر......!'' نوربانو نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ لیکن حقیقت وہ خوش اور مطمئن تھی۔ اللہ اس کھیل میں ہر قدم پر اس کی مدد کر رہا تھا۔

سکون ایسا تھا کہ اس رات خلافِ معمول وہ جلدی سو گئی۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ بڑی وضع دار عورت تھی۔ ایک تو ڈاکٹر صاحب اور صفیہ سے ویسے ہی تعلق تھا۔ دوسرے رشتہ بھی ایسا تھا کہ اسے نبھانے کی بڑی اہمیت تھی۔ زرینہ عبدالحق کی بہن اور اس کی بیٹی تھی۔ چنانچہ وہ بڑے خلوص سے وہاں رکی تھی۔ اور اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس کا یہاں رکنا بہت فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کی اتنی طویل رفاقت کے بعد یہ تنہائی صفیہ کو شاید مار ہی ڈالتی۔

جب بھی صفیہ اداس اور ملول ہوتی، وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی۔ ...ایسے ہی تو بٹتا ہے۔

لیکن اس خوشی کا خیال اس کے ذہن سے کبھی نہیں ہٹتا تھا، جو اللہ کی طرف سے اسے ملنے والی تھی...... عبدالحق کی اولاد، وہ اس کے بارے میں سوچتی تو اس کا وجود ہیجان سے چھلکنے لگتا۔ اور عجیب بات تھی۔ وہ سوچتی تو بس اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ آتا۔ عبدالحق کا بیٹا! اور فوراً ہی اسے خیال آتا کہ ضروری تو نہیں کہ بیٹا ہی ہو۔ یہ تو اللہ کی دین ہے۔ ایک نعمت ہے تو دوسری اللہ کی رحمت۔ اور سچ یہ ہے کہ رحمت نعمت سے بڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت وسیع ہوتی ہے۔

پھر یہ عبدالحق کا بیٹا! جیسے نوربانو سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ اس نے کئی بار خود کو ٹوکا، سمجھایا۔ لیکن جب بھی خیال آیا تو وہ عبدالحق کا بیٹا، وہ ہار گئی۔

اسے ضمیر پر بوجھ محسوس ہونے لگا۔ یہ تو نوربانو کے ساتھ زیادتی تھی۔ اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں، جیسے وہ بس غرض پوری کرنے کا کوئی وسیلہ ہو۔ ایسا ہے تو نہیں۔ اس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ نوربانو کو بیٹیوں ہی کی طرح چاہتی تھی۔

پھر اسے ارجمند کا خیال آتا۔ ارجمند سے اسے ایسی محبت تھی، جیسی اولاد کی اولاد سے ہوتی ہے۔ سو یہ طے تھا کہ وہ ارجمند کو نوربانو سے بہت بڑھ کر چاہتی ہے۔ اور اب اس کی عبدالحق سے شادی کے بعد تو اس کی محبت اور بڑھ گئی تھی۔

وہ بہت خوش تھی۔ لیکن کبھی اسے خیال آتا کہ ارجمند کو عبدالحق کے بچے کی ماں بننا چاہئے تھا۔ وہ اتنی دیندار اور نیک ہے۔ بڑے ٹھاکر کی ایمان والی نسل کی امانت تو اسے ملنی چاہئے تھی۔ وہ اس کی بہت اچھی پرورش کرتی۔

پھر اسے خیال آتا کہ وہ ناشکرے پن کی مرتکب ہو رہی ہے۔

وہ یہاں اپنی خوشی سے، بغیر کسی دباؤ کے رکی تھی۔ اور خلوصِ دل سے رکی تھی۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر لمحہ لاہور میں گزارے۔ عبدالحق کی سب سے بڑی خوشی کے ہر مرحلے سے باخبر رہے۔

کئی دن وہ انتظار کرتی رہی کہ لاہور سے فون آئے گا۔ یہاں بے تکلفی کے باوجود ایک تکلف تھا۔ یہ بیٹی کی سسرال تھی، اور پھر موت کا گھر۔ یہاں سے فون کرنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

لاہور سے فون نہیں آیا۔ لیکن اس سے بڑی بات یہ تھی کہ کراچی سے عبدالحق نے بھی اسے فون نہیں کیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اسے پریشانی ہونے لگی۔ کوئی ایسی ویسی بات، کوئی گڑبڑ تو نہیں۔

دل بہت گھبرایا تو بالآخر اس نے ہر تکلف کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس روز اکبر شام کو دکان پر جانے لگا تو اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اکبر بیٹے! ذرا لاہور میری بات تو کرا دے۔''

اکبر نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر شرمندہ نظر آنے لگا۔

''تو کیا لاہور اب تک آپ کی بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں پتر! میں سوچتی رہی کہ فون آئے گا، پر پتا نہیں، کیا بات ہے......؟''

''اور آپ نے مجھ سے کہا بھی نہیں؟'' اکبر نے کہا، پھر زرینہ کی طرف پلٹا۔

''تم نے بھی حد کر دی۔ تمہیں یہ خیال نہیں آیا۔ کیا خیال رکھتی ہو اماں کا......؟''

''واقعی......! مجھے خیال ہی نہیں آیا۔'' زرینہ نے شرمندگی سے کہا۔

''لیکن اماں کو خود کہہ دینا چاہئے تھا۔''

''اماں تو بیٹی کے سسرال سمجھ کر تکلف کرتی ہیں۔'' اکبر بولا۔ پھر اس نے نمبر ملایا۔ رابطہ ملا تو وہ ریسیور حمیدہ کو دے کر خود دکان پر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد دوسری طرف سے ساجد کی آواز ابھری۔

''ارے ساجد......!''

''جی دادی اماں......!''

حمیدہ جانتی تھی کہ رابعہ فون پر بات کرنے سے گھبراتی ہے۔ لیکن درحقیقت اسے توقع تھی کہ فون ارجمند اٹھائے گی یا نوربانو۔

''تو کیا ہے پتر......!'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں دادی اماں......! لیکن اب یہاں میرا دل نہیں لگ رہا

ہے۔''

''اچھا......! اپنی چھوٹی چاچی سے یا چاچی سے بات کرا دے میری۔''

''وہ تو یہاں نہیں ہیں دادی اماں ......!''

حمیدہ کا دل دھک سے رہ گیا۔

''کیا ہوا ......؟ خیر تو ہے ......؟''

''وہ دونوں تو ایبٹ آباد چلی گئیں۔ پندرہ دن ہو گئے دادی اماں!''

حمیدہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے ......؟

''اچھا ......! تو رابعہ سے میری بات کرا۔''

رابعہ نے بتایا کہ ان دونوں کو عبدالحق نے خود ایبٹ آباد بھجوایا ہے۔ نوریز بھی ساتھ ہے۔ وجہ اسے نہیں معلوم۔

حمیدہ کو صدمہ ہوا۔ عبدالحق نے اسے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ کم از کم ارجمند ہی سے اسے فون کرا دیتی۔ کیا دنیا ہی بدل گئی۔ لیکن اتنا وہ سمجھتی تھی کہ نور بانو کسی سے کچھ بھی کرا سکتی ہے۔ اپنا دل برا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

''عبدالحق نے کراچی پہنچنے کے بعد کوئی فون کیا ......؟''

''نہیں اماں ......! میرا تو دل بڑا پریشان ہے ان کی طرف سے۔ وہ ایسا کر نہیں سکتے۔ خدانخواستہ کوئی بات ہے۔''

حمیدہ کا دل اور پریشان ہو گیا۔ واقعی! یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ عبدالحق فون نہ کرے۔

مگر اس رات ہی عبدالحق کا فون آ گیا۔

''تو کیسا ہے پتر! خیریت تو ہے ......؟'' حمیدہ نے تڑپ کر پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے اماں ......! میں شرمندہ ہوں کہ اتنے دن فون نہیں کیا۔''

''فون نہیں کیا تو کوئی وجہ بھی ہو گی۔ مجھے بتانا ......!''

''یہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گیا تھا اماں! گردے میں پتھری تھی۔ آپریشن ہوا۔ ابھی اسپتال سے گھر واپس آیا ہوں۔''

حمیدہ کا دل ہولنے لگا...... آپریشن ...... گردے کا۔ اب کیسا ہے تو ......؟''

''اب بالکل ٹھیک ہوں اماں ......! تین دن گھر پر آرام کروں گا، پھر دفتر جاؤں گا۔ تم پریشان نہ ہونا، بس دعا کرتی رہنا میرے لئے۔''

یہ تفتیش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ حمیدہ کی الجھن دور نہیں ہوئی۔ عبدالحق نے زرینہ، اکبر اور اصغر سے بات کی۔ پھر فون رکھ دیا۔

حمیدہ یہ سوچ کر کڑھتی رہی کہ اتنی بڑی بیماری کے دوران بھی عبدالحق اکیلا تھا۔ اور اب بھی اکیلا ہے۔ عبدالحق نے اسے یعقوب کی شادی کا بتایا تھا۔ مگر وہ لوگ اتنا خیال تو نہیں رکھ سکتے اس کا۔ ارجمند کو اس کے ساتھ جانا چاہئے تھا۔

ایبٹ آباد کی پریشانی تو وہ بھول گئی۔ اسے کراچی کی فکر لاحق ہو گئی۔

اگلی بار عبدالحق سے فون پر بات ہوئی تو اس نے اس سلسلے میں بات کی۔

''وہاں تو سفر کی مصروفیت سر پر سوار تھی اماں......!'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''اور یہ بات صرف ایک دن پہلے طے ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کراچی پہنچتے ہی تمہیں فون کروں گا۔ مگر درد اتنا شدید اٹھا، اور پھر......''

''مگر اس حال میں ایبٹ آباد جانے کی تک کیا تھی......؟''

''نور بانو یہ تمام عرصہ کسی بہت خوب صورت مقام پر گزارنا چاہتی ہے۔ کہتے ہیں اماں ......! کہ ان سب باتوں کا بچے پر بھی اثر پڑتا ہے۔''

''تو تو صحرا میں پیدا ہوا تھا پتر......! پر ہر طرح سے کروڑوں میں ایک ہے، خیر......'' حمیدہ کہنا چاہتی تھی کہ بالکل ابتداء میں اتنا لمبا سفر، جس میں اتنے جھٹکے لگیں، کسی طرح اچھا نہیں۔ یہ تو حمل ضائع کرنے والی حرکت ہے۔ مگر اس نے کہا نہیں کہ عبدالحق پریشان ہو جائے گا اور اپنی پریشانی اس نے یہ سوچ کر دور کر لی کہ جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ اللہ کا حکم ہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

عبدالحق اس کی خاموشی سے گھبرا گیا۔

''تم مجھ سے ناراض ہو گئیں اماں؟''

''ارے نہیں پتر! تو جانیا ہے، تجھ سے ناراض میں نہیں ہو سکتی۔''

''مگر میری غلطی ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں اماں! مجھے تم سے اجازت

لینی چاہئے تھی۔ لیکن نور بانو کا تو تمہیں پتا ہے۔ وہ جب پیچھے پڑ جائے تو ....''

''جانتی ہوں پتر..... ! پر ارجمند کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایسے میں تو ارجمند کو تیرے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ تو کتنا اکیلا ہے۔''

''یہاں یعقوب اور اس کی بیوی بھی ہے اماں..... ! اور عارف بھائی بھی ہیں۔ میری فکر نہ کرو۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''پر ارجمند کو ساتھ لٹکانے کی کیا تک تھی .....؟''

''تم جانتی ہو اماں! کہ نور بانو ارجمند کو اپنی بہنوں کی طرح چاہتی ہے۔ ایسے میں اس سے ڈھارس مل سکتی ہے اسے۔''

حمیدہ نے حجت نہیں کی۔ بابا نے کہا تھا، خاموشی سے تماشا دیکھنا۔

فون رکھنے کے بعد وہ اس پر غور و فکر کرتی رہی۔ ہر بات اسے غیر معمولی لگ رہی تھی۔ موت اللہ کا حکم ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی موت نے اسے پانچ مہینے کے لئے تمام معاملات سے دور کر دیا تھا۔

اسے بابا کے الفاظ یاد آئے، اور اسے یقین ہوگیا کہ کوئی بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ کھیل نور بانو کا ہے۔ لیکن کھیل کی نوعیت وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اور بابا نے کہا تھا..... کھیلنے دے انہیں۔ وہ سمجھتے ہیں جھوٹ کی ناؤ تیرتی رہے گی، بلکہ پار بھی لگ جائے گی۔ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

تو کیا اس کا یہاں طویل قیام بھی کھیلنے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے پردہ ہے؟ اس نے سوچا۔

مگر بچہ پیدا ہوگا، تب تو وہ ان کے ساتھ ہوگی۔

❁ ❁ ❁

ارجمند شرمندہ بھی تھی اور افسردہ بھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب وہ دادی اماں کا سامنا کبھی کیسے کر سکے گی؟

اس نے چاہا تھا کہ ایبٹ آباد روانگی سے پہلے دادی اماں کو فون کر کے بتا

دے۔ بلکہ اصولاً تو انہیں ان سے اجازت لینی چاہئے تھی۔

لیکن نور بانو نے سختی سے اسے منع کر دیا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کیوں آپی.....؟'' اس نے احتجاج کیا۔

''انہیں ہم اپنے معاملات سے جتنا دور، جتنا بے خبر رکھیں گے، اتنا ہی بہتر ہوگا۔'' نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔

''یہ بدتمیزی ہوگی آپی! وہ ہماری بڑی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہمارا جانا تو طے ہو چکا ہے۔''

''تم نہیں سمجھو گی۔ ہمارے معاملات میں رازداری کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ ایسی بات چھپانا کوئی آسان ہوتا ہے۔''

''پھر بھی آپی.....!''

اس بار نور بانو نے سخت لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میری ہر بات مانو گی۔''

''جی آپی..... ! مجھے یاد ہے۔''

پھر وہ عبدالحق کی طرف سے پریشان ہوگئی۔ جب سے عبدالحق گیا تھا، اس نے کوئی رابطہ ہی نہیں کیا تھا۔ یہ بات خلافِ معمول تھی۔ پہلے وہ ہر دوسرے تیسرے دن فون کیا کرتا تھا۔ اور جاتے ہی فون کرنا تو لازم تھا۔

اس نے نور بانو سے یہ بات کہی تو نور بانو بے پروائی سے بولی۔

''اتنی چھٹیوں کے بعد گئے ہیں تو کام میں جت گئے ہوں گے۔ ایسے ہی ہیں وہ۔ کام سے تو عشق ہے انہیں۔ میں وہاں کراچی میں تھی تو کام کے دوران میری یاد بھی نہیں آتی تھی انہیں۔''

''مگر آپی..... ! مجھے یقین ہے کہ وہ جاتے ہی فون کرتے۔''

''تم انہیں مجھ سے زیادہ تو نہیں جانتیں۔'' نور بانو نے تنک کر کہا۔

''تم یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ تم بس خوش رہو۔ کہتے ہیں کہ اس عرصے میں بس خوش رہنا چاہئے۔ پریشانی سے بچے کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

یہ سن کر ارجمند سہم گئی۔ اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا، اور اس کے پاس عبدالحق کی بہت قیمتی امانت تھی، بلکہ نور بانو کی بھی۔ اللہ اسے سرخ رو کرے، وہ بس یہ دعا ہی کر سکتی تھی۔

لیکن پریشانی کا آدمی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ بس ہوتی ہے تو ہوتی ہے۔ اور جب پریشانی کی وجہ بھی موجود ہو تو کوئی پریشانی سے کیسے بچ سکتا ہے؟

اس نئے گھر کے تمام معاملات نمٹانے کے بعد نور بانو خود بھی فکر مند ہوگئی۔ اس نے خود کراچی فون کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، لیکن فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ اس نے سوچا، ممکن ہے عبدالحق ابھی تک دفتر میں ہو۔ لیکن رات کو دیر سے فون کرنے پر بھی فون ریسیو نہیں ہوا۔

ارجمند کے برعکس نور بانو اس پر پریشان نہیں ہوئی۔ وہ تو سدا کی بدگمان تھی۔ بدگمانی کے سوا کیا کرتی؟ اسے غصہ آیا اور وہ کڑھنے لگی۔ لیکن بار بار کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہوا تو وہ پریشان ہو ہی گئی۔

پھر بالآخر عبدالحق کا فون آیا، اور پتا چلا کہ وہ بہت بیمار تھا اور اس کا آپریشن ہوا ہے۔

''کمال کرتے ہیں آپ.....! میں یہاں آپ کے لئے پریشان ہوتی رہی۔ کم از کم اسپتال جانے سے پہلے فون تو کر دیتے یہاں۔'' نور بانو اس پر برس پڑی۔

''اللہ کی بندی.....! میں اسپتال خود نہیں گیا تھا، لے جایا گیا تھا۔'' دوسری طرف سے عبدالحق نے برا مانے بغیر کہا۔

''اب میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ گردے کا درد کتنا شدید ہوتا ہے۔ درد کے اور اللہ کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا، الحمدللہ.....!''

نور بانو کو ہنسی آ گئی۔

''اس کے لئے بھی الحمدللہ کہہ رہے ہیں۔''

''الحمدللہ تو ہر حال میں کہنا چاہئے۔ بہرحال اب میں ٹھیک ہوں۔ فون

کرتا رہوں گا۔ اور ہاں.....! تمہیں اماں کو فون کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی؟''

''افراتفری میں خیال ہی نہیں رہا۔ اب کر لوں گی۔'' نور بانو نے بے پرواہی سے کہا۔

''اور سناؤ.....! ارجمند کیسی ہے؟ بات ہو سکتی ہے اس سے؟''

نور بانو نے ریسیور ارجمند کو تھما دیا۔ لیکن جتا دیا کہ یہ بات اسے اچھی نہیں لگی ہے۔

ارجمند نے عبدالحق سے مختصر گفتگو کی۔ نور بانو کے تیور اس نے پہچان لئے تھے۔ اس نے عبدالحق سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔

عبدالحق نے آخر میں کہا۔

''نور بانو کا بہت خیال رکھنا ارجمند.....!''

''جی.....! آپ فکر نہ کریں۔'' ارجمند نے کہا اور دل میں بولی، جانتی ہوں، مجھے اپنا اور آپ کی امانت کا خیال رکھنا ہے، اور آپی کا بھی۔ لیکن اس کی اس سوچ میں کوئی گلہ، کوئی شکایت نہیں تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے تم سے.....؟'' رابطہ منقطع کرنے کے بعد نور بانو نے ارجمند سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

''آپ کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''آپ کا خیال رکھنے کی تلقین کر رہے تھے۔''

نور بانو عجیب سے انداز میں ہنسی۔

''حالانکہ خیال تو مجھے تمہارا رکھنا ہوگا۔ لیکن انہیں کیا معلوم.....''

ارجمند کو اندازہ ہوگیا کہ زندگی اتنی آسان نہیں ہے، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ نور بانو ایک ایسی آگ میں جل رہی ہے، جو کبھی بجھنے والی نہیں۔ اور وہ جلے گی تو جلائے گی بھی۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ وہ اس کے لئے تیار تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ اس نے پایا ہے، وہ اللہ کی عطا ہے، بہت بڑا فضل ہے، اور اس کی وہ کوئی بھی قیمت ادا کر سکتی ہے..... ہنسی خوشی۔ عبدالحق کا ملنا تو ایک خواب تھا اس کے لئے۔ اللہ نے اسے تعبیر عطا فرما دی۔ اور یہی نہیں، اسے ایک

بہت بڑا اعزاز بھی عطا فرما دیا، جو وہ ہنسی خوشی نور بانو کو سونپ سکتی ہے۔

وہ ہر آزمائش کے لئے تیار تھی۔

❁ ❁ ❁

نوریز کو اس پر حیرت تھی کہ بالکل اچانک ہی گھر کی بیبیوں نے اس سے پردہ شروع کر دیا۔ ویسے تو وہ لاہور میں بھی کبھی گھر کے اندر نہیں جاتا تھا، سرونٹ کوارٹر ہی میں رہتا تھا۔ لیکن وہاں ایسا پردہ نہیں ہوتا تھا۔ اور چھوٹی بی بی تو اس کے سامنے ہی بڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو شروع ہی سے چادر لیتی تھیں۔ لیکن بیگم صاحبہ اس سے بے نیاز تھیں۔ البتہ لاہور سے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے پہلی بار چادر لی تھی۔

ایبٹ آباد چھوٹی بی بی تو پہلے ہی آ چکی تھیں۔ لیکن بیگم صاحبہ کا یہ پہلا موقع تھا۔

بنگلے کے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نوریز گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی روکی اور اس نے اتر کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔ لیکن بیگم صاحبہ نیچے نہیں اتریں۔ چھوٹی بی بی بھی بیٹھی رہیں۔

''یہ چوکیدار یہاں اکیلا رہتا ہے؟'' بیگم صاحبہ نے اس سے پوچھا۔

''اس کے بیوی بچے تو نہیں ہیں یہاں.....؟''

''جی نہیں بیگم صاحبہ.....! یہ یہاں اکیلا ہی ہوتا ہے۔ گھر اس کا قریب ہی ہے۔''

بیگم صاحبہ نے واضح طور پر سکون کا سانس لیا۔

''اب میری بات غور سے سنو نوریز.....! ہمیں یہاں ملازماؤں کی ضرورت ہوگی۔ دو عورتیں ہوں کم از کم، ایک ہی گھر کی ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ مگر ابھی تو پہلا مرحلہ گھر کی صفائی کا ہے۔''

''اس کی فکر نہ کریں بیگم صاحبہ.....! چوکیدار کی بیوی اور بیٹی ہفتے میں ایک دن آ کر صفائی کرتی رہی ہیں۔ اور میں نے فون کر دیا تھا۔ کل صفائی ہو چکی ہوگی۔ گھر آپ کو بالکل صاف ملے گا۔''

''چلو..... یہ بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ملازماؤں کا بندوبست جلد از جلد کرنا ہوگا۔''

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں بیگم صاحبہ.....! چوکیدار کے گھر والے یہاں سرونٹ کوارٹر میں آ جائیں گے۔ عورتیں اندر کا کام سنبھال لیں گی۔''

''نہیں.....! میں اسے مناسب نہیں سمجھتی۔'' بیگم صاحبہ نے کہا۔

''تم اپنے طور پر کوئی بندوبست کرو۔''

نوریز کو حیرت ہوئی۔ چوکیدار کے گھر والوں سے بہتر کون ہو سکتا تھا؟ وہ آدمی بھی بھروسے کا تھا۔ تاہم اس نے کہا۔

''ہو جائے گا بیگم صاحبہ.....! ہو جائے گا بیگم صاحبہ.....! یہاں میری کافی جان پہچان ہے۔''

وہ دونوں نیچے اتریں۔

''تمہارا کوارٹر کہاں ہے.....؟''

نوریز نے اشارے سے بتایا۔

''وہاں چھوٹا ٹیلی فون بھی لگوا دیا ہے صاحب نے۔ ویسا ہی ایک ٹیلی فون اندر بھی ہے۔ آپ اس پر ایک نمبر بتائیں گی تو مجھے پتا چل جائے گا۔''

نور بانو تو نہیں سمجھ سکی۔ لیکن ارجمند سمجھ گئی کہ وہ انٹر کام کی بات کر رہا ہے۔

نوریز نے فوری طور پر ادھر ادھر بات کی۔ وہاں غربت بہت تھی، اس لئے کام لوگوں کے لئے بڑی نعمت تھا۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ یہ کام اس کے گھر میں کسی کو مل جائے۔

وہاں تو امیدوار عورتوں کا تانتا بندھ گیا۔

لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بیگم صاحبہ کو ان میں سے کوئی بھائی ہی نہیں۔

نوریز خود پہاڑی علاقے کا رہنے والا تھا۔ جانتا تھا کہ یہ لوگ عام طور پر سیدھے سادے اور وفادار ہوتے ہیں۔ لیکن ایبٹ آباد کے لوگوں میں تو خوبیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ نوریز دل سے مانتا تھا کہ اس کے اپنے علاقے کے لوگ ایبٹ آباد کے

لوگوں کے مقابلے میں کہیں تیز وطرار ہوتے ہیں۔

رات کو بیگم صاحبہ نے انٹرکام پر اسے طلب کیا۔ وہ گیا تو انہوں نے اس کا اور چوکیدار کا کھانا اسے دیا۔

''آپ کو کوئی ملازمہ اچھی نہیں لگی؟'' نوریز نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''سچ تو یہ ہے کہ سبھی اچھی تھیں۔ ضرورت سے زیادہ اچھی۔'' بیگم صاحبہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''لیکن میرے مطلب کی ان میں کوئی بھی نہیں تھی۔''

اب نوریز کی یہ پوچھنے کی ہمت تو نہیں ہوئی کہ اس کی پسند کا معیار کیا ہے؟ اور ضرورت سے زیادہ اچھی سے اس کی کیا مراد ہے؟ تاہم اسے ایک اور خیال آیا۔

''آپ کہیں تو میں گاؤں سے اپنی اماں اور بہن کو لے آؤں؟ انہیں تو آپ جانتی بھی ہیں۔'' اس نے بے حد خلوص سے کہا۔

نہ جانے کیوں بیگم صاحبہ گڑبڑا گئیں۔

''ارے نہیں بھئی..... ! میں انہیں تکلیف کیسے دے سکتی ہوں؟''

''تکلیف کیسی بیگم صاحبہ..... ! یہ تو ہمارے لئے عزت اور فخر کی بات ہوگی۔''

''نہیں بھئی..... ! ہمیں تو بہت لمبے عرصے کے لئے ملازمہ چاہئے۔'' بیگم صاحبہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

اب نوریز کیا کہہ سکتا تھا؟ وہ خاموشی سے کھانا لے کر سرونٹ کوارٹر کی طرف چل دیا۔

اگلے روز بیگم صاحبہ کو ایک عورت پسند آ ہی گئی۔ لیکن اسے دیکھ کر نوریز کو صدمہ ہوا۔ دیکھنے میں ہی چالاک اور مکار لگتی تھی، اور لالچی پن اس کی نگاہوں سے صاف عیاں تھا۔

پھر وہ اپنی بیٹی کو بھی لے آئی۔ بیٹی جوان تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ ماں کے برعکس دیکھنے میں وہ سادہ لوح لگتی تھی۔

بیگم صاحبہ کی پسند اچھی نہیں ہے۔ نوریز نے دل میں سوچا۔ اللہ رحم کرے، یہ عورت کوئی چوٹ ضرور دے گی۔ اس نے سوچا، چوکیدار سے کہے گا کہ آتے جاتے اس عورت پر خاص طور پر نظر رکھے۔

✿ ✿ ✿

جو کھیل نور بانو کھیل رہی تھی، اس میں ملازمہ کی بڑی اہمیت تھی۔ پہلے دن جو عورتیں آئیں، انہوں نے اسے بڑا مایوس کیا۔ ان میں سے کوئی بھی اس کی ضرورت کے مطابق نہیں تھی۔

نور بانو نے ہر عورت سے اپنے طے شدہ معیار کے مطابق دو ہی سوال کئے تھے..... اور وہ بھی یہ بتانے کے بعد کہ انہیں مستقل طور پر سال بھر یہیں رہنا ہوگا۔ چھٹی ایک دن کی بھی نہیں ملے گی۔ بہت ضروری ہوا تو گھنٹے دو گھنٹے کی چھٹی مل سکتی ہے۔

دو ایک عورتوں کے سوا کسی کو اس پر اعتراض نہیں تھا۔ انہیں تو کام چاہئے تھا، اور وہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھیں۔

پھر نور بانو اپنا پہلا سوال کرتی۔

''تنخواہ کیا لوگی.....؟''

سب کے پاس اس کا ایک ہی جواب تھا۔

''جو چاہے، دے دینا بیگم صاب.....!'' لفظ اور پیرایہ مختلف تھا، لیکن جواب سب کا یہی تھا۔

نور بانو کو بڑی مایوسی ہوئی۔ یہ کیسے لوگ ہیں؟ اس نے دل میں سوچا۔ اتنا سخت کام، اپنے گھر سے دوری، اور اس پر بھی تنخواہ مانگنے کی ہمت نہیں۔ جو مل جائے، قبول ہے۔ ایسے لوگ اس کی مطلب کے ہو نہیں سکتے۔

پھر بھی اس نے دوسرا سوال بھی سب سے کیا۔

''اللہ اگر تم سے کہے کہ جو چاہو مانگو، تمہیں ملے گا تو تم کیا مانگو گی.....؟''

بیشتر عورتیں تو اس کی بات سمجھ ہی نہیں سکیں۔ اسے وضاحت کرنی پڑی۔

لیکن یہاں بھی جواب تقریباً ایک ہی تھا۔ گھر والوں کے لئے اور اپنے

لئے عزت کے ساتھ تین وقت کی روٹی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا ...... اور بس۔

''اللہ جی کا شکر ہے بی بی صاب! کہ سر چھپانے کو ٹھکانا دے رکھا ہے اس نے۔ بس جی یہاں روزگار نہیں ہے۔'' ایک نے ذرا تفصیل سے بات کی۔

نور بانو کی جھنجلاہٹ کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں اسے اپنے مطلب کی ملازمہ نہیں ملے گی۔

رات کو وہ سونے کے لئے لیٹیں تو ارجمند نے دھیرے سے کہا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آیا آپی ......! کہ آپ نے سب کو رد کیوں کر دیا؟ وہ سبھی اچھی تھیں۔''

''یہی تو خرابی تھی ان میں۔'' نور بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ارجمند نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں سمجھی نہیں آپی ......! قناعت پسند لوگ ایماندار بھی ہوتے ہیں اور وفادار بھی۔''

''تم نہیں سمجھو گی ارجی ......! ہماری ضرورت برعکس ہے۔''

''یعنی ہمیں بے ایمان اور دغاباز ملازمہ چاہئے۔'' ارجمند کے لہجے میں حیرت تھی۔

''یہ الفاظ ذرا زیادہ سخت ہیں۔ لیکن بہرحال ہمیں ایسی ہی ملازمہ چاہئے۔'' نور بانو نے بے حد سکون سے کہا۔

''لیکن کیوں آپی ......!''

''دیکھو، یہاں معاملہ بڑی رازداری کا ہے۔'' نور بانو نے اسے سمجھایا۔

''ہمیں نہ وفاداری چاہئے نہ ایمان داری۔ ایسے لوگ تو سچے ہوتے ہیں۔ ہمارا راز نہیں چھپا سکیں گے۔ ہاں، کوئی لالچی عورت ہو تو ہمارا راز چھپانے کی قیمت مانگے گی، جو ہم ادا کر سکتے ہیں۔ اور پھر وہ ہمارے راز کو راز رکھے گی بھی۔''

یہ بات ایک لمحے میں ارجمند کو سمجھ میں آ گئی۔ آپی کتنی ذہین اور سمجھ دار ہیں۔ اس نے دل میں سوچا۔

''ذرا سوچو! ہماری ملازمہ اندر کی بات سے واقف ہو گی۔ مگر اسے حقیقت

چھپانی ہوگی، جھوٹ بولنا ہوگا۔''

''میں سمجھ گئی۔'' ارجمند نے کہا۔

''لیکن آپی ......! ایسے لوگ خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہیں کسی کی کمزوری پتا چل جائے تو ......''

''ہم اسے موقع ہی نہیں دیں گے۔ اور پھر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو، سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

ارجمند کے خیال میں بھی بہتر یہی تھا۔ آپی جانیں، آپی سنبھالیں۔

اگلا دن بھی مایوس کن انداز میں شروع ہوا۔ وہی قناعت پسندی۔ مگر پھر جو عورت اندر آئی، اسے دیکھ کر نور بانو کے دل میں امید جاگی۔ وہ اسے غور سے دیکھتی رہی ...... خاموشی سے۔

اس عورت کی نظروں کو قرار نہیں تھا۔ ایک نظر اس نے نور بانو کو دیکھا، پھر گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو......؟'' نور بانو نے اس سے پوچھا۔

عورت نے چونک کر اسے دیکھا۔

''بڑا خوب صورت بنگلا ہے۔'' اس نے بلا جھجک کہا۔ پھر پوچھا۔

''آپ کا اپنا ہے......؟''

نور بانو نے جواب دینے کے بجائے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا اندازہ ہے......؟''

''میرے خیال میں تو آپ نے کرائے پر لیا ہے۔'' عورت نے اس بار بھی بلا توقف کہا۔

''یہ تم نے کیسے سمجھا......؟''

''بنگلہ بہت بڑا اور خوب صورت ہے۔ لیکن سامان اس حساب سے نہیں ہے۔'' عورت نے کہا۔

نور بانو خوش ہوگئی۔ یہ عورت ذہین اور متجسس بھی تھی اور جرات مند بھی۔ یہ اسے اپنے مطلب کی لگ رہی تھی۔

"بنگلہ ہمارا اپنا ہے۔لیکن میں یہاں رہنے کے لئے پہلی بار آئی ہوں۔ سامان تو اب خریدا جائے گا۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے بی بی صاب......!" عورت کا انداز اور لہجہ ایک دم بدل گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا......؟" نور بانو نے اپنا لہجہ سخت کر لیا۔

"رشیدہ......!"

"تمہاری کوئی بیٹی بھی ہے......؟"

"تین ہیں بی بی صاب......! پر ایک ابھی بہت چھوٹی ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے......"

"مجھ سب معلوم ہے بی بی صاحبہ......! مجھے اپنی ایک بیٹی کے ساتھ یہیں رہنا ہوگا......اپنے گھر کو بھول کر......"

"اور تم ایسا کر سکتی ہو......؟"

رشیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بالکل کر سکتی ہوں۔ گھر میری بڑی بیٹی سنبھال لے گی۔ کام کے حساب سے پیسے ملیں تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔"

اس "کچھ بھی کر سکتی ہوں" میں بہت کچھ تھا۔ نور بانو خوش ہوگئی۔

"پیسے کام سے زیادہ ہی ملیں گے۔" اس نے کہا۔

"اچھا......! تم خود بتاؤ، کیا لوگی......؟"

رشیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ مجھے رکھ رہی ہیں......؟"

"ابھی فیصلہ تو نہیں کیا ہے۔ لیکن تم مجھے اچھی لگی ہو۔ بولو......! کیا لو گی......؟"

رشیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔

"آپ کو تو زیادہ لگے گا بی بی صاب......! لیکن گھر چھوڑ کر یہاں رہنا آسان نہیں، اور وہ بھی دو آدمیوں کا...... آپ مجھے سو روپے مہینہ دے دیں۔"

نور بانو کو پیسوں کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ تاثر دینا مناسب نہیں ہوگا۔ اس کے سامنے ایک بہت تیز و طرار عورت تھی۔

"یہ تو واقعی بہت زیادہ ہے۔" اس نے کہا۔

"پچاس روپے تو ہم اپنے ڈرائیو کو دیتے ہیں۔"

رشیدہ مایوس نظر آنے لگی۔

"لیکن چلو...... میں تمہیں منہ مانگی تنخواہ دیتی ہوں۔" نور بانو نے جلدی سے کہا۔

"تو آپ نے مجھے رکھ لیا......؟"

"ابھی نہیں ......! دراصل میرے شوہر سی آئی ڈی میں بہت بڑے افسر ہیں۔ بہت شکی مزاج ہیں۔ پہلے تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ تو میں سوچوں گی کہ تمہیں رکھنا مناسب بھی ہے یا نہیں......؟" نور بانو نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

"تم یہاں کی تو نہیں لگتیں......؟"

"آپ نے کیسے پہچانا بی بی صاب......!" رشیدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"سی آئی ڈی افسر کی بیوی ہوں۔ میرے شوہر تو تمہیں ایک نظر دیکھ کر تمہارے پورے خاندان کے بارے میں بتا دیں۔ اور وہ سخت بھی بہت ہیں۔"

رشیدہ بہت مرعوب نظر آ رہی تھی۔

"ہم بفہ کے رہنے والے ہیں بی بی صاب......! یہ آگے مانسہرہ میں ہے...... بفہ......"

"تو یہاں کیوں آ گئے تم لوگ......؟"

"قسمت کی خرابی بی بی صاب......! بفہ میں ہماری اپنی زمین تھی۔ میرا آدمی بیمار ہوا تو ہم پر قرضہ چڑھ گیا۔ زمین ہاتھ سے نکل گئی۔ ہم یہاں آ گئے کہ یہاں صاب لوگوں کی چاکری کر کے پیسہ جمع کریں گے، پھر جا کر زمین چھوڑائیں گے۔ پر اب تک تو کچھ ہوا نہیں......"

"کتنا قرضہ ہے تمہارا......؟" نور بانو نے پوچھا۔ اس کے نکتہ نظر سے تو یہ

مثالی صورتِ حال بن رہی تھی۔

''پہاڑ جیسا ہے بی بی صاب.....!''

''پھر بھی، کچھ بتاؤ تو.....''

''چھ سو روپے ادا کرنے ہیں زمین چھوڑانے کے لئے۔'' رشیدہ نے آہ بھر کے کہا۔

نور بانو کچھ سوچ رہی تھی۔

''میں تمہیں اچھی تنخواہ دوں، اور یہاں ایک سال رکوں تو تم اتنی رقم بچا سکتی ہو۔ لیکن اگر تم نے میری مرضی کے مطابق کام کیا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ یہاں سے جاتے ہوئے تمہیں چھ سو روپے الگ سے دوں گی۔''

رشیدہ نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔ پیروں میں بیٹھ گئی۔

''میں آپ کے لئے جان بھی دے سکتی ہوں بی بی صاب.....!''

''مجھے جان نہیں، وفاداری چاہئے۔ صرف ایک بات، کہ یہاں کی کوئی بات کبھی گھر سے باہر نہ نکلے۔''

''آپ سمجھ لیں بی بی صاب.....! کہ میرے منہ میں زبان ہے ہی نہیں۔''

''دو مہینے دیکھوں گی تمہیں۔'' نور بانو نے بڑی شان سے کہا۔

''پھر تنخواہ بھی بڑھا دوں گی اور جاتے وقت وعدہ بھی پورا کروں گی۔''

''تو میں کام پر آ جاؤں.....؟''

یوں یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

اس کے بعد گھر سجانے اور سنوارنے کا مسئلہ تھا۔ فرنیچر تو وہاں موجود تھا۔

نور بانو نے خوابگاہ کی آرائش پر خاص توجہ دی۔ وہ اور ارجمند دونوں اسی کمرے میں سوتی تھیں۔

وہ ارجمند کے ساتھ گئی اور دل کھول کر خریداری کی۔ پیسے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ عبدالحق نے دونوں کے اکاؤنٹ کھلوا دیے تھے۔

رشیدہ اپنی بیٹی کو لے کر آ گئی تھی۔ وہ سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا نام آبیہ تھا۔ وہ اپنی ماں سے بالکل مختلف تھی۔ بغیر ضرورت کے وہ بولتی ہی نہیں تھی۔

اس میں تیز طراری بھی نہیں تھی۔

نور بانو کو اس طرف سے بھی اطمینان ہو گیا۔

لیکن ایک بہت بڑی فکر ابھی اسے لاحق تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس نے قبل از وقت اعلان کر کے غلطی کی ہے۔ تاریخوں میں کبھی کبھی گڑبڑ بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو پورا ایک مہینہ بھی نکل جاتا ہے۔

اب وہ ایک ایک دن گن رہی تھی۔

پھر ارجمند کا ایام کا عرصہ شروع ہو گیا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ اب ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ مطمئن ہو رہی تھی۔ دس دن اوپر ہو گئے تو گویا پوری طرح تصدیق ہو گئی۔

اس شام نور بانو نے رشیدہ سے علیحدگی میں بات کی۔

''یہاں کسی دائی کو بھی جانتی ہو تم.....؟''

''میں خود بہت اچھی دائی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''کتنی اچھی.....؟'' نور بانو نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا۔ سارے مرحلے آسان ہوئے جا رہے تھے۔

''چال دیکھ کر پہچان لیتی ہوں بی بی صاب.....!''

''تو پہچانا.....؟''

''جی بی بی صاب.....! بیٹا ہوگا اللہ نے چاہا تو.....!''

''اب تک بتایا کیوں نہیں تھا.....؟''

''آپ کے حکم کے بغیر زبان کھل سکتی ہے بھلا.....؟'' رشیدہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اچھی بات ہے۔ تم بہت سمجھدار ہو۔'' نور بانو بھی مسکرائی۔

''اچھا.....! ذرا یہ تو بتاؤ کہ بات کس کی کر رہی ہو.....؟ کس کے ہاں بیٹا ہوگا.....؟''

''آپ کے ہاں.....! اور کس کے ہاں ہو سکتا ہے.....؟'' رشیدہ نے بغیر جھجکے کہا۔

"کیسی پہچان ہے تمہاری.....؟"

"وہ کہہ رہی ہوں بی بی صاب.....! جو سب کو بتانا ہے۔" رشیدہ پھر مسکرائی۔

"میں راز داری کا مطلب سمجھ گئی ہوں، اور اس پر عمل کر کے مجھے انعام بھی لینا ہے۔ اب آپ سمجھ لیں کہ میری زبان پر اس وقت سچ نہیں آیا تو کبھی نہیں آئے گا۔ باہر کیا؟ میں تو گھر کی بات گھر میں بھی کرنے والی نہیں۔ ثبوت آپ کو دے دیا ہے۔"

"تو انعام بھی پکا سمجھو۔ لیکن غلطی نہ کرنا۔ میرا شوہر بڑا جلاد ہے، اور یہ سب کچھ اس کے کہنے پر ہو رہا ہے۔" نور بانو نے دھمکی دینا بھی ضروری سمجھا۔

"مجھے اس سے کیا بی بی صاب.....! میں تو بس آپ کی وفادار ہوں۔"

"اچھا، یہ بتاؤ.....!" نور بانو کہتے کہتے رک گئی۔

"کیا یہ سچ ہے.....؟ تم سے چوک بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"نہیں بی بی صاب.....! مجھ سے چوک نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا مہینہ ہے آپ کا۔"

عورت پکی ہے، نور بانو نے دل میں سوچا۔ اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔

"یہ خوش خبری کا انعام ہے۔"

"شکریہ بی بی صاب.....!"

"اور سنو.....! اسپتال تو ہم جا نہیں سکتے۔"

"یہ میں بھی سمجھتی ہوں بی بی صاب.....!"

"تو تم سنبھال سکوں گی نا.....؟"

رشیدہ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیئے۔

"ان ہاتھوں میں سو بچے تو نکلے ہیں بی بی صاب.....! آپ فکر ہی نہ کریں۔" اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"اس کا محنتانہ الگ سے دوں گی میں۔"

"مجھے معلوم ہے، مجھے مانگنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

"بس.....! اب ہر طرح سے خیال رکھنا ہے اس کا۔" نور بانو نے کہا۔

"اور ہاں.....! اپنی بیٹی کو سمجھا دینا۔"

"وہ تو کچھ بولتی ہی نہیں بی بی صاب.....! اللہ میاں کی گائے ہے۔ پھر بھی میں نے اسے سمجھا دیا ہے بہت اچھی طرح۔"

اب نور بانو پوری طرح مطمئن تھی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی اسے عربی زبان میں گفتگو کرنے کا موقع ملے گا۔

سعودی حکومت کے بھارت سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ بلکہ وہ پاکستان پر عموماً بھارت کو ترجیح دیتی تھی۔ لیکن پھر سوچ میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور سعودی حکومت نے پاکستان سے قریبی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنیادی تعلق تو دین کے حوالے سے تھا ہی، مسلمان آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے دونوں برادر ملک تھے۔

اس کے پیش نظر پاکستان میں سعودی سفیر کی اہمیت کو سمجھا گیا۔ چنانچہ پاکستان کے لئے جس نئے سفیر کا تقرر کیا گیا، وہ ایک سعودی شہزادہ تھا۔ شاید اس کا مقصد پاکستان کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسے اہمیت دی جا رہی ہے۔

نئے سفیر کے لئے قیمتی گاڑیاں اور دیگر ساز و سامان پاکستان آیا تو کسٹم کلیئرنس کا مرحلہ سامنے آیا۔ کلکٹر صاحب کو اتفاق سے علم تھا کہ عبدالحق عربی سے واقف ہے۔ انہوں نے یہ تمام معاملات عبدالحق کو سونپ دیئے۔

پہلی ملاقات میں عبدالحق نے شہزادہ محمد بن عثمان سے عربی میں گفتگو کی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

"آپ تو بہت اچھی عربی بولتے ہیں۔" ان کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

"یہ تو مجھے علم نہیں۔" عبدالحق نے اپنی فطری عاجزی سے کام لیا۔

’’البتہ میرے استاد بہت قابل تھے۔ پھر مجھے عربی بولنے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا۔ میں قرآن تک ہی محدود رہا۔‘‘

’’تب تو یہ بات اور حیرت انگیز ہے۔‘‘

’’مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ آپ یقیناً میری حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔‘‘

’’یہ بات نہیں ...! بس ذرا لہجے میں اجنبیت سی ہے۔ ورنہ ذخیرۂ الفاظ تو تمہارا وسیع ہے۔‘‘ شہزادے نے کہا۔

’’اور لہجے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کمی بولنے کی مشق نہ ہونے سے ہے۔‘‘

’’شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، شکریہ ...!‘‘

’’لیکن یہ کمی دور ہو جائے گی۔ میں تم سے بات کیا کروں گا؟‘‘

’’مگر آپ تو اسلام آباد میں ہوں گے۔‘‘

’’تو کیا ہوا ...؟ فون پر بھی تو بات ہو سکتی ہے۔‘‘

’’جی ... یقیناً ...!‘‘

شہزادہ کچھ سوچ رہا تھا۔

’’تم مجھے بہت اچھے لگے ہو۔ تم سے دوستی پکی ...!‘‘ اس نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔

’’لیکن تمہارا تبادلہ اسلام آباد بھی تو ہو سکتا ہے۔‘‘

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ اس تعلق کی رفتار بہت تیز معلوم ہو رہی تھی۔

’’تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سلسلے میں بات کروں ...؟‘‘

عبدالحق کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لاہور کراچی کی نسبت اسلام آباد سے زیادہ قریب تھا۔

سارے معاملات خوش اسلوبی کے ساتھ نمٹ گئے۔ شہزادہ جتنے دن کراچی میں رہا، اس نے زیادہ وقت عبدالحق کے ساتھ ہی گزارا۔ وہ اسلام آباد کے لئے روانہ ہونے لگا تو اس نے کہا۔

’’بس چند روز کی بات ہے۔ اب اسلام آباد میں ملاقات ہوگی۔‘‘

’’انشاء اللہ ...!‘‘

ایک ہفتے بعد کلکٹر کی طرف سے عبدالحق کا بلاوا آ گیا۔

’’کیا حکم ہے جناب ...!‘‘ عبدالحق نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

’’حکم میرا نہیں ... اوپر والوں کا ہے۔‘‘ کلکٹر صاحب بولے۔

’’میں سمجھا نہیں جناب ...!‘‘

’’میں نے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی۔‘‘

’’میں آپ کی یہ بات بھی نہیں سمجھا۔‘‘

’’تمہارا تبادلہ وزارتِ خارجہ میں کر دیا گیا ہے۔‘‘ کلکٹر صاحب نے تاسف سے کہا۔

عبدالحق کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ اس کا تبادلہ ہو سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کلکٹر صاحب بہت بارسوخ آدمی ہیں۔ وہ وفاقی وزیرِ خزانہ کے داماد تھے۔

’’میں نے بہت اوپر تک بات کی۔ لیکن تمہارا تبادلہ نہیں رکوا سکا۔ یہ سب شہزادے کی فرمائش پر ہو رہا ہے۔ میں نے تمہیں اس کے کام پر مامور کر کے بڑی غلطی کی۔ تمہیں کھو دیا میں نے۔‘‘

’’مجھے افسوس ہے جناب ...!‘‘

کلکٹر صاحب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

’’ایک بات بتاؤ......! تم اس تبادلے پر خوش ہو نا ...؟‘‘

’’میں جھوٹ نہیں بولوں گا سر ...! میرے لئے اس میں بہتری ہے۔‘‘

’’کیا یہ تبادلہ تمہاری خواہش یا فرمائش پر ہوا ہے ...؟‘‘

’’مجھے افسوس ہے جناب ...! کہ آپ نے ایسا گمان کیا۔‘‘ عبدالحق نے دھیمے لہجے میں کہا۔

’’میں سفارش کا قائل نہیں ہوں۔ اور اپنا کام خوش دلی اور ایمانداری سے کرتا ہوں۔ یہ تبادلہ نہ ہوتا تو بھی مجھے کوئی فرق نہ پڑتا۔‘‘

’’سوری عبدالحق......! مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔‘‘

’’اس میں آپ کا قصور نہیں۔ صورتِ حال ہی ایسی تھی۔‘‘

''اور تم دیانتدار اور کام والے نہ ہوتے تو میں تمہارے تبادلے کی پرواہ کیوں کرتا؟'' کلکٹر صاحب نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''میں نے سعودی شہزادے سے اپنا تبادلہ کرانے کے لئے تو نہیں کہا، لیکن آپ چاہیں تو اپنا تبادلہ رکوانے کے لئے ان سے بات کر سکتا ہوں۔''

''نہیں بھئی.....! تمہارے لئے یہ مناسب نہیں۔''

''کیوں.....؟''

''حیرت ہے کہ تم اتنا عرصہ یہاں کام کر کے بھی یہ بات نہیں سمجھے۔'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''تم اپنا تبادلہ رکوانے کی کوشش کرو گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم رشوت خور ہو۔ یہ محکمہ ہی ایسا ہے عبدالحق.....!''

''میں یہ بات سمجھتا ہوں جناب.....! لیکن اسے اہمیت نہیں دیتا۔'' عبدالحق کے لہجے میں بے پرواہی تھی۔

''مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ کون مجھے کیا سمجھتا ہے؟ میں تو بس اللہ کو جواب دہ ہوں اور میرا ضمیر میرا محتسب ہے۔''

''بہرحال! اس کی ضرورت نہیں۔'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''لیکن میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔''

''شکریہ جناب.....!'' عبدالحق نے تبادلے کا حکم نامہ لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

یوں اس کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔

❁ ❁ ❁

جنگ بغیر اعلان کے شروع ہوئی تھی۔ بھارتی جنرلوں کو یقین تھا کہ رات کو وہ لاہور جم خانہ میں جامِ فتح بلند کریں گے۔

اکبر اس روز وقت سے پہلے ہی گھر آ گیا۔ وہ بہت متوحش نظر آ رہا تھا۔

''خیر تو ہے.....؟ کیا بات ہے پتر.....؟'' حمیدہ نے اس سے پوچھا۔

''بھارت نے حملہ کر دیا ہے اماں.....!''

''کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ منہ کی کھائے گا۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو.....؟''

''ہم سرحد کے بہت قریب ہیں اماں.....! قریب کے کچھ گاؤں گولہ باری کی زد میں آئے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں پتر.....! رب خیر کرے گا۔''

''مجھے بات تو پوری کرنے دیں۔ ادھر ادھر کے گاؤں کے لوگ نقل مکانی کر رہے ہیں۔''

''بے وقوفی ہے۔ اپنے گھر چھوڑ کر کوئی جاتا ہے؟''

اکبر کی آواز سن کر صفیہ بھی وہاں آ گئی۔ تاہم اس نے مداخلت نہیں کی۔ شوہر کی موت کے بعد اسے دنیا میں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ اس وقت بھی اسے تجسس نہیں ہوا۔ خاموشی سے سنتی رہی۔

''جان ہے تو جہان ہے اماں.....!'' اکبر نے قدرے جھنجلا کر کہا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا اور نرم لہجے میں بولا۔

''اس تمام علاقے میں پاکستان کے فوجی آ گئے ہیں اور مورچے قائم کر رہے ہیں۔ ان کا عام لوگوں سے یہی کہنا ہے کہ وہ نقل مکانی کر جائیں۔ جو علاقہ میدانِ جنگ بن جائے، وہ رہائشی نہیں رہتا۔''

اس وقت زرینہ بھی آ گئی۔

''مطلب کیا ہے ان سب باتوں کا.....؟'' حمیدہ نے کہا۔

''مطلب یہ ہے اماں.....! کہ ہمیں وقتی طور پر علاقہ چھوڑ دینا چاہئے۔''

''تم جانتے ہو کہ میں عدت میں ہوں۔'' صفیہ نے پہلی بار زبان کھولی۔

''امی.....! مجبوری میں اللہ نے آدمی کو ہر معاملے میں رعایت دی ہے۔''

''لیکن اس کا فیصلہ بندے پر چھوڑ دیا ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''رعایت فائدہ اٹھانے کے لئے نہیں ہے۔ اپنے نفس کے لئے نہیں ہونی چاہئے۔''

''جی ہاں..... ! لیکن زندگی کو خطرہ ہو تو اللہ نے حرام کو حلال قرار دیا ہے۔''

''وہ بھی مشروط ہے۔ اجازت پیٹ بھرنے کی نہیں ''

''تو میں بھی جان بچانے کی بات کر رہا ہوں۔''

زرینہ سحر زدہ سی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اب حمیدہ بھی خاموش تھی۔ بحث ماں اور بیٹے کے درمیان تھی۔

''ہاں ..... ! یہ تو ہے۔'' صفیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

اکبر خوش ہوگیا کہ اس نے ماں کو قائل کر لیا۔

''لیکن ہم گھر چھوڑ کر جائیں گے کہاں .....؟ اچانک زرینہ بولی۔

''اور چاہے جنگ میں سب کچھ ختم ہو جائے، ایک دن لوٹ کر تو یہیں آنا ہے۔''

یہ سن کر حمیدہ کی آنکھوں میں چمک ابھری۔ ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ مچلی۔

''دوسرے لوگ بھی تو جا رہے ہیں۔'' اکبر زرینہ کی طرف پلٹا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

''ان کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ ہم کون سا ان سے مختلف ہیں۔ آدمی کو وقت اور حالات کے مطابق سوچنا اور فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔''

''تمہارے لئے یہ پریشانی نہیں۔'' حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

''لاہور میں تمہارا اپنا گھر موجود ہے۔''

اکبر نے سکون کی سانس لی۔ مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ پہلے امی قائل ہوئیں، اور اب اماں۔

''شکریہ اماں.....!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو تم کب جا رہے ہو.....؟'' صفیہ نے اسے چونکا دیا۔

''ہم سب جائیں گے امی .....!''

''نہیں..... ! میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ میں عدت پوری ہونے سے

پہلے یہاں سے ہلوں گی بھی نہیں۔ تم زرینہ کو لے کر چلے جاؤ۔''

''لیکن آپ تو قائل ہوگئی تھیں۔ ابھی ذرا پہلے آپ نے میری بات مان لی تھی۔''

''تمہارے لئے، اپنے لئے نہیں۔ ایسے فیصلے اپنے اپنے ہوتے ہیں۔ تم اپنے فیصلے پر عمل کرو، میں اپنے فیصلے پر عمل کروں گی۔'' صفیہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

اکبر نے بے بسی سے حمیدہ کی طرف دیکھا۔

''آپ ہی انہیں سمجھائیں اماں .....!''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں پتر..... ! ہر آدمی کا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔''

''میں امی کو یہاں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میں ان کے ساتھ رہوں گی۔''

''اور میں بھی.....!'' زرینہ نے جلدی سے کہا۔

اکبر حیرت اور بے بسی سے بار بار ان کے چہرے دیکھتا رہا۔

''ان بوڑھی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے پتر اکبر..... ! اللہ کی بڑی قدرت دیکھی ہے۔'' حمیدہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس وقت ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

''یہ جگہ جو اب حق نگر کہلاتی ہے، شہر کا شہر بس گیا ہے، یہاں کبھی کئی چھوٹے بڑے گاؤں ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک دن جنگ سے بڑی ... بہت ہی بڑی آفت آئی اس علاقے پر، لال آندھی..... !

میں نے بڑی منتیں کر کے عبدالحق کو یہاں سے بھگا دیا۔ وہ جا ہی نہیں رہا تھا کسی طرح۔ اور میں خود یہیں رکی رہی اللہ کے بھروسے پر ...''

''تو آپ بھی چلی جاتیں عبدالحق بھائی کے ساتھ ...!'' اکبر نے کہا۔

''یہی تو وہ بھی کہہ رہا تھا۔'' حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''پر میں جانتی تھی کہ وہ دوڑ سکتا ہے، میں نہیں دوڑ سکتی۔ میں اس کا بوجھ بن جاؤں گی۔ میری وجہ سے وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ کبھی نہ جاتا میرے بغیر ... پر

میں نے اپنی قسم دی تو وہ ہار گیا۔''

''آپ کیسے بچیں.....؟'' اکبر نے پوچھا۔

''پتا نہیں.....! رب ہی جانتا ہے۔ تم اس آندھی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ریت کی دیواریں تھیں جو اُڑ رہی تھیں۔ مجھے کچھ نہیں پتا تھا کہ میں کہاں جا رہی ہوں؟ ریت نے مجھے سچ مچ اندھا کر دیا تھا۔ وہ تمام گاؤں ریت کے نیچے دفن ہوگئے۔ مجھے اللہ نے کہیں پہنچا دیا۔ میں اندھی ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں؟ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک بار کسی انسان کی آواز سنی تھی.....بس ایک بار..... اس سے پتا چل گیا تھا کہ وہاں کھجور کا ایک درخت ہے اور پانی کی ایک چائی..... برسوں میں وہاں اکیلی رہی۔ کھجوریں اور پانی مجھے ملتا رہا۔ چائی میں پانی کہاں سے آتا تھا، مجھے نہیں پتا۔ وہاں تو ہوا چلنے کی بھی چاپ نہیں تھی۔ میں اندھی، اندازے سے نماز پڑھتی تھی۔ مجھے دن کا پتا تھا نہ رات کا.....''

اکبر سحرزدہ سانس لے رہا تھا۔

''پھر ایک دن میرا پتر عبدالحق وہاں آگیا۔ اس کے ساتھ زبیر اور رابعہ کے علاوہ نور بانو بھی تھی۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اللہ نے کیسے مجھے زندہ رکھا؟ اور کیسے عبدالحق کو مجھ تک لایا؟ میں سمجھ نہیں سکتی تھی۔ بس اس کی قدرت، اس کا کرم، پھر مجھے آنکھیں بھی واپس مل گئیں۔ اللہ کی مہربانی سے عبدالحق نے مٹی ہٹوائی، اپنی حویلی برآمد کرائی۔ یہ کام ایسا تھا، جیسے کوئی پہاڑ ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دے۔''

''کچھ تھوڑا سا تو میں نے بھی دیکھا ہے اماں.....!''

''تم نے کچھ نہیں دیکھا پتر.....! صرف حویلی اوپر آنے تک مٹی کا بہت بڑا پہاڑ کھڑا ہوگیا تھا۔ تم نے تو کچھ دیکھا ہی نہیں۔''

''میں نے جو دیکھا، اس سے اندازہ لگا سکتا ہوں۔''

''یہ بھی سمجھے کہ میں نے تمہیں یہ سب کیوں سنایا.....؟''

''اللہ کی قدرت بتانے کے لئے.....!''

''وہ تو ہے۔ پر مجھے یہ بتانا تھا کہ اللہ نے دفن ہوئے مردہ گاؤں پر سے

مٹی ہٹوا کر اس زمین پر یہ حق نگر آباد کرایا۔ یہاں کبھی ٹھاکروں کی گڑھی اور ہندوؤں کے دیگر گاؤں ہوتے تھے۔ اگر اس آندھی میں یہ سب دفن نہ ہوتے تو آج یہ زمین ہندوستان میں ہوتی۔ لیکن اب یہ حق نگر ہے اور پاکستان میں ہے۔ یہ حق نگر پاکستان کی طرح اللہ کا معجزہ ہے، اس کا کرم ہے۔'' وہ رکی اور اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔

''کون جانے، وقت کہانی دہرا رہا ہو۔ ممکن ہے، کافروں کے گاؤں سے یہاں تباہی ہو۔ پر میرا ایمان ہے کہ حق نگر ختم بھی ہوگیا تو دوبارہ آباد ہوگا۔ برسوں پہلے میں نے عبدالحق کو یہاں سے جانے پر مجبور کیا تھا، آج تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم زرینہ کو لے کر چلے جاؤ۔ ہم دو بوڑھی عورتوں کو یہاں چھوڑ جاؤ۔ انشاء اللہ تم واپس آؤ گے تو ہم تمہیں یہیں ملیں گی۔ تم چلے جاؤ بیٹے.....!''

اکبر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''آپ نے میری آنکھیں کھول دیں اماں.....!'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

''اب ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ زمین کتنی قیمتی ہے۔''

''شکر ہے کہ تم نے اللہ کے اس انعام کو سمجھ لیا۔ یہ حق نگر اللہ کا تحفہ ہے۔ اس آندھی سے پہلے اس زمین پر میرے شوہر، میرے بیٹے اور میرے علاوہ نماز پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔''

''میں سمجھ گیا اماں.....!''

''کاش! یہ بھی سمجھ لو کہ پاکستان کتنی بڑی نعمت ہے۔'' صفیہ نے کہا۔

''اور اس کی قیمت مسلمانوں نے اپنے خون اور مال اور آبرو سے چکائی ہے۔''

اکبر نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''اب میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا امی.....!''

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو یہ اطلاع عام لوگوں سے پہلے مل گئی تھی۔ عوام کو تو خبروں میں پتا چلا تھا۔

وہ محکمہ خارجہ کے لئے ایک مصروف ترین دن تھا۔ احتجاجی مراسلہ تیار کر کے بھارت کے سفیر کے حوالے کر دیا گیا۔ بھارت نے بغیر کسی جواز اور بغیر اعلان کے فوج کشی کر کے عالمی قوانین کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔

تمام دوست ممالک سے رابطے کئے گئے۔ ان پر صورتِ حال واضح کر کے ان سے ہر ممکنہ مدد کی درخواست کی گئی۔

لیکن ریڈیو پر عوام سے صدرِ پاکستان کا خطاب اہم ترین سنگ میل قرار پایا۔ جوش، ولولے اور عزم سے بھرپور اس خطاب نے عوام میں نئی روح پھونک دی۔ اٹھارہ سالہ قوم نے ایک انگڑائی لی اور چودہ سو سالہ اُمت بھی تبدیل ہوگئی۔ ہر شخص اپنے مقام پر جیسے اپنے محاذ پر تھا، اور جنگ لڑ رہا تھا۔

جنگ کے لئے تیار نہ ہونے کے باوجود پاکستانی افواج نے بزدل دشمن کو حیران کر دیا، جس نے رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کیا تھا اور سوچا تھا کہ محض چند گھنٹوں میں وہ لاہور پر قابض ہوگا۔ افواجِ پاکستان نے نہ صرف موثر دفاع کیا، بلکہ جارحانہ حکمت عملی تیار کر کے اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔

وزارتِ خارجہ میں مصروفیت ایسی تھی کہ دن اور رات برابر ہوگئے تھے۔

عبدالحق کا تبادلہ سعودی سفیر شہزادہ محمد بن عثمان کی فرمائش پر ہوا تھا۔ اس لئے اسے ذاتی طور پر بھی سعودی سفیر سے رابطے کے لئے کہا گیا۔ کیونکہ سعودی حکومت کا ردِعمل کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

انڈونیشیا اور چین دو ایسے ممالک تھے، جنہوں نے اس موقع پر پاکستان کی کھل کر مدد کی۔

عبدالحق نے سعودی سفارت خارجہ جا کر شہزادہ محمد بن عثمان سے ملاقات کی۔ شہزادے نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''مجھے شرمندگی ہے برادر عبدالحق! کہ میری محبت نے تمہیں مصیبت میں

پھنسا دیا۔''

''یہ میرے لئے مصیبت نہیں ..... ایک اعزاز ہے یور ہائی نس۔'' عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''اور میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔''

وہ ان کے درمیان پہلی ملاقات تھی۔ کیونکہ عبدالحق کو اسلام آباد میں وزارتِ خارجہ جوائن کئے چند ہی دن ہوئے تھے۔

''تم مجھ سے تکلف نہ کیا کرو برادر عبدالحق..... !'' شہزادے نے بڑی محبت سے کہا۔

''یہ تکلف نہیں، آپ کے مقام کا تقاضا ہے۔ اس عمارت میں تو میں آپ کے یور ہائی نس کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔''

''لیکن یہ ملاقات سرکاری تو نہیں۔ وزارتِ خارجہ سے مجھے سرکاری طور پر جو پیغام ملا تھا، وہ میں نے اپنی حکومت کو پہنچا دیا ہے۔''

''یہ غیر رسمی، نیم سرکاری ملاقات ہے یور ہائی نس۔ ہمیں اس وقت برادر ملک کی امداد کی اشد ضرورت ہے۔''

محمد بن عثمان نے ایک گہری سانس لی۔

''میں اس وقت تم سے جو گفتگو کروں گا، وہ ذاتی حیثیت میں ہوگی۔''

''میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں یور ہائی نس۔''

''بدقسمتی سے ہماری حکومت کا جھکاؤ بھارت کی طرف رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ تجارتی مجبوریاں ہیں۔ لیکن مجھ سمیت حکومت میں بعض اہم افراد اس میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ پاکستان ایک مسلم ملک ہے، اور ہمیں بھارت پر اسے فوقیت دینی چاہئے۔ میری سفیر کی حیثیت سے یہاں تقرری اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ لیکن یہ تبدیلی بتدریج ہوگی۔ پالیسیوں پر یوٹرن لینا کسی بھی طرح اچھا نہیں ہوتا۔''

''لیکن یور ہائی نس .....''

''مجھے بات پوری کرنے دو برادر.....!'' محمد بن عثمان نے نرم لہجے میں

کہا۔
''اس وقت ہم کھل کر پاکستان کی مدد نہیں کر سکتے۔ لیکن ہم مدد ضرور کریں گے۔ البتہ راز داری کے ساتھ۔ اور تمہاری حکومت کو بھی اس راز داری کا پاس رکھنا ہوگا۔ مجھے اس کی ضمانت درکار ہے۔''
''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں......'' عبدالحق نے جوش سے کہا۔
محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔'' تم میرے لئے قابل احترام ہو برادر......! لیکن یقین دہانی سرکاری ہونی چاہئے۔''
''یہ کام انشاء اللہ آج ہی ہو جائے گا۔''
''ہمارے پاس حربی وسائل تو ہیں نہیں، ہم مالی مدد کے علاوہ صرف تیل فراہم کر سکتے ہیں۔''
''جزاک اللہ......! یور ہائی نس۔ یہ ہمارے لئے بہت ہے۔''
''اور مجھے تمہاری افواج کی کارکردگی پر خوشی بھی ہے اور فخر بھی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ مسلمان موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ شوقِ شہادت سے مالا مال ہوتا ہے۔ کاش پوری اُمت ایسی ہو جائے۔''
''آمین......!'' عبدالحق نے دل کی گہرائی سے کہا۔
''میں آپ کا شکرگزار ہوں یور ہائی نس......! اب میں......''
محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔
''بقول تمہارے غیر رسمی، نیم سرکاری ملاقات ہو چکی۔ اب یہ ذاتی ملاقات ہے۔''
''جی...... بہت بہتر......!''
محمد بن عثمان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔
''بہت تھکے تھکے لگ رہے ہو برادر......!''
''گزشتہ تین روز مصروفیت ہی ایسی رہی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نیند نہیں مل سکی ہے۔''
''ارے ہاں......! تمہارے گھر والے تو لاہور میں ہیں نا......؟''

اس سوال نے عبدالحق کو چونکا دیا۔ ان تین دنوں میں اسے کچھ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔
''اس وقت تو ہم بکھرے ہوئے ہیں یور ہائی نس۔'' اس نے جواب دیا۔
''میرے بھائی بھابی اور بھتیجا تو لاہور میں ہیں۔ دونوں بیویاں ایبٹ آباد میں ہیں، اور......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔
محمد بن عثمان اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت سپید پڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں خالی پن تھا، جیسے وہ شاک میں ہو۔
''کیا ہوا برادر عبدالحق......! خیریت تو ہے......؟''
عبدالحق نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن دور ہو چکا تھا، اور اب ان میں سراسیمگی تھی۔
''کیا ہوا برادر......؟'' شہزادے کے لہجے میں شفقت تھی۔
''میری اماں......'' عبدالحق کے لئے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔
''......وہ سرحد کے قریب میرے آبائی قصبے حق نگر میں ہیں...... میری بہن کے ساتھ۔''
''اوہ......!'' محمد بن عثمان نے بے ساختہ کہا۔ پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں حیرت تھی۔
''اور تمہیں اب تک اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلی بار تمہیں خیال آیا ہے ان کا؟ تین دن بعد......؟''
''جی......! فرصت ہی نہیں ملی۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔
''تو اب تم کیا کرو گے......؟''
''دعا ہی کر سکتا ہوں ان کے لئے۔''
''جا کر انہیں واپس لاہور کیوں نہیں لے آتے......؟''
''ایسے وقت میں ذاتی معاملات پیچھے چلے جاتے ہیں یور ہائی نس۔ میں ایک دن کی چھٹی بھی نہیں لے سکتا۔ ویسے بھی حفاظت کرنے والا تو اللہ ہے۔''
محمد بن عثمان اب اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری عربی بولنے کی صلاحت نے مجھے تمہارا دوست بنایا برادر عبدالحق......!" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

"لیکن اب میں تمہیں گہرائی میں دیکھ رہا ہوں تو مجھے تم سے تعلق پر فخر محسوس ہو رہا ہے۔"

عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔ اب وہ اماں اور حق نگر کے بارے میں فکر مند تھا۔

"ایک بات بتاؤ......! جہاں تمہاری ماں ہیں، وہاں فون ہے......؟"

"جی ہاں......! ہے۔"

"نمبر بتاؤ......!"

عبدالحق نے نمبر بتایا۔ محمد بن عثمان نے نمبر ملایا۔ کئی بار کی کوشش ناکام ہوئی تو اس نے اپنے سیکرٹری سے کہا کہ اس سلسلے میں ایکسچینج سے معلومات کرے۔

سیکرٹری نے بتایا کہ تقریباً تمام سرحدی علاقوں کا مواصلاتی رابطہ باقی ملک سے منقطع ہو چکا ہے۔

"اب تو بس یہی ایک صورت ہے کہ تم خود وہاں جاؤ۔" محمد بن عثمان نے عبدالحق سے کہا۔

"اور یہ ممکن نہیں......!"

"خیر......! یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اب سرکاری بات ہو جائے۔"

عبدالحق کو محمد بن عثمان کے اس اچانک رویے پر حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"جیسا کہ میں نے کہا کہ ان معاملات میں راز داری کی ضرورت ہے۔ قوموں کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم میری بات غور سے سنو......! میں نے پہلے ہی بتا دیا کہ ہماری حکومت کھل کر تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ بات خبروں میں نہیں آئے گی اور میں تمہارے صدر یا وزیر خارجہ سے ملوں تو یہ خبر بنے گی۔ اور ان میں سے کوئی مجھ سے ملنے آئے تو یہ بھی خبر ہوگی۔ مجھے قومی سطح پر اس یقین دہانی کی ضرورت ہے کہ ہم پاکستان کے لئے جو کچھ بھی کریں گے۔ اس

کے بارے میں مکمل راز داری سے کام لیا جائے گا۔ اب یہ کام آسان تو نہیں۔"

عبدالحق سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایک ہی راستہ ہے۔"

"ٹیلی فون......!" محمد بن عثمان نے اس کی بات پوری کر دی۔

"جی ہاں......!"

"ٹیلی فون بھی ہاٹ لائن......صدر صاحب خود مجھ سے بات کریں گے۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں......!"

"مسئلہ ہے۔" محمد بن عثمان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"یہ بات صدر صاحب تک کون پہنچائے گا......؟"

عبدالحق چکرا گیا۔ بات درست تھی۔ مسئلہ پروٹوکول کا تھا۔ وہ براہ راست صدر صاحب سے تو بات نہیں کر سکتا۔ اصولاً تو اسے یہ بات سیکرٹری خارجہ سے کرنا تھی۔ سیکرٹری خارجہ وزیر خارجہ سے اور پھر وزیر خارجہ صدر سے بات کرتا۔

محمد بن عثمان جیسے اس کی سوچیں پڑھ رہا تھا۔

"تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ لیکن ہمیں کوئی اور صورت نکالنی ہوگی۔"

"مجھے تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔"

"سوچا جائے تو کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔"

ذرا دیر بعد محمد بن عثمان نے ایک خاکہ عبدالحق کے سامنے رکھ دیا۔ تفصیل اس نے زبانی بتائی۔

❁ ❁ ❁

"تو وہ ہماری امداد نہیں کریں گے......؟" سیکرٹری نے کہا۔

"جی جناب......! انہوں نے صاف انکار کر دیا۔"

"یہ تو حال ہے مسلمانوں کا۔ مسلمانوں کے بجائے کفار کی مدد کرتے ہیں۔" سیکرٹری جذباتی ہو گیا۔

"اور جناب......! انہوں نے مجھے ایک شکایت نامہ اس ہدایت کے ساتھ دیا ہے کہ یہ مجھے خود صدر صاحب کو پہنچانا ہے۔"

"وہ کون ہوتا ہے یہ حکم صادر کرنے والا.....؟" سیکرٹری کو غصہ آ گیا۔

"لاؤ.....! مجھے دکھاؤ وہ شکایت نامہ۔"

"انہوں نے کہا تھا کہ یہ میں صرف صدر صاحب کے ہاتھ میں دوں۔"

"تم حکومت پاکستان کے ملازم ہو عبدالحق صاحب.....! کسی اور کے حکم کے پابند نہیں ہو۔"

"یہ درست ہے جناب.....!" عبدالحق نے وہ سرکاری خط سیکرٹری کے حوالے کر دیا۔

خط کھلے ہوئے لفافے میں تھا۔ سیکرٹری کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ تاہم اس نے خط نکالا اور پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے دوران اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اس کا غصہ بڑھ رہا ہے۔

"یہ بکواس ہے.....؟" اس نے خط کو دوبارہ لفافے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"انہیں شبہ ہے کہ ان کی کالیں ٹیپ کی جا رہی ہیں۔ انہیں شبہ ہے کہ انٹیلی جنس والے ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے سفارتی حقوق پامال کئے جا رہے ہیں۔ نری بکواس ہے۔"

"مجھے تو معلوم نہیں جناب.....! میں نے تو پڑھا بھی نہیں۔"

سیکرٹری نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"اور حال یہ ہے کہ وہ خود سفارتی آداب سے بے بہرہ ہے۔" اس نے کہا۔

"ہمارے ہی افسر کے ہاتھ یہ شکایت نامہ بھیجنا..... اس کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ وہ فرسٹ سیکرٹری کے ہاتھ یہ خط ہمیں بھجواتا۔ صدر صاحب سے براہ راست.....!"

"اس وقت صورتِ حال کچھ ایسی ہے جناب.....! کہ میرے خیال میں صدر صاحب......"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیکرٹری نے فون اٹھایا۔

عبدالحق جانتا تھا کہ یہ کس کا فون ہے۔ وہ پروگرام کے عین مطابق تھا۔

"ٹھیک ہے۔ بات کراؤ.....!" سیکرٹری نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر عبدالحق سے بولا۔

"ہز ہائی نس پرنس محمد بن عثمان کا فون ہے۔" اس کے لہجے میں تحقیر تھی۔

عبدالحق نے بے پرواہی سے سر جھٹک دیا۔

"جی.....! آپ کیسے ہیں یور ہائی نس۔" سیکرٹری فون پر بھی تقریباً کورنش بجا لایا۔

"میرا شکایت نامہ صدر صاحب تک پہنچا دیا گیا.....؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

"نہیں یور ہائی نس۔ ابھی تو عبدالحق صاحب یہاں پہنچے ہیں۔"

"آپ نے پڑھ لیا اسے.....؟"

"میں کیسے پڑھ سکتا ہوں یور ہائی نس۔ جبکہ وہ صدر صاحب کے لئے ہے۔" سیکرٹری نے عبدالحق کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"بس.....! تو آپ عبدالحق کے ہاتھ اسے صدر صاحب کو بھجوا دیں۔"

"سوری یور ہائی نس، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔" سیکرٹری نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کیوں.....؟" دوسری طرف سے سخت لہجے میں پوچھا گیا۔

"یہ پروٹوکول کے خلاف ہے یور ہائی نس۔ قاعدے کے مطابق ہم تو قاصد کے ذریعے اسے صدر صاحب کے سیکرٹریٹ تک بھجوا سکتے ہیں۔"

"آپ یہ نہ بھولیں مسٹر سیکرٹری کہ آپ اس وقت حالت جنگ میں ہیں۔ میری شکایات بڑی سنگین نوعیت کی ہیں، جن کا فوری طور پر ازالہ کیا جانا چاہئے۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ مجھے یہ علم ہے کہ آپ کے دفاتر میں فائلیں کس رفتار سے چلتی ہیں۔ اسی لئے اس خط کو ڈائریکٹ صدر صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔"

"لیکن یور ہائی نس، یہ عبدالحق کا..... بلکہ میرا بھی منصب نہیں کہ ہم براہ راست صدر صاحب....."

"آپ بس اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ طریقہ میں بتاتا ہوں۔" دوسری

طرف سے خشک لہجے میں کہا گیا۔

سکریٹری سنتا رہا۔ پھر اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''یس یور ہائی نس۔'' اور فون رکھ دیا۔

فون رکھنے کے بعد اس نے رومال سے پیشانی کا پسینہ خشک کیا اور عبدالحق کو پُرخیال نظروں سے دیکھتا رہا۔

''تمہاری تو سفیر صاحب سے خاصی گہری دوستی ہے۔''

''دوستی تو لیول کے مطابق ہوتی ہے جناب.....!'' عبدالحق نے بے تامل کہا۔

''میں عربی بول اور سمجھ لیتا ہوں، کسٹمز میں اس بنیاد پر ہز ہائی نس کا کنسائنمینٹ میرے سپرد کیا تھا۔ دوستی کیسی جناب.....!''

''لیکن تمہارا یہاں تبادلہ بھی انہی کی فرمائش پر ہوا ہے۔'' سکریٹری کا انداز معترفانہ تھا۔

''مجھے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ میں کسٹمز میں بہت خوش تھا۔''

سکریٹری مسکرایا۔

''یہی تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کسٹمز چھوڑ کر وزارت خارجہ میں کون آتا ہے.....؟''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''میں تو ہر جگہ اور ہر حال میں خوش رہنے والا آدمی ہوں جناب.....!''

سکریٹری نے جیسے سنا ہی نہیں۔

''یعنی یک طرفہ محبت ہے یہ۔ ہز ہائی نس نے تمہیں بلوا لیا..... تمہاری مرضی کے خلاف۔''

عبدالحق کو غصہ تو بہت آیا۔ لیکن سامنے جو بڑے معاملات تھے، ان کے پیش نظر اسے پی لینا ہی مناسب تھا۔ تاہم اس نے کہا۔

''کیسی محبت، کہاں کی دوستی جناب.....! دیکھیں، اسی خیال سے تو مجھے ان کے پاس بھیجا گیا تھا۔ ورنہ میری اتنی حیثیت تو نہیں تھی۔ اور اب نتیجہ دیکھیں۔

میں خالی ہاتھ واپس آیا..... لیکن نہیں، ساتھ میں الٹا ایک شکایت نامہ لے آیا۔''

''ڈپلومیسی درحقیقت منافقت اور بے غیرتی کا نام ہے۔'' سکریٹری نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''اب مجھے دیکھو، جی تو میرا چاہ رہا تھا کہ بے بھاؤ کی سناؤں اسے۔ لیکن سب کچھ بھول کر مجھے اس کی ہدایت پر عمل کرنا ہے۔''

''میں جا سکتا ہوں.....؟'' عبدالحق نے معصومیت سے پوچھا۔

''ابھی نہیں.....!'' سکریٹری نے کہا۔

''میں صدر صاحب کے پی اے سے بات کر لوں۔ پھر بتاتا ہوں۔''

❁ ❁ ❁

صدر کی شخصیت ایسی تھی کہ ان کے سامنے آدمی کو اپنا وجود بے معنی لگنے لگتا تھا۔ عبدالحق تو ویسے ہی ان سے بہت متاثر تھا۔ وہ نہ معیشت داں تھے نہ ماہر اقتصادیات۔ لیکن انہوں نے نہایت قابل اور لائق لوگوں کی ایک ٹیم بنائی تھی، جس نے ملکی معیشت کو مستقبل کے لئے ایک نہایت ٹھوس بنیاد فراہم کر دی تھی۔ اس کے نتیجے میں ملک میں خوش حالی آ رہی تھی۔ اچھے حکمراں ایسے ہی ہوتے ہیں۔

''سنا ہے کہ سعودی سفیر نے اپنا کوئی شکایت نامہ مجھے بھیجنے پر اصرار کیا ہے اور وہ بھی صرف تمہارے ذریعے۔'' صدر صاحب نے گونج دار آواز میں کہا۔

''لاؤ وہ شکایت نامہ دیکھا تو جائے۔''

لفافہ عبدالحق کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے صدر صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ محض دکھاوا ہے جناب صدر.....! اسے پھاڑ کر پھینک دیجئے گا۔ اصل پیغام تو زبان ہے۔ یہ کہ آپ سعودی سفیر سے ہاٹ لائن پر بات کر لیں۔''

صدر صاحب کے چہرے پر حیرت کے آثار نظر آئے۔

''اوہ.....! تمہارا سعودی سفیر سے ایسا کیا تعلق ہے کہ اس نے اس کام کے لئے تمہیں منتخب کیا.....؟''

''یہ ان کی عنایت ہے جناب صدر.....! کہ وہ مجھے دوست سمجھتے ہیں۔

حالانکہ میں اس کا اہل ہرگز نہیں ہوں۔"

صدر صاحب نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

"کوئی اہلیت تو ہوگی۔ سعودی سفیر کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ یہ لوگ ایسے ہی دوستیاں نہیں کرتے۔"

"معمولی سی بات ہے جناب.....!" عبدالحق نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

"عربی زبان کی کچھ شد بد ہے مجھے۔ بول اور سمجھ لیتا ہوں۔"

صدر صاحب مسکرائے۔

"تو یہ تو بڑی خوبی ہوئی نا.....!" پھر ان کا انداز بدل گیا۔

"ٹھیک ہے.....! اب تم جا سکتے ہو۔"

* * *

عبدالحق آفس پہنچا تو جیسے دنیا ہی بدل چکی تھی۔ فوراً ہی سکریٹری کے سامنے اس کی پیشی ہوگئی۔ سکریٹری کے تیور ہی بدلے ہوئے تھے۔

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا عبدالحق.....!" اس نے بلا تمہید، سخت لہجے میں کہا۔

"میں سمجھا نہیں جناب.....!"

"ہم نے تمہیں سعودی سفیر کے پاس ایک قومی کام کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ وہ تو ہوا نہیں، لیکن تم نے اپنا ذاتی کام کرا لیا۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....!" عبدالحق نے احتجاج کیا۔

"کیسا ذاتی کام.....؟"

"بنو مت.....! خیر، اسے چھوڑو۔ اب تم سات دن کی چھٹی کی درخواست لکھ دو۔ میں اسی وقت اسے منظور کروں گا، اور اسی وقت سے تمہاری چھٹی شروع۔"

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

"مگر میں چھٹی پر جانا ہی نہیں چاہتا۔ یہ تو ہنگامی صورتِ حال ہے۔ ایسے میں چھٹی....."

"یہی تو بات ہے۔" سکریٹری نے جھنجلا کر کہا۔

"چھٹی ملنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہاں تو چھٹیاں منسوخ کر کے لوگوں کو ڈیوٹی پر بلا لیا گیا۔ ہم نے تمہیں سفیر کے پاس بھیجا تو تم نے اس سے چھٹی کی بات کر لی۔"

عبدالحق کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ شکایت نامہ صدر صاحب کو بھجوانے کی کیا تک ہے..... اور وہ بھی صرف تمہارے ہاتھ.....! اب سمجھ میں آئی کہ یہ تمہاری چھٹی کا معاملہ تھا۔"

عبدالحق کی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا۔

"ہوا کیا ہے جناب.....! کچھ بتائیں تو....." اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"صدر صاحب کے پی اے کا فون آیا کہ تم سے ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست لے کر، چھٹی منظور کر کے تمہیں فوری طور پر ریلیو کر دیا جائے۔"

"آپ کے خیال میں میں نے سفیر صاحب سے اپنی چھوٹی کے لئے بات کی ہوگی.....؟" عبدالحق کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"سامنے کی بات ہے..... کھلی بات ہے۔" سکریٹری نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔

"اس کے لئے تو سفیر صاحب آپ کو بھی فون کر سکتے تھے۔ چڑیا کے شکار کے لئے توپ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی.....؟" عبدالحق نے دلیل دی۔

"تم جانتے تھے کہ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہے۔ میں انکار کر دیتا، اور میرا خیال ہے کہ منسٹر صاحب بھی انکار کر دیتے۔ اسی لئے تم نے سفیر صاحب کو صدر صاحب کا راستہ دکھایا ہوگا۔ سفیر صاحب تو یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے۔"

اب عبدالحق بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔

صدر صاحب نے ہاٹ لائن پر سعودی سفیر سے رابطہ کیا ہوگا۔ سفیر نے صدر صاحب پر سفارتی نزاکتوں اور رازداری کی اہمیت واضح کرنے کے بعد سعودی

عرب کی طرف سے دی جانے والی امداد کی تفصیل بتائی ہوگی۔ یہ بھی طے تھا کہ اس کے سفارت خانے سے نکلتے ہی سفیر نے سعودی حکومت سے رابطہ کر کے امداد کے بارے میں معاملات طے کئے ہوں گے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ یہ باتیں پہلے ہی طے ہو چکی ہوں۔

بہر حال صدر صاحب سے فون پر گفتگو کے آخر میں سفیر نے اس کی چھٹی کا معاملہ سامنے رکھا ہوگا۔ صدر صاحب کے نزدیک وہ ایک چھوٹی سی فرمائش ہوگی۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے پی اے کو ہدایت کر دی ہوگی۔

سعودی سفیر یقینی طور پر بہت ذہین آدمی تھا۔ وہ ایک عمل سے کئی مقاصد حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ بات اس نے ثابت کر دی تھی۔

عبدالحق سمجھ سکتا تھا کہ سفیر نے اس کی ضرورت کو محض اصل معاملے کو کیمو فلاج کرنے کے لئے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ایک سچے دوست کی حیثیت سے بڑے خلوص سے اس کی مدد کی۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ مدد از خود اصل معاملے کے لئے پردہ بن گئی۔

عبدالحق نے درخواست سکریٹری کی طرف بڑھائی۔ اس نے فوری طور پر منظوری کا نوٹ لکھ کر اس پر دستخط کئے اور درخواست پر پیپر ویٹ رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔''

عبدالحق دروازے کی طرف بڑھا۔ سکریٹری کے پکارنے پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کوئی اپنے کسی کام کے لئے مجھ پر سفارش کے ذریعے دباؤ ڈلوائے۔ یہ بات ذہن میں رکھنا عبدالحق......!''

عبدالحق اس سے کہنا چاہتا تھا کہ اس نے تو یہاں سفارش یا رشوت کے بغیر کام ہوتے ہی نہیں دیکھے۔ لیکن یہ مناسب نہیں تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر پلٹا اور کمرے سے نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کو عبدالحق کے اسلام آباد تبادلے کی خبر نے پریشان کر دیا تھا۔ اسلام آباد اور ایبٹ آباد کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔ عبدالحق کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ دفتر سے چھٹی کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھے اور ایبٹ آباد چلا جائے۔ وہ سحر خیز تھا۔ یہ اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ رات ایبٹ آباد میں گزارے اور صبح یہاں سے سیدھا اپنے دفتر چلا جائے۔ جبکہ یہاں کی صورت حال کے مطابق نور بانو اس کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

یہاں صورتِ حال چاند چڑھے گا تو دنیا دیکھے گی ..... والی ہوگئی تھی۔ اب چھپانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ یہاں تو سب خیر تھی۔ رشیدہ اور آبیہ کے سوا کسی کو حقیقت کا علم نہیں تھا۔ لیکن عبدالحق آ جاتا تو .....

یہ خیال آتا تو نور بانو کو پسینے چھوٹنے لگتے۔

اطمینان کی بات صرف اتنی تھی کہ عبدالحق وعدے کا پاس رکھنے والا تھا۔ لیکن صرف اس بات سے نور بانو کی تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو، وہ بہر حال انسان تھا..... اور مرد۔ فطری تقاضے تو اسے بھی ستاتے ہوں گے۔ پھر وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ اتنا کم فاصلہ..... تو کیا عجب ہے کہ وہ کسی دن ایبٹ آباد چلا آئے، چاہے بعد میں اس پر شرمندہ ہو یا پچھتائے۔ انسان کا تو اسی طرح کا معاملہ ہوتا ہے۔ ایک کمزور لمحے میں سب کچھ ہار جاتا ہے۔ جبکہ یہاں تو تحریک بھی بہت بڑی تھی۔

اسی لئے عبدالحق نے فون کر کے تبادلے کی اطلاع دی تو نور بانو نے احتیاطاً اپنی کھڑی ہوئی دیوار کو دو اور ردے لگا کر مزید اونچا کر دیا۔

''واہ.....! اس کا مطلب ہے کہ اب آپ بہت قریب آ رہے ہیں۔'' اس نے چہک کر کہا۔

''ہاں.....! بہت قریب، لاہور سے بھی اور ایبٹ آباد سے بھی۔''

''اسلام آباد سے ایبٹ آباد کا سفر کتنی دیر کا ہے.....؟'' اس نے پوچھا۔

''زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے کا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ دفتر سے چھٹی کر کے یہاں

آئیں، رات گزاریں اور صبح یہاں سے دفتر چلے جائیں۔''

''بالکل ممکن ہے۔ لیکن یہ تم کہہ رہی ہو......؟'' عبدالحق کے لہجے میں حیرانی در آئی۔

''تو اور کون کہہ سکتا ہے......؟'' نور بانو نے لہجے میں بے خودی سموتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کیا پتا کہ میں آپ کو کتنا یاد کرتی ہوں، کتنی کمی محسوس کرتی ہوں آپ کی۔ شاید اس عرصے میں بیویوں کو شوہر کے سہارے کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہوتی ہے۔''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ عبدالحق نے کچھ نہیں کہا۔

''تو آپ آئیں گے نا......؟''

''میں کیسے آ سکتا ہوں......؟''

''کیوں نہیں آ سکتے ......؟ میں اسلام آباد تبادلے کے بعد کی بات کر رہی ہوں۔''

عبدالحق نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تم کچھ بھول رہی ہو۔''

''مجھے تو اس وقت آپ کے سوا کچھ یاد ہی نہیں۔''

''حالانکہ یہ بات تمہیں کبھی بھولنی ہی نہیں چاہئے۔''

نور بانو کو ڈھارس بندھی، تقویت کا احساس ہوا۔ گویا عبدالحق کو اپنا وعدہ یاد ہے۔ تاہم اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''آپ کس بات کی بات کر رہے ہیں......؟''

''حیرت ہے ......! تمہیں یاد نہیں۔''

''آپ یاد دلا دیں نا......!''

''تم نے مجھ سے ایک وعدہ لیا، مجھے پابند کیا تھا، تم نے ایک منت مانی تھی، تمہیں یاد نہیں......؟''

نور بانو نے اپنی آواز سے یہ تاثر دیا کہ جیسے اسے زبردست جھٹکا لگا ہے۔

''ارے......! وہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔'' اس نے لہجے میں تاسف سموتے ہوئے کہا۔

''اب سوچتی ہوں کہ کتنی بڑی حماقت کر بیٹھی ہوں۔''

''اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔''

''آدمی حماقت کا ازالہ بھی تو کر سکتا ہے۔''

''کیسے......؟''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھ سے آپ کے بغیر نہیں رہا جاتا۔''

''یہ کیسے ممکن ہے......؟''

''بس آپ آ جائیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔''

''تم وعدے کی اہمیت نہیں سمجھتیں۔'' عبدالحق نے تمہیدی لہجے میں کہا۔

''اللہ تو انسانوں سے کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی بھی پسند نہیں کرتا۔ جبکہ منت تو اللہ سے کیا ہوا عہد ہوتا ہے۔ جو بندے نے مانگا ہوتا ہے، اس کی قیمت ہوتی ہے ایک طرح سے۔ اس سے پھرنا تو اللہ کو صریحاً ناراض کرنا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس آپ ......'' نور بانو رونے لگی۔

''شاید میں تم سے زیادہ تڑپ رہا ہوں تمہارے پاس آنے کے لئے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن کیا کروں......؟ تم ہی نے مجھے پابند کیا، مجھ سے وعدہ لیا اور میں وعدہ شکنی کا قائل نہیں ہوں۔''

''تو کیا میں یوں ہی ترستی رہوں گی آپ کے لئے......!''

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''ایک صورت ہے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس نے ہر طرح سے بندوں کے لئے آسانیاں عطا فرمائی ہیں۔ قسموں اور وعدوں سے نکلنے کے لئے کفارے کا راستہ ہے۔ لیکن یہاں ہمیں دہرا کفارہ ادا کرنا ہوگا...... تمہیں الگ اور مجھے الگ۔ میں قرآن پاک میں دیکھوں گا، اور کسی صاحب علم سے راہنمائی بھی

طلب کروں گا اس سلسلے میں۔''

نور بانو بری طرح دہل گئی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ عبدالحق کو پکا کرنے کے اس کھیل میں مناسب حدود سے آگے نکل گئی تھی۔

''نہیں عبدالحق صاحب ......! اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''یہ معاملہ بہت بڑا اور اہم ہے میرے لئے۔ بات آپ کے بچے کی ہے۔ خدانخواستہ اسے کسی بھی طرح کا نقصان پہنچ جائے تو اس کا کوئی ازالہ نہیں ہوگا۔ نہیں ...... ہرگز نہیں، ہم دونوں کو ہی اپنے عہد کی پابندی کرنی ہوگی۔ بھول جائیں اس بات کو۔''

دوسری طرف عبدالحق نے سکون کا سانس لیا۔ یہ اس کی آواز سے ظاہر تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو تم ......! صبر کرنا ہی مناسب ہے۔ اللہ بھی اسے پسند کرتا ہے۔ ہمیں انشاء اللہ اس کا صلہ بھی ملے گا۔''

لیکن شاید عبدالحق کے اندر کا مرد جاگ چکا تھا۔ اس کی اگلی بات سن کر تو نور بانو پر لرزہ طاری ہوگیا۔

''مگر خوش قسمتی سے میری ایک بیوی اور بھی ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''میں اس سے ملنے کے لئے تو آ سکتا ہوں۔ اس کے لئے تو کوئی پابندی نہیں ہے مجھ پر۔''

نور بانو چند لمحوں کے لئے گنگ ہو کر رہ گئی۔ پھر اس نے جلدی سے دلیل دی۔

''لیکن میں بھی تو یہیں ہوں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے......؟ اتنا بڑا گھر ہے۔ بات مشکل سہی، مگر میں دل پر پتھر رکھ لوں گا۔ نہیں ملوں گا تم سے۔''

نور بانو کی حاسدانہ فطرت اس طرح ابھری کہ وہ خود پر قابو ہی نہ رکھ سکی۔

''تو یوں کہیں نا ...... اس سے ملنے کے لئے تڑپ رہے ہیں آپ......!''

اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں تو تم سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ لیکن وہ بھی بہرحال میری بیوی ہے۔ اور تم نے خود اصرار کر کے اس سے میری شادی کرائی تھی۔ ورنہ خدا گواہ ہے کہ میں تو یہ چاہتا ہی نہیں تھا۔ اب تم تنگ دلی اور روایتی جہالت کا مظاہرہ کرو تو یہ میں قبول نہیں کروں گا۔ تمہیں تو اپنی فطرت کا پتا تھا۔ تمہیں یہ شادی کرانی ہی نہیں چاہئے تھی۔ اب اس کے بھی تو کچھ حقوق ہیں۔ تمہاری منت کی خاطر میں انہیں نظر انداز کر کے گناہ گار نہیں ہو سکتا۔''

''یہ فلسفہ مجھے نہ پڑھائیں۔ وہ کم عمر بھی ہے اور حسین بھی، اس لئے ......''

''تمہاری سوچ کبھی نہیں بدلے گی۔'' عبدالحق نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم اسے اپنی بہن سمجھتی تھیں، مگر اب تمہارے لئے وہ محض سوکن ہے۔''

نور بانو نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ عبدالحق کی ہر بات درست تھی۔ اسے غلط ثابت کرنے کے لئے وہ اسے یہاں آنے اور ارجمند سے ملنے کی اجازت بھی دے دیتی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ عبدالحق اس سے ملے یا ارجمند سے، دونوں صورتوں میں اس کا پول کھل جاتا۔

اس نے جلدی سے پینترا بدلا۔

''وہ اب بھی میرے لئے بہن ہی ہے۔ اور میں جانتی ہوں کہ میں اصرار نہ کرتی تو آپ کبھی اس سے شادی نہ کرتے۔ اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ کہتے ہیں، زچگی کے عرصے میں عورتوں کے مزاج میں تبدیلی آتی ہے۔ میں شاید چڑچڑی ہوگئی ہوں۔ کچھ اس کی وجہ آپ سے دوری بھی ہے۔ میں کب دور رہی ہوں آپ سے۔ یہ پہلا موقع ہے، اور اس کا سبب بھی میں خود ہوں۔ اس لئے اور زیادہ جھنجلاتی ہوں۔ آنے والے کی فکر نہ ہوتی تو خود اصرار کر کے آپ کو بلواتی۔ لیکن اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''لیکن میں تو......''

وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہے گا۔ اس نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے بات پوری کرنے دیں۔ آپ یہاں آئیں، سر آنکھوں پر، میرا کوئی حق نہیں ہے اعتراض کرنے کا۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ اس طرح آپ بھی آزمائش میں پڑیں گے اور میں بھی۔ اتنے قریب آ کر آپ مجھ سے ملے بغیر رہ سکیں گے.....؟''

اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ لیکن دوسری طرف سے حسب توقع جواب نہیں ملا۔

''خیر..... آپ تو رہ لیں گے۔ لیکن اپنا مجھے معلوم ہے کہ میں نہیں رہ سکوں گی۔'' اس نے دوسرے زاویے سے وار کیا۔

''خیر..... آپ آ جائیں۔''

''نہیں.....! میں نہیں آ رہا ہوں۔ میں نہ تمہیں آزمائش میں ڈالنا چاہتا ہوں نہ خود کو۔''

ادھر ادھ کی چند باتوں کے بعد عبدالحق نے ریسیور رکھا تو نوربانو نے سکون کا سانس لیا۔ اس وقت وہ بال بال بچی تھی۔ اور حماقت اس کی اپنی تھی۔ بات کو اتنی دور نہیں لے جانا چاہئے، جہاں واپسی ممکن ہی نہ رہے۔

عبدالحق کے اسلام آباد تبادلے کو چند روز ہی ہوئے تھے کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس بات کو اب تین دن ہو گئے تھے، اور عبدالحق کا فون نہیں آیا تھا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی۔

مگر اسے احساس تھا کہ ارجمند اس سے کہیں زیادہ پریشان ہے عبدالحق کے لئے۔ رشیدہ کا کہنا تھا کہ پریشانی نہ ارجمند کے لئے اچھی ہے اور نہ ہی بچے کے لئے۔

نوربانو نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''تم پریشان نہ ہو۔ جنگ کی وجہ سے مصروفیت بڑھ گئی ہوگی۔''

''میں پریشان نہیں ہوں آپی.....!'' ارجمند نے کہا۔

''البتہ مجھے دادی اماں کی فکر ہے۔ حق نگر تو بالکل سرحد پر ہے۔''

''مجھ سے چھپاتی ہو۔ میں بہن ہوں تمہاری۔ کیا جانتی نہیں ہوں تمہیں۔''

خوش قسمتی سے اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔

''لو..... فون آ گیا ان کا۔'' نوربانو نے بہت یقین سے کہا۔

''اب پہلے تم ہی بات کر لو۔ تاکہ تسلی ہو جائے تمہاری۔''

ارجمند نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھا۔ آپی اسے عبدالحق سے بات کرنے کا موقع ہی کب دیتی تھیں۔

نوربانو کے سامنے اس وقت دو مقاصد تھے۔ ایک تو عبدالحق کا یہ تاثر زائل کرنا کہ وہ ارجمند کو سوکن سمجھتی ہے۔ دوسری ارجمند کی پریشانی دور کرنا، جو بچے کے لئے نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ آخر وہ بچہ اسی کو تو ملنا تھا۔ وہ اسی کا بچہ تو کہلاتا۔

''اٹھاؤ نا فون.....!'' اس نے ذرا ڈپٹ کر کہا۔

''ارے ارجمند.....!'' عبدالحق کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔

''تمہاری آواز تو کب سے نہیں سنی میں نے۔ بہت مصروف رہتی ہو۔''

''جی..... اتفاق ہے کہ آپ کا فون جب بھی آیا، میں مصروف تھی۔''

''کیسی ہو تم.....!''

''الحمد للہ.....! میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں۔ آپ نے سو پریشان کر دیا ہمیں۔''

''ہمیں..... تم تو نہیں ہوئیں نا پریشان۔'' عبدالحق نے ذرا شوخ لہجے میں کہا۔

''جی..... میں بھی۔'' ارجمند نے کن انکھیوں سے نوربانو کو دیکھتے ہوئے دبی آواز میں کہا۔

''فون کیوں نہیں کیا اتنے دن سے.....؟''

''تمہیں نہیں پتا۔ ملک میں ایمرجنسی نافذ ہے۔ اتنی مصروفیت رہی کہ دن رات برابر ہو گئے۔''

ارجمند نے نوربانو کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''لیجئے..... آپی سے بات کیجئے۔ یہ بہت پریشان ہو رہی تھیں۔''

نوربانو نے ریسیور لیتے ہی شکایات کا دفتر کھول دیا۔

عبدالحق نے اسے مصروفیت کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

''فون میں نے اس لئے کیا ہے کہ مجھے اماں سے ملنے جانے کے لئے خاص طور پر ایک ہفتے کی چھٹی دی گئی ہے۔ میں صبح حق نگر جا رہا ہوں۔ وہاں سارے رابطے منقطع ہیں۔ میں فون نہیں کر سکوں گا وہاں سے۔ پریشان نہ ہونا۔''

لیکن نور بانو تو یہ سن کر ہی پریشان ہوگئی۔

''کمال کرتے ہیں آپ ...! کوئی ضرورت نہیں آپ کو وہاں جانے کی۔ وہ تو بالکل سرحد ہے، جہاں جنگ ہو رہی ہے۔''

''وہاں میری اماں موجود ہیں۔'' عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

''موجودہ صورتِ حال میں تو یہ بہت ضروری ہے کہ میں وہاں جاؤں۔''

''میں نے کہا نا ...!''

''تم مجھ سے اس طرح بات نہ کرو۔ میں جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔''

عبدالحق کے لہجے نے نور بانو کو دہلا دیا۔

''آپ کو میری پریشانی کا بالکل خیال نہیں۔''

''خیال نہ ہوتا تو فون کر کے تمہیں کیوں بتاتا؟ بتائے بغیر ہی نہ چلا جاتا۔''

''اچھا ... اپنا خیال رکھئے گا۔ اور واپس آتے ہی فون کیجئے گا۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں ... خدا حافظ ...!''

❁ ❁ ❁

حمیدہ عبدالحق کو دیکھ کر خوش ہوگئی۔

''تو یہاں کیوں آگیا بیٹے ...؟''

''تمہارے لئے، زرینہ کے لئے، اکبر اور چچی کے لئے، اپنے سب لوگوں کے لئے۔''

''لیکن ایسے حالات میں سفر کرنا ...''

''میں نے تو سفر کیا ہے۔ آپ سب لوگ تو یہاں رہ رہے ہیں۔''

''میں نے تو کہا تھا کہ لاہور چلے جائیں۔'' اکبر نے کہا۔

''لیکن اماں آمادہ ہی نہیں ہوئیں۔ پھر خالد نے بھی مجھے سمجھایا۔''

''مجھے تو نہیں لگتا کہ یہاں سے لوگوں نے نقل مکانی کی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عبدالحق بھائی ...! یہاں سے کوئی نہیں گیا۔ سب لوگ جوش سے بھرے ہوئے ہیں۔ محاذ پر جا کر لڑنا چاہتے ہیں۔ فوجیوں نے بڑی مشکل سے روک رکھا ہے انہیں۔''

''اور صورتِ حال کیا ہے یہاں کی ...؟''

''حق نگر سے متصل جو گاؤں حق نگر کی حدود میں ہے، وہ فوج نے خالی کرا لئے ہیں۔ وہ لوگ اس وقت یہاں حق نگر میں ہی ہیں۔'' اکبر نے بتایا۔

''بھارتی گولہ باری سے دیہاتوں میں کافی نقصان ہوا ہے۔''

''اور یہاں ...؟''

''شروع میں تو اس طرف کے کچھ علاقے میں گولے آکر گرے۔ لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ پھر جب فوج آگئی، مورچے بن گئے تو اب تک سکون ہے۔''

''مورچے کہاں لگے ہیں ...؟''

''وہ جو گاؤں خالی کرائے گئے تھے نا ... وہاں۔''

''تو اب کچھ دیر آرام کر لے پتر ...! تھک گیا ہوگا۔'' حمیدہ نے مداخلت کی۔

''تھکن کیسی اماں ...! آرام سے آیا ہوں۔''

مگر حمیدہ کے اصرار پر اسے لیٹنا ہی پڑا۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد حق نگر کے لوگ آنے لگے۔ آرام کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اکبر نے ٹالنا چاہا لیکن عبدالحق نے منع کر دیا۔ عبدالحق کے کہنے پر اکبر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔

اب عبدالحق کا یہاں آنا کم ہی ہوتا تھا۔ لیکن ہر بار اسے حیرت ہوتی تھی۔ ہر بار اسے احساس ہوتا تھا کہ اللہ کے کرم سے یہاں اس کی عزت، اس کا مرتبہ پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں، عزت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والوں کی ایک نسل جوانی میں قدم رکھ چکی تھی۔ ہر بار پرانے چہروں کے درمیان اجنبی چہروں کی کثرت دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان چہروں پر بھی اور ان آنکھوں میں بھی اس کے لئے وہی محبت اور احترام تھا، جو انہیں ان کے بڑوں نے دیا تھا۔ وہ لڑکے اس کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن وہ ان لڑکوں کے لئے اجنبی نہیں تھا۔

وہ جو ہجرت کر کے آئے، کیسے احسان شناس لوگ تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو قصے کہانیوں کے بجائے تحریک پاکستان کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے انہیں ہجرت کے سفر کی سچی داستانیں سنائی تھیں۔ انہوں نے انہیں ہندوؤں اور سکھوں کے مظالم کے بارے میں بتایا تھا۔ انہوں نے اپنے بچوں کو بتایا تھا کہ پاکستان کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے، اور یہ ملک کتنا مبارک اور اہم ہے۔ اور انہوں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ کس حال میں یہاں پہنچے تھے اور عبدالحق نے کس طرح ان کا ساتھ دیا، ان کے لئے سب کچھ کیا۔ آج وہ جو کچھ بھی ہیں، اللہ کے فضل اور عبدالحق کے ایثار و محبت کی وجہ سے ہیں۔ ان کی ماؤں نے ہمیشہ انہیں تلقین کی تھی کہ عبدالحق کا ان کی آنے والی نسلوں تک پر احسان ہے۔ یہ انہیں کبھی نہیں بھولنا ہے۔

پرانے لوگوں میں سے کچھ کم ہو گئے تھے۔ اللہ کے ہاں چلے گئے تھے۔ عبدالحق ان میں سے ایک ایک کے گھر دعا اور تعزیت کے لئے گیا۔

اس رات وہ سونے کے لئے لیٹا تو اسے خود پر افسوس ہوا۔ بچے بڑے ہو گئے تھے، اور بڑے ہو رہے تھے۔ وہ پاکستان کا مستقبل تھے، اور وہ ان سے، ان کی ضرورتوں اور ان کی تربیت سے بے خبر تھا۔ اس رات اس نے بہت کچھ سوچا۔

اگلی صبح اس نے تمام لڑکوں کو بلا لیا۔ وہ ان سے بات کرنا، ان کی ضرورتوں کو سمجھنا چاہتا تھا۔

شاید قدرت نے اسے وہاں اس کام کے لئے ہی بھیجا تھا۔

وہاں دو بڑی ضرورتیں سامنے آئیں۔ ایک تو یہ کہ وہاں آبادی کے لحاظ سے اسکول نہیں تھے۔ اور میٹرک کے بعد کالج کی تعلیم کے لئے انہیں بڑے شہروں

کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ صاحب حیثیت لوگ تو اپنے بچوں کو شہر بھجوا دیتے تھے۔ لیکن باقی لوگ یوں ہی رہ جاتے تھے۔

اس نے مختلف علاقوں میں چار اسکول اور دو کالج قائم کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ایک گرلز کالج تھا۔ سرکاری اسکولوں میں اساتذہ کی کمی کا مسئلہ بھی تھا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں بھی کوشش کرے گا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہاں عورتیں بڑی ہنر مند تھیں۔ سلائی، کڑھائی اور دست کاری کے ایسے نمونے اس نے دیکھے کہ وہ دنگ رہ گیا۔ اور ان ہنر مندوں کا استحصال ہو رہا تھا، ان میں مرد بھی تھے۔ شہر سے دکان دار آتے اور ان کی چیزوں کو کوڑیوں کے مول خرید کر لے جاتے۔ جبکہ شہروں میں وہ چیزیں مہنگے داموں فروخت ہوتی تھیں۔

عبدالحق نے فیصلہ کیا کہ ایک تو یہاں کاٹیج انڈسٹری قائم کرنے کے سلسلے میں کام کرے گا، اور دوسرے زبیر سے مل کر ایک ایسا منصوبہ بنائے گا، جس میں ہنر مندوں کو ان کی محنت کا بہترین صلہ مل سکے۔ اس کے ذہن میں ایکسپورٹ کا خیال بھی تھا۔

اس شام کو میجر منیر اس سے ملنے کے لئے آ گئے۔

اسے حیرت ہوئی کہ میجر اسے کیسے جانتا ہے۔ گفتگو پر پتا چلا کہ یہ بھی حق نگر کے لوگوں کی مہربانی ہے۔

میجر نے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھا۔

''یہاں کے نوجوان بہت پر جوش ہیں اور پاکستان سے محبت بھی کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ دونوں باتیں قابل قدر ہیں۔ لیکن ہمارے لئے مسئلہ بھی بن گئی ہیں۔''

''کیسے...؟''

''حق نگر کے باہر ہماری چوکی ہے۔ یہ نوجوان ڈنڈے اور لاٹھیاں اٹھائے وہاں چلے آتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں محاذ پر جانے دیا جائے۔ بہت ہوا تو کسی کے پاس بہت پرانے طرز کی بندوق ہوتی ہے اور بس۔ ہم انہیں سمجھا سمجھا کر

تھک گئے ہیں کہ یہ جنگ ہے، جو اندھا دھند نہیں، بلکہ منصوبہ بندی اور جنگی حکمت عملی کے تحت لڑی جا رہی ہے۔ یہ کوئی جذباتی معاملہ نہیں۔ لیکن ہر روز تین چار بار ہمیں ان کو بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ ہمارے لئے ایک اضافی بوجھ بن گیا ہے۔"

"لیکن اس سے آپ کے جوانوں کا جذبہ اور حوصلہ بھی تو بڑھتا ہوگا۔" عبدالحق نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں، اور میں اس پر ان کا شکر گزار بھی ہوں۔" میجر منیر نے بڑے تحمل سے کہا۔

"لیکن آپ سوچیں تو، ہم حالت جنگ میں ہیں، اور دشمن نے بغیر اعلان کے اچانک حملہ کیا ہے۔ یوں صورت حال کی سنگینی اور بڑھ گئی ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کا خلوص ہمارے لئے مسئلہ بن جاتا ہے۔"

"یہ بتائیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں ......؟"

میجر منیر مسکرایا۔

"یہ مسئلہ نہ ہوتا تو بھی میں آپ سے ملنے کے لئے آتا۔ مجھے اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا۔ شاید آپ کو نہیں معلوم کہ آپ یہاں کیسے چاہے جاتے ہیں۔ میں جب یہاں آیا تو بہت حیران ہوا۔ یہاں آپ کا نام ایسے لیا جاتا ہے، جیسے کسی محبوب بادشاہ کا۔ ایسا بادشاہ جو یہاں موجود بھی نہیں۔ پھر مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ درحقیقت آپ اس سے زیادہ محبت کے مستحق ہیں۔ خیر ...... میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ ایک آپ ہی ہیں، جو انہیں سمجھا سکتے ہیں اور ہمیں اس پریشانی سے نجات دلا سکتے ہیں۔ دیکھیں، میں نے ان سے یہاں تک کہا کہ خدانخواستہ ...... اللہ نہ کرے، اگر ہمیں ضرورت پڑی تو ہم خود انہیں آواز دے کر مطالبہ کر لیں گے۔ مگر یہ نہیں مانتے۔"

"ٹھیک ہے میجر صاحب! میں کوشش کروں گا کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔"

"شکریہ عبدالحق صاحب ......! میرے لائق کبھی بھی کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔"

عبدالحق نے اسی روز تمام لڑکوں کو بلایا اور انہیں سمجھایا۔ بات ان کی سمجھ

میں آ گئی۔

"فوج کی اپنی ایک حکمت عملی، اپنا ایک طریق کار ہوتا ہے۔" اس نے انہیں سمجھایا۔

"بے شک ......! ابھی ضرورت پڑے تو عام لوگوں سے بھی کام لیتے ہیں، مگر اندھا دھند نہیں۔ وہ بھی ایک حکمت عملی کے تحت ہوتا ہے۔ تمہارا جذبہ اپنی جگہ سچا اور قابل احترام ہے۔ لیکن تمہارا روز انہیں پریشان کرنا ان کے ارتکاز میں خلل انداز ہوتا ہے، جو ملک و قوم کے لئے نقصان دہ ہے۔"

لڑکوں نے تفہیمی انداز میں سر ہلائے۔ بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

"اور وطن سے محبت کے اظہار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ تم فوج میں بھرتی کے لئے کوشش کرو۔"

ان کے ردعمل نے عبدالحق کو مطمئن کر دیا۔

لیکن عورتیں فوجیوں کے لئے کھانا لے کر بہرحال جاتی رہیں۔

عبدالحق حیران بھی تھا اور خوش بھی کہ اس جنگ نے قوم میں ایسا یک جہتی کا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ سیسہ پلائی دیوار بن گئی تھی۔ وہ جذبے ہی تھے، جنہوں نے ہمیشہ کی طرح کفار کی عددی اور عسکری برتری کے بت کو مسمار کر دیا تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ اگلے روز زبیر بھی آ گیا۔ اس کے ساتھ رابعہ اور ساجد بھی تھے۔

"زبیر بھائی ......! آپ یہاں کیسے ......؟" عبدالحق نے حیرت سے کہا۔

"بہت ضروری کام میں نہ پھنسا ہوتا تو ہم سات تاریخ کو ہی یہاں آ جاتے۔ اماں کو ایسے میں یہاں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ہم، میں تو شرمندہ ہوں کہ پانچ دن بعد آیا ہوں۔"

"چلو اچھا ہوا، میں آپ کو یاد کر رہا تھا۔"

"کیا یاد کر رہے تھے کاکا ......! مجھے تو فون بھی نہیں کیا آپ نے۔" زبیر نے شکایت کی۔

عبدالحق نے مصروفیت اور پھر اچانک چھٹی ملنے کے بارے میں بتایا۔ پھر

معذرت کی۔

''اس افراتفری میں خیال ہی نہیں رہا۔ معافی چاہتا ہوں۔''

''کیوں شرمندہ کرتے ہیں کا کا......! غلطی تو میری ہے کہ میں نے شکایت کی۔'' زبیر بری طرح کھسیا گیا۔

رات کو عبدالحق نے زبیر سے حق نگر کے بارے میں اپنے منصوبوں پر بات کی۔

''یہ خیال میرے ذہن میں بھی تھا کا کا......!'' زبیر نے کہا۔

''خاص طور سے دست کاری کی مصنوعات برآمد کرنے کا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ جنگ ختم ہوتے ہی اس سلسلے میں کام شروع ہو جائے گا۔''

''اور اسکول اور کالج......؟''

''وہ بھی...... آپ کسی سے وعدہ کریں کا کا......! تو وہ میرے لئے حکم ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔''

''بہت شکریہ زبیر بھائی......! مجھ پر تو آپ نے کوئی بوجھ ہی نہیں رہنے دیا کبھی۔''

''شرمندہ نہ کریں کا کا......!''

موقع غنیمت جان کر زبیر اسے کاروباری معاملات کی تفصیل بتانے لگا۔

عبدالحق پہلے ہی سے اس بات کا قائل تھا کہ تعلیم سے محرومی کے باوجود زبیر فہم و فراست اور کاروباری سوجھ بوجھ سے مالا مال ہے۔ اس نے اپنے طور پر وہی فیصلہ کیا تھا، جو اقتصادیات کے ماہرین کا تھا۔ اس نے زراعت کو سمیٹ کر پوری توجہ صنعت پر مرکوز کر دی تھی۔

''مجھے یہ بتائیں زبیر بھائی......! کہ ہم آدھے آدھے کے حصہ دار ہیں نا......!''

زبیر نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے بعد وہ بولا تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

''نہیں کا کا......! منافع کا صرف بیس فیصد میں آپ کے اکاؤنٹ میں جمع

کراتا ہوں۔ باقی اپنے اکاؤنٹ میں۔''

عبدالحق کو ذرا حیرت تو ہوئی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

''آپ نے کچھ کہا نہیں کا کا......!''

''کہنے کی کوئی بات ہی نہیں۔'' عبدالحق نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے شروع میں ہی کہا تھا کہ سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔ اور سچی بات یہ کہ میرے خیال میں آپ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں۔ نہ میں کچھ کرتا ہوں اور نہ مجھے پتا ہے کسی چیز کا۔''

''یہ میں نے ایک وجہ کے تحت کیا ہے کا کا......! لیکن میں ابھی آپ کو اس کی وجہ نہیں بتاؤں گا۔''

''میں پوچھوں گا بھی نہیں زبیر بھائی......!''

چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔ عبدالحق حق نگر سے رخصت ہوا تو زبیر اپنی فیملی کے ساتھ وہیں مقیم تھا۔

''میں تو جنگ ختم ہونے کے بعد ہی یہاں سے جاؤں گا کا کا......! اور وہ بھی یہاں کے کام شروع کرانے کے بعد۔'' اس نے کہا۔

''شکریہ بھائی......! اب مجھے اطمینان رہے گا۔'' عبدالحق نے کہا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو اپنا کھیل بڑی احتیاط کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ باریک بینی اس کے منصوبے کا لازمہ تھی۔ تفصیلات اور چھوٹی چھوٹی جزئیات کا خیال رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔

اب کی طرف ارجمند کو چھپا کر رکھنا ضروری ہوگیا تھا تو دوسری طرف اسے خود بھی محتاط رہنا تھا۔ ارجمند تو اب اس کے لئے ایک ایسے ہیرے کی طرح تھی، جسے ہر اپنے پرائے کی نظر سے چھپانا تھا۔ چنانچہ ارجمند تو بس اپنے کمرے تک محدود ہوگئی۔ ویسے بھی باہر وہ کہاں آتی جاتی تھی؟ لیکن سب سے بڑھ کر اسے نوریز کی نظر سے بچانا تھا۔ وہ مستقل ملازم تھا۔ وہ ایک بار بھانپ لیتا تو گڑبڑ ہو جاتی۔ اس وجہ سے ارجمند کو اور سختی سے محدود کرنا پڑا۔ ورنہ ابتداء میں تو وہ بازار جاتی

رہی تھی۔

اس کا اپنا معاملہ اور تھا۔ جیسے ارجمند کو چھپانا تھا، ویسے اسے خود کو دکھانا تھا۔ اپنی زچگی کے لئے جو گواہ اسے درکار تھے، ان میں نوریز کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔

اس نے انٹر کام پر نوریز سے کہا۔

''گاڑی تیار رکھو۔ مجھے اسپتال جانا ہے۔''

نوریز گھبرا گیا۔

''خیریت تو ہے بیگم صاحبہ ....!''

''ہاں ! خیریت ہے۔ تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' نوربانو نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے اس مرحلے کے لئے ہر تیاری رشیدہ کے مشورے سے کی تھی، اور یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ ورنہ اس نے خود جو طریقہ سوچا تھا، وہ اس کے لئے مشکل تھا۔ وہ تو فلمی سی ترکیب تھی۔

لیکن رشیدہ نے کہا۔

''اس کی ضرورت نہیں بی بی صاب ....! بس ڈھیلی سی ایک قمیض پہن لیں۔ اور خود کو اچھی طرح چادر میں لپیٹ لیں۔''

''تو نوریز کو کیسے پتا چلے گا....؟''

''میں بتاؤں گی نا اسے۔ پھر اس حلیے میں آپ کو دیکھے گا تو اسے یقین ہو جائے گا۔''

''لیکن اس نے کہیں دیکھ لیا تو....؟'' نوربانو مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

''ایسا نہیں ہوگا بی بی صاب ....! نوکر لوگ اپنی مالکن کو ایسے نہیں دیکھتے۔ خاص کر اچھے نوکر۔ اور آپ کا یہ نوکر بہت شریف ہے۔ پھر پیٹ تو آپ کا اچھا خاصا ہے۔'' نوربانو کے چہرے پر خفگی دیکھ کر اس نے جلدی سے بات بدلی۔

''میرا مطلب ہے، اب لڑکیوں جیسی تو آپ کی کمر نہیں ہے نا ....!''

''سوچ لو ....!''

''میں سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہی ہوں بی بی صاب ! جو آپ نے سوچا ہے، اسے نبھانا مشکل ہو جائے گا۔ آپ سوچیں نا۔ اسپتال میں تو آپ نقلی پیٹ لے کر نہیں جا سکتیں۔ باہر نوریز کو تو دکھا دیں گی، پر اندر اسپتال میں کیا کریں گی ....؟''

بات معقول تھی۔ نوربانو کی سمجھ میں آ گئی۔ رشیدہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ڈھونگ گلے پڑ جاتا۔ لیکن اس بات پر اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ نوریز پر یہ تاثر چھوڑا جا سکے گا۔

''بس آپ کو ذرا اپنی چال بدلنی ہوگی۔''

''کیا مطلب ....؟''

''حاملہ عورتوں کی طرح چلنا ہوگا آپ کو۔''

''مجھے کیا پتا ؟ کیسے چلتی ہیں حاملہ عورتیں ؟'' نوربانو نے بھنا کر کہا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا اور چل کر دکھایا۔

نوربانو کو ذرا مشکل تو لگا۔ لیکن اس کے اپنے طریق کار کے مقابلے میں تو وہ بہت آسان تھا۔ وہ روز اس کی مشق کرنے لگی۔

''تو اب چلیں ....؟'' نوربانو نے انٹر کام رکھنے کے بعد رشیدہ سے کہا۔

''آپ پانچ منٹ بعد آیئے گا۔'' رشیدہ بولی۔

''میں جا کر اس کے ذہن میں بات تو بٹھا دوں۔''

''ٹھیک ہے ....!''

رشیدہ باہر آئی۔ نوریز گاڑی کی صفائی کر رہا تھا۔

''گاڑی بالکل دروازے کے ساتھ کھڑی کر دو۔'' رشیدہ نے اس سے کہا۔

نوریز پھر پریشان ہو گیا۔

''خیر تو ہے ....؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''تم نے یہ بی بی صاب سے بھی پوچھا تھا۔ ایسی باتیں پوچھی نہیں

جاتیں۔" رشیدہ نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ پھر بولی۔

"وفادار ہو، اس لئے پریشان ہوتے ہو۔ یہ پریشانی کی نہیں، خوشی کی بات ہے۔ بی بی صاب ماں بننے والی ہیں۔ اب ہر مہینے اسپتال جایا کریں گی۔"

نوریز نے منہ پھیر لیا۔ دل میں سوچا، عجیب بے خیال عورت ہے۔ مگر بہرحال اسے اطمینان ہوگیا۔

وہ انہیں سی ایم ایچ لے گیا۔ بیگم صاحبہ رشیدہ کے ساتھ اندر گئیں۔ کوئی بیس منٹ بعد وہ واپس آگئیں۔ نوریز اب انہیں نظر اٹھا کر دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔

اس معمول کو اب دو ماہ ہوگئے تھے۔ نوربانو نے بڑی کامیابی سے اپنے حق میں فضا تیار کر لی تھی۔ گواہ بھی موجود تھے۔ حالانکہ ایسا کوئی امکان نہیں تھا کہ کبھی ان کی ضرورت پڑے گی۔

❁ ❁ ❁

جب سے عبدالحق چھٹی گزار کے واپس آیا تھا، اسے دفتر کی فضا بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ویسے تو ابھی اسے محکمے میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، اور ابھی اتنے تعلقات بھی نہیں بنے تھے۔ پھر بھی کم وقت میں اس کی ایک عزت بن گئی تھی۔

لیکن چھٹی سے واپس آنے کے بعد اسے ایسا لگ رہا تھا، جیسے لوگ اس سے کچھ کھنچے کھنچے ہیں۔ بہرحال اسے اس بات کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ وہ تو اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی تھا۔

سکریٹری صاحب نے کا پی اے، مبین اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ بھی پنج وقتہ نمازی تھا۔ اس نے ایک دن بڑی راز داری سے عبدالحق سے کہا۔

"سر.....! آپ دفتری معاملات میں ذرا محتاط رہئے گا۔"

"میں دفتری معاملات میں ہمیشہ محتاط ہی رہتا ہوں۔" عبدالحق نے کہا۔

"لیکن بات کیا ہے.....؟"

"آپ کو اپنے لئے فضا کچھ ناسازگار نہیں لگ رہی ہے.....؟" مبین نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"وہ تو شروع سے ہی محسوس ہوئی تھی۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن اب اور بڑھ گئی ہے۔"

"ہاں.....! لگتا تو ہے مجھے بھی۔ لیکن وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔"

"آپ کو جس طرح سے چھٹی دلوائی گئی ہے، وہ ہمارے صاحب کو اچھا نہیں لگا۔ ان کا خیال ہے کہ آپ اپنے اثر و رسوخ کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔"

"حالانکہ میں اسے گناہ سمجھتا ہوں۔"

"آپ خود سوچیں، ظاہری طور پر تو یہی نظر آتا ہے سر.....!"

"اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے۔" عبدالحق نے خشک لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں نے اثر و رسوخ استعمال کیا بھی ہے، جو کہ میں نے ہرگز نہیں کیا، تو بھی تمہارے صاحب کو اس میں کیا پریشانی ہے؟ کیا سفارش یہاں کوئی نئی چیز ہے؟ کیا وہ سفارش کے تحت پہلے بھی پسندیدہ کام نہیں کرتے رہے؟"

"آپ کی بات درست ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ انہیں آپ سے اللہ واسطے کا بیر ہوگیا ہے۔"

"مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن تم نے محتاط رہنے کا کیوں کہا مجھ سے.....؟"

"صاحب نے بات منسٹر صاحب تک پہنچا دی ہے۔ منسٹر صاحب بھی بڑے انا والے آدمی ہیں سر.....! آپ ان کی بیڈ بک میں آگئے ہیں۔ اور شاید آپ نہیں جانتے، اس کی منتقم مزاجی مشہور ہے۔"

"میں صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں اور صرف اللہ سے ہی ڈرتا ہوں۔"

عبدالحق سرکاری ملازم تھا۔ اس لئے سیاست پر کوئی تبصرہ نہیں کرتا تھا۔ لیکن منسٹر صاحب کے بارے میں اس کی کوئی اچھی رائے نہیں تھی۔ جاننے والے جانتے تھے کہ وہ صدر صاحب کو ڈیڈی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ عبدالحق کے نزدیک

کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ بات ثابت کرتی تھی کہ وہ حد درجہ خوشامدی انسان ہیں۔ اور جو آدمی خوشامدی ہو، وہ خوشامد پسند بھی بہت ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ خوشامدی لوگ ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ صدر صاحب کو سب سے زیادہ نقصان اپنے اسی وزیر سے پہنچے گا، جسے وہ بیٹے کا درجہ دیتے ہیں۔

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اعلانِ تاشقند پر دستخط ہو چکے تھے۔ فوجوں کی واپسی ہو رہی تھی۔

عبدالحق کے نزدیک بڑی بات یہ تھی کہ سترہ روز جنگ نے ملکی معیشت پر نہ کوئی برا اثر چھوڑا تھا، اور نہ ہی اسے پیچھے دھکیلا تھا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔ پاکستانی روپیہ بھارتی روپے کے مقابلے میں زیادہ مستحکم تھا۔ پاکستان میں روزگار کی فراوانی تھی، اشیائے ضرورت سستی تھیں۔ جبکہ بھارتی میں بے روزگاری اور غربت بڑے مسائل تھے۔

یہ اللہ کا فضل تھا کہ صرف اٹھارہ برس کے عرصے میں نوزائیدہ پاکستان، جسے دانستہ طور پر کمزوریاں سونپی گئی تھیں، ہر اعتبار سے پہلے سے مستحکم بھارت سے آگے نکل گیا تھا۔ اس کی ٹیکسٹائل انڈسٹری بین الاقوامی مارکیٹ میں اپنی برتری ثابت کر رہی تھی۔ پھر جنگ نے پوری دنیا میں پاکستان کا امیج بہتر بنایا تھا۔ ثابت ہو گیا تھا کہ پاکستانی قوم غیور اور خودداری بھی ہے اور بہادر بھی۔ اور وہ کسی بھی جارحیت کے خلاف اپنا دفاع کر سکتی ہے۔

✿ ✿ ✿

نور بانو دکھاوے کے لئے اسپتال جاتی رہی تھی۔ لیکن ایک دن اس کے پیٹ میں اتنا خوف ناک درد اٹھا کہ سچ مچ اسپتال جانے کی نوبت آ گئی۔

درد اتنا شدید تھا کہ وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔

ارجمند نے پہلی بار اسے اس حال میں دیکھا تھا۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''میں کیا کروں آپی ......!'' اس نے گھبرا کر کہا۔

''آغا جی کو فون کروں......؟''

نور بانو کو تو ایسا کرنٹ لگا کہ وہ اپنے درد کو بھی بھول گئی۔

''یہ تو کبھی بھول کر بھی نہ کرنا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ لیکن آخر میں اس کی چیخ نکل گئی۔

''مگر آپ اتنی تکلیف میں ہیں۔''

''یہ تکلیف بہت پرانی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو کراچی سے بھاگنا پڑا تھا۔'' نور بانو نے کراہتے ہوئے کہا۔

رشیدہ بھی آ گئی تھی۔

''کیا ہوا بی بی صاب......!''

''مجھے فوراً اسپتال لے چلو۔''

رشیدہ کی سمجھ میں معاملہ تو نہیں آیا۔ لیکن اس نے یہ سمجھ لیا کہ اسپتال جانا ہے۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکی، تاکہ نوریز سے گاڑی کے لئے کہے۔

ارجمند نور بانو کے پاؤں سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

نور بانو شدید تکلیف میں تھی۔ لیکن ارجمند نے عبدالحق کو فون کرنے کی تجویز پیش کر کے اسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ کیسی ہی تکلیف ہو، اسے ہوش میں رہنا ہے۔ اور وہ بڑی طاقت ورقوتِ ارادی کی مالک تھی۔ ورنہ جیسی تکلیف میں وہ تھی، اس میں تکلیف اور خدا کے سوا کچھ بھی یاد نہیں رہتا آدمی کو۔

''میرا بیگ اٹھاؤ۔ اس میں دوا ہے......'' اس نے ارجمند سے کہا۔

ارجمند نے بیگ میں سے دوا نکال کر اسے دی، اس کے لئے پانی لائی۔

ٹیبلٹ لینے کے بعد تکلیف میں معمولی سی کمی ہوئی۔ یعنی اسپتال جانا اب بھی ضروری تھا۔ تاہم وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

ارجمند نے جلدی سے چادر اوڑھ لی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

''یہ...... یہ تم کیا کر رہی ہو......؟''

''آپ کے ساتھ چلنا ہے مجھے۔''

''پاگل ہو گئی ہو۔'' نور بانو نے چیختے ہوئے کہا۔

اسی دوران رشیدہ آ گئی۔

''چلیں بی بی صاب ...... ! میں نے گاڑی دروازے پر لگوا دی ہے۔''

ارجمند حیرت اور صدمے سے نور بانو کو دیکھ رہی تھی۔

''تو کیا میں اس حال میں آپ کو اکیلے اسپتال جانے دوں ......؟''

''ہاں ...... ! تم صرف ایک بات یاد رکھو۔'' نور بانو نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی ہو جائے، تمہیں کبھی کسی کے سامنے نہیں آنا ہے۔'' اس کے لئے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ بات بہت اہم ہے ...... زندگی سے بھی زیادہ اہم ...... اور خاص طور پر نوریز اور چوکیدار کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔''

اتنا کہتے کہتے وہ ہانپ گئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔

ارجمند نے حیرت اور دکھ سے اسے دیکھا۔

''لیکن آپی ...... ! آپ . . .''

''تمہیں میری قسم ...... ! میں مر بھی رہی ہوں تو اس کے خلاف نہ کرنا۔''

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ ...... !'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

رشیدہ کے سہارے سے وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی، لیکن لڑکھڑا گئی۔ رشیدہ چوکنی نہ ہوتی، سہارا نہ دیتی تو وہ گر گئی ہوتی۔ درد کی شدت سے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

''آپ کا چلنا تو مشکل ہے بی بی صاب ...... ! میں آبیہ کو بلاتی ہوں۔ ہم اٹھا کر آپ کو لے چلیں گے۔''

''نہیں ...... ! تم بس سہارا دے دو۔ میں چل سکتی ہوں۔ آبیہ کو یہیں چھوڑنا ہے ...... ارجمند کے پاس۔''

اور ہمت اور طاقت نہ ہونے کے باوجود وہ صرف قوتِ ارادی کے زور پر دروازے تک چلی گئی۔

❁ ❁ ❁

ان کے جانے کے بعد ارجمند گھر میں اکیلی رہ گئی۔ آبیہ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی تھی۔

اس تنہائی میں پہلی بار اسے اس صورتِ حال پر غور کرنے کا موقع ملا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی کی محض قیمت ادا نہیں کر رہی ہے۔ وہ تو ایک بہت بڑے جھوٹ ...... بلکہ ایک فریب میں نور بانو کی شریک ہے۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

اب تک وہ صرف یہ سوچتی رہی تھی کہ عبدالحق اسی کے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھا، اور اس خوشی کے ملنے کا ظاہری طور پر کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اللہ سے اسے امید تھی، بلکہ یقین تھا کہ وہ کوئی راستہ نکال دے گی۔

پھر جب آپی نے اس سے بات کی تو اس نے اسے اللہ کی رحمت پر محمول کیا۔ جو اسے چاہئے تھا، وہ اسے بغیر مانگے مل رہا تھا۔ اسے اللہ کی رحمت کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لئے تو وہ کوئی بھی قیمت ادا کر سکتی تھی۔ آپی نے جو مانگا تھا، وہ تو کوئی بڑی بات تھی ہی نہیں۔

وہ ایسی سرشار ہوئی کہ اسے سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ وہ تو جیسے کسی خوب صورت خواب میں جی رہی تھی۔

درحقیقت وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ نظریاتی طور پر تو وہ بہت مضبوط تھی، اور بہت کچھ جانتی اور سمجھتی تھی۔ لیکن عملی زندگی کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزارنا عبادت ہے۔

لیکن جب وہ ماں بننے کے مرحلے میں داخل ہوئی تو اس پر آگہی کے دروازے کھلنے لگے۔

پہلے تو اسے جسمانی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ جی متلانے کی کیفیت اسے بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ اُلٹی ہونے سے تو وہ بہت گھبراتی تھی۔ مگر اب اُلٹیاں معمول بن گئی تھیں۔ اور ہر اُلٹی کے بعد وہ دیر تک نڈھال رہتی تھی۔

پھر مزاج میں تبدیلی آنے لگی۔ جو خوشبو بہت اچھی لگتی تھی، وہ اب اتنی بری لگنے لگی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ لیکن اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ بس اس کی سمجھ میں یہی آتا تھا کہ وہ نارمل نہیں رہی۔ اور اب وہ کبھی پہلے کی طرح نارمل ہو بھی سکے گی، اس کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

پھر ایک رات وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے پیٹ میں متحرک اس وجود نے اسے احساس دلا دیا۔

ارے.....! یہ میرے وجود میں ایک اور وجود اپنی مرضی سے..... پوری خود مختاری کے ساتھ حرکت کر رہا ہے۔ ایک لمحے کو وہ خوف زدہ ہوئی۔ اگلے لمحے وہاں مداخلت بے جا پر جھنجلائی، جیسے اندر متحرک وہ وجود اس کے وجود کی آزادی کو چیلنج کر رہا ہے۔ مملکت کے اندر ایک اور مملکت!

مگر وہ بس دو ہی لمحے تھے۔

پھر اچانک اسے اس متحرک وجود پر، جو اب اچانک ساکت ہو گیا تھا، ایسا پیار آیا کہ پہلے کبھی کسی پر بھی نہیں آیا تھا۔ ارے ! یہ تو میری ہڈیوں، میرے خون اور میرے گوشت سے نمو پانے والا میرا بچہ ہے..... میرا اور آغا جی کا بچہ !

اور اچانک وہ گھبرا گئی۔ اے..... تم ساکت کیوں ہو گئے ؟ بولو نا.....!

کیا ہو گیا تمہیں.....؟ اس نے زبانِ خامشی میں اسے پکارا۔

اور بچے نے جیسے اس کی بات سن لی۔ وہ پھر ہلا۔

اور ارجمند کو اس پر ایسی محبت آئی کہ وہ اس کی دسترس میں ہوتا تو وہ اسے چوم چوم کر بے حال کر دیتی۔ شکریہ میرے بچے..... !! اس نے کہا۔

اندر سے ابھرنے والی ایک آواز نے سختی سے اسے ٹوکا۔ تم کچھ بھول رہی ہو۔ یہ تمہارا نہیں، نوربانو کا بچہ ہے۔

ارے نہیں.....! اور اچانک اسے نوربنو سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔ ایک ننھے سے پل میں ہی وہ احساسِ زیاں سے نڈھال ہو گئی۔ اور وہ احساسِ زیاں ایسا

شدید تھا کہ اسے لگا کہ وہ دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہو گئی ہے۔

لیکن اس کے نزدیک وعدے کی بڑی اہمیت تھی، کیونکہ اللہ نے وعدے کو اہمیت دی ہے۔ وہ احساسِ زیاں کو جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ بے شک، یہ آپی کا بچہ ہے۔ میرے پاس تو یہ ان کی امانت ہے۔

مگر اس کا دل اس کے ساتھ ہم آواز نہیں تھا۔ اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

وہ اس کے لئے بچے کی موجودگی کا پہلا شعوری احساس تھا۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ اسے کچھ پہلے ہی محسوس کر چکی تھی۔ جب اسے پہلی بار احساس ہوا تھا کہ اس کے اندر دل دھڑکنے کی ایک نہیں، دو آوازیں ابھرتی ہیں۔ شاید وہ غیر شعوری طور پر سمجھ گئی ہوگی۔ لیکن شعور کی سطح پر وہ الجھتی تھی کہ یہ دو آوازیں کیوں ؟ اور وہ ڈرتی تھی کہ کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں۔

مگر اس تحرک سے روشناس ہونے کے بعد اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے اندر اب دو دل دھڑکتے ہیں۔

ایبٹ آباد میں اسے بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ بات صرف عبدالحق کی نہیں تھی۔ وہ تو اس کے لئے ہوا کے ایک خوش گوار جھونکے کی طرح تھے۔ لیکن دادی اماں، ساجد، چاچا اور چاچی..... ان سب لوگوں کی اسے کمی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں اس کے پاس آپی کے سوا کوئی نہیں تھا اور آپی یہاں آ کر بالکل بدل گئی تھیں۔ وہ تو بس ہر وقت اس کھیل کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں، جو وہ کھیل رہی تھیں، اور اس کھیل میں وہ بھی ان کی شریک تھی۔

اس تنہائی نے اسے اللہ کے اور قریب کر دیا۔ وہ بڑی کثرت سے قرآن پڑھنے لگی۔

لیکن آج جو کچھ ہوا، اس نے پہلی بار اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اور جب سوچا تو اس کی سمجھ میں آیا کہ جسے وہ اب تک اپنی دانست میں ایثار سمجھ رہی تھی، وہ تو ایک بہت بڑا فریب ہے، جو وہ اپنے بہت محبوب لوگوں کو دے رہی ہے۔

اس نے اس پر سوچنا شروع کیا تو جیسے دروازے کھلتے چلے گئے۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ اس کے لئے اللہ کی طرف سے امداد ہے کہ اس طرح عبدالحق اسے

مل رہا ہے۔ لیکن اب اس نے دوسرے زاویے سے سوچا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے فتنہ ہو۔

اس خیال سے اس نے صورتِ حال کا تجزیہ کیا تو اسے ڈر لگنے لگا۔

جب آپی نے اس سے یہ بات کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس پر آپی نے کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ اس پر چھوڑ دے۔ اور اس نے یہ سوچ کر آپی کی بات مان لی تھی کہ اسے آم سے غرض ہونی چاہئے، پیڑ گننے سے نہیں۔ درحقیقت اسے تو ان معاملات کی سمجھ ہی نہیں تھی۔ کیا ہوتا ہے، کیسے ہوتا ہے، کیا کیا فرق پڑتا ہے، اسے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ اس نے تو بس معاملات کی باگ دوڑ آپی کو سونپ دی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آپی نے ایبٹ آباد آنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ مگر جب اس نے اپنے اندر آنے والی جسمانی تبدیلیوں کو دیکھا تو بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ آپی جو کھیل کھیل رہی تھیں، اس میں انہیں بہت کچھ چھپانا تھا۔ اور انہیں ایک نہیں، دو افراد کو چھپانا تھا۔ ایک طرف انہیں اس کی جسمانی تبدیلیوں کو چھپانا تھا تو دوسری طرف خود کو بھی چھپانا تھا کہ ان کے اعلان کے مطابق وہ جسمانی تبدیلیاں ان میں آنی چاہئے تھیں، جبکہ وہ ان میں آ ہی نہیں سکتی تھیں۔ خرابی یہ تھی کہ یہ فریب دورخ سے بے نقاب ہو سکتا تھا۔

چنانچہ آپی اسے لے کر یہاں آ گئیں۔ یہاں وہ دونوں محفوظ تھیں۔

ارجمند نے مزید سوچا تو اسے خوف آنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آپی نے اس ناممکن کام کا بیڑہ کیوں اٹھایا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ قدرت نے آپی کی مدد کی۔ اگر ڈاکٹر صاحب کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو دادی اماں، جنہیں پوتے کی آرزو تھی، انہیں اکیلا کیسے چھوڑتیں؟ وہ تو انہیں اپنے ہاتھ کا چھالا بنا لیتیں۔ انہیں کیسے دور رکھ پاتیں آپی۔

پھر ایک اور خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ عدت ختم ہو گی تو دادی اماں یہاں آئے بغیر رہیں گی بھلا......؟ اور آئیں گی اور دیکھیں گی تو پول نہیں کھل جائے گا بھلا......؟ اللہ......! وہ بھی دادی اماں کی نظروں میں حقیر ہو جائے گی۔

لیکن نہیں......! آپی بہت ذہین ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال نہ ہوا ہوتا تو بھی آپی نے دادی اماں کو دور رکھنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر نکال لی ہوتی۔ آخر انہوں نے آغا جی کو بھی تو یہاں آنے سے روک دیا ہے۔ اور اب بھی، جیسے انہوں نے آغا جی کو روک رکھا ہے، ویسے ہی دادی اماں کو بھی روک دیں گی۔

آپی کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ وہ ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے ایک ناممکن کو... آغا جی کے ملنے کو ممکن بنا دیا تو اپنے لئے تو وہ اس سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں۔

لیکن یہ سب غلط ہے۔ اس نے شرمندگی سے سوچا۔ دادی اماں کے لئے یہ بہت بڑی خوشی ہے۔ وہ ہر لمحہ اپنی بہو کے قریب رہنا چاہتی ہوں گی، جو کہ ان کے خواب کو تعبیر دینے والی ہے۔ یوں وہ ایک بڑی خوشی سے محروم رہیں گی۔

اور آغا جی کے ساتھ تو یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ بلکہ شاید یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے آدمی اتنا طویل عرصہ تنہا گزارے، یہ تو بہت بڑا ظلم ہے۔ وہ انسان ہیں اور انسان کے ساتھ نفس لگا ہے، جو کہ ایک لمحے میں بہت بڑا فتنہ، بہت بڑی آزمائش بن جاتا ہے۔ کبھی آغا جی کا دل چاہتا ہوگا

یہ سوچتے ہوئے تنہائی کے باوجود اس کا چہرہ دہک اٹھا۔

ایک شخص کو اس کے اللہ کے عطا کئے ہوئے حق سے سازش، جھوٹ اور فریب کے تحت محروم کرنا یہ تو گناہ ہی ہے۔ اس نے سوچا اور لرز گئی۔ اسے آغا جی پر ترس آنے لگا۔ آپی نے انہیں کیسے دور کیا ہے۔ لیکن وہ خود بھی تو اس جرم میں برابر کی شریک ہے۔

مگر اب وہ کچھ کر نہیں سکتی، پیچھے ہٹ نہیں سکتی۔ اب یہ جھوٹ ہو، فریب ہو، گناہ، اسے تو آخر تک نبھانا ہے۔ عہد شکنی تو نہیں کی جا سکتی۔ اور سوال صرف اس کے ذلیل اور حقیر ہونے کا ہوتا تو وہ پرواہ نہ کرتی، اعتراف کر لیتی۔ لیکن یہاں معاملہ آپی کا بھی ہے۔

اس نے سمجھ لیا کہ وہ کثرت سے استغفار اور توبہ کرنے کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتی۔

"کیوں بیٹے ... ! ٹھیک ہے نا ... ؟" اس نے اپنے بچے سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں، کیسے، لیکن اسے یقین تھا کہ وہ بیٹا ہی ہے۔

بچے نے خفیف سے جنبش کی، جسے اس نے بچے کی تائید پر محمول کیا۔

اس کا بچہ اس کی تنہائی کا ساتھی بن گیا تھا۔ زور سے بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دل میں جو کچھ کہے گی، بچہ اسے سن بھی لے گا اور سمجھ بھی لے گا۔ اور اس نے اپنے طور پر بچے کی تربیت بھی شروع کر دی تھی۔

میں چاہتی ہوں کہ تم سر سے پاؤں تک صرف اور صرف محبت ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ میری تمام باتیں تمہارے اندر اتر جائیں، کیونکہ اندر اتری ہوئی باتیں ہی تو سب سے طاقت ور ہوتی ہیں۔ وہ بچے سے کہتی۔ میں تمہیں چار محبتیں سونپنا چاہتی ہوں۔ سب سے پہلے اللہ کی محبت، جو میرے بطن کے گہرے اندھیرے میں تین مرحلوں میں تمہاری تخلیق مکمل فرمائے گا انشاء اللہ! یہ اس کا احسان ہے تم پر بھی اور دوسروں پر بھی ... مجھ پر بھی، تمہارے باپ پر بھی اور دادی پر بھی۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہر عبادت اور ہر محبت کا صرف وہی سزاوار ہے۔ اس کا حکم ماننا، اس کی اطاعت کرنا بشر کی پہلی ترجیح ہونا چاہئے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں گی۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتی رہوں، یہاں تک کہ تم جوان ہو جاؤ، تب بھی اس کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ حالانکہ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔ صرف اتنا جانتی ہوں، جتنا خود اس نے بتایا ہے۔ اور جتنا کچھ اس نے بتایا ہے، وہ بہت ہی کم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی توصیف اور اس کی عظمت ازل سے ابد تک مسلسل بیان کی جائے تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

پھر قرآن ہے میرے بچے ... ! اس سے عشق کرنا کہ یہ اللہ کا کلام ہے، ہم پر اس کا ایک اور بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن جو ضابطہ حیات ہے، راہنما ہے، نورِ ہدایت ہے، ہمارے لئے راستہ بھی ہے اور منزل بھی۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جاتے جاتے فرمایا کہ اسے مضبوطی سے تھامے رکھنا۔

پھر ہمارے پیارے نبی ہیں ... محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ... اللہ کو سب

سے بڑھ کر محبوب، آخری پیغمبر، جن کے ذریعے اللہ نے قرآن ہم تک پہنچایا، جنہوں نے ہمیں قرآن کو سمجھنا اور اس کی ایک ایک آیت پر عمل کرنا سکھایا۔ جن کی وجہ سے ہم ایمان سے روشناس ہوئے۔ جن کی عطا کی ہوئی روشنی میں ہی ہم ہر گمراہی، ہر خرابی اور دنیا اور آخرت کے ہر عذاب سے محفوظ ہو سکتے ہیں۔ اپنے ماں باپ سے، دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ان سے محبت کرنا میرے بچے ... ! ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا، ان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہر عمل کی اتباع کرنا کہ اسی میں فلاح ہے۔

اور چوتھی محبت میرے بچے ... ! یہ کہتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ بچے کا کوئی نام بھی ہونا چاہئے۔ اسی ثانیے اس کے ذہن میں ایک نام آیا اور جو اس نے دل، دماغ اور روح کی گہرائی سے قبول کر لیا۔

غور سے سنو میرے بچے ... ! تمہارا نام نورالحق ہے۔

اسے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ کون ہوتی ہے اس بچے کا نام رکھنے والی؟ یہ تو آپی کا بچہ ہے۔ اس بچے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ تو بس اسے نو ماہ پیٹ میں رکھنے اور جنم دینے کی حد تک ماں ہے اور یہ بات بھی کسی اور کو معلوم نہیں ہوگی۔

تو کیا ... ؟ میں اسے اپنے طور پر خاموشی سے اس نام سے پکار لیا کروں گی۔ اس نے سوچا۔

ہاں تو نورالحق ... ! میں آپ کو چوتھی بڑی محبت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس نے بچے سے اپنا سلسلہ کلام جوڑا۔ پہلی تینوں بڑی محبتیں آخرت کے لئے ہیں، اگرچہ ان سے دنیا بھی سنورتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دنیا کی محبت بھی سونپی ہے۔ وہی تو آزمائش بنتی ہے۔ اللہ نے دنیا کی محبت دے کر دنیا میں بھیجا ہے ... جنت کمانے کے لئے۔ تو ہوتا یہی ہے۔ دنیا کی محبتیں بڑھ کر ہوس بن جاتی ہیں اور آدمی آخرت کو بھول جاتا ہے۔ آخرت میں عزت، سعادت اور انعام دلوانے والی محبتوں کو بھول جاتا ہے۔

میں تم سے دنیا میں سب سے بڑی محبت کے لئے کہتی ہوں کہ تم سب

سے بڑھ کر اپنے باپ سے محبت کرنا۔ اتنی محبت کرنا ..... اتنی محبت کرنا ان سے کہ میں سرخ رو ہو جاؤں۔ لیکن یاد رہے، اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن کی محبت کے سامنے ان کی محبت کی کوئی حیثیت نہیں۔

یہ ساری باتیں وہ اس سے کرتی رہتی تھی۔ وہ اسے عبدالحق کے بارے میں بتاتی، جیسے اسے متعارف کرا رہی ہو۔

لیکن آج نماز پڑھ کر آپی کی شفا اور صحت کے لئے دعا کرنے کے بعد وہ دیر تک استغفار کرتی رہی۔ پھر وہ قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھ گئی۔

قرآن پڑھتے ہوئے کوئی آیت سمجھ میں آتی تو وہ اس پر بچے سے یک طرفہ تبادلہ خیال کرتی۔ عبدالحق کے بعد وہ دوسری ہستی تھی، جس سے وہ قرآن کی روشنی بانٹتی تھی۔

❁ ❁ ❁

اسپتال میں نور بانو کو پہلے تو او پی ڈی میں لے جایا گیا۔ مگر پھر اس کی حالت کے پیش نظر اسے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ دوائیں دی گئی تھیں، جن سے تکلیف کچھ کم ہوگئی تھی۔ پھر بھی نور بانو کی حالت اچھی نہیں تھی۔ لیکن ایسے میں بھی اسے اپنے کھیل کے خراب ہونے کی فکر لاحق تھی۔ اس نے سرگوشی میں رشیدہ سے کہا۔

''نوریز کو گھر واپس بھیج دو۔''

''لیکن بی بی صاب .....! یہاں بھی تو .....''

''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا ہی کرو۔'' نور بانو نے چڑ کر کہا۔

رشیدہ نے نوریز کو نور بانو کا پیغام پہنچا دیا۔ نوریز بہت فکر مند تھا۔

''بیگم صاحبہ کب تک یہاں رہیں گی .....؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا پتا .....؟ تم بس اپنا کام کرو۔''

''میرے خیال میں تو صاحب کو بتا دینا چاہئے۔''

یہاں رشیدہ کو اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا پڑا۔ نور بانو نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اس نے اپنے طور پر سمجھ لیا تھا کہ یہ کھیل اس کی مالکن اپنے شوہر کو بے

خبری میں رکھ کر کھیل رہی ہے۔

''یہ تمہارا کام نہیں نوریز .....! ہم تو نوکر لوگ ہیں۔'' اس نے نوریز کو سمجھایا۔

''صاحب نے کبھی مجھے نوکر نہیں سمجھا۔ میں گھر کے فرد کی طرح ہوں۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نوکر تو نوکر ہی رہتا ہے۔'' رشیدہ نے سرد لہجے میں کہا۔

''ویسے تمہارے صاحب کرتے کیا ہیں .....؟'' اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔ اپنے انداز کے تصدیق کا یہ اچھا موقع اسے ملا تھا۔

''بہت بڑے افسر ہیں۔'' نوریز نے فخر سے کہا۔

''پولیس افسر .....؟'' رشیدہ نے تصدیق چاہی۔

''نہیں .....!'' نوریز نے جواب دیا۔ پھر چونک کر بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا .....؟''

''کسی نے بھی نہیں .....! ہم لوگ تو پولیس افسر کو ہی بڑا افسر سمجھتے ہیں۔''

''میرے صاحب پولیس افسر سے بھی بڑے افسر ہیں۔''

اس وقت رشیدہ کو ایک اور خیال آ گیا۔ اگر صاحب کا فون آ گیا اور چھوٹی بی بی نے انہیں بی بی صاب کے بارے میں بتا دیا تو .....؟ بی بی صاب کی یہ بات تو جھوٹی ثابت ہوگئی تھی کہ صاحب بہت بڑی پولیس افسر ہیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ ایسے میں اگر صاحب یہاں آ گئے تو .....؟ کوئی گڑبڑ ہوگئی تو انعام تو دور کی بات، نوکری بھی چلی جائے گی۔ زمین واپس لینے کا آسرا بھی ختم .....

''تم ذرا رکو۔ میں بی بی صاب سے مل لوں۔ ہو سکتا ہے، مجھے بھی تمہارے ساتھ چلنا پڑے۔'' اس نے نوریز سے کہا۔

وہ وارڈ میں آئی۔ لیکن نور بانو مسکن دواؤں کے زیر اثر تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے اپنی بہتری کی خاطر اپنے طور پر ہی کچھ فیصلے کرنے ہوں گے۔ ایک تو اس نے یہ سوچ لیا کہ بی بی صاب کو ایک الگ کمرہ دلوانا ہوگا۔ دوسرے چھوٹی بی بی سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔

اس نے نرس کو دس کا ایک نوٹ دیا۔

"بی بی صاب کا خاص خیال رکھنا ... ابھی میں آؤں گی تو انہیں الگ کمرے میں لے جائیں گے۔"

❁ ❁ ❁

"آپی نہیں آئیں ....؟" ارجمند نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے.... ؟ خیریت تو ہے نا.... !"

"تو پھر آپی کہاں ہیں ....؟" ارجمند کے لہجے میں وحشت تھی۔

"وہ ابھی اسپتال میں ہیں۔" رشیدہ نے کہا۔ پھر اس کی پریشانی بڑھتے دیکھ کر جلدی سے وضاحت کی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ طبیعت اب بہت ٹھیک ہے ان کی۔ پر شاید دو ایک دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔"

"تو تم انہیں اکیلا چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئیں؟" ارجمند نے برہمی سے کہا۔

"میں تو کام سے آئی ہوں۔ ایک تو بی بی صاب کو الگ کمرہ دلانا ہے، اس کے لئے پیسے چاہئیں۔"

ارجمند اس کی پوری بات سنے بغیر الماری کی طرف بڑھ گئی۔ الماری کے سیف نے نور بانو ہمیشہ اچھی بڑی رقم رکھتی تھی کہ ممکن ہے، کبھی اچانک ضرورت پڑ جائے۔ اس کی چابی اس کے پاس ہی رہتی تھی۔

اس نے سیف میں سے سو سو کے دس نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

"یہ لو ..... اور اب آپی کے پاس سے نہ ہٹنا، بلکہ سنو.... میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔ ایک نظر دیکھ کر آ جاؤں گی آپی کو۔"

رشیدہ نے گہری سانس لی۔

"یہ ہونا ہوتا تو وہ آپ کو اپنے ساتھ ہی نہ لے جاتیں۔"

ارجمند ٹھٹک گئی۔

اب رشیدہ کے لئے بات کرنے کا موقع تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے جو کچھ بھی کہنا ہے، بی بی صاب سے منسوب کر کے کہنا ہے۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو اس کے لئے تیار کیا۔

"مجھے بی بی صاب نے خاص طور پر بھیجا ہے.... آپ کو سمجھانے کے لئے۔"

ارجمند متوقع نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"انہوں نے کہا ہے کہ صاحب کا فون آئے تو انہیں ٹال دیجئے گا۔ یہ نہ بتایئے گا کہ وہ اسپتال میں ہیں۔"

"یہ ان سے چھپانے والی بات نہیں.... یہ تو انہیں بتانے والی بات ہے۔" ارجمند نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ میں ان سے کیوں چھپاؤں ....؟"

"تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔"

"بات ایسی ہے کہ وہ پریشان تو ہوں گے۔ لیکن ان سے چھپائی نہیں جا سکتی۔ آپی کی صحت ان کی پریشانی سے زیادہ اہم ہے۔"

"لیکن وہ پریشان ہوں گے تو یہاں چلے آئیں گے۔"

"اور انہیں آنا بھی چاہئے۔" ارجمند نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"آپ نہیں سمجھتیں کہ وہ یہاں آئیں گے تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ وہ آپ کو دیکھیں گے۔" یہ کہتے ہوئے رشیدہ کی معنی خیز نظریں ارجمند کے پیٹ کی طرف جھکیں۔

"اور پھر بی بی صاب کو دیکھیں گے۔"

ارجمند کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے رشیدہ کی بے حجابی پر پہلے تو غصہ آیا۔ مگر پھر وہ بات کی اہمیت کو سمجھ گئی۔ واقعی..... اسی لئے تو آپی نے آغا جی کو یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔

"لیکن وہ آپی سے بات کرنے کو کہیں گے تو میں انہیں کیسے ٹالوں

گی..... ؟" اب اس کا انداز مدافعانہ تھا۔

"کہہ دیجئے گا کہ وہ بازار گئی ہوئی ہیں۔" رشیدہ نے بے پرواہی سے کہا۔

"اور انہوں نے دو چار گھنٹے کے بعد پھر فون کر لیا تو.....؟"

"تو کہئے گا، ابھی واپس نہیں آئی ہیں۔"

"یہ کیسے ممکن....."

"کہہ دیجئے گا کہ انہیں معمول کے معائنے کے لئے اسپتال بھی جانا تھا۔"

"یہ بھی نہیں پتا کہ آپی کو کتنے دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔" ارجمند نے پریشانی سے کہا۔

"کچھ بھی ہو، آپ کو انہیں یہاں آنے سے روکنا ہے۔"

یہ بات تو ارجمند نے بھی سمجھ لی تھی۔ لیکن یہ بھی جان لیا تھا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔

"تو اس کے لئے مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

اتنا بڑا جھوٹ بولنے کے بعد آپ جھوٹ بولنے سے ڈرتی ہیں۔" رشیدہ نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو۔" ارجمند نے بہت سخت لہجے میں کہا۔ یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت تھی کہ ایک نوکرانی اس کو اس کے منہ پر اس بدتمیزی سے جھوٹا کہے۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا تھا۔

"آئندہ کبھی مجھ سے اس طرح بات نہ کرنا۔"

"آپ کو مجھ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے۔" رشیدہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"میں بظاہر آپ کی نوکرانی سہی، اصل میں آپ کی راز دار ہوں۔"

مگر اب ارجمند کو جلال آ گیا تھا۔

"راز دار تم آپی کی ہو، میری نہیں۔ میرے لئے تمہاری وہی حیثیت ہے، جس میں تمہیں رکھا گیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا کہ رشیدہ کی

پوزیشن بہت مضبوط ہے اور وہ اس کی توقع کے عین مطابق اسے بلیک میل کر رہی ہے۔ لیکن بلیک میل ہونا اس کی اپنی فطرت کے خلاف تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایک بار بلیک میلنگ قبول کر لی تو بھی چھٹکارا نہیں مل سکے گا۔ اسے اسی لمحے رشیدہ کو زیر کرنا ہے۔

"لیکن راز تو آپ کا بھی ہے۔ صاحب کو معلوم ہو گیا تو.....؟" رشیدہ بھی بہت پکی تھی۔ وہ ایسے ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"میرے لئے جھوٹ بولنا جتنا مشکل ہے، سچ بولنا اتنا ہی آسان ہے۔" ارجمند نے پوری سچائی سے کہا۔

"اور سچ بولتے ہوئے میں نتائج کی پرواہ بھی نہیں کرتی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔"

رشیدہ کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس جھوٹ سے تو اس کی زمین واگزار ہونے کی امید بندھی تھی۔ اور ارجمند کا لہجہ ایسا تھا، جیسے وہ ابھی فون کر کے صاحب کو حقیقت بتا دے گی۔ اس نے جلدی سے ارجمند کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر معافی مانگتی ہوں چھوٹی بی بی.....! اگر میں نے آپ سے بدتمیزی سے بات کی تو صرف بی بی صاب کی خاطر....."

"غلط.....!" ارجمند نے اس کی بات کاٹ دی۔

"آپی سے تمہیں کیا دلچسپی، تم اپنی غرض کی فکر کرتی ہو۔ کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو.....؟"

"یہ بھید کھل گیا تو بی بی صاب مر جائیں گی۔"

"میں نے کہا نا.....! تم بس اپنی غرض کی فکر کرو۔ باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ آئندہ مجھ سے یا آپی سے کبھی اس طرح بات نہ کرنا۔ ورنہ میں تمہیں فوری طور پر نکال دوں گی۔ بس اب تم جاؤ۔" ارجمند نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

رشیدہ نے عافیت اسی میں جانی کہ وہاں سے نکل بھاگے۔ کچھ بھی ہو، کمزور ہمیشہ کمزور ہی رہتا ہے۔ اس نے تلخی سے سوچا۔

اس کے جانے کے بعد ارجمند دیر تک اس صورت حال کے بارے میں سوچتی رہی۔ ایک بڑی اہم حقیقت یہ تھی کہ اب تک اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اس نے بس اتنا کیا تھا کہ ایک سچائی کا اعلان نہیں کیا تھا۔ لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اور یہ وہ جانتی تھی کہ ایک جھوٹ بولنے کے نتیجے میں آدمی کو ہزار جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔

یہ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کے بجائے سچ کہہ دے۔ لیکن اس میں عہد شکنی ہوتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان دو برائیوں میں زیادہ بڑی برائی کون سی ہے۔

وہ دیر تک اس پر سر کھپاتی رہی۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ محض وقت ضائع کر رہی ہے۔ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی کہاں ہے۔ اگر کوئی مفتی فتویٰ بھی دے دے کہ جھوٹ بولنے کے مقابلے میں عہد شکنی بہتر ہے، تب بھی وہ عہد شکنی نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں آپی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ رشیدہ نے کہا تھا کہ یہ جھوٹ کھل گیا تو بی بی صاب مر جائیں گی۔ ایسا نہ بھی ہوتو یہ طے تھا کہ وہ آغا جی، دادی اماں اور سب لوگوں کی نظروں میں بے توقیر ہو جائیں گی۔ بلکہ وہ خود اپنی نظروں میں بھی گر جائیں گی۔ اور یہ وہ کیسے گوارہ کر سکتی ہے۔ آپی نے اسے اپنی سگی بہن کی طرح چاہا ہے۔ یعنی بات عہد شکنی سے بڑھ کر احسان فراموشی تک پہنچے گی۔

جس وقت نور بانو نے اس سے یہ وعدہ لیا تھا، اسے نہیں معلوم تھا کہ کس طرح کے معاملات درپیش ہوں گے۔ ذرا بھی اندازہ ہوتا تو وہ عبدالحق سے محرومی گوارہ کر لیتی، لیکن یہ وعدہ نہ کرتی۔

مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تن بہ تقدیر ہوگئی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق سفارش کا قائل ہی نہیں تھا۔ وہ کسی بھی صورت میں سعودی سفیر سے اپنے کسی ذاتی مسئلے کے سلسلے میں رابطہ نہ کرتا۔ لیکن خوش قسمتی سے یہ بات

دوسروں کو معلوم نہیں تھی۔ اس لئے وہ محتاط تھے۔

اس کے باوجود محکمے میں اسے عضو معطل بنا دیا گیا تھا۔ درحقیقت اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے سکریٹری صاحب سے اس سلسلے میں بات کی۔

''آپ کو کیا پریشانی ہے، عیش کرتے رہئے۔'' سکریٹری نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''مفت کی تنخواہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔ میں یہاں کام کرنے کے لئے آتا ہوں۔'' عبدالحق نے سادگی سے کہا۔

''جب کام کا وقت تھا تو آپ چھٹی پر چلے گئے۔'' سکریٹری نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''میں چھٹی پر گیا نہیں، زبردستی بھیجا گیا تھا۔''

سکریٹری کو اچانک خیال آگیا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی پوزیشن خراب کر رہا ہے۔ ہاتھیوں کی اس لڑائی میں اسے خواہ مخواہ نقصان پہنچ جائے گا۔ چنانچہ اس نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

''مجھے آپ سے ہمدردی ہے عبدالحق صاحب......! لیکن یہاں سب کچھ منسٹر صاحب کے حکم سے ہوتا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔ کاش میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا۔''

''آپ اتنا کریں کہ میں جہاں سے آیا تھا، مجھے وہیں بھیج دیں۔''

''یہ میرے اختیار میں کہاں......؟'' سکریٹری نے ٹھنڈی سانس لی۔

''آپ منسٹر صاحب سے بات تو کر سکتے ہیں۔''

''میری کیا مجال کہ آپ کے سلسلے میں ان سے بات کروں۔ وہ تو آپ کا نام سن کر ہی بھڑک جاتے ہیں۔'' سکریٹری بولا۔ پھر چند لمحے کے توقف کے بعد اس نے تجویز پیش کی۔

''جب آپ ایمرجنسی کے دوران چھٹی لے سکتے ہیں تو اپنا تبادلہ بھی کرا سکتے ہیں۔ ویسے بھی کہاں کسٹم اور کہاں وزارت خارجہ؟'' اس کے لہجے میں دبی دبی شرارت تھی۔

عبدالحق نے سمجھ لیا کہ بات کرنا لاحاصل ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

اس نے بہت سے ناپسندیدہ افسروں کا حشر دیکھا تھا۔ انہیں او ایس ڈی بنا دیا جاتا اور پھر بھاری پتھروں کی طرح اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر لڑھکایا جاتا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوا تو وہ اس کی وجہ بھی جانتا تھا۔ محض سفیر صاحب کی مداخلت کے خیال سے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ حالانکہ سفیر صاحب کو تو صورتِ حال کا علم ہی نہیں تھا۔

بہرحال وہ اس صورتِ حال سے بہت ناخوش تھا۔

دشواری یہ تھی کہ گھر میں بھی اس کے لئے خوشی نہیں تھی۔ اوّل تو وہ گھر ہی نہیں تھا۔ وہ تو چار دیواری تھی، مکان تھا، اور مکان مکینوں کے بغیر گھر کہاں ہوتے ہیں؟ یہ بات بہت عجیب اور دل شکن تھی کہ وہ بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھا۔

وہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ تنہائی اسے بری لگ رہی تھی۔ ورنہ اسے تو تنہائی بہت پسند تھی۔ تنہائی میں نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا اور اس پر غور کرنا اس کے لئے بہت بڑی نعمت اور بہت بڑی خوشی تھی۔

لیکن یہ تنہائی تو نہیں تھی۔ یہ مہیب، مسلسل اور اتھاہ تنہائی، جس کا کوئی اختتام نہیں تھا، یہ تو کچھ اور تھا۔ تنہائی تو وہ ہوتی ہے، جسے آدمی اپنی خوشی سے اپنی مرضی کے مطابق اپنائے۔ یہ تنہائی تو اس پر مسلط کر دی گئی تھی۔

ظلم یہ تھا کہ نور بانو نے اسے اپنا عادی بنا دیا تھا۔ اور پھر اب تو ارجمند بھی تھی۔ کبھی کبھی ارجمند بھی اسے یاد آتی۔ لیکن وہ اپنی گفتگو اور خاص طور پر قرآن کے بارے میں گفتگو کے حوالے سے یاد آتی تھی۔ جبکہ نور بانو کی یاد کا حوالہ صرف اور صرف نفسانی تھا۔

اللہ کا کرم تھا کہ وہ قرآن سے جڑا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال میں قرآن کی ہدایت کے مطابق وہ ہفتے میں دو تین دن روزہ رکھ لیتا تھا۔ ورنہ شاید جسمانی تقاضے اسے پاگل کر دیتے۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ کر، سب کچھ بھول کر ایبٹ آباد چلا جائے۔

ایسے میں اسے نور بانو پر جھنجلاہٹ ہونے لگی، غصہ آنے لگا۔ وہ سوچتا، یہ

کیسی بے تکی عورت ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ اللہ نے خوشی دی تو منت مان کر خود کو اور اسے نعمتوں سے محروم کر دیا۔ اور ظلم پر ظلم یہ کہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے گئی۔

سوچوں کے اس عرصے میں اس پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ارجمند کو ساتھ لے جانے میں نور بانو کا بنیادی مقصد اپنی دوسراہٹ نہیں ہے، بلکہ وہ ارجمند کو اس سے دور رکھنا چاہتی تھی، اس ڈر سے کہ کہیں ارجمند اسے اس سے بڑھ کر عزیز نہ ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ نور بانو سدا کی حاسد اور تنگ دل ہے۔ جو ساجد جیسے چھوٹے سے بچے کو رقیب سمجھ سکتی ہے، وہ سوکن کو کیا سمجھے گی؟ یہ جو اس نے اصرار کر کے ارجمند سے اس کی شادی کرائی، یہ تو ایک معجزہ ہے، اور اللہ نے ایک تنگ دل عورت کے اس ایثار کے صلے میں ہی اسے نواز دیا ہے۔ لیکن اس کی تنگ دلی تو جانے سے رہی۔

اس کی یہ سوچ بے سبب، بے دلیل نہیں تھی۔ نور بانو نے خود یہ بات ثابت کر دی تھی۔ تمام عرصے میں صرف ایک بار اس کی ارجمند سے بات ہو سکی تھی، وہ بھی بمشکل ایک منٹ۔ اس کے علاوہ اس نے جب بھی ارجمند سے بات کرنی چاہی، نور بانو نے کوئی بہانہ بنا دیا۔

نور بانو پر اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نے اسے فون کرنا بھی کم کر دیا۔ جھنجلاہٹ کے علاوہ بھی اس کی وجوہات تھیں۔ ایک تو اسے یہ بات بہت بری لگی تھی کہ اس کے یقین کے برعکس تمام آداب اور طور طریقے بالائے طاق رکھ کر وہ حمیدہ کی اجازت لئے بغیر ایبٹ آباد چلی گئی تھی۔ یہی نہیں، پانچ ماہ کے اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی حمیدہ کو فون نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس کی ماں کے ساتھ ایسا سلوک!

اور دوسری وجہ ذاتی تھی۔ نور بانو سے فون پر بات کرتا تو اس کا نفس بے لگام ہو جاتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایبٹ آباد چلا جائے۔ روزے کا اثر بھی زائل ہو جاتا تھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ اسے ارجمند کی حق تلفی کا احساس ستاتا تھا۔ وہ جانتا تھا

کہ ارجمند کے ساتھ بہت بڑی زیادتی، بلکہ ظلم ہو رہا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کے ضمیر پر بہت بڑا بوجھ تھا۔ اور اس بوجھ کی ذمہ دار نور بانو تھی۔

ارجمند نے کبھی یہ بات نہیں چھپائی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ بلکہ اس کی محبت تو ہر اعتبار سے غیر معمولی تھی۔ پہلی بار اس بارے میں اسے نادرہ نے بتایا تھا۔ اور نادرہ خود اسے غیر معمولی سمجھتی تھی، اس کے بقول ارجمند کو یہ محبت جس عمر میں ہوئی تھی، اس میں بچوں کو محبت کا مطلب بھی معلوم نہیں ہوتا۔

پھر وہ محبت اپنے وجود میں بھی غیر معمولی تھی۔ اور عبدالحق کو اس سے بھی انکار نہیں تھا کہ خود ارجمند ہر اعتبار سے غیر معمولی لڑکی ہے۔ وہ ایک بار اپنی محبت کا اعلان کرنے کے بعد سکون سے بیٹھ گئی تھی۔ اس کی محبت میں اضطراب، خلفشار، بے چینی اور تڑپ نہیں تھی، جبکہ کم عمری کی محبت تو طوفان کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس کی محبت میں سکون، قناعت اور یقین تھا۔ شاید اس کی وجہ اللہ سے اس کا تعلق تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو وہ چاہتی ہے، اللہ اسے دے دے گا۔

اور ہوا بھی یہی تھا۔۔۔ اور حد درجہ ناقابل یقین تھا۔ کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ نور بانو جیسی تنگ دل اور حاسد عورت، خوشامد کر کے اس کی شادی ارجمند سے کرائے گی۔ لیکن یہ ان ہونی ہوگئی تھی۔

ارجمند سے شادی کے بعد عبدالحق نے کئی بار خود کو ٹٹولا تھا۔ اسے ارجمند سے محبت نہیں تھی۔ لیکن وہ اس میں بہت کشش محسوس کرتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ کشش جسمانی نہیں، ذہنی اور روحانی تھی۔ اللہ سے تعلق اور قرآن کی محبت ان کے درمیان قدرِ مشترک تھی۔ بلکہ یہاں وہ ارجمند سے مرعوب تھا۔ ارجمند کم عمر ہونے کے باوجود اس سے آگے تھی۔

تاہم وہ ارجمند کی خوب صورتی سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بہت حسین تھی۔۔۔۔ اتنی حسین کہ حقیقت نہیں، خواب لگتی تھی۔ مگر اس کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ خوب صورتی اس کی نظر میں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے، لیکن جب وہ نور بانو کو

دیکھتا تو پوری سچائی کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ نور بانو ارجمند سے زیادہ حسین ہے۔ ایسے میں وہ جلدی سے اپنی سوچ میں تین لفظ ٹانک لیتا میری نظر میں۔

دونوں کی قربت کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ نور بانو کی قربت میں وحشت تھی، طوفان تھا، سب کچھ بہل جاتا تھا۔ جبکہ ارجمند کی قربت میں سکون تھا، کچھ پانے کا احساس تھا۔ ارجمند سے وہ گھنٹوں باتیں کرتا اور وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا۔ ہر بار وہ اس سے کچھ نہ کچھ سیکھتا۔

تو اسے ارجمند سے کم از کم روایتی محبت ہرگز نہیں تھی، لیکن اب وہ اس کی بیوی تھی، اس کی ذمہ داری تھی۔ اور نور بانو کی وجہ سے اس کی حق تلفی ہو رہی تھی۔ لیکن ذمہ دار تو وہ تھا۔ اسے احساس جرم ستاتا تھا۔ وہ اللہ سے ڈرنے والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ اللہ کے سامنے اس زیادتی اور بے انصافی کی جواب دہی کون ہوگی، جو کہ ممکن ہی نہیں۔ لیکن نور بانو کے وجود کا صندوق نت نئی ترکیبوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنی ہر بات منوانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اب منت کو ہی دیکھ لو۔ اس سے ایک طرف تو وہ محروم ہوا۔ لیکن نور بانو نے ارجمند کے لئے بھی کوئی موقع نہیں چھوڑا۔ اور عبدالحق کو یقین تھا کہ نور بانو نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا ہے۔

اس نے سر جھٹک کر گویا اپنی سوچوں کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ ان دنوں تو وہ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا۔ کہیں بھی سکون نہیں تھا، نہ گھر میں، نہ دفتر میں۔ بس ایک خوش کن خیال اسے سہارا دیتا تھا۔ وہ باپ بننے والا ہے اور اگر اللہ نے بیٹا عطا فرمایا تو انشاء اللہ اس کی نسل ایمان کے راستے پر آگے بڑھے گی۔

یہ اس کے لئے بہت بڑی خوشی تھی۔ اس کے بارے سوچتا تو ہر پریشانی غیر اہم اور بے معنی لگنے لگتی۔

اس نے سوچا کہ آج ایبٹ آباد فون کر ہی لے۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا تو پہلے وہ حمیدہ کو فون کرتا۔ اس وقت بھی اس نے ایسا ہی کیا۔

عدت ختم ہونے کے بعد حمیدہ صفیہ کو اپنے ساتھ لاہور لے آئی تھی۔ اور اب اس نے سوچا تھا کہ صفیہ کو اپنے ساتھ ایبٹ آباد لے جائے گی۔ نور بانو کے ہاں ولادت تک وہ دونوں یہیں رہیں گی۔

حمیدہ سے فون پر خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد اس نے پوچھا۔

''اماں......! ایبٹ آباد کا کب کا ارادہ ہے......؟''

''اگلے ہفتے انشاء اللہ چلیں گے۔ میں نے زبیر سے بات کر لی ہے۔''

''ٹھیک ہے......! میں نور بانو کو بتا دوں گا۔''

''اسے نہ بتانا پتر......! اچانک کہیں دیکھے گی تو کتنی حیران ہوگی وہ۔''

حمیدہ بچوں کی سی ہیجانی خوشی میں مبتلا تھی۔

''ٹھیک ہے اماں......!'' عبدالحق نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ دل میں اس نے سوچ لیا تھا کہ نور بانو کو بتانا ضروری ہے۔ اماں جسے نور بانو کے لئے خوش گوار حیرت سمجھ رہی ہیں، ممکن ہے، وہ نور بانو کے لئے نہایت ناخوش گوار ہو۔ پہلے سے بتا کر وہ اسے کم از کم اس کے لئے تیار کر سکتا ہے۔ یوں نور بانو کے منفی ردِ عمل کا سامنا تو وہ کرے گا۔ اماں محفوظ ہو جائیں گی۔

اس نے ایبٹ آباد کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع اسے دوسری طرف سے ارجمند کی السلام علیکم کی آواز سنائی دی۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔

''شکر ہے ارجمند......! تم سے بات تو ہوئی۔'' اس نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''کیسی ہو تم......!''

''جی......الحمد للہ......!'' ارجمند کے لہجے میں ہلکی سی حیرت تھی۔

''بہت مصروف رہتی ہو......؟''

''جی...... جی نہیں تو......!'' ارجمند گڑبڑا گئی۔

''میں جب بھی فون کرتا ہوں، تم کہیں مصروف رہتی ہو۔''

''اتفاق ہے......!'' ارجمند نے کہا۔ پھر جلدی سے بات بدلی۔

''آپ کیسے ہیں......؟''

''الحمد للہ......! خیریت سے ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم سے بات کا موقع ملا۔''

ارجمند کا دل ایک پل کو جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

''ایسی کیا بات ہے......؟''

''بہت جی چاہتا تھا تم سے بات کرنے کو۔ کبھی تم خود ہی فون کر لیا کرو۔ میرا نمبر تو ہے تمہارے پاس......؟''

''جی......جی......لیکن......'' ارجمند کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟

''یہ کہنے والی باتیں نہیں ہوتیں آغا جی......! یہ تو بغیر کہے ہی محسوس کر لی اور سمجھ لی جاتی ہیں۔ اور میں نہیں سمجھتی کہ آپ نے یہ سوال سنجیدگی سے کیا ہے، کیونکہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں۔ دل ٹیلی فون کا اور لفظوں کا محتاج تو نہیں ہوتا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن مجھے معذرت کرنی ہے تم سے۔ معافی مانگنی ہے۔''

''کیسی بات کر رہے ہیں آغا جی......! کیوں مجھے گناہ گار......''

''مجھے بات کرنے دو پلیز......!'' عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

''تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اور اس کا ذمہ دار میں ہوں۔''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نہ جانے کس زیادتی کی بات کر رہے ہیں۔''

''تمہیں نور بانو کے ساتھ یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ مجھے روک دینا چاہئے تھا۔ لیکن میں وقت پر فیصلہ نہیں کر سکا۔ یہ تمہاری حق تلفی ہے۔ مجھے اس کی جواب دہی کرنی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے ہر حال میں اللہ کے ساتھ شرمندہ ہونا ہے۔ لیکن میں اس بات سے بہت ڈرتا ہوں۔ تم مجھے اس زیادتی پر معاف کر کے مجھے جواب دہی سے بچا سکتی ہو۔''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں آغا جی......!'' ارجمند نے بڑی محبت سے کہا۔

''میں اپنی خوشی سے یہاں آئی ہوں۔ اس لئے آپ کو کوئی جواب دہی نہیں کرنی۔''

''میں اتنے بڑے معاملے میں یوں مطمئن نہیں ہو سکتا۔ ایک بات بتاؤ، میں اگر تمہیں منع کر دیتا تو کیا تم پھر بھی یہاں آتیں......؟''

ارجمند بری طرح گڑبڑا گئی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"آپ کی حکم عدولی تو میں نہیں کر سکتی تھی۔"

"تو سچ یہ ہے کہ مجھے اپنے اس حق کو فرض سمجھ کر استعمال کرنا چاہئے تھا۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب تمہارے معاف کرنے سے ہی میں بچ سکتا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر ارجمند نے کہا۔

"آج ایک اہم بات بتا دوں آپ کو۔ ہمیشہ یاد رکھئے گا۔ میں نے اللہ کی بارگاہ میں ہمیشہ ایک عرض کی ہے۔ آپ کی طرف سے مجھ پر کوئی زیادتی یا میری کوئی حق تلفی ہو، دانستہ ہو یا نادانستہ، میں زندگی بھر کے لئے آپ کو اس پر معاف کرتی ہوں۔ میرا کوئی دعویٰ نہیں ہوگا آپ پر۔ تو آپ بےفکر ہو جائیں۔ انشاء اللہ قیامت کے دن میرے بارے میں آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔"

عبدالحق کو اس کی محبت نے ہلا کر رکھ دیا۔

"تم بہت اچھی ہو ارجی ..... میں تمہارا....."

"آگے کچھ نہ کہئے گا۔ یہ تو محبت کا حق ہوتا ہے۔ اور میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔"

"کاش میں بھی ....."

"یہ بھی نہ کہیں۔ جو محبت کرتا ہے، اسے محبت کرنا اچھا لگتا ہے، محبوب بننا نہیں۔"

"ارے ہاں ..... ! ایک اہم بات بتانی ہے۔ اگلے ہفتے اماں عفیہ چچی کے ساتھ آ رہی ہیں۔"

چند لمحوں کے لئے تو ارجمند سن ہو کر رہ گئی۔ پیچیدگی اور بہت بڑی پیچیدگی! مگر وہ انہیں روک تو نہیں سکتی۔

"جی بہت بہتر ..... !" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نور بانو سے بات ہو سکتی ہے .....؟" عبدالحق نے سرسری انداز میں کہا۔ ویسے اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ یہ ممکن نہیں۔ نور بانو اگر گھر میں ہوتی تو ارجمند سے اتنی طویل گفتگو وہ کبھی نہ کر پاتا۔

"اس وقت تو یہ ممکن نہیں آغا جی ..... !"

"کیوں .....؟"

"آپی اسپتال گئی ہیں۔" ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

"خیریت تو ہے .....؟"

ارجمند اگر سوچتی تو شاید اس سوال کا جواب کبھی نہ دے پاتی۔ لیکن جواب تو جیسے اس کی نوکِ زباں پر دھرا تھا۔

"وہ چیک اپ کے لئے جاتی ہیں نا ..... !"

"اوہ ..... ! ٹھیک ہے۔ ارجمند ..... ! اپنی آپی کا خیال رکھنا۔"

"آپ بےفکر رہیں آغا جی ..... ! آپ کی ہر امانت کا میں زندگی سے بڑھ کر خیال رکھتی ہوں، اور خیال رکھوں گی۔ چاہے مجھے خیال رکھنا آتا ہو یا نہیں آتا ہو۔ نہیں آتا تو میں سیکھ لوں گی۔"

عبدالحق نے سوچا کہ اتنی کم عمری میں ایک زچہ کا خیال رکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ لڑکی واقعی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔

اس نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

❁ ❁ ❁

نوریز رشیدہ کے ساتھ اسپتال جانا چاہتا تھا۔ لیکن رشیدہ نے اسے سختی سے روک دیا۔

"یہ بی بی صاب کا حکم ہے۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تمہیں یہیں رہنا ہے۔ بی بی صاب کے پاس میں رہوں گی۔"

نوریز کو وہ شروع سے ہی اچھی نہیں لگی تھی۔ مگر بیگم صاحب نے اسے خود رکھا تھا۔ اور وہ نہ ان سے اختلاف کر سکتا تھا، نہ ہی ان کے حکم سے سرتابی۔ وہ بے بس تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اس معاملے میں اسے کسی بہت بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ گڑبڑ کیا ہے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صاحب سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

رشیدہ اسپتال پہنچی تو نور بانو کی وہی کیفیت تھی۔ وہ مسکن دواؤں کے زیر

اثر تھی۔ رشیدہ نے ڈاکٹر سے بات کی اور یوں نور بانو کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا۔ ضرورت کی تمام چیزیں رشیدہ اپنے ساتھ لائی تھی۔

نور بانو کو ہوش آیا تو درد کا احساس تو بالکل نہیں تھا۔ لیکن نقاہت حد درجہ کی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ اجنبی کمرہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ ذہن پر زور دینے پر یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی، اور وہ اسپتال آئی تھی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ رشیدہ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اسے جاگتے دیکھا تو وہ اس پر جھک گئی۔

''آپ کی طبیعت اب کیسی ہے بی بی صاحب ...؟'' اس نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں ...!'' نور بانو نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔

''یہ اسپتال ہے ...؟''

''جی ہاں ... ! میں نے آپ کے لئے الگ کمرے کی بات کر لی تھی۔''

''مگر ہم گھر کیوں نہیں گئے ...؟''

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ آپ کو تین چار دن رُکنا ہوگا یہاں۔''

''کیوں ...؟'' نور بانو کے لہجے میں وحشت تھی۔

''یہاں تو میرا دم گھٹ جائے گا۔''

''آپ کی طبیعت بہت خراب ہے بی بی صاحب ... ! کل کے بعد اب تو آپ کو ہوش آیا ہے۔''

''کل ...؟'' نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، لیکن نقاہت کی وجہ سے ڈھ گئی۔ اسی لمحے درد نے بھی احساس دلا دیا کہ وہ ابھی موجود ہے۔ اور اس درد سے وہ بہت ڈرتی تھی۔

وہ لیٹی بے بسی سے رشیدہ کو تکتی رہی۔ اٹھنے کی وہ کوشش اس کے لئے اتنی بڑی مشقت ثابت ہوئی تھی کہ اب وہ ہانپ رہی تھی۔ بات کرنے کے قابل بھی نہیں تھی۔

''آپ آرام کریں بی بی صاحب ... ! کمزوری بہت ہوگئی ہے آپ کو۔''

یہ بات نور بانو نے بھی سمجھ لی تھی۔ درد اب جاگا تھا۔ اگرچہ ہلکا تھا۔ مگر اسے یہ ڈر لگ رہا تھا کہ بڑھ نہ جائے۔ کچھ دیر وہ خاموش رہی۔ یہاں تک کہ درد کا احساس معدوم ہوگیا۔

پھر اس نے آہستہ سے رشیدہ سے پوچھا۔

''تو میں کل سے یہاں ہوں ...؟''

''جی بی بی صاحب ... !''

اچانک نور بانو کا ذہن جیسے جاگ اٹھا ... بلکہ اندیشوں سے بھر گیا۔ اگر اس دوران عبدالحق نے فون کیا ہو، اور ارجمند نے اسے اس کے بارے میں بتا دیا ہو تو کیا ہوگا ... ؟ وہ یہاں آجائے گا۔ اور وہ یہاں آگیا تو سب کچھ ختم۔ شاید کچھ بھی نہیں بچے گا ... اس کی ازدواجی زندگی بھی نہیں بچے گی۔ عبدالحق جھوٹ سے کتنی نفرت کرتا ہے۔ جبکہ یہاں تو بات جھوٹ سے بہت آگے کی ہے۔ یہ تو بہت بڑا فریب ہے، مجرمانہ دھوکا ہے اسے وہ کیسے معاف کر سکے گا، چاہے وہ اس سے کتنی ہی محبت کرتا ہے۔ اور اب تو ارجمند جیسی حسین لڑکی اس کی بیوی ہے، اور ایسی بیوی جو ماں بن کر اس کا سب سے بڑا ارمان پورا کرنے والی ہے۔

اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ چہرے سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ آنکھیں دھندلانے لگیں۔

رشیدہ اس کے چہرے پر پل پل بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی گھبرا گئی۔

''کیا ہوگیا بی بی صاحب ...؟''

مگر نور بانو جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔

''میں ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔'' رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

نور بانو نے بمشکل اشارے سے اسے روکا اور بیٹھنے کو کہا۔ پھر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

رشیدہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھ گئی۔ حالانکہ اس کے خیال میں ڈاکٹر کی

ضرورت تھی۔

نور بانو کی حالت کچھ سنبھلی تو اس نے آہستہ سے کہا۔

''بہت بڑی گڑبڑ ہو جائے گی رشیدہ...! اور کون جانے، ہو بھی گئی ہو۔''

''کچھ نہیں ہوا بی بی صاحب...! کچھ نہیں ہوگا۔ سب ٹھیک ہے۔''

نور بانو ہذیانی انداز میں نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''تمہیں اسی وقت گھر جانا ہوگا۔ ارجمند کو سمجھنا ہوگا۔''

رشیدہ سمجھ گئی کہ بات کیا ہے؟ اس نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''آپ بےفکر رہیں بی بی صاحب...! یہ کام تو میں کل ہی کر چکی ہوں۔''

''تم سمجھ ہی نہیں رہی ہو میری بات...!'' نور بانو کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آپ صاحب کے فون کے خیال سے پریشان ہو رہی ہیں نا...؟''

نور بانو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب اس کے لئے بولنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک تو نقاہت، اس پر کچھ چھن جانے، زندگی اجڑ جانے کے خوف نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔

رشیدہ نے اسے اپنی گزشتہ روز کی کارگزاری کی تفصیل سنا دی۔

نور بانو سنتی رہی اور تشکر سے سر ہلاتی رہی۔ اس کا وجود پرسکون ہوتا جا رہا تھا۔

سب کچھ سننے کے بعد نور بانو نے دھیمے لہجے میں اسے داد دی۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا رشیدہ....! تم بڑے انعام کی حق دار ہو۔''

''میں تو بس اپنا فرض پورا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں.... بی بی صاحب....!''

''مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہیں منتخب کیا۔''

''مگر ایک بات ہے بی بی صاحب....! مجھے ڈر ہے کہ چھوٹی بی بی بھانڈا نہ پھوڑ دیں۔''

نور بانو پھر متوحش ہوگئی۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اس نے رشیدہ کو بتایا تھا کہ

یہ سب کچھ اس کے شوہر کی مرضی سے ہی ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔

''یہ بات تم نے کیسی کہی...؟''

''میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مجھ پر بگڑ گئیں۔ کہنے لگیں، اپنے کام سے کام رکھو۔ نوکرانی ہو، نوکرانی ہی رہو۔''

''ایسے کہا ارجمند نے...؟'' نور بانو نے حیرت سے کہا۔ ویسے وہ جانتی تھی کہ ارجمند رشیدہ کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ اس نے کہا تھا کہ آپی! یہ عورت ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھائے گی، اور اس نے جواب دیا تھا کہ تم اسے مجھ پر چھوڑ دو۔

''انہوں نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ ان کے لئے جھوٹ بولنا جتنا مشکل ہے، سچ بولنا اتنا ہی آسان ہے۔''

ایک لمحے کو تو نور بانو یہ سن کر گھبرا گئی۔ وہ بیمار تھی، تکلیف میں تھی، ناطاقتی کا شکار تھی۔ ایسے میں ذہن ٹھیک سے کام کہاں کرتا ہے؟ لیکن یہ اس کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ اس نے تیزی سے خود کو سنبھالا اور ذہن کو مرکوز کر کے سوچنے کی کوشش کی۔ یہ تو وہ اب بھی نہیں سمجھ سکی کہ رشیدہ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا ہے۔ یہ بات سمجھ لی ہے کہ یہ سارا کھیل وہ اپنے شوہر کی بےخبری میں کھیل رہی ہے۔ شاید اس لئے نہ سمجھ سکی کہ اس کے سامنے اس سے بڑا مسئلہ تھا۔

کیا ارجمند واقعی بھانڈا پھوڑ دے گی....؟

اس نے ارجمند کو دیکھا تھا۔ وہ اسے جانتی تھی۔ اور وہ کوئی نادان عورت نہیں تھی۔ ارجمند سے عبدالحق کی شادی اس نے یوں ہی تو نہیں کرا دی تھی۔ بہت سوچ سمجھ کر اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اس نے۔ وہ جانتی تھی کہ ارجمند اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہے۔

اور رشیدہ؟ رشیدہ کو بھی اس نے جان لیا تھا، سمجھ لیا تھا۔ تبھی تو اسے منتخب کیا تھا کہ اس کے پاس اخلاق کا کوئی معیار نہیں، وہ صرف اپنے مفاد کی فکر کرنے والی ہے۔ وہ کمزوری دیکھے گی تو اس کو چھپانے کی قیمت مانگے گی۔ اور قیمت بغیر مانگے مل رہی ہو تو وہ وفادار بن کر اس کمزوری کا پردہ رکھے گی۔ اور نور بانو اسے قیمت ادا کر سکتی تھی۔ اسی لئے اس نے اسے رکھ لیا تھا۔

ایک لمحے میں نور بانو نے سمجھ لیا کہ اسے ارجمند کی طرف سے خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ البتہ رشیدہ ضرورت سے زیادہ چھپل سکتی ہے۔ اسے دیکھنا ہوگا کہ اس میں رشیدہ کی کوئی چال تو نہیں۔ لیکن یہ سچ ہے کہ رشیدہ نے اس وقت وہ سب کچھ کیا جو نہایت ضروری تھا، جبکہ خود نور بانو کچھ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ اور ارجمند بھی بے دھیانی میں غلطی کر سکتی تھی۔ مگر اب وہ محتاط رہے گی۔

"پھر تم نے کیا کہا.....؟" بالآخر نور بانو رشیدہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں کیا کہتی بی بی صاحب..... نوکرانی تو میں ہوں نا..... رازدار تو بس آپ کی ہوں۔" رشیدہ نے آخری پر خاص طور پر زور دیا۔

اس بار نور بانو کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس نے رشیدہ سے کہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے شوہر کے علم میں ہے۔ اور اب وہ جتا رہی تھی کہ وہ جانتی ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

تو اب رشیدہ اس اضافی کمزوری سے بڑھ چڑھ کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ ارجمند نے سچ ہی کہا تھا۔

مگر خود اس نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ وہ اسے سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس بار، اس عالم میں راستہ اسے رشیدہ کے ساتھ ارجمند کے رویے نے دکھایا تھا۔

"یہ سچ ہے۔" اس نے رشیدہ سے کہا۔

"اس کے لئے سچ بولنا آسان ہے اور جھوٹ بولنا مشکل۔ تم اس سے کبھی نہ الجھنا۔ تمہارا معاملہ بس میرے ساتھ ہے۔ تم اس سے الجھو گی تو میرا اور تمہارا دونوں کا کام خراب ہوگا۔"

"توبہ کریں بی بی صاحب.....!" رشیدہ نے دونوں کان پکڑتے ہوئے کہا۔

"میں کیوں الجھوں گی ان سے۔ یہ تو میں نے آپ کی بھلائی کی خاطر سمجھایا تھا انہیں۔"

"اس میں تمہاری بھی بھلائی تھی۔" نور بانو نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

رشیدہ کھسیا گئی۔ مگر اس نے بالادستی کا اظہار کرنا ضروری سمجھا۔

"تو آپ کے شوہر یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بچہ آپ کو ہونے والا ہے.....؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے تو کہا تھا کہ....."

"میں نے جو مناسب سمجھا، تمہیں بتا دیا۔" نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔

"اگر مجھے وقت پر خیال نہ آتا تو بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔"

"ایسی بات نہیں۔ ارجمند ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹ سکتی ہے۔"

"لیکن انہیں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

اب نور بانو نے سمجھ لیا کہ ارجمند کو رشیدہ کے لئے ہوا بنانا ضروری ہے۔

"میں نے کہا نا.....! اس کو بھول جاؤ تم..... ورنہ وہ تمہیں نکال بھی سکتی ہے۔"

"تو اس کے بعد یہ راز ساری دنیا کو معلوم ہو جائے گا۔"

نور بانو نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو رشیدہ.....! میں تمہیں جو کچھ بھی دوں گی، اپنی خوشی سے دوں گی۔ لیکن تم میری مجبوری نہیں ہو۔ تم نے کبھی غور نہیں کیا ہوگا۔ ہمارے گھر کے باہر تم پر نظر رکھی جاتی ہے۔ جو اتنا بڑا راز رکھتے ہیں، وہ راز کو راز رکھنا ہی جانتے ہیں۔ وہ کسی پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ میں دل کی نرم ہوں۔ لیکن ارجمند اور طرح کی لڑکی ہے۔ اس کے سامنے میں بھی بے بس ہوں۔ اس کے باپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ راز فاش کرنے سے پہلے ہی تمہارا پتا بھی نہیں چلے گا کسی کو۔ بہت بڑے فائدے کے کام میں اپنے لئے بہت بڑا نقصان تلاش نہ کرو تم.....!"

نور بانو نے ایسے لہجے میں بات کی تھی کہ رشیدہ خوف زدہ ہوگئی۔ تیز و طرار عورت تھی۔ نور بانو کی بات پر اسے پورا یقین تو نہیں آیا تھا۔ لیکن یہ ضرور سمجھ میں آگیا کہ زیادہ الجھنے کے بجائے بس اپنے فائدے کی فکر کی جائے۔

"میں تو آپ کی خیر خواہ ہوں بی بی صاحب.....!"

"میرے دل میں بھی تمہاری بڑی قدر ہے۔" نور بانو نے بڑے خلوص

سے کہا۔ اتنی دیر میں وہ نڈھال ہوگئی تھی۔ اس نے آنکھیں موندھ لیں۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ کی سمجھ میں بھی بہت کچھ آ گیا تھا۔ بہت زیادہ تو نہیں، البتہ وہ ڈر ضرور گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں، وہ کچھ بھی کرا سکتے ہیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کون لوگ ہیں؟ لیکن ان کا رہن سہن اور ان کا کھلا ہاتھ دیکھ کر یہ تو پتا چلتا تھا کہ وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ اس کے لئے اہمیت صرف نوربانو کی ہے۔ ارجمند کو نہ اس کی ضرورت ہے اور نہ ہی پرواہ۔ اگر نوربانو کو کچھ ہوگیا تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا، اور اس کے سب خواب بکھر جائیں گے۔

اس نے یہ بات گرہ میں باندھ لی کہ تیزی اور طراری دکھانے میں اس کا نقصان ہے۔ اس کھیل میں اسے وفاداری ہی کامیابی دلا سکتی ہے۔ وفاداری اور رازداری۔

❁ ❁ ❁

تین دن اسپتال میں رہنے کے بعد نوربانو کی حالت بہتر ہوگئی۔ اسپتال سے ڈس چارج ہوتے وقت ڈاکٹر نے اس سے بڑی تفصیل سے بات کی۔

''سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کو ڈس چارج نہیں کرنا چاہتا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''آپ کو یہ تکلیف کب سے ہے.....؟'' ڈاکٹر نے اس کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''کئی برس سے ہے۔ میں مستقل طور پر دوائیں استعمال کرتی ہوں۔''

''آپ کو کبھی کسی ڈاکٹر نے آپریشن کے لئے نہیں کہا.....؟''

نوربانو کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

''جی..... کہا تو تھا لیکن.....''

''آپ ڈرتی ہیں آپریشن سے.....؟''

''جج..... جی..... جی ہاں.....!''

''اور وہ بہت ضروری ہے۔ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا آپریشن۔ آپ کو اس تکلیف سے نجات مل جاتی۔ اب آپ کا مرض بہت بڑھ گیا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر اچانک بات بدلی۔

''آپ کو یہاں کوئی دیکھنے بھی نہیں آیا.....؟''

''جی..... میں یہاں اکیلی ہوں۔ بس یہ ملازمہ ہے میرے ساتھ.....!''

''اور آپ کے شوہر.....؟''

''وہ سرکاری افسر ہیں۔ کراچی میں ہوتے ہیں۔'' نوربانو نے دانستہ جھوٹ بولا۔

''یہ اور خراب بات ہے۔ آپ انہیں یہاں بلوا لیجئے۔ آپ کے لئے ضروری یہ ہے کہ ایک ماہ کے اندر آپریشن ہو جائے آپ کا۔ ورنہ آپ کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔''

''جی.....! میں ان سے بات کروں گی۔'' نوربانو نے بے دلی سے کہا۔

''آپ اس مسئلے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔''

یہ گفتگو سن کر رشیدہ پریشان ہوگئی۔ اگر خدانخواستہ بی بی صاب کو کچھ ہوگیا تو اس کا کیا ہوگا؟ اس نے جلدی سے نوربانو سے کہا۔

''آپ ابھی آپریشن کرا لیجئے نا بی بی صاب.....!''

نوربانو کے جواب دینے سے پہلے ہی ڈاکٹر بول اٹھا۔

''یہ ممکن نہیں ہے.....ہم اپنی ذمہ داری پر یہ آپریشن نہیں کر سکتے۔''

''کیا مطلب.....؟'' نوربانو نے چونک کر پوچھا۔

''آپ کے شوہر یا کسی ذمہ دار رشتہ دار کو تحریری طور پر آپریشن کے لئے اجازت دینی ہوگی۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ جلد از جلد اپنے شوہر کو یہاں بلوا لیجئے۔''

''جی بہتر.....!''

''اور اس وقت تک یہ دوائیں باقاعدگی سے استعمال کریں۔ پرانی دوائیں چھوڑ دیں۔''

نور بانو نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ عبدالحق یہاں موجود نہیں، ورنہ آپریشن کی نوبت آ جاتی۔ اور وہ آپریشن سے اتنا ڈرتی تھی کہ اس کے مقابلے میں مر جانا اس کے نزدیک بہتر تھا۔ زندگی میں آدمی کی چیر پھاڑ... کانٹ چھانٹ... توبہ توبہ...!

❁ ❁ ❁

نور بانو اسپتال سے گھر واپس آئی تو ارجمند نے سکون کی سانس لی۔ دیکھنے میں وہ بہت کمزور لگ رہی تھی۔ لیکن ارجمند کے لئے تو یہ بہت بڑی بات تھی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کر گھر میں آئی ہے۔

وہ بس اس کی دیکھ بھال، اس کے کھانے پینے کی فکر میں لگ گئی۔

ایک بار موقع ملا تو نور بانو نے اس سے کہا۔

''تم میرے پاس کیوں نہیں بیٹھتیں...؟''

''بس... یخنی بنا کر لے آؤں آپ کے لئے۔ پھر آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی۔''

''یخنی آپا بنا لے گی۔ تم کیوں فکر کرتی ہو...؟''

''وہ اتنی اچھی نہیں بنا سکتی۔'' ارجمند نے کہا اور کچن میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اس کے لئے یخنی لے کر آ گئی۔

''یہ لیجیے...!'' اس نے پیالہ نور بانو کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا گرم گرم ہی پی لیں۔ انشاء اللہ طاقت آ جائے گی۔ بہت کمزور ہو گئی ہیں آپ۔''

''ہاں...! کمزوری کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے۔''

''فکر نہ کریں۔ چار دن میں آپ کی طاقت بحال ہو جائے گی۔''

نور بانو چمچے سے یخنی پینے لگی۔ درمیان میں اسے احساس ہوا کہ ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ ارجمند بڑی محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو...؟'' اس نے ارجمند سے پوچھا۔

''آپ کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی میں تو...'' یہ لڑکی درحقیقت اسے کتنا چاہتی ہے، اس کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہے... اور کر رہی ہے۔ کوئی عورت کسی کے لئے ایسی قربانی نہیں دے سکتی، جیسی یہ دے رہی ہے۔ اسے شرم آنے لگی کہ وہ اسے اپنی غرض کے لئے استعمال کر رہی ہے۔

پھر اس نے دھیرے سے سر ہلا کر گویا اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس وقت اتنی پریشانیاں تھیں۔ یہ شرمندگی پالنے کا وقت نہیں تھا۔

''یہ بتاؤ! تمہارے آغا جی نے فون کیا تھا...؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جی آپی...! پہلے ہی دن ان کا فون آ گیا تھا۔''

''میرے بارے میں پوچھا ہوگا انہوں نے...؟''

''انہوں نے تو فون ہی آپ کو کیا تھا۔'' ارجمند نے سادگی سے کہا۔

''پھر...؟''

''میں نے کہہ دیا کہ آپ چیک اپ کے لئے اسپتال گئی ہیں۔''

نور بانو نے سکون کی سانس لی۔

''شکر ہے...! تم طبیعت خراب ہونے کا کہتیں تو وہ آ ہی جاتے۔''

''لیکن آپی...! یہ بات غلط ہے۔ میں جھوٹ بولنا پسند نہیں کرتی۔''

ارجمند کا لہجہ غیر معمولی حد تک نرم تھا۔

نور بانو نے چونک کر اسے دیکھا، پھر مسکرائی۔

''میں جانتی ہوں۔ اسی لئے یہ نوبت ہی کبھی نہیں آنے دی تھی۔ اب یہ درد تو ناگہانی تھا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔''

''آپی...! میں نے آپ کی محبت میں آپ کی ہر بات مان لی۔ میں اس وقت بہت کچھ جانتی اور سمجھتی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس معاملے میں اتنی تنائیاں ہوں گی۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔''

''نہیں آپی...! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ جھوٹ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اور

یہ ہمارا جھوٹ تو بہت بڑا ہے۔ مجھے تو شرم بھی آتی ہے آپی! ابھی یہ کھل گیا تو میں کسی کا سامنا بھی نہیں کر سکوں گی۔ ذرا سوچیں تو، اس کی وجہ سے آغا جی بھی تکلیف میں ہیں۔''

''انہیں کیا تکلیف ہے.....؟'' نور بانو کو جلال آ گیا۔

''آپ سے دور، آپ سے محروم ہیں۔ یہ ان کے لئے معمولی بات تو نہیں۔ آپ مجھ سے ویسے ہی کہتیں تو بھی یہ سب کچھ ہو جاتا۔ میں تو آپ کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

''جانتی ہوں۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔

''مگر اس طرح مجھے وہ عزت اور مان تو نہ ملتا.....''

''یہ تو سوچیں کہ اس میں ہم دونوں کو بدترین ذلت بھی مل سکتی ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم نے میرے لئے وہ کچھ کیا ہے، جو دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں آپی.....! لیکن اب مجھے اس صورتِ حال سے گھبراہٹ ہو رہی ہے۔''

نور بانو نے غور سے اسے دیکھا۔

''تو تم کیا چاہتی ہو.....؟''

''میں چاہتی ہوں کہ ہم اس جھوٹ سے نجات پا لیں۔ سچ بولیں.....''

''ٹھیک ہے.....! لیکن اس سے پہلے میں جان دے دوں گی۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔''

ارجمند نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جو کچھ اسے نظر آیا، اسے دیکھ کر وہ تھرا گئی۔

''یہ کیسی بات.....''

نور بانو کے چہرے پر اب نرمی تھی۔

''سچ تو یہ ہے کہ ارجی.....! کہ اب مجھے غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن تیر اب کمان سے نکل چکا ہے۔ اب پیچھے ہٹنے میں جو ذلت ہے، وہ مجھے گوارہ نہیں۔

اس کے مقابلے میں موت مجھے قبول ہے۔''

''یہ میں کیسے گوارہ کر سکتی ہوں۔'' ارجمند نے احتجاج کیا۔

''سوچ لو.....! فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔ میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ ابھی فون کر کے انہیں سچ بتا دو۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہیں میری موت کی خبر بھی دے.....''

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ایسا آپ سوچئے بھی نہیں.....''

''میں نے کہا نا.....! فیصلہ تمہیں ہی کرنا ہے۔''

ارجمند چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر اس کے کندھے جھک گئے، جیسے اس نے شکست قبول کر لی ہو۔

''ٹھیک ہے آپی! اب جو ہو سو ہو۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔ ہمیں معاف فرمائے۔''

''میں تم سے معافی مانگتی ہوں میری بہن.....! غلطی میری ہے۔ مگر اب پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔'' نور بانو نے کہا۔

''اللہ سب جانتا ہے، تم ناسمجھ تھیں، جو کچھ ہوا میری ذمہ داری ہے۔''

ارجمند نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''اب بس کریں آپی.....!'' اور دل میں اس نے سوچا، قصوروار میں بھی ہوں۔ میری ناسمجھی اپنی جگہ، لیکن میں نے اپنے لالچ میں آپ کی بات مانی۔

''بس! آپ جلدی سے اچھی ہو جائیں۔''

❁ ❁ ❁

ارجمند خود کو بہت بوجھل محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت کثرت سے استغفار کرتی تھی۔ دوسری طرف وہ فکرمند بھی تھی اور خوفزدہ بھی۔ عبدالحق نے اسے بتایا تھا کہ ایک ہفتے بعد حمیدہ صفیہ کے ساتھ ایبٹ آباد آنے والی ہے۔ اب یہ بات وہ نور بانو کو کیسے بتائے؟ ابھی تو وہ بیماری سے سنبھلی بھی نہیں ہے۔ اور یہ تو اتنا بڑا دھماکا ہوگا کہ خدانخواستہ کچھ بھی ہو جائے۔

جس بھید کے کھلنے کے حوالے سے اس نے نوربانو کو بیچ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی، نوربانو نے تو اس کے بدلے موت کو گوارہ قرار دیا تھا۔ اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ بھید کھلنے ہی والا ہے، اور اسے روکنے کی کوئی صورت نہیں۔

ایک دن اور گزر گیا۔ زندگی ارجمند کو بوجھ لگنے لگی۔ وہ کیا کرے؟

پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ نوربانو پر کچھ بھی گزرے، لیکن اسے اس بارے میں بتانا ضروری ہے۔ اس نے پہلے بھی یہی سوچا تھا کہ نوربانو کچھ نہ کچھ کر لے گی۔ دادی اماں کو آنے سے روکنے کی کوئی ترکیب سوچ لے گی۔

یہ سوچ کر اس نے نوربانو کو یہ بات بتا ہی دی۔

نوربانو کا تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم ...؟''

''جی آپی ...! آغا جی نے مجھے بتایا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بس دو تین دن میں ہی ...'' نوربانو سے بات پوری نہیں کی گئی۔ وہ تو بری طرح بوکھلا گئی تھی۔ اس افتاد کو روکنے کی کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کے آتے ہی کھیل ختم۔ عمر بھر کی ذلت اور رسوائی الگ۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اسے دیکھ کر ارجمند کو بھی ہول اٹھنے لگے۔ اگر آپی کا یہ حال ہے تو پھر بچت کی کوئی صورت نہیں۔ اللہ ... وہ آغا جی کو، دادی اماں کو ... کیا منہ دکھائے گی؟ کیسا اس پر مان کرتی تھیں دادی اماں۔

نوربانو نے بھی سوچ لیا کہ اب تو زندگی یا موت۔ آفت سر پر کھڑی ہے۔ جو کیا جا سکتا ہے، کر لیا جائے۔ ذہن میں ایک ہی تدبیر آتی تھی۔ منت والی بات کو دہرایا جائے۔ بات اگرچہ بچکانہ لگے گی۔ لیکن اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔

اور اس پر غور کیا تو اسے کامیابی کا خاصا امکان نظر آنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ حمیدہ کو پوتے کی کیسی آرزو ہے۔ اس کے لئے تو وہ پیروں فقیروں کے در پر حاضری دیتی پھری تھی۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ منت کی بات کو ضرور

اہمیت دے گی۔ بلکہ قوی امکان یہ ہے کہ یہ سننے کے بعد وہ کبھی بھی یہاں نہیں آئے گی۔

اس نے مزید غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ یہ بات عبدالحق سے کرنے کی نہیں۔ بات براہِ راست حمیدہ سے کی جائے، اور اسے رازداری کا بھی کہا جائے۔ یوں عین ممکن ہے کہ عبدالحق کو اس بات کا پتا بھی نہ چلے۔

اس کا دل کہہ رہا تھا کہ بچت کی صورت نکل آئی ہے۔ اگر عبدالحق منت کی بات کے سامنے ہار سکتا ہے تو توہم پرست حمیدہ تو اس کے سامنے دم بھی نہیں مار سکے گی۔ اس نے مزید سوچا کہ وہ فون نہ کرنے کا حیلہ بھی اسی بات کو بنا لے گی۔ پرانی شکایت بھی رفع، نیا فساد بھی ختم!

اس کے چہرے پر سکون اور آنکھوں میں امید کی پھیلتی چمک دیکھ کر ارجمند کی بھی جان میں جان آئی۔

''کچھ سمجھ میں آ گیا آپی......!'' اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

''ہاں گڑیا......! تم ذرا لاہور کا فون نمبر ملاؤ۔'' نوربانو کے لہجے میں اعتماد تھا۔

''براہِ راست دادی اماں کو روکیں گی آپ ...؟''

''تم بس دیکھتی جاؤ......!''

ارجمند کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ نوربانو کیا کہے گی؟ اس نے نمبر ملاتے ہوئے سوچا، دیکھتے ہیں۔

لیکن کچھ دیکھنے اور سننے کا موقع نہیں ملا۔ لاہور میں فون پر نسیمہ سے بات ہوئی۔ اس نے کہا۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے۔''

''خیریت......؟''

''اماں کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ سب انہیں لے کر اسپتال گئے ہیں۔''

ارجمند نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر نوربانو کو یہ بات بتائی۔

نور بانو بڑے ظالمانہ انداز میں مسکرائی۔ ارجمند کو وہ مسکراہٹ ذرا بھی اچھی نہیں لگی۔ وہ خود دادی اماں کی بیماری کا سن کر دہل گئی تھی۔ جبکہ نور بانو کے لئے جیسے وہ کوئی خوش خبری تھی۔

"میری بات کراؤ نسیمہ سے......!" نور بانو نے کہا۔

نور بانو نے نسیمہ سے کہا کہ وہ اس کے فون کے بارے میں سب کو بتا دے۔

"اور ہاں......! ایک بات دھیان سے سن نسیمہ......!" پھر اس نے اچانک کہا۔

"اماں اگر یہاں ایبٹ آباد آنے کا ارادہ کریں تو ان سے کہنا کہ پہلے فون پر مجھ سے بات کر لیں۔"

"جی بہتر......!"

"یہ بات بھولنی نہیں ہے۔" نور بانو نے تاکید کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ پھر وہ ارجمند کی طرف مڑی۔

"لو......خواہ مخواہ گھبرا رہی تھیں تم......!" اس نے کہا۔

ارجمند نے کچھ نہیں کہا۔ وہ حمیدہ کی طرف سے پریشان ہو رہی تھی۔ لیکن بات اس کے سامنے ہی ہوئی تھی۔ نور بانو نے نسیمہ سے حمیدہ کی بیماری کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے سوچا، کچھ دیر بعد وہ خود ہی فون کر لے گی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو وہ فون ریسیو کر کے حیرت ہوئی۔ زبیر نے اس سے پہلے خود اسے فون کبھی نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ تو فون پر بات کرتے ہوئے گھبرا جاتا تھا۔ اسے احساس ہوگیا کہ ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے۔

"خیریت تو ہے بھائی......!"

"کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں ہے کاکا......!" زبیر نے اسے تسلی دینے

کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"بس اماں کی طبیعت ذرا خراب ہوگئی ہے۔"

"کیا ہوا......؟" عبدالحق نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"دو تین دن سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا۔ پھر آج الٹیاں شروع ہوگئیں۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا......؟"

"جی کاکا......! اس نے کہا کہ یرقان ہے۔ ہم انہیں اسپتال لے گئے۔ اب وہ وہیں ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو بھائی......! میں کل پہنچ جاؤں گا۔"

"میں نے آپ کو پریشان کر دیا کاکا......!" زبیر کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"ارے نہیں......! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس اب آپ پریشان نہ ہوں۔"

ریسیور رکھنے کے بعد عبدالحق کو بے چینی ہونے لگی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی وقت لاہور کے لئے روانہ ہو جائے۔ لیکن دفتر کے معاملات ویسے ہی پیچیدہ چل رہے تھے۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔ ملازمت کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ چچا جان کے خلوص کی توہین نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ ملازمت کی ذمہ داریوں کو بھی سمجھتا تھا۔ نہ سمجھتا ہوتا تو اسی وقت لاہور چلا جاتا۔ لیکن چھٹی لینا بھی ضروری تھا اور اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت بھی ضروری تھی۔

دوسری طرف وہ یہ بھی جانتا تھا کہ چھٹی اسے نہیں ملے گی۔ اب ایسے میں وہ کیا کرے؟ یہ تو ممکن نہیں کہ اماں اتنی بیمار ہوں کہ اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آجائے اور وہ بیٹھا نوکری کی فکر کرتا رہے۔ ایمرجنسی میں چھٹی اس کا حق ہے۔ نہیں دیا جاتا تو اس کے پاس فوری طور پر استعفیٰ دینے کا راستہ موجود ہے۔

یہ سوچ کر وہ مطمئن ہوگیا۔ اس کے باوجود بہت دیر تک اسے نیند نہیں آئی۔

اگلی صبح جو کچھ ہوا، وہ اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ چیف سکریٹری نے

اس کی درخواست پڑھنے کے بعد کہا۔

"میں تو منظوری نہیں دے سکتا عبدالحق صاحب......! مجھے منسٹر صاحب سے بات کرنی ہوگی۔"

"میں دفتری ضابطوں سے بخوبی آگاہ ہوں جناب......!" عبدالحق نے نرم لہجے میں کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ......! میری چھٹی منظور کرنا آپ ہی کی ذمہ داری ہے۔"

"وہ تو ہے۔ لیکن منسٹر صاحب نے آپ کے معاملے میں خاص طور پر......"

"آپ ان سے رابطہ کر لیں۔ میں ایک گھنٹے بعد آپ سے بات کروں گا۔"

بڑی مشکل سے عبدالحق نے وہ ایک گھنٹہ گزارا، اور پھر چیف سکریٹری کے کمرے میں پہنچ گیا۔

"ابھی تک تو میرا ان سے رابطہ نہیں ہو سکا ہے۔" چیف سکریٹری نے اسے بتایا۔

"بس تو آپ خود میری چھٹی کی منظوری دے دیں۔"

"سوری عبدالحق صاحب......! یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تو ٹھیک ہے......! میری درخواست مجھے واپس دے دیں۔"

چیف سکریٹری نے سکون کی سانس لی اور اس کی درخواست اس کی طرف بڑھا دی۔

عبدالحق نے درخواست پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دی۔ اور ایک اور کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

چیف سکریٹری اس کے ردِعمل پر پہلے ہی پریشان تھا، گڑبڑا کر بولا۔

"یہ کیا ہے......؟"

"پڑھ لیں......!"

چیف سکریٹری نے پڑھا اور برا سا منہ بنا کر بولا۔

"استعفیٰ سے پہلے آپ کو پندرہ دن کا نوٹس دینا چاہئے۔"

"جی نہیں......! فوری استعفیٰ کا حق بھی مجھے حاصل ہے، اور میں اسے استعمال کر رہا ہوں۔"

"لیکن استعفیٰ کی منظوری......"

"یہ میرا دردِ سر نہیں......!" عبدالحق نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب آپ جو چاہیں کریں، میں لاہور جا رہا ہوں۔"

"عجیب آدمی ہیں آپ......!"

"یہ ملازمت میری ضرورت نہیں ہے جناب......! میں تو کسی اور جذبے کے ساتھ اس طرف آیا تھا۔ یہ بات منسٹر صاحب کو بھی بتا دیجئے گا۔"

عبدالحق نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔

❁ ❁ ❁

وہ لاہور پہنچا تو منظر بدل چکا تھا۔

حمیدہ اس کی توقع کے برعکس اسپتال میں نہیں تھی، بلکہ گھر پر ہی تھی۔ چچا جان اپنے گھر والوں سمیت وہاں موجود تھے۔ گھر کی رونق دیکھ کر چند لمحوں کے لئے تو وہ اپنی پریشانی بھول ہی گیا۔

لیکن حمیدہ کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ وہ بے بسی سے بستر پر لیٹی اسے دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

عبدالحق اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ کیا حال بنا لیا ہے اماں ......!"

"ٹھیک ہوں ......! بس کمزوری بہت زیادہ ہے۔"

"انشاءاللہ ......! دور ہو جائے گی اماں......! غم نہ کرو۔"

"سوچا تھا، ایبٹ آباد جاؤں گی۔ پر اللہ کی مرضی نہیں تھی۔"

"چلی جانا اماں......! دل کیوں چھوٹا کرتی ہو......؟"

"مجھے تو لگتا ہے پتر .....! کہ اب کبھی اٹھ ہی نہیں سکوں گی۔" حمیدہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"کروٹ بدلنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ میرا پوتے کا ارمان پورا کر رہا ہے۔ پر اس کی مرضی نہیں کہ میں وہاں بہو کے پاس جاؤں۔ میں نے تو تیاری کر لی تھی جانے کی....." اتنا کہہ کر وہ ہانپنے لگی۔

عبدالحق اس کا ہاتھ سہلاتا رہا۔

"کچھ مت بولو اماں ..... ! اتنی کمزوری ہے۔"

"کیسے چپ رہوں .....؟ اتنی شکایتیں ہیں تجھ سے ....." حمیدہ سے بولا نہیں گیا۔

"مجھ سے شکایتیں .....؟" اس کے لہجے کی سنگینی نے عبدالحق کو دہلا دیا۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر خوش دلی سے کہا۔

"فکر نہ کرو اماں .....! میں یہیں ہوں تمہارے پاس.....! تمہاری طبیعت ٹھیک ہونے سے پہلے میں یہاں سے نہیں جانے والا۔ جی بھر کر شکایتیں کر لینا مجھ سے، جلدی کیا ہے .....؟"

حمیدہ کی آنکھیں مند گئیں۔ وہ غشی کی سی کیفیت تھی۔

عبدالحق تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔

ان برسوں میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ رضوانہ اور شاہانہ کی شادی ہوگئی تھی۔ ماجد مسعود صاحب کا اکلوتا بیٹا تھا، اب اس کی بھی شادی ہوگئی تھی۔ مسعود صاحب نانا بھی بن گئے تھے اور دادا بھی۔

انہوں نے عبدالحق کو اپنی بہو سے ملوایا۔ بہت سادہ سی لڑکی تھی۔ وہ عبدالحق کو بہت اچھی لگی۔

تھوڑی دیر بعد وہاں عبدالحق کے ساتھ بس مسعود صاحب اور زبیر رہ گئے۔

"اماں کو اسپتال سے کیوں لے آئے بھائی.....!" عبدالحق نے پُرتشویش لہجے میں زبیر سے پوچھا۔

"اس کا مشورہ میں نے دیا تھا۔" مسعود صاحب نے جلدی سے کہا۔

"کیوں.....؟ تم پریشان کیوں ہو رہے ہو.....؟"

عبدالحق نے سکون کی گہری سانس لی۔

"اب میں مطمئن ہوگیا چچا جان.....!"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے پوچھے بغیر....."

عبدالحق نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔

"یہ آپ کا حق اور اختیار ہے چچا جان .....!" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے وضاحت کی۔

"اماں اتنی کمزور ہوگئی ہیں۔ مجھے ان کی حالت اچھی نہیں لگی۔ اور انہیں گھر میں دیکھ کر مجھے ڈر لگا کہ کہیں اسپتال والوں نے جواب دے کر انہیں ڈس چارج تو نہیں کر دیا۔"

"ایسی بات نہیں ہے میاں .....! یرقان میں تو کمزوری ہو ہی جاتی ہے۔" مسعود صاحب نے کہا۔

"مجھے اس کا تجربہ ہے کہ اسپتال میں ڈرپ لگانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ رضوانہ کو یرقان ہوا تھا تو میں نے حکیم یاسین صاحب سے علاج کروایا تھا اس کا۔ اور ایک صاحب ہیں یہاں گڑھی شاہو میں، وہ دم کرتے ہیں۔ کسی کا بخشا ہوا ہے۔ وہی میں نے اماں کے لئے سوچا۔"

"میں مطمئن ہوں چچا جان .....! بس مجھے ڈر بہت لگا ہے اماں کو دیکھ کر۔"

"انشاء اللہ! انہیں کچھ نہیں ہوگا میاں ..... ! دم کرنے والے صاحب روز یہاں آئیں گے۔ ایک ہفتے میں انشاء اللہ یرقان اتر جائے گا۔ اثرات رہ جائیں گے۔ وہ انشاء اللہ دواؤں سے زائل ہو جائیں گے۔ لیکن اس بیماری میں سب سے بڑی دوا مکمل آرام ہے میاں.....! یرقان کے مریض کے لئے تو ہلنا بھی مشقت ہوتا ہے۔"

یہ سب سن کر زبیر کی جان میں جان آئی۔ وہ تو اپنی جواب دہی سے ڈر رہا

تھا۔

''اور دفتر کی صورتِ حال کیا ہے......؟''

عبدالحق نے انہیں پوری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔

''اوہ......! تم نے مجھے بتایا بھی نہیں......!''

''اب کیا ساری عمر آپ کی انگلی تھام کر چلتا رہوں؟ کوئی مسئلہ ہو تو ننھے بچوں کی طرح آپ کی طرف دیکھوں؟'' عبدالحق نے شرمندگی سے کہا۔

''یہ تو بڑی غیرت والی بات کی ہے تم نے......!'' مسعود صاحب نے شکایت کی۔

''آپ جانتے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے۔''

مسعود صاحب مسکرا دیئے۔

''جانتا ہوں۔ ورنہ ناراض ہو جاتا تم سے۔ مگر استعفیٰ دیتے وقت تمہیں میرا خیال نہیں آیا......؟''

''میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا چچا جان......!''

''خیر......! استعفیٰ تو تمہارا منظور نہیں ہوگا۔ البتہ وہ تمہیں فٹ بال بنا دیں گے۔''

''کیا مطلب......؟''

''او ایس ڈی......!'' مسعود صاحب نے مختصراً کہا۔ پھر بولے۔

''خیر......اب تم یہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

عبدالحق کو کوئی ایسی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اسے تو بس حمیدہ کی فکر تھی۔

✿ ✿ ✿

نوربانو کی طبیعت خاصی بہتر ہوگئی تھی۔ ارجمند لاہور فون کرنا چاہتی تھی مگر جھجک رہی تھی۔ خود اسے تو بہت شرمندگی تھی۔ پانچ مہینے ہوگئے، اور اس نے حمیدہ کو فون بھی نہیں کیا۔ نوربانو نے دانستہ فون نہیں کیا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ رابطہ ہوگا تو پول کھل جانے کا کوئی خطرہ ضرور سر اٹھائے گا۔

ارجمند سوچتی کہ آپی کی آپی جانیں۔ لیکن اس سے کسی نے اس سلسلے میں

سوال کر لیا تو شرمندگی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور یہ بھی سچ تھا کہ وہ دادی اماں کی کمی بڑی شدت سے محسوس کرتی تھی۔

اور اب تو دادی اماں بیمار ہیں......ایسی بیمار کہ اسپتال میں ہیں۔ تو کیا وہ ان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے بھی فون نہیں کر سکتی۔

تیسرے دن اس کی برداشت جواب دے گئی۔

''آپی......! مجھے لاہور فون کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں......!'' نوربانو نے صاف جواب دے دیا۔

''دادی اماں بیمار ہیں آپی......!''

''اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہے۔''

میرے حق میں تو ہرگز بہتر نہیں ہے۔ ارجمند نے دل میں کہا۔

''سوئے ہوئے شیر کو جگانا حماقت ہوتی ہے۔'' نوربانو نے بات مکمل کی۔

ارجمند کو احساس ہوگیا تھا کہ اب تک نوربانو کی ہر بات مان کر اس نے غلطی کی ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا۔

''آپ بات کو صرف ایک رخ سے دیکھ رہی ہیں آپی......!'' اس کے لہجے میں نرمی بھی تھی اور قطعیت بھی۔

''ذرا دوسرے رخ سے بھی تو دیکھیں، پانچ مہینے ہوگئے، ہم نے دادی اماں سے ایک بار بھی بات نہیں کی۔ یہ تو غیر فطری ہے۔ ہم نے ایبٹ آباد آنے سے پہلے انہیں رسماً اطلاع بھی نہیں دی۔ حالانکہ ہمیں ان سے اجازت لینی چاہئے تھی۔ ہم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایسے غیر فطری روّیے پر غور کیا جائے تو شبہات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔''

اس پر نوربانو کے کان کھڑے ہوئے۔

''یہ کیسی بات کر رہی ہو تم......!''

''آپ خود سوچیں، اگر آپ دادی اماں سے یہاں آنے کی اجازت مانگتیں تو منع تو نہیں کرتیں آپ کو......''

''مجھے تو یقین ہے کہ وہ منع کر دیتیں۔''

"چلیں...... مان لیا۔ مگر پانچ مہینے میں ایک بار بھی فون نہ کرنا...... آپ خو سوچیں۔"

اس بات کا نور بانو کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"اور اب وہ بیمار ہیں۔ ایسے میں فون نہ کرنا......"

"ٹھیک ہے......! لیکن سوچ لو، کوئی بات بگڑی تو سنبھال سکو گی......؟"

"آپ فکر نہ کریں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

مگر لاہور میں رابطہ ملتے ہی عبدالحق کی آواز سنائی دی تو ارجمند حیران رہ گئی۔ وہ حیرانی ایک لمحے کی تھی۔ پھر اس نے سوچا کہ عبدالحق کی وہاں موجودگی تو فطری ہے۔

"آپ کیسے ہیں آغا جی......!" اس نے سلام کے بعد کہا۔

یہ سن کر نور بانو چونکی۔ ارجمند نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

"ٹھیک ہوں، الحمدللہ......!" دوسری طرف سے عبدالحق نے کہا۔

"تم کیسی ہو......؟ نور بانو کا کیا حال ہے......؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ بس آج کل آپی کی طبیعت ذرا گری گری رہتی ہے۔ لیکن اس وقت تو میں نے دادی اماں کے لئے فون کیا ہے۔ ان کی طبیعت کیسی ہے آغا جی......!"

عبدالحق کو حیرت ہوئی کہ اسے اماں کی بیماری کا کیسے پتا چلا......؟ اور خود اسے شرمندگی ہوئی کہ اماں کی پریشانی میں اسے ایبٹ آباد فون کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ اماں بیمار ہیں......؟" اس نے پوچھا۔

"آپی نے تین چار دن پہلے فون کیا تھا نا......! تو سب لوگ اماں کو لے کر اسپتال گئے ہوئے تھے۔ نسیمہ سے بات ہوئی تھی آپی کی۔ اب نسیمہ تفصیل سے تو بتا نہیں سکی۔ بس یہ اندازہ ہوگیا کہ دادی اماں کی طبیعت زیادہ ہی خراب ہے، تب سے پریشانی ہے ہمیں۔ آپی کی طبیعت بھی اور خراب ہوگئی۔"

"اور تب سے تمہیں آج خیال ہے اماں کا......؟" عبدالحق کے لہجے میں طنز بھی تھا اور شکایت بھی۔

جواب دیتی تو جھوٹ بولنا پڑتا۔ ادھر نور بانو اسے گھور رہی تھی۔ ارجمند نے دوسری ترکیب نکالی۔

"بدگمانی نہیں کرتے آغا جی......! بہت بری بات ہے۔" اس نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔

لیکن عبدالحق مطمئن نہیں ہوا۔

"میں معذرت کرا لوں گا۔ مگر پہلے مجھے وجہ تو بتا دو۔"

"میں نے آپ کو بتایا نا کہ آپی کی طبیعت خراب ہے۔ آج ذرا بہتر ہوئی ہے۔ دوسرے ہمیں یہ خیال بھی تھا کہ بات دادی اماں سے ہی ہو تو بہتر ہے۔ چاچا اور چاچی تو فون پر بات کرتے ہوئے عجیب سے ہو جاتے ہیں۔"

یہ بات عبدالحق کو معقول لگی۔ اس کا تجربہ تو اسے بھی تھا۔

"اب دادی اماں کے بارے میں تو بتا دیں......!"

"اماں کو یرقان ہوگیا ہے۔ اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ خود سے اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتیں۔"

"اللہ......!" ارجمند وحشت زدہ ہوگئی۔

"علاج ہو رہا ہے...... روحانی بھی اور حکیم کا بھی۔ اب پہلے سے کافی بہتر ہیں۔ یرقان سمجھو، آدھا اتر چکا ہے۔ لیکن حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ کمزوری دور ہونے میں بہت وقت لگے گا۔ اس بیماری میں دوا سے زیادہ آرام کام کرتا ہے۔"

ارجمند سچ مچ تڑپ گئی تھی حمیدہ کے لئے۔ اس نے کہا۔

"اب تشویش کی تو کوئی بات نہیں ہے نا آغا جی......!"

"الحمدللہ......! حکیم صاحب مطمئن ہیں۔ وہ کہتے ہیں، دوا، پرہیز اور آرام...... تینوں کا خیال رکھا جائے تو انشاء اللہ بہت جلد اماں اٹھ کھڑی ہوں گی۔"

"بات تو نہیں ہو سکتی اماں سے......؟" ارجمند کے لہجے میں تڑپ تھی۔

"نہیں ارجی......!"

"بہرحال آپ نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اب میں آپ کو اس پر انعام دوں گی۔" ارجمند کو احساس تھا کہ نور بانو اسے گھور رہی ہے۔

"اتنی دور سے انعام......؟" عبدالحق نے شوخ لہجے میں کہا۔

ارجمند نے اپنے فطری ردِعمل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ لیکن چہرہ پھر بھی گلابی ہوگیا۔

"جی......! آپ کا انعام یہ ہے کہ اب آپ آپی سے بات کر سکیں گے۔ ورنہ میں ہرگز نہ کراتی بات......!" یہ کہہ کر اس نے ریسیور نور بانو کی طرف بڑھا دیا۔

نور بانو کے چہرے پر کھنچاؤ تھا۔ تاہم اس نے ریسیور لے لیا۔

"کیسے ہیں آپ......؟" اس نے لہجے میں نقاہت سموتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ لیکن تمہاری آواز سے تو بہت کمزوری ظاہر ہو رہی ہے۔" عبدالحق کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اب تو بہت بہتر ہوگئی ہوں۔ ایک ہفتہ پہلے تو بولنا بھی ممکن نہیں تھا میرے لئے۔"

ارجمند حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اگر نسیمہ سے فون پر نور بانو کی آواز میں پوچھا جاتا تو وہ بتاتی کہ اس کی آواز میں کیسی سختی اور لہجے میں کیسا تحکم تھا۔

"مجھے تو یہ آواز سن کر بھی پریشانی ہوگئی ہے تمہاری طرف سے۔"

"اب آنے کا ارادہ نہ کر لیجئے گا، خدا کے لئے......!" نور بانو کی آواز اور کمزور ہوگئی۔

دوسری طرف سے عبدالحق کی سرد آہ سنائی دی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"ہوا کیا تھا......؟"

"وہی جو ہوتا ہے ایسے میں...... پر آپ کہاں سمجھ سکتے ہیں......؟"

پانچ منٹ ہوگئے، اور صرف نور بانو کے بارے میں بات ہوتی رہی۔

ارجمند سوچ رہی تھی، کچھ ہنر تو ہے آپی کے پاس۔ دادی اماں کی عیادت تو رکھی رہ گئی۔

نور بانو کو حمیدہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت نہ ہوتی تو شاید اس کا تذکرہ ہی نہ آتا۔ لیکن بالآخر نور بانو نے خود ہی پوچھ لیا۔

"اماں کا کیا حال ہے......؟"

"بہتر ہے......! البتہ کمزور بہت ہوگئی ہیں۔"

"اور وہ یہاں جو آنے والی تھیں......؟"

"اسے تو بھول ہی جاؤ۔ حکیم صاحب نے مسلسل چھ ماہ آرام کے لئے کہا ہے......سختی سے۔"

"خدا کا شکر ہے......!" نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیا مطلب......؟"

"وہ آرام کہاں کرتی ہیں......؟"

"مگر اب تو آرام کرنا پڑے گا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خود بھی ڈر گئی ہیں۔"

"وہ نہیں ڈرنے والی۔ کچھ عجب نہیں کہ اگلے مہینے ہی یہاں کے لئے نکل کھڑی ہوں۔" نور بانو نے عبدالحق کو چڑھانے کے لئے کہا۔

"نہیں بھئی......! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کے لئے اپنے کمرے میں چلنا پھرنا ممکن نہیں، اتنے طویل سفر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے......؟"

"بہرحال سختی سے خیال رکھئے گا اس بات کا۔ یرقان بگڑ جائے تو......"

"اللہ نہ کرے......! کیسی بات کرتی ہو......؟"

"اماں کی بھلائی کے لئے کہہ رہی ہوں۔ میں وہاں ہوتی تو خود خیال رکھتی۔ اور آپ بھی کون سا وہاں رہیں گے تمام وقت۔ کچھ الٹا سیدھا سوچیں تو کون روکنے والا ہے انہیں......؟"

"تم فکر نہ کرو۔ میں سب بندوبست کر کے جاؤں گا یہاں سے۔"

نور بانو نے ریسیور رکھا تو وہ پوری طرح مطمئن تھی۔ ریسیور رکھ کر وہ ارجمند کی طرف پلٹی۔

"چلو...... بلا ٹلی......!" اس نے خوش ہو کر کہا۔

ارجمند کو حمیدہ کے بارے میں ایسی سخت باتیں سن کر بہت تکلیف ہوتی تھی۔ وہ نور بانو سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا۔

''آپ دادی اماں کے بارے میں ایسی باتیں نہ کیا کریں آپی......!'' اس نے کہا۔

''آپ جانتی ہی نہیں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہیں۔''

''مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے......؟'' نور بانو نے طنزاً کہا۔

''وہ آپ کے لئے ساس نہیں، ماں ہیں۔''

''رہنے دو یہ باتیں......!'' نور بانو نے چڑ کر کہا۔

''اگر میں نے خود عبدالحق صاحب سے تمہاری شادی نہ کرائی ہوتی تو یہ بھرم بھی کھل جاتا۔''

ارجمند بھونچکی رہ گئی۔

''کیا مطلب آپی......!'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

''وہ تو پہلے ہی سے ان کی دوسری شادی کرانے کے چکر میں تھیں اولاد کی خاطر......!''

''تو دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں ہے آپی......! بلکہ تیسری اور چوتھی بھی......اللہ نے اجازت دی ہے اس کی۔''

''بے شک دی ہے۔ لیکن میں نے علم دین رکھنے والی عورتوں کو بھی شوہر کی دوسری شادی پر طوفان اٹھاتے دیکھا ہے۔ یہ عورت کی کمزوری ہے۔ بڑی بڑی باتیں کروا لو دین کی، قرآن حدیث سنا ڈالیں گی فرفر......لیکن شوہر کی دوسری شادی کی بات آ جائے تو سب کچھ بھول جاتی ہیں۔ اللہ بھی یاد نہیں رہتا۔''

''بدبختی اور جہالت ہے ان کی۔'' ارجمند نے نیچی آواز میں کہا۔

''اللہ کے حکم کے سامنے کیا چون و چرا......؟ یہ سب کچھ ہندوؤں کے ساتھ میل جول کا نتیجہ ہے۔ انہی سے یہ سب کچھ سیکھا ہے ہم نے......اور یہ بہت برا ہے آپی......!''

نور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ بتاؤ......! وہ اگر تم سے ایک اور شادی کی اجازت مانگیں تو تم کیا کرو گی......؟''

''میں بہت سخت برا مانوں گی۔'' ارجمند نے بے ساختہ کہا۔

''دیکھا......! آخر ہو نا عورت......!'' نور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں اس بات پر برا مانوں گی کہ جس چیز کی انہیں اللہ نے اجازت دی ہے، وہ اس کے لئے مجھ سے اجازت کیوں مانگ رہے ہیں......؟ یہ تو بہت بری بات ہو گی۔''

''کچھ بھی ہو بھئی......! میں تو ایسی ہی ہوں، عام سی عورت...... میں تو کبھی اجازت نہ دوں۔ اسی لئے تو کراچی جا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ تو اس منحوس پیٹ کے درد نے مجھے مجبور کر دیا، ورنہ......''

اب ارجمند اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شاید عقدے کھلنے کا دن تھا۔

''تو اس درد کی وجہ سے آپ لاہور واپس آئیں......؟''

''تو اور کیا......؟ لیکن مجھے معلوم تھا کہ بڑی بی فوراً ہی ان کی دوسری شادی کے چکر میں پڑ جائیں گی۔ میں نے سوچا، موقع ہی کیوں دوں......؟ سارے معاملات اپنے ہاتھ میں ہی نہ لے لوں۔''

''تو آپ کو میرا خیال کیسے آیا......؟''

''تو اور کس کا خیال آتا......؟ اور تھا کون تمہارے سوا......؟ تم میرے لئے بہن تھیں۔ اگر مجھے عبدالحق صاحب میں کسی کا حصہ لگانا ہی تھا تو میں تمہارے سوا کسی اور کو تو ان کا سایہ بھی نہیں دے سکتی تھی۔ ایک تم ہی تو تھیں ارجی......! سو میں نے اپنی سب سے قیمتی چیز میں تمہیں حصہ دار بنا لیا۔''

ارجمند کئی لمحوں تک خاموش رہی۔ لگتا تھا، اب کچھ نہیں بولے گی۔

نور بانو نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا بے حد واضح تاثر تھا۔

''تم چپ کیوں ہو گئیں ارجی......؟''

''کبھی چپ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے آپی......!'' ارجمند نے آہستہ سے کہا۔

''میری کوئی بات بری لگی ہے تمہیں......؟''

''رہنے دیں آپی......!''

''نہیں......! مجھے بتاؤ......! تمہیں میری قسم......!''

''آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔ اور یہ بات مجھے اچھی نہیں لگے گی۔''

''مجھے برا نہیں لگے گا...... وعدہ رہا...... اور دیکھو، میں نے تمہیں اپنی قسم دی ہے۔''

ارجمند اس کے اصرار کے باوجود جھجک رہی تھی۔ پھر بالآخر اس نے گہری سانس لی۔

''ٹھیک ہے آپی......! میں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''چیزوں اور انسانوں میں بہت فرق ہوتا ہے آپی......! کوئی انسان کسی انسان کی ملکیت نہیں ہوتا۔ بلکہ میں تو سمجھتی ہوں کہ کوئی جاندار بھی کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ پالتو جانور بھی نہیں۔ بلی صرف اپنے مالک تک محدود نہیں رہتی۔ جو کوئی بھی ذرا سا التفات دکھائے، اس کے سامنے خرخراتی ہے، اس سے پیار کرانے کی کوشش کرتی ہے۔ کتا سب سے بڑھ کر اپنے مالک کا وفادار ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے لوگوں کو بھی دوست بناتا ہے۔ اپنے مالک کے دوستوں سے بھی محبت کرتا ہے۔ جبکہ انسان کو تو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے، تو کوئی بات تو ہے اس میں۔ اس میں ہمہ گیری ہے، وسعت ہے۔ اللہ نے اسے محدود ہونے کے لئے نہیں بنایا۔ صرف اپنی متعین کی ہوئی حدود کا پابند ہونے کا حکم دیا ہے اسے۔ پوری کائنات مسخر کر دی ہے اس کے لئے۔ یہ ایک غلام کا منصب تو نہیں۔ ایک غلام کیا کسی کو مسخر کرے گا۔ انسان کوئی رومال تو نہیں کہ کوئی کہے، یہ میرا رومال ہے، میں یہ کسی کو نہیں دوں گا۔ اور مرد تو آزاد طبع ہی اچھا لگتا ہے آپی......! بس وہ اللہ کا غلام ہو۔ اور سوچیں، اللہ نے اسے کتنے رشتے، کتنے تعلق عطا فرمائیں ہیں...... بیک وقت......! وہ والدین کا بیٹا ہے، بہن بھائیوں کا بھائی ہے، بیوی کا شوہر ہے، پھر ماں باپ کی طرف سے ملنے

والے رشتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوست احباب ہیں، دنیاوی تعلقات ہیں۔ کئی کئی دوست ہوتے ہیں اس کے۔ سب سے تعلق مختلف ہوتا ہے اس کا۔ ساری محبتیں الگ الگ ہوتی ہیں، برابر نہیں ہوتیں، ایک جیسی نہیں ہوتیں، اور اللہ کی شان دیکھیں کہ اتنے تعلقات، محبتوں اور رشتوں میں بھی وہ تقسیم نہیں ہوتا۔ ایک سالم اکائی ہی رہتا ہے۔ وہ کوئی بتاشوں کا ڈھیر نہیں ہوتا کہ کسی کی ملکیت ہو، اور جس کی ملکیت ہو، وہ جہاں جی چاہے، اسے مٹھی مٹھی بھر بانٹ دے اور جہاں چاہے، کہہ دے کہ نہیں اسے تو میں ایک بتاشہ بھی نہ دوں۔''

نور بانو حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کبھی ارجمند کو اتنا بولتے نہیں سنا تھا۔

ارجمند نے اپنی بات جاری رکھی۔

''تو آپی......! مرد کو بانٹا نہیں جاتا۔ وہ تو خود بانٹنے والا ہوتا ہے۔ اللہ نے اسے صرف چار شادیوں کی اجازت نہیں دی، ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے۔ اسے انصاف کے ساتھ ان کے حقوق ادا کرنے کا، ان کے ساتھ برابری کا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ سوچیں تو یہ اس کی آزمائش ہے، اور اس کے لئے وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہے۔ ہم جسے عیش سمجھتے ہیں، وہ دراصل اس کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔''

''تو وہ اس میں پورا کب اترتا ہے؟ پورا اتر ہی نہیں سکتا۔'' نور بانو نے پر خیال لہجے میں کہا۔

''ماں اپنی اولاد تک کو برابر کی محبت نہیں دے سکتی۔ مرد بیویوں کے درمیان کیا انصاف کرے گا؟''

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں آپی......! یہ انصاف ظاہر ہے۔ دنیاوی چیزوں اور آسائشات میں اس کا خیال رکھنا ہے۔ مکان ہے، کپڑے ہیں، کھانا پینا ہے، وقت کی تقسیم ہے۔ کسی سے یہ ظاہر نہ ہو کہ ایک کو دوسری پر فوقیت دی جا رہی ہے۔ اس محبت تو دل میں ہوتی ہے۔ ہاں......! یہ ضروری ہے کہ آدمی حتی الامکان اسے ظاہر نہ ہونے دے۔ کسی کو شکایت نہ ہو۔ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ ایسی حکمت سے کام

لے کہ ہر بیوی یہی سمجھے کہ وہ سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ یوں کوئی بیوی خواہ یہ سمجھتی رہے، لیکن کبھی اسے ظاہر نہیں کرے گی۔ یوں سب خوش اور مطمئن رہیں گی، اور ہر طرف امن رہے گا۔''

''تمہیں اتنا بولنا آتا ہے ارجی ......!'' نور بانو نے حیرت سے کہا۔

''اور تم اتنا کچھ جانتی اور سمجھتی ہو، کیسے ...... ؟''

''میں قرآن پڑھتی ہوں اور اس پر غور کرتی ہوں آپی ......! اور میں ہر بات پر سوچتی ہوں۔ آدمی تو سوچنے والا جانور ہے نا آپی ......!''

''مگر ارجی ......! محبت چھپائی کہاں جاتی ہے؟ وہ تو ظاہر ہو کر رہتی ہے اور ظاہر ہوگی تو شکایت بھی ہوگی۔''

ارجمند نے ایک گہری سانس لی۔

''دیکھیں آپی ......! مجھے معلو ہے کہ آغا جی آپ سے بہت محبت کرتے ہیں ...... بہت زیادہ...... اور مجھ سے تو وہ محبت ہی نہیں کرتے۔ لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں ان سے۔''

نور بانو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔

''شاید اس لئے کہ تم ان سے محبت نہیں کرتیں۔''

''نہیں آپی ......! شوہر سے محبت کرنا بیوی کا فرض ہوتا ہے۔ اور میں بھی آغا جی سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہتے کہتے ارجمند کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''شوہروں سے محبت وہ عورتیں شاید نہیں کر پاتی ہوں گی، جن کی شادی ان کی مرضی کے خلاف زبردستی کی گئی ہو۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔''

''تو تم نے بھی تو محض میری وجہ سے ان سے شادی کی ہے۔'' نور بانو نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ارجمند جانتی تھی کہ اس گفتگو میں یہ مرحلہ بھی آئے گا اور وہ اس کے لئے تیار تھی۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے جھوٹ بولنا بہت ناپسند ہے آپی ......! یہ سچ ہے کہ اس شادی کا سبب آپ ہیں۔ لیکن بات صرف اتنی سی نہیں۔ اگر آغا جی اچھے انسان نہ ہوتے،

اگر میں انہیں ناپسند کرتی ہوتی تو میں اس شادی سے صاف انکار کر دیتی۔ ازدواجی زندگی کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھی جاتی۔ آپ اپنے اوپر یہ بوجھ کبھی نہیں رکھئے گا کہ میرا آپ پر کوئی احسان ہے۔'' یہ کہہ کر جیسے وہ ہلکی ہوگئی۔

نور بانو کی رنگت ایک لمحے کو متغیر ہوگئی۔ کیا یہ اظہار محبت ہے؟ اس نے سوچا۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بے شک ارجمند اعلیٰ ظرف ہے۔ کس خوب صورتی سے اس نے مجھے اپنے احسان سے آزاد کر دیا ہے۔

اب وہ ارجمند کو نئی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ یہ کم عمر لڑکی کتنی سمجھدار اور نیک ہے۔ اس کے سامنے اسے اپنا وجود بہت چھوٹا، بہت حقیر لگنے لگا۔ یہ زندگی کے، ہر چیز کے بارے میں سوچتی ہے، غور کرتی ہے، اس کے اپنے نظریات ہیں۔ یہ بولتی کم ہے، اور جب بولتی ہے تو بہت سوچ سمجھ کر، تول کر بولتی ہے، ایسے کہ اس کی بات رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔

اپنی غلطیوں، اپنی خامیوں، اپنی کمزوریوں سے وہ ناواقف نہیں تھی۔ لیکن ارجمند کی باتوں نے اس کے دل پر اثر کیا تھا۔ پہلی بار ...... زندگی میں پہلی بار وہ ان کا دفاع کرنے، ان کے لئے جواز گھڑنے کے بجائے ان پر شرمندہ ہو رہی تھی۔ اس نے دینی تعلیم حاصل کی تھی۔ قرآن کے علاوہ حدیث بھی پڑھتی رہی تھی۔ یہ سب باتیں وہ جانتی تھی۔ لیکن اس کا عمل عام، جاہل عورتوں کا سا تھا۔ عملی زندگی میں وہ سارا دین بھول گئی تھی اور کیوں نہ بھولتی؟ وہ قرآن سے دور ہوگئی تھی۔ نماز بھی بھول بیٹھی تھی۔ جبکہ ارجمند نے وہ سب کچھ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کے برعکس وہ کتنی خوش، پرسکون اور مطمئن تھی۔ محبت میں وہ صرف دینے کی قائل تھی۔ مانگتی کچھ تھی ہی نہیں۔ بے طلبی بڑی چیز ہے۔ آدمی بے طلب ہو تو بے چینی اور اضطراب، دکھ اور پریشانی اور کوئی خوف اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ یہ بات اب اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔

وہ سوچتی رہی۔ ارجمند نے اس کے کہنے پر شادی کی۔ اسے وہ کچھ دینے کا وعدہ کیا، جو کوئی عورت کسی کو نہیں دے سکتی۔ اور اس نے عبدالحق کو اس سے دور کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ حالانکہ وہ کم عمر بھی ہے اور بہت حسین بھی، چاہتی تو

ایسا کر سکتی تھی، اور اس میں کامیاب بھی ہو سکتی تھی۔

اور خود اس کا عمل کیا ہے؟ اس نے اپنی غرض کے لئے اسے استعمال کیا اور تنگ نظری کا اس کی یہ عالم ہے کہ اس کا بس چلے تو وہ اسے عبدالحق سے فون پر بات بھی نہ کرنے دے۔

اس نے نظر اٹھا کر ارجمند کو دیکھا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی ...! تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں سچ مچ بہت بری ہوں۔''

''ایسا نہ کہیں آپی ...!'' ارجمند نے تڑپ کر کہا۔

''خدا گواہ کہ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔''

''میں جانتی ہوں۔ تم نے یہ نہیں کہا، مگر یہ سچ ہے۔ میں اب خود کو بدلوں گی۔ تم اور بتاؤ مجھے۔ مجھ سے باتیں کرو۔ مجھے فائدہ ہوگا اس سے۔''

''میں کیا کہوں .....؟ اتنا تو میں کبھی بولتی بھی نہیں۔''

نور بانو سمجھ گئی کہ تسلسل ٹوٹ چکا ہے۔ ارجمند بے ساختہ بول رہی تھی ..... ارادے سے، سوچ سمجھ کر نہیں۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہے؟ لیکن وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں بہت سی ایسی باتیں تھیں، جو وہ کسی سے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خود سوچ کر اسے احساسِ گناہ ہوتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ایسے سوچ کر وہ خود کو اللہ کی رحمت سے دور کر رہی ہے۔ لیکن سوچوں پر بھلا کس کا اختیار ہے؟

اب اس نے سوچا کہ وہ ارجمند سے یہ باتیں کر سکتی ہے۔

''کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں ارجی .....!'' اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

''تو ان پر کسی سے بات کرنی چاہئے۔''

''کسی سے وہ باتیں کروں تو وہ مجھے بہت برا سمجھے گا۔''

''میں آپ کو کبھی برا نہیں سمجھوں گی آپی.....!'' ارجمند نے بے حد خلوص سے کہا۔

''ایسے یقین سے نہ کہو ارجی ...! ان باتوں پر تو مجھ پر کفر کا حکم بھی لگ سکتا ہے۔''

ارجمند جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

''کیسی باتیں کرتی ہیں آپی ...!''

''ڈر گئیں نا.....!''

''نہیں آپی ...! یہ بات نہیں.....! ایسی باتیں ہیں تو آپ کو اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔''

نور بانو نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

''یعنی تم یہی کہہ رہی ہو نا کہ تم ایسی باتیں نہیں سننا چاہو گی۔''

''آپ نے مجھے بات پوری نہیں کرنے دی۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ اس کے بعد آپ کو اپنے کسی خیر خواہ سے وہ باتیں کرنی چاہئیں۔ اللہ بندے کے رجوع کرنے پر خوش ہوتا ہے۔ وہ اس خیر خواہ کے ذریعے وہ خرابی دور کر دے گا۔''

''مگر مجھے یہ ڈر ہے کہ وہ باتیں سن کر تم ہی مجھ سے دور ہو جاؤ گی۔''

''انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ مجھ سے بات کریں۔''

نور بانو کچھ دیر سوچتی رہی۔

''یہ بہت پہلے سے ہے۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''تم نے میری بہنوں کو نہیں دیکھا۔ وہ اتنی خوب صورت تھیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اور وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ لیکن میں ان سے جلتی تھی، حسد کرتی تھی۔''

''یہ تو فطری بات ہے آپی ...! لیکن آدمی ایسی سوچوں سے لڑتا ہے اور اللہ کی مدد سے جیت بھی جاتا ہے۔ مگر ایک بات بڑی سچائی کے ساتھ بتاؤں ...! آپ مجھے بہت خوب صورت لگتی ہیں۔''

''لگنے اور ہونے میں بڑا فرق ہے ارجی ...! میں جانتی تھی اور جانتی ہوں کہ میری بہت واجبی سی شکل و صورت ہے۔ بہنوں کی غیر معمولی خوب صورتی نے اس احساس کو بڑھا دیا تھا۔ کچھ لوگوں کی باتیں بھی اثر دکھاتی تھیں۔ لوگ اکثر

امی سے کہتے...... آپ کی یہ بیٹی کس پر پڑ گئی؟ اور امی مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہی سمجھا کہ وہ مجھ پر ترس کھاتی ہیں۔"

"یہ تو بدگمانی ہے آپی......! اور آپ اب بھی بدگمانی بہت کرتی ہیں۔"

"جانتی ہوں، پر فطرت کا کیا کروں......؟" نور بانو نے کہا۔

"اب آگے بات کرتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔"

"آپ بالکل نہ ڈریں آپی......! میں آپ سے محبت کرتی ہوں، بہن ہی ہوں آپ کی۔"

نور بانو اب بھی جھجک رہی تھی۔

"بے فکر ہو کر بات کریں...... اللہ کی طرف سے بہتری آئے گی انشاء اللہ......!"

نور بانو نے ایک گہری سانس لی اور پھر جیسے پھٹ پڑی۔

"مجھے اللہ سے بھی گلہ تھا۔ اللہ نے اگر مجھے کسی ایسے گھر میں پیدا کیا ہوتا، جہاں بہنیں مجھ جیسی ہی ہوتیں تو شاید میں ایسی نہ ہوتی۔ مجھے اللہ سے ہمیشہ گلہ رہا کہ اس نے میرے ساتھ بے انصافی کی ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی اور اس نے ارجمند کو بہت غور سے دیکھا۔

"اتنی خوب صورت بہنوں کے ہوتے ہوئے یہ بے انصافی کا احساس تو فطری تھا نا......!" پھر اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں آپی......! اللہ کے حکم کے خلاف کوئی بات فطری نہیں ہو سکتی، خواہ وہ انسان کی فطرت میں ہی کیوں نہ ہو......؟ جو آپ سوچتی رہیں، وہ بہت بری بات تھی۔ اللہ سے کسی بری چیز کو نسبت دینا...... توبہ توبہ......! دیکھیں نا......! اللہ کے ناموں میں سے العدل ہے۔ اللہ نے پوری کائنات کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، میزان قائم فرمائی ہے۔ یہ تو آپی......! ایمان کے خلاف ہے۔"

"اب دیکھو نا......! تم ناراض ہو رہی ہو نا......! دور بھی ہو جاؤ گی۔"

نور بانو نے فریاد کی۔ وہ اس وقت جیسے چھوٹی سی بچی بن گئی تھی۔

"نہ میں ناراض ہو رہی ہوں نہ دور......!" ارجمند نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

"میں تو آپ کو سمجھا رہی ہوں کہ اس پر آپ کو توبہ کرنی چاہئے۔ اور اللہ سے رجوع کرنا چاہئے۔"

"اب بے اختیار سوچ کا آدمی کیا کر سکتا ہے......؟"

"سوچ کی جانچ پڑتال ضروری ہے۔ سوچ ہی تو عمل کی راہ ہموار کرتی ہے۔ سوچ غلط ہوگی تو آدمی کو برے عمل کی طرف لے جائے گی۔ آدمی کو اپنے ہر خیال کی طرف سے چوکنا رہنا چاہئے۔ جب آپ سمجھ جائیں گی کہ سوچ غلط ہے تو آپ اسے مسترد کریں گی اور گمراہی سے بچ جائیں گی۔"

"مگر میں تو اپنی سوچ کو درست سمجھ رہی تھی۔"

"آدمی کو گمراہ کرنے کے لئے شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے آپی......! اور اسے باور کراتا ہے کہ اس کی سوچ درست ہے۔ اب اللہ کا اور ایمان کا معاملہ تو بہت نازک ہوتا ہے۔ معمولی سی لغزش بھی سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ اور آپی......! ہمیں تو اللہ نے ایمان پر پیدا فرمایا ہے۔ ہم اللہ کے خلاف سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟ شیطان سوچ ذہن میں ڈالتا ہے۔ لیکن ایسی سوچ کو تو مسلمان ابھرتے ہی رد کر دیتا ہے۔"

"اچھا......! تم بتاؤ......! تم میری جگہ ہوتیں تو کیا ہوتا......؟"

"میں تو فوراً ہی اسماء الحسنٰی کے ورد کو معمول بنا لیتی۔"

"اور خیال پھر بھی نہ مٹتا تو......؟"

"ذکر ہر برائی کو بنا دیتا ہے آپی......! نماز آدمی کو ہر برائی سے روکتی ہے۔"

میں نے تو نماز ہی چھوڑ دی تھی۔ نور بانو نے شرمندگی سے سوچا۔

"اور خیال پھر بھی نہ مٹتا تو......؟" اس نے اصرار کیا۔

ارجمند نے ایک گہری سانس لے کر اپنی جھنجلاہٹ کو دبایا۔

"دیکھیں آپی......! میں تو اللہ کی پناہ مانگتی ہوں شیطان کے شر سے اور

ایسی سوچوں اور وسوسوں سے۔ لیکن آپ سوچیں، سب کچھ تو اللہ نے کسی کو بھی نہیں دیا۔ بڑے بڑے بادشاہ بھی بڑی بڑی نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح انہیں حاصل نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی شخص محرومی سے مبرا نہیں۔ اب اللہ کی حکمت دیکھیں۔ ایک طرف تو ان محرومیوں سے آدمی کے ایمان کی آزمائش ہوتی ہے، جس میں کامیابی کا صلہ بہت عظیم ہے۔ اور دوسری طرف یہ محرومیاں، بن دیکھے اسے اللہ کے قادرِ مطلق ہونے کا یقین بھی دلاتی ہیں۔''

نور بانو بڑی توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

''اب میں آپ کی سوچ کی بات کرتی ہوں۔ اب تک تو آپ کو سمجھ لینا چاہئے کہ اچھا نصیب سب سے بڑی نعمت ہے۔ آپ کی بہنیں بہت حسین تھیں۔ لیکن ان کے نصیب اچھے نہیں تھے۔ مجھے یاد ہے، آپ نے مجھے ان کی موت کے بارے میں بتایا تھا تو میں کانپ گئی تھی۔ اور آپ کے بقول آپ کی صورت اچھی نہیں۔ لیکن آپ کتنی خوش نصیب ہیں، یہ آپ نے کبھی نہیں سوچا۔ ظاہری اور باطنی دونوں اعتبار سے آغا جی جیسے نہایت خوب صورت آپ پر جان چھڑکتے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت آپ کو حاصل ہے۔ کون سی چیز ایسی ہے، جو آپ چاہیں اور آپ کو بغیر کسی دشواری کے نہ ملے؟ اب آپ ساری نعمتوں کو بھول کر اپنی شکل وصورت کے لئے اللہ سے گلہ کرتے رہیں، جبکہ اس کی وجہ سے آپ کو کوئی محرومی بھی نہیں ملی تو یہ تو ناشکرا پن ہے۔

اب عملی زندگی میں دیکھیں تو ثابت ہوتا ہے کہ شکل وصورت کی اتنی اہمیت ہے بھی نہیں۔''

''کیسے.....؟''

''دنیا میں بدصورت سے بدصورت شخص کو بھی پسند کرنے والے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ یوں کہیں ان میں بھی بہت سے لوگ بے پناہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ اور بہت سے نہیں تو کم از کم ایک شخص تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو جن لوگوں کو بدصورت قرار دیا جاتا ہے، ان سے کبھی کوئی محبت ہی نہ کرتا۔ وہ محبت سے بھی محروم رہتے اور ازدواجی زندگی سے بھی۔''

نور بانو نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

''واقعی.....! تمہاری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔''

''تو خوب صورتی سے زیادہ اہمیت کشش کی ہے۔ اللہ نے ہر کسی کے لئے ہر کسی میں کشش نہیں رکھی۔ جو لوگ معیارِ حسن پر پورا اترتے ہیں، دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو انہیں خوب صورت نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں نا کہ خوب صورتی تو دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ آپ کسی کو خوش ذوق کہیں یا بدذوق، لیکن ہر شخص کا اپنا الگ ذوق ہوتا ہے۔''

''لیکن خوب صورتی کی اہمیت تو اپنی جگہ ہے۔'' نور بانو نے اعتراض کیا۔

''اور میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔''

''یہ تو محض کتابی بات ہے۔''

''جی نہیں.....! یہ عملی زندگی کی حقیقت ہے۔ آپ کی کوئی بہن موجود ہوتی تو اس کی خوب صورتی کے باوجود آغا جی آپ ہی سے شادی کرتے۔''

''یہی تو کتابی بات ہے۔''

''نہیں آپی.....! اللہ نے اس کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے اپنی رحمت سے۔ اپنے گھر میں ہی دیکھ لیں۔ آغا جی، دادی اماں اور میں..... ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اور یقیناً آپ ہم سب کو اچھی لگتی ہیں، ورنہ محبت کیوں کرتے.....؟''

''اچھا لگنا اور بات ہے اور خوب صورت ہونا اور بات ہے۔ تم سب کی محبت کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں خوب صورت ہوں۔''

''تو اب خود ہی بتا دیں.....! خوب صورتی بڑی چیز ہے یا محبت.....؟''

''دونوں کی اہمیت اپنی جگہ.....!'' نور بانو کو احساس تھا کہ وہ کٹ حجتی کر رہی ہے۔

''اللہ سب کچھ تو نہیں دیتا کسی کو۔ آپ بتائیں، دونوں میں سے کوئی ایک چیز آپ کو مل رہی ہو تو آپ کس کا انتخاب کریں گی۔''

''خوب صورتی کا.....!'' نور بانو نے بے جھجک کہا۔

''کیوں.....؟''

"کیونکہ خوب صورتی مل گئی تو محبت خود بخود مل جائے گی۔"

"مجھے افسوس ہے آپی.....! کہ آپ غلطی پر ہیں۔"

"ثابت کرو.....!" نور بانو اپنے اندر کے جالے ایک ہی بار میں صاف کر دینا چاہتی تھی۔

"دو زاویے ہیں۔ ایک کو آپ کتابی قرار دیں گی۔ لیکن پھر بھی میں بتاؤں گی ضرور! دیکھیں، جو محبت صرف خوب صورتی کی وجہ سے ملے گی، وہ ممکنہ طور پر سچی اور پائیدار نہیں ہوگی۔ ہر مادی چیز کی طرح جسمانی خوب صورتی بھی فانی اور غیر پائیدار ہوتی ہے۔ تو جب خوب صورتی نہیں رہے گی تو محبت بھی ختم ہو جائے گی۔ ایسی محبت کا کیا فائدہ؟ وہ تو آخر میں، جب آدمی بوڑھا ہو جائے گا تو اسے دکھ ہی دے گی۔ جبکہ آدمی کو بڑھاپے میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے محبت کی۔"

"تم نے ٹھیک کہا.....! یہ تو کتابی بات ہے۔ مجھ سے تو عملی بات کرو۔" نور بانو بولی۔

"تو اب میں جو بات بھی کروں گی، آپ کے جواب کی روشنی میں کروں گی۔ میں خود سے کچھ نہیں کہوں گی۔ ہر بات سامنے کی، عملی زندگی کی، ہمارے اپنے گھر کی بات ہوگی۔" ارجمند نے کہا۔

"اب آپ یہ بتائیں کہ خوب صورتی کے اعتبار سے آپ خود کو کیسا سمجھتی ہیں؟"

"میں سرے سے خوب صورت ہوں ہی نہیں۔"

"تو آپ خود کو کیسا سمجھتی ہیں؟"

"واجبی قبول صورتی سے بھی نیچے۔"

"اور میں کیسی ہوں.....؟"

"تم ایسی حسین ہو کہ تمہاری مثال دی جا سکتی ہے۔ میری بہنیں بھی بہت حسین تھیں، لیکن تم ان سے کہیں زیادہ حسین ہو۔"

"خود سے میرا موازنہ نہ کریں۔"

"کتنی تعریف کروانا چاہتی ہو اپنی.....؟" نور بانو نے جھنجلا کر کہا۔

"مجھے آپ پر کچھ ثابت کرنا ہے۔" ارجمند نے برا مانے بغیر کہا۔

"اور یہ ہرگز ضروری نہیں کہ میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ آپ بس میری بات کا جواب دیں۔"

"میرا اور تمہارا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ تم لاکھوں، بلکہ کروڑوں گنا خوب صورت ہو مجھ سے۔"

"لیکن آغا جی آپ سے بہت..... بہت زیادہ محبت کرتے ہیں، جبکہ مجھ سے وہ ذرا بھی محبت نہیں کرتے۔ میں ان کی آپ سے محبت اور مجھ سے محبت کا موازنہ کرتے ہوئے آپ کی ہی بات دہراؤں گی کہ ان دونوں محبتوں کا موازنہ ممکن ہی نہیں۔ وہ میرے مقابلے میں بلاشبہ کروڑوں گنا محبت کرتے ہیں آپ سے۔"

نور بانو آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

"دل کا حال کون جانے.....؟ آدمی دکھاوا تو کرتا ہے۔"

"یہ اور بری بات ہے..... آپ بدگمانی کر رہی ہیں یا بے کار کی محبت..... اتنے قریبی تعلق میں دکھاوا نہیں چلتا۔ آدمی کی محبت صاف نظر آتی ہے۔ اس کی نظروں سے، اس کے عمل سے، ہر بات سے، ہر انداز سے پتا چلتا ہے۔"

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی، پھر اس نے محبت سے ارجمند کا ہاتھ تھام لیا۔

"واقعی.....! میں زیادتی کر رہی ہوں۔ میں نے تمہاری بات سمجھ بھی لی اور مان بھی لی۔" اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔ اس نے غور سے ارجمند کو دیکھا۔

"تم میری وجہ سے کتنے دکھ اٹھا رہی ہو۔ میں نے بڑی زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ.....!"

ارجمند نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہیں آپی.....! میں جھوٹ نہیں بولتی۔ میں بہت خوش ہوں۔ اتنی خوش میں اس سے پہلے کبھی نہیں رہی۔ آپ نے تو مجھے خوشی اور عزت دی ہے، مرتبہ دیا ہے۔ دکھ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"تمہیں توہین کا احساس نہیں ہوتا۔" نور بانو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"توہین کیسی.....؟ میں اسے عزت اور مرتبہ قرار دے رہی ہوں۔"

اب نور بانو کو یقین ہوگیا کہ ارجمند عبدالحق سے محبت کرتی ہے۔ اس کا ذہن تو اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا، کیونکہ اس نے ایسی کوئی بات دیکھی نہیں تھی۔ لیکن اس کے اندر اس بات کا گہرا یقین ابھر رہا تھا۔

"تم اتنی خوب صورت ہو، اس کے باوجود عبدالحق صاحب تمہیں نظر انداز کرتے ہیں، اور میری معمولی شکل و صورت کے باوجود مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں، اس پر توہین کا احساس نہ ہونا تو غیر فطری ہے۔" بالآخر اس نے کہا۔

"نہیں آپی ...! یہ غیر فطری نہیں۔ دیکھیں، یہ میرا نصیب ہے، اور مجھے اس پر یقین ہے کہ جو کچھ اللہ نے میرے نصیب میں لکھا ہے، وہ سب میرے لئے بہت اچھا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کی طرف سے مسلسل میری بہتری ہو رہی ہے۔ میرا ہر آج میرے گزرے ہوئے کل سے بہتر ہوتا ہے۔"

یہ بات نور بانو کے دل کو لگی۔ اسے یاد آیا کہ یہ بچی کیسے اور کس حال میں اس کے گھر آئی تھی، اور اب ...! یہ بات بھی اس کی سمجھ میں آگئی کہ باہمی محبت کے باوجود وہ اور ارجمند ایک دوسرے کی ضد ہیں، برعکس ہیں۔ بات صرف شکل و صورت تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ مزاج اور فطرت کے لحاظ سے بھی برعکس تھیں۔ وہ جتنی ناشکری تھی، ارجمند اتنی ہی شکر گزار تھی۔ وہ بدگمان تھی اور ارجمند ہر ایک کے بارے میں صرف اچھا گمان رکھتی تھی۔

"اب بتائیں، میں آپ کو قائل کر پائی یا نہیں ...؟" ارجمند نے اسے چونکا دیا۔

"ہاں بھئی ...! میں پوری طرح قائل ہوگئی۔ بات سمجھ میں آگئی۔"

"اب اللہ سے تو آپ کو کوئی گلہ نہیں رہا ...؟"

"نہیں ...!"

"الحمدللہ ...! یہ اللہ کا کرم ہوا ہے آپ پر ...!"

"مگر ایک بات اور ہے۔"

"وہ بھی کر لیں۔"

"وہ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ تم ایسے ہی سمجھا سکو گی مجھے ...؟"

نور بانو کے لہجے میں دبا دبا سا خوف تھا۔

"کوشش کروں گی اور اللہ سے مدد چاہوں گی۔"

"مجھ سے ناراض، مجھ سے دور تو نہیں ہو جاؤ گی ...؟"

"انشاءاللہ ...! ایسا نہیں ہوگا۔"

"اللہ نے تمام انسانوں کو برابر کے حقوق دیئے۔ مرد اور عورت کو زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح بنایا۔ عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں حقیر نہیں کیا۔"

"بلکہ زیادہ عزت اور مرتبہ دیا۔" ارجمند بیچ میں بول پڑی۔

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"جو ماں کا مرتبہ ہے، کسی اور کا نہیں، نسلوں کی امین ہوتی ہے۔ اس کی پاؤں کے نیچے جنت ہے۔"

"لیکن مرد اسے پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔" اس بار نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مسلم معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا آپی ...!" ارجمند نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہندو معاشرے کی بات کر رہی ہیں، جس میں عورت مرد کا کھلونا ہے، جہاں اس کی حیثیت محض ایک داسی کی ہے۔ پتی ورتا کے نام پر سارے حقوق چھین لئے ہیں اس سے۔ اسلام نے تو مرد سے زیادہ عزت دی ہے اسے۔"

"کیا عزت دی ہے؟ جب جی چاہے، شوہر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا ہے۔"

"بدقسمتی سے برصغیر میں جہاں مسلمانوں نے ہندو معاشرے پر ان مٹ اثرات مرتب کئے، وہاں ساتھ رہنے کے نتیجے میں انہوں نے کچھ ہندوؤں کے اثرات بھی قبول کر لئے۔ یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔"

"تم کیسی بات کر رہی ہو......؟" نور بانو نے تنک کر کہا۔

"مسلمان بھلا بت پرستوں سے متاثر ہو سکتا ہے......؟"

"بات شرمندگی کی ہے۔ مگر ایسا ہوا ہے۔ اور غیر فطری بھی نہیں، ساتھ رہیں گے تو میل جول بڑھے گا۔ اسلام رواداری سکھاتا ہے۔ دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ رواداری میں بے اعتدالی ہونے لگی تو تہواروں میں بھی شریک ہونے لگے۔ اسلامی تہذیب اور ثقافت میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت گھلنے ملنے لگی۔ یہ شب برأت میں آتش بازی کہاں سے آئی؟ دیوالی سے...... یہ محرم میں تعزیے اور اکھاڑے کہاں سے آئے؟ دسہرے سے...... اور جہیز کے نام پر جو زیادتیاں ہوتی ہیں، وہ ہم نے کینا دان سے سیکھی ہیں۔ آپ مانیں نہ مانیں، متاثر تو ہم ہوئے ہیں۔ ہم سجدہ کرتے ہی اور ہندو ماتھا ٹیکتے ہیں۔ سجدہ صرف اللہ کے لئے ہوتا ہے۔ اور ماتھا درخت، پتھر اور اپنے جیسے انسان...... کسی کے سامنے بھی ٹیکا جا سکتا ہے، جس سے بھی آپ مرعوب ہوں۔ تو اب دیکھیں کہ سجدہ کرنے والے بھی ماتھا ٹیکنے لگے۔ یہ اثرات خانگی زندگی پر بھی پڑے۔ کہیں مردوں نے تو کہیں عورتیں نے ہندوؤں کی سوچ اور ان کے طور طریقے اپنا لئے۔"

"بات کسی اور رخ پر نکل گئی۔" نور بانو نے کہا۔

"میں یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اللہ نے مردوں کو چار شادیوں تک کی اجازت دی۔ لیکن عورت کو نہیں دی۔ یہ تو مرد کو برتری دی نا...... !"

ایک لمحے کو ارجمند کا چہرہ متغیر ہوا۔ نور بانو اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

"میں وضاحت کر دوں...... !"

ارجمند نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"نہیں آپی...... ! آپ نے کہا، میں نے سن اور سمجھ لیا۔ اتنا ہی کافی ہے۔ مزید وضاحت کریں گی تو میں اور آپ دونوں گناہ گار ہوں گی۔"

"میں نے تو دل میں جو خیال آتا ہے، اس میں تمہیں شریک کر لیا۔ اب تم ناراض نہ ہو جانا۔"

اس وقت ارجمند درحقیقت جھنجلا گئی تھی، بلکہ مشتعل ہو گئی تھی۔ یہ آپی کیسی باتیں سوچتی ہیں، کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اس کا پہلا ردعمل تو یہ تھا کہ وہ نور بانو سے کنارہ کش ہو جائے۔ یہ وہ باتیں تھیں، جو اس نے کبھی سوچی بھی نہیں تھیں۔ اور اس

کے نزدیک یہ سب کچھ سوچنا خود کو تباہ کر لینے کے مترادف تھا۔ تو اس نے سوچا کہ نور بانو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔

لیکن وہ نور بانو سے محبت کرتی تھی۔ وہ اسے تباہی کے گہرے گڑھے میں گرتے دیکھے اور اسے بچانے کے لئے کچھ نہ کرے، یہ اس کے نزدیک احسان فراموشی تھی۔ اسے کوشش تو کرنی ہوگی۔ لیکن کیا...... ؟ یہ موضوع تو وہ تھا، جس پر اللہ کی رحمت سے اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

"تم اس سلسلے میں کیا کہوگی...... ؟" نور بانو نے اسے چونکا دیا۔

"بنیادی بات یہ ہے آپی...... ! کہ میں سورۃ الحشر کی ایک آیت مبارکہ کا حوالہ دوں گی، جس میں اللہ نے ایمان والوں سے فرمایا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ تمہیں دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں، اس سے رُک جاؤ۔ اور اس کے آگے تنبیہ فرمائی کہ اللہ سے ڈرو۔ وہ بہت شدید سزا دینے والا ہے۔ اب یہ ذہن میں رکھیں آپی...... ! کہ یہ خطاب ان لوگوں سے ہے، جو ایمان لائے، اور اللہ کی اطاعت کرنے والے ہیں۔ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ماننے کو کہہ رہا ہے اور نہ ماننے کے نتیجے میں بدترین سزا کی وعید دے رہا ہے تو اللہ کا حکم!" یہ کہتے ہوئے اسے جھرجھری سی آئی۔ اس کے لہجے میں خوف در آیا۔

"اللہ کے حکم میں کیا چون و چرا...... اللہ کے حکم سے اختلاف و انحراف کہاں لے جائے گا...... ؟ سب کچھ تباہ ہو جائے گا آپی...... !"

ایک لمحے کو تو نور بانو بھی تھرا کر رہ گئی۔

"اللہ کے حکم کے معاملے میں ایک ہی روّیہ ہونا چاہئے۔ کسی دوسرے روّیے کی اس میں گنجائش نہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ سنیں اور ایمان لے آئیں۔ اللہ نے فرمایا، میں واحد اور احد ہوں۔ میرا کوئی شریک نہیں۔ نہ میں کسی سے ہوں، نہ کوئی مجھ سے ہے۔ اور ہم نے مان لیا۔ اللہ نے جو کچھ حلال قرار دیا، ہم نے اسے اپنا لیا۔ اور جسے حرام قرار دیا، اس سے منہ پھیر لیا۔ اس طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ یہ ہے بندگی...... !"

"لیکن اللہ نے آدمی کو عقل دی، سوچنے والا بنایا۔ اب اس کے اندر

اختلافی سوچ ابھرے۔ مخالف دلیلیں سر اٹھائیں تو......؟''

''بے شک اللہ نے عقل دی۔ دنیا کا نفع نقصان سمجھنے کے لئے۔ دین کو سمجھنے کے لئے نہیں۔ ایمان تو دل سے لانے کو کہا، دلیلوں کی روشنی میں نہیں۔ ایمان بالغیب۔ اگر اللہ سامنے آجائے تو کس کی مجال ہو اس کا انکار کرنے کی۔ یہ بالغیب ہی تو آزمائش ہے۔ کون جانے، عقل بھی ہمیں ایک اعتبار سے آزمائش کے لئے ملی ہو...... ہمیں بھٹکانے، بہکانے کے لئے۔ سنیں آپی......! کتاب تو مجھے یاد نہیں، لیکن میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پہلے تسلیم پھر تفہیم۔ یہ اللہ کے حکم کے لئے ہے کہ سنو اور اسی لمحے تسلیم کرلو۔ تفہیم کے چکر میں مت پڑو۔ یہ ایمان کا حصہ ہے کہ اللہ کا حکم سچا، برحق۔ اس کو کسی دلیل کی حاجت نہیں۔''

نوربانو نے دیکھا کہ ارجمند عجیب سی کیفیت میں بول رہی ہے، جیسے وہ ارجمند نہیں، کوئی اور ہو۔

''لیکن تسلیم کرنے میں عقل رکاوٹ ہو تو......؟'' اس نے کہا۔

''تو یہ بدترین بدبختی ہوگی۔'' ارجمند کے لہجے میں جلال تھا۔

''تسلیم کرلیا اور تفہیم نہ ہوئی تو......؟''

ارجمند کو خود بھی لگ رہا تھا، جیسے اس کے اندر کوئی اور چھپا بیٹھا ہے۔ آواز تو اس کی تھی، لیکن شاید الفاظ اس کے نہیں تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ جو باتیں وہ کر رہی ہے، وہ اس کی اپنی فہم سے بھی ماورا ہیں۔

''اہمیت صرف تسلیم کی ہے آپی......! تسلیم کافی ہے، تسلیم شافی ہے۔ تسلیم میں خیر و برکت ہے۔ بندہ تسلیم کرے گا، عمل کرے گا تو اللہ اسے تفہیم سے نوازے گا...... مرحلہ وار۔ کیونکہ تفہیم دراصل ایمان ہے۔'' ارجمند نے پُرخیال لہجے میں کہا اور پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

''کیسے......؟''

ارجمند جیسے کھل اٹھی۔ اس کے اندر جیسے روشنی ہوگئی تھی...... بلکہ وہ جگمگا رہی تھی۔

''اب جو کچھ بھی میں کہوں گی، وہ اس کا ثبوت ہے۔ کیونکہ آپ نے جو

سوال اٹھائے، وہ میرے ذہن میں کبھی ابھرے نہیں تھے۔ اس لئے کہ خواہ میں اللہ کے حکم پر عمل نہ کر پاؤں، لیکن اسے بلاچون و چرا تسلیم ضرور کرتی ہوں۔ آج ضرورت محسوس ہوئی تو اللہ نے تفہیم بھی عطا فرما دی۔''

نوربانو نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ننھے بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

''اللہ کا شکر ہے......!'' ارجمند نے کہا۔

''مجھے سمجھاؤ بھی تو......!'' نوربانو بولی۔

''آپی......! سورۂ ملک میں اللہ نے فرمایا...... اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ...... کیا وہی نہ جانے، جس نے پیدا کیا؟ یہ کتنی بڑی بات ہے آپی......! محض چار لفظوں میں۔ اللہ خالق ہے۔ اپنی مخلوق کو خوب جانتا ہے۔ اسی لئے تو کریم بھی ہے۔ بغیر مانگے ہماری ضرورتیں پوری فرماتا ہے۔ بلکہ ہمیں تو اپنی ضرورتوں کا علم ہی نہیں ہوتا۔ تو وہ ہمیں جانتا ہے...... ہمارا مزاج، ہماری فطرت، تو اس نے جو حکم دیا، اس میں ہماری بہتری ہے۔ وہ ہماری ہی بھلائی کے لئے ہے۔ ہم اپنے باطن کے نہاں خانوں سے بے خبر ہیں، لیکن وہ ہمارا ہر بھید جانتا ہے۔ صرف ہمیں ہی نہیں، ہماری فطرت بھی اس نے بنائی ہے۔ مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ دونوں کی فطرت اور مزاج مختلف ہیں۔ اسی...... کے حساب سے اللہ نے ان کے لئے دائرہ کار بنایا ہے۔ ان کا الگ الگ میدان ہے۔ مرد میں وسعت ہے۔ اس کی فطرت میں تجسس ہے۔ اسے باہر کے معاملات سے نمٹنا ہے۔ اس کے سامنے کائنات کی وسعت ہے۔ وہ کھوجی ہے۔ وہ اپنے گھر اور خاندان کا رکھوالا ہے۔ اسے اپنے خاندان کے لئے سامان زیست فراہم کرنا ہے۔ اللہ نے جو رزق اس کے لئے رکھا ہے، اس کی جستجو کرنی ہے، اس کے لئے سعی کرنی ہے۔ اس لئے اللہ نے اسے جسمانی طاقت عطا فرمائی ہے۔ وہ صنف قوی ہے۔ بوقت ضرورت اسے لڑنا بھی ہے، دفاع بھی کرنا ہے۔''

''تو برابری کہاں رہی......؟'' نوربانو نے جھنجھلا کر کہا۔

''یہ دنیا تو پھر مرد کی ہی ہے نا......!''

''آپ پوری بات سنیں گی تو سمجھیں گی۔'' ارجمند نے نرم لہجے میں کہا۔

''اور بات ویسے بھی آسان نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ اللہ نے مرد اور عورت کی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ان کا دائرہ کار بنایا۔ مگر یوں بھی تو ہے کہ اللہ کو جس سے جو کام لینا تھا، اسے اس کے مطابق بنایا .... جسمانی اعتبار سے بھی اور فطرت اور مزاج کے اعتبار سے بھی۔'' اب اس کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ خود سے بات کررہی ہو۔ پھر وہ جیسے چونکی۔ اس نے نور بانو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ برابر کی بات کرتی ہیں تو وہ برابری ہر طرح سے، تو نہیں ہوسکتی۔ ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے، اور ہر چیز اپنے مقام پر ہی اہمیت رکھتی ہے۔ مقام سے ہٹ کر ہر چیز اپنی اہمیت کھو بیٹھتی ہے۔''

''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔'' نور بانو نے اعتراض کیا۔

''اللہ نے آدمی کو سمجھانے کے لئے اس کی نگاہوں کے سامنے مثالیں چھوڑی ہیں۔ بس اسے ادھر ادھر دیکھنا اور غور کرنا ہے۔ آپ ذرا پھول کے بارے میں سوچیں۔ اس کا مقام کیا ہے؟ شاخ پر! کلی کھلتی ہے، پھول بنتی ہے، پھول خوشبو بکھیرتا ہے، اور کیونکہ ہر چیز کی طرح فانی ہے، اور اس کا وقت بھی مقرر ہے، سو اپنے وقت پر وہ بکھر جاتا ہے۔ لیکن ہم اسے شاخ سے توڑیں تو اس کی وہ وقعت نہیں رہتی۔ چند لمحے ہم اسے سونگھتے ہیں، پھر بے پرواہی سے پھینک دیتے ہیں، اور وہ خاک میں مل جاتا ہے۔ شاخ پر رہے تو اس کی عزت بھی ہوتی ہے، اور اس میں کشش بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاخ سے ٹوٹ کر کچھ بھی نہیں۔''

نور بانو نے بڑے رشک سے اسے دیکھا۔ یہ اتنی کم عمر لڑکی اتنا کچھ کیسے سوچ اور سمجھ لیتی ہے۔

''ہر چیز کا یہی حال ہے آپی ....! اللہ نے جسے جو مقام دیا ہے، وہیں پر اس کی عزت اور مرتبہ ہے۔ اس مقام سے ہٹ کر کچھ بھی نہیں۔ یہی حال مرد اور عورت کا ہے۔ ان کا اپنا اپنا مقام ہے۔ آپ ذرا سوچیں، مرد اور عورت جسمانی اعتبار سے ایک جیسے ہوتے تو ان میں ایک دوسرے کے لئے کشش ہوتی بھلا ....؟''

یہ کہتے کہتے ارجمند شرما گئی۔

''پھر دنیا کا نظام کیسے چلتا ....؟ کشش تو مختلف ہونے ہی کی وجہ سے ہے۔ میں مردوں کا دائرہ کار بیان کر رہی تھی تو آپ نے یہ سمجھ لیا کہ یہ اس کی برتری ہے۔ نہیں آپی ....! ایسا نہیں ہے۔ مرد اپنے خاندان کا محافظ ہے۔ لیکن عورت کو تو اللہ نے نسلوں کا امین اور محافظ بنایا ہے۔ کہیں مرد کو فوقیت حاصل ہے تو کہیں عورت کو۔ اور اسے تسلیم کرنا ہی زندگی کی کامیابی ہے۔

مرد کا تعلق باہر کی دنیا سے ہے، سو اسے اس کے لئے اللہ نے وسائل عطا فرمائے۔ اور عورت کی حکمرانی گھر کی چار دیواری میں ہے، اور اسے اس کے لئے وسائل عطا ہوئے ہیں۔ مرد جسمانی طور پر طاقتور ہے۔ وہ جو بوجھ اٹھا سکتا ہے، عورت نہیں اٹھا سکتی۔ لیکن جو بوجھ عورت اٹھا سکتی ہے، وہ مرد نہیں اٹھا سکتا۔ وہ بچوں کو نہیں پال سکتا، ان کی تربیت نہیں کرسکتا۔ یہاں عورت برتر ہے۔ شوہر مر جائے تو بیوی رزق کی جستجو بھی کرتی ہے اور بچوں کی تربیت بھی کرلیتی ہے۔ لیکن بیوی مر جائے تو شوہر کے لئے یہ آسان نہیں ہوتا۔ میری بات سمجھ رہی ہیں نا آپ ....! اللہ نے دونوں کو ان کی ضرورت کے مطابق جسم اور صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں۔''

''کچھ کچھ سمجھ رہی ہوں۔ لیکن یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں ہے۔''

''یہ اس کی تمہید ہے آپی ....! مرد میں برداشت، صبر اور تحمل عورت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جس تکلیف میں مرد تڑپ جاتا ہے، عورت اسے اُف کئے بغیر سہ لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچوں کی تربیت کرسکتی ہے۔ بیٹوں کے روپ میں وہ مردوں کو برداشت، صبر اور تحمل سکھاتی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے آپی ....! کہ مرد اور عورت ایک دوسرے سے یکسر مختلف، بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مرد میں وسعت ہے تو عورت میں ارتکاز ہے۔ مرد میں شجاعت ہے تو عورت میں حکمت ہے۔ مرد کے پاس طاقت ہے تو عورت کے پاس دانائی ہے، اور دانائی بڑی سے بڑی طاقت کو زیر کرلیتی ہے۔ مرد تنوع پسند ہے تو عورت یکسو۔ عورت ایک ہدف رکھتی ہے، اور اس کے لئے بڑے ارتکاز کے ساتھ اس کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ جبکہ مرد کے سامنے بہت سے اہداف ہوتے ہیں اور وہ بیک وقت ان کے لئے

جدوجہد کرتا ہے۔ عورت کی توجہ کا مرکز اس کا گھر ہے، اور مرد زندگی کی ہر لڑائی لڑنے کے بعد گھر کا رخ کرتا ہے۔ گھر کا آرام، وہاں ملنے والی محبتیں اور آسائشیں اسے اگلے روز پھر جنگ لڑنے کے لئے تازہ دم کرتی ہیں۔ یعنی عورت کی مدد کے بغیر مرد کوئی جنگ نہیں لڑ سکتا، اور عورت کے لئے اس کا محافظ مرد ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہیں، ورنہ زندگی کی گاڑی ٹھپ ہو جائے گی۔

اب مزاج اور فطرت کا فرق دیکھیں۔ مرد تنوع پسند ہے اور عورت یکسو۔ مرد میں وسعت اور توسیع پسندی ہے، اور عورت میں مرکزیت اور ارتکاز۔ مرد ایک وقت میں کئی عورتوں سے محبت کر سکتا ہے، جبکہ عورت ایک وقت میں دو مردوں سے محبت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

نور بانو کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن ارجمند نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

"نہیں آپی..... ! یہ نہیں کہئے گا کہ یہی تو خرابی ہے کیونکہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے۔ اور اسی کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ نے قانون بنائے ہیں۔ عام طور پر عورت کی پہلی محبت آخری ہوتی ہے، اس کی پسند نہیں بدلتی۔ جبکہ مرد کی پسند بدلتی رہتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ متضاد چیزیں پسند کرتا ہے۔ اور ہاتھ بڑھا لینا اور حاصل کر لینا بھی اس کی فطرت ہے۔" ارجمند نے ایک گہری سانس لی اور پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

"اللہ کے ہر حکم میں اور اس کے ایک ایک لفظ میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ ہم انہیں سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس کی مرضی ہو تو اس کی کوئی حکمت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس چار شادیوں کی اجازت میں بھی بے شمار مصلحتیں ہوں گی۔ لیکن ان میں سے ایک اللہ کے فضل سے میری سمجھ میں آ گئی۔ اس میں مردوں کے لئے گناہ سے بچنے کا سامان ہے۔"

"تو عورتوں کے لئے کیوں نہیں.....؟" نور بانو نے پھر اعتراض داغا۔

"عورت کے لئے یہ غیر فطری ہوتا۔" ارجمند نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"عورت ایک وقت میں دو مردوں سے محبت بھی نہیں کر سکتی، ایک سے

زیادہ شوہر رکھنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

"لیکن ارجی..... ! ایسی بھی عورتیں ہوتی ہیں جو....."

ارجمند نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی۔

"وہ شیطان کے زیر اثر خلاف فطرت زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔"

"یہ فطری اور غیر فطری کا یقین کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

"میں تو گناہ کو غیر فطری سمجھتی ہوں آپی..... ! اگرچہ ہوتا وہ آدمی کی فطرت میں ہی ہے۔ لیکن شاید آزمائش کے لئے رکھا گیا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پھر آدمی گناہ کا عادی ہو جائے تو وہ غیر فطری گناہ کرتے ہوئے بھی نہیں ہچکچاتا۔ اب اس کی تشریح کے لئے مجھ سے نہ کہئے گا آپی..... ! میں کر سکتی ہوں، لیکن کروں گی نہیں، بہتی سی باتیں زبان پر لانا بھی مناسب نہیں ہوتا۔ اس پر آپ خود سوچ سکتی ہیں۔"

نور بانو نہ چاہتے ہوئے بھی قائل ہو گی۔

"یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"ہاں..... ! میرے پاس ایک دلیل ہے۔ دنیا کے کسی مذہب نے، خواہ وہ مشرکوں کا ہو، عورت کا ایک وقت میں دو شوہر رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ کسی سیکولر معاشرے میں بھی، جو مہذب ہو، ایسا نہیں ہوتا۔"

"لیکن مرد کو دو بیویاں رکھنے کی اجازت بھی نہیں دی۔" نور بانو نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو وہ معاشرے مردوں کو گناہوں سے دور بھی نہیں رکھ سکے۔ لادینی معاشروں میں مرد اور عورت شادی کے بغیر بھی ساتھ رہتے ہیں، لیکن انداز ان کا شوہر اور بیوی والا ہی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس میں خیر اور برکت نہیں ہوتی۔ شادی مہذب مذہبی معاشروں کا سب سے اہم ادارہ ہوتا ہے۔ معاشرے اس پر قائم ہوتے ہیں۔ یہ حرام اور حلال کی بنیاد ہے۔ اب میں آپ سے ایک بات پوچھوں آپی..... ! اگر اللہ عورت کو بیک وقت ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دے دے تو کیا آپ دوسری شادی کر لیں گی.....؟"

نور بانو نے جھرجھری سی لی۔

''کیا بیہودہ بات کی ہے تم نے ... ہرگز نہیں ... ! یہ تو ممکن ہی نہیں ... !''

''دیکھ لیں ... ! یہ ہے فطرت ... !'' ارجمند نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''ہر عورت کا یہی جواب ہوگا۔ آپ نے یہی کہا تھا نا کہ اللہ نے عورتوں کو چار شادیوں کی اجازت کیوں نہیں دی ..... ؟ یہ کیسی برابری ہے۔ اب آپ نے خود ہی اپنے اعتراض کو مسترد کر دیا۔''

نور بانو کھسیا گئی۔

''وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''

ارجمند کے دماغ میں روشنی کا ایک اور جھماکا سا ہوا۔

''ابھی ابھی ایک اور بات میری سمجھ میں آئی ہے آپی ... !''

''نہیں .....! اس بات کو بھول جاؤ ارجی ... !'' نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔

''یہ بات میں نے جہالت میں کہہ دی تھی۔ میں توبہ کرتی ہوں اس پر۔ دراصل میں اس پر جھنجلاتی ہوں کہ مردوں کو چار شادیوں کی اجازت ملی تو عورت کو اس سلسلے میں حسد کیوں ملا؟ میں اپنے شوہر کو کیوں کسی دوسری عورت کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی۔''

''ایسی بات کیوں کرتی ہیں ..... ؟'' ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ نے تو خود آغا جی کی دوسری شادی کرائی ہے۔''

اب نور بانو یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ مجبوری تھی، ورنہ وہ حسد تو اس سے بھی کرتی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہاری بات اور ہے۔ ورنہ میں تو عبدالحق صاحب پر کسی دوسری عورت کا سایہ بھی برداشت نہ کرتی۔ اب یہ حسد تو فطری ہے نا ... !''

''حسد کبھی فطری نہیں ہوتا آپی .....! یہ تو ایک دوسرے سے لگنے والی بیماری ہے۔ اسلامی معاشرے میں بیوی اس پر کبھی اعتراض نہیں کر سکتی کہ اس کا

شوہر دوسری، تیسری یا چوتھی شادی کرے۔ ہم نے تو یہ سب کچھ ہندو عورتوں سے سیکھا ہے۔''

''یہ بتاؤ ... ! ایسا اسلامی معاشرہ ہے کہاں ... ؟'' نور بانو کے لہجے میں طنز تھا۔

''میرے خیال میں تمام عرب ممالک میں ایسا ہی ہے۔ اور سعودی عرب میں تو ہے ہی۔ وہاں لفظ سوکن استعمال ہی نہیں ہوتا۔ ہر بیوی اپنے شوہر پر اس کی دوسری بیویوں کے حق کو تسلیم کرتی ہے۔ کتنے ہی گھر ایسے ہیں، جہاں ایک سے زیادہ بیویاں ساتھ ہی رہتی ہیں۔ بچے بھی اپنے باپ کی ہر بیوی کو ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ وہاں سوتیلی ماں بھی نہیں ہوتی۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ..... ؟''

''عربی لٹریچر پڑھتی رہی ہوں میں۔ اسلامی معاشرے میں اللہ کے حکم سے اختلاف کون کر سکتا ہے ..... ؟ یہ تو بغاوت ہے آپی ... !''

نور بانو نے پھر جھرجھری لی۔

''ٹھیک ہے ارجی.....! شکریہ.....! بات میری سمجھ میں آگئی۔ اب میں اللہ سے توبہ کروں گی اس پر۔''

''اللہ کا شکر ہے آپی .....!'' ارجمند کھل کے مسکرائی۔ وہ بہت خوش تھی۔

''میں تمہاری شکر گزار ہوں۔ تم نے بہت اچھی طرح سمجھایا ہے مجھے۔ ورنہ یہ باتیں تو میں کسی سے کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔''

''میرا کوئی کمال نہیں آپی.....! یہ اللہ نے رحمت کی ہے آپ پر.....!'' ارجمند نے عاجزی سے کہا۔

''تم بہت اچھی ہو ارجی.....!''

''اگر یہ سچ ہے تو یہ بھی اللہ کا فضل ہے، الحمدللہ .....!'' ارجمند نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اب میں آپ کے لئے پھل لاتی ہوں۔ کچھ کھالیں، کتنی کمزور ہوگئی ہیں آپ.....!''

وہ چلی گئی اور نور بانو اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ اس گفتگو کے مکمل ہونے پر بہت پہلے ہی دروازے کے پاس سے ہٹ چلی تھی۔

یہ محض اتفاق تھا کہ دروازے کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک بات اس کے کان میں پڑی، اور وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔
اس وقت نور بانو اپنے شوہر سے فون پر بات کر رہی تھی۔

اس گفتگو کو سنتے ہوئے رشیدہ پر سب کچھ عیاں ہو گیا۔ ہر عقدہ کھل گیا۔
کچھ کچھ تو وہ پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ مگر اب تو پوری کہانی سامنے آ گئی۔

اور وہ سنتے ہوئے اسے حیرت ہوئی۔ وہ کیسا شخص ہوگا جو واجبی شکل و صورت کی اس عام سی عورت سے اتنی محبت کرتا ہوگا کہ اولاد سے محروم ہونے کے باوجود دوسری شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ اور پھر اس کی بیوی نے اصرار کر کے اس کی شادی اس لڑکی سے کرا دی جو کم عمر بھی ہے اور بے حد حسین بھی۔ لیکن وہ شادی کے بعد بھی اس لڑکی کو نظر انداز کرتا ہے، اسے وہ محبت نہیں دیتا، جس کی یہ حقدار ہے۔

رشیدہ کوئی نادان عورت نہیں تھی۔ وہ بہت سمجھدار، بلکہ چالاک تھی۔ چند منٹ کی گفتگو میں سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ خود کو بہت تیز و طرار سمجھتی تھی۔ لیکن اسے تسلیم کرنا پڑا کہ نور بانو کے سامنے وہ طفل مکتب ہے۔ اپنی مقصد برآری کے لئے نور بانو نے جو کچھ سوچا، وہ سوچنا بھی آسان نہیں تھا۔ کجا یہ کہ اس پر عمل کرنا۔

اور اس نے مان لیا کہ خود غرضی میں بھی نور بانو اس سے بہت آگے ہے۔
جو نہیں کہا گیا تھا، رشیدہ نے وہ بھی سمجھ لیا تھا۔ اس عورت نور بانو نے کیسا کھیل کھیلا تھا۔ جب اس نے سمجھ لیا کہ اب اس کے شوہر کی دوسری شادی ہو کر رہے گی تو اس نے اس معصوم لڑکی کو آلۂ کار بنا لیا، جو اس سے بہت محبت کرتی ہے۔ ایک اجنبی عورت کے مقابلے میں تو یہ بہت بہتر تھا، کیونکہ یہ لڑکی اس کی کوئی بات

ٹال ہی نہیں سکتی۔

اور پھر فائدے کا یہ اک رخ ہی نہیں تھا۔ لڑکی اس کے لئے وہ ایثار کر رہی تھی، جو دنیا میں کوئی کسی کے لئے نہیں کرتا۔ یعنی بچہ اس کا ہوتا اور ماں نور بانو بنے گی۔

رشیدہ سمجھ سکتی تھی کہ کم عمر اور معصوم لڑکی ہامی بھرتے ہوئے یہ سمجھ ہی نہیں سکی ہوگی کہ اس کھیل میں کتنی دشواریاں ہیں۔ یہ کھیل کھیلنا تقریباً ناممکن ہے۔ ہاں! اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ رہی ہوگی۔

رشیدہ کے لئے یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ نور بانو نے یہ کھیل کیسے ترتیب دیا ہوگا۔ یہ اس نے کیسے ممکن بنایا کہ ساس اور شوہر کو چھوڑ کر، اور ارجمند کو ساتھ لے کر وہ یہاں اتنی دور آ گئی، جہاں بچے کے معاملے میں رازداری کا اہتمام کرنا اس کے لئے ممکن ہو گیا۔ کیسے اس نے شوہر کو اور اپنی ساس کو یہاں آنے سے روک رکھا ہے۔ یہ سب کیسے کیا اس نے؟

رشیدہ دروازے کے پاس اس وقت آئی، جب نور بانو اپنے شوہر سے بات کر رہی تھی، اور اس نے کہا تھا... اب آنے کا ارادہ نہ کر لیجئے گا... اور یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں کیسا خوف تھا۔ اس کی یہ بات سن کر ہی رشیدہ وہاں رک گئی تھی۔

بات تھی بھی خوف کی۔ شوہر یہاں آ جائے تو پول کھل جائے گی۔ بے عزتی الگ، محبت سے محرومی الگ۔ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے اس عورت نے صرف ایک بچے کے لئے۔

لیکن رشیدہ کو ماننا پڑا کہ قسمت بھی نور بانو کا ساتھ دے رہی ہے۔ فون پر گفتگو سے پتا چلا کہ اس کی ساس آنے والی تھی۔ لیکن اچانک وہ بہت بیمار ہو گئی ہے، اور نہیں آ سکے گی۔

قسمت ساتھ نہ دے تو یہ کھیل دھرا رہ جائے۔ رشیدہ نے سوچا تھا۔
پھر نور بانو اور ارجمند کے درمیان جو گفتگو ہوئی، رشیدہ نے وہ بھی سنی۔
جب چار شادیوں والی بات چلی، تبھی وہ وہاں سے ٹلی۔

اور اس گفتگو نے اس پر سب کچھ کھول دیا۔

جو کچھ اس نے سنا، اس نے رشیدہ جیسی ورعت کو بھی خوفزدہ کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ اب وہ نور بانو سے خوفزدہ تھی۔ اس نے سوچا، یہ عورت کچھ بھی کر سکتی ہے۔ یہ جس کی دشمن ہو جائے، اسے مٹا ڈالے گی۔ اور دوست یہ کسی کی بھی نہیں۔ جو عورت محض خوب صورتی کی بنا پر اپنی سگی بہنوں سے حسد کر سکتی ہے، وہ کسی کو نہیں بخشے گی۔ بظاہر تو وہ ارجمند کو اپنی سگی بہن جیسا سمجھتی تھی اور اسے اتنا چاہتی تھی کہ اپنے شوہر میں اسے شریک کر لیا۔ لیکن رشیدہ کو یقین تھا کہ سب صرف دکھاوا ہے۔ وہ یقین سے کہہ سکتی تھی کہ نور بانو کسی سے بھی محبت کرنے والی نہیں۔ محبت اس کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔ ارجمند کو وہ بس استعمال کر رہی ہے..... اور کس بری طرح استعمال کر رہی ہے۔

اتنی سی دیر میں رشیدہ کو لگتا تھا کہ اس نے نور بانو کو پوری طرح جان اور سمجھ لیا ہے۔ یہ عورت اپنے شوہر میں کسی کو شریک کرنے والی نہیں۔ ارجمند کو بظاہر شریک کیا تو اپنی غرض کے لئے..... اور وہ بھی ایک غرض نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک بات میں کئی فائدے حاصل کرنا جانتی ہے۔

ارجمند کی اپنے شوہر سے شادی کرا کے ایک طرف تو اس نے خود کو صحیح معنوں میں سوکن سے محفوظ کر لیا۔ اگر دوسری شادی اس کی ساس کراتی تو بھی آنے والی یقیناً نور بانو سے کم عمر اور زیادہ حسین ہوتی۔ اور وہ اس کے اختیار میں نہ ہوتی۔ وہ اس سے دبتی نہیں۔ بلکہ ذرا بھی تیز ہوتی تو اس کے شوہر کو بآسانی اس سے چھین لیتی۔ جبکہ ارجمند بہت کم عمر اور بہت زیادہ حسین ہونے کے باوجود پوری طرح اس کی مطیع تھی۔ اس سے اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اور دوسرا فائدہ اور بڑا تھا، جو اسے حاصل ہونے والا تھا۔ بچہ، جو اس کا نہیں تھا، لیکن اس کا کہلاتا، اسے عزت دلاتا۔

رشیدہ کو یقین ہو گیا کہ بچہ مل جانے کے بعد نور بانو چند روز کے لئے بھی اپنے شوہر میں ارجمند کی شراکت برداشت نہیں کرے گی۔ تب ارجمند اسے محض ایک کانٹا لگے گی، اور وہ اس کانٹے کو جلد از جلد اپنے شوہر کی زندگی سے نکال دے گی۔

رشیدہ کو جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے اتنی متضاد شخصیتوں کو پہلے کبھی یکجا نہیں دیکھا تھا۔ نور بانو چالاک اور مطلبی تھی، اتنی پست کہ رشیدہ نے ایسی پستی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اور ارجمند بے غرض، مخلص اور معصوم، اور اتنی بلند کہ رشیدہ کو وہ بلندی ناقابل یقین اور افسانوی لگتی تھی۔ رشیدہ جہاں دیدہ عورت تھی۔ لیکن وہ کہہ سکتی تھی کہ نہ ایسی بلندی اس نے پہلے کبھی دیکھی اور نہ ہی ایسی پستی۔ اور لطف یہ کہ یہ دونوں انتہائیں ایک شوہر کے گھر میں یکجا تھیں۔ اور ان کے درمیان یکطرفہ ہی سہی، بہرحال محبت کا رشتہ بھی تھا۔

رشیدہ جتنی نور بانو سے خوفزدہ ہوئی، اتنا ہی اسے ارجمند پر ترس آیا۔ اس نے پہلے کبھی ارجمند کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے لئے وہ محض ایک کیس تھی۔ اور اسے شروع ہی سے احساس تھا کہ ارجمند اسے ناپسند کرتی ہے۔ مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس کا تو واسطہ نور بانو سے تھا۔ لیکن جس دن ارجمند نے اسے جھڑکا اور اس کی حیثیت اسے یاد دلائی تو اسے احساس ہوا کہ یہ سیدھی سادی، کم عمر لڑکی روحانی طور پر بہت مضبوط ہے۔ وہ نہ جھوٹ بولتی ہے اور نہ کسی سے دبتی ہے۔ اس دن اس کی ڈانٹ کھا کر اس نے اسے اپنے لئے خطرناک سمجھ لیا اور اس کی اہمیت بھی سمجھ لی۔ یہ بات البتہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ نور بانو کے لئے اتنی بڑی قربانی کیوں دے رہی ہے؟ اس نے اس بات کو اپنی ہی روشنی میں دیکھا۔ اس نے یہی سمجھا کہ اس کی طرح نور بانو نے ارجمند کو بھی کوئی بڑا لالچ دیا ہوگا۔ ہر شخص کی اپنی ایک قیمت ہوتی ہے۔ اس کی کم تھی، ارجمند کی زیادہ ہوگی، اور بس۔

مگر اب سب کچھ جاننے کے بعد اسے اس پر ترس آ رہا تھا۔ بے چاری لڑکی.....! اسے کچھ بھی تو نہیں ملے گا محرومی کے سوا۔ اپنے بچے سے بھی محروم، اور اس کے بعد شوہر سے بھی محروم۔

اسے اس میں ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ارجمند کے ساتھ یہی ہوگا۔ جو عورت اتنی بڑی ان ہونی کو ممکن بنا سکتی ہے، اس کے لئے اپنی راہ کی رکاوٹ دور کرنا تو بہت معمولی سی بات ہوگی۔ بچہ کوئی چاند تو نہیں ہوتا کہ ہر آنگن میں نظر آ جائے۔ وہ تو جاں ہوتا ہے، وہیں نظر آتا ہے اور جہاں نہیں ہوتا، وہ کوئی اس کا

گمان بھی نہیں کر سکتا۔ مگر اس عیار عورت نے تو کمال کر دکھایا ہے۔ اس نے تو چڑھتے چاند کو ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل کر کے اپنے آنگن میں دکھا دیا۔

رشیدہ کو نور بانو سے صرف خوف نہیں آیا، اسے بہت شدید کراہت بھی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ ایک بہت بڑے گناہ میں شریک ہوگئی ہے۔ ارجمند کو وہ سمجھا نہیں سکتی تھی۔ وہاں سے سوائے ڈانٹ کے کچھ نہیں ملتا اسے۔ پھر وہ ضرورت مند تھی، اور اس کی ضرورت بہت بڑی تھی۔ ورنہ وہ اسی وقت وہاں سے رخصت ہو جاتی۔ ایک لمحے کو تو اس کا دل یہی چاہا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہاں اتنا وقت وہ لگا چکی ہے، وہ ضائع ہوگا۔ اور اب محض تین مہینوں ہی کی تو بات ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں اس کا کیا قصور؟ یہ تو یوں ہی ہونا تھا۔ وہ نہ ہوتی تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ یہ معاملہ تو نہیں رکتا۔ اب کم از کم وہ اپنی زمین تو واگزار کرا سکے گی۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ، لیکن ایک عجیب بات ہوئی۔ رشیدہ کو نور بانو مکروہ لگنے لگی، لیکن ارجمند سے اسے محبت ہوگئی ..... بے غرض محبت .....! اگرچہ وہ اس کے لئے کر کچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر محبت کا کیا، وہ تو بس ہو جاتی ہے۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق کو کراچی واپس آئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔

اماں کی حالت کافی بہتر ہونے پر وہ اسلام آباد واپس گیا تو اس کے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اماں کے صحت یاب ہونے تک ان کے پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں وہ اپنے سر کوئی الزام لے کر مسعود صاحب کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ جس طرح چھٹی منظور کرائے بغیر وہ لاہور آیا ہے، اس کے خلاف ڈسپلنری ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کے سامنے استعفیٰ کا راستہ کھلا تھا۔ ویسے بھی منسٹر صاحب کے مخاصمانہ رویے کے بعد وہ ملازمت چھوڑ دینے کو ہی بہتر سمجھتا تھا۔

لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

وہ اسلام آباد پہنچا تو دوبارہ کسٹمز میں تبادلے کا لیٹر اس کا منتظر تھا۔

اس نے مسعود صاحب کو فون کیا۔

''آپ نے زبردستی معاملات کو جاری رکھنے کی کوشش کی ہے چچا جان .....!'' اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں بیٹے .....! تم معاملات کو زبردستی ختم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو مناسب نہیں تھا۔''

''مگر یہ سب کچھ ہوا کیسے .....؟''

''کلکٹر آف کسٹمز کا تو بس چلتا تو وہ پہلے ہی تمہارا ٹرانسفر نہ ہونے دیتے۔ میں نے بس اتنا کیا کہ انہیں صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ وہ تو بے تاب ہو رہے تھے تمہیں دوبارہ پانے کے لئے۔''

''چلیں .....! ٹھیک ہے.....!''

''تم فوراً ہی کراچی چلے جاؤ.....!''

''جی چچا جان .....!''

اور کراچی پہنچ کر مسعود صاحب کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ کلکٹر صاحب نے اس کا ایسا پرتپاک خیر مقدم کیا، جیسے وہ ان کا برسوں کا بچھڑا ہوا بھائی ہو۔

''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہیں کتنا مس کر رہا تھا عبدالحق .....!'' انہوں نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''مس تو میں بھی آپ کو کرتا رہا ہوں جناب .....!''

''مگر دیکھ لو..... میں نے تمہیں کھینچ کر بلایا ہی لیا نا.....!''

''میں شکر گزار ہوں جناب .....!'' عبدالحق نے کہا۔

کلکٹر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔''

''کیوں جناب.....!''

''تم نے مجھے فون پر کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی۔ میں مسعود صاحب کا شکر گزار ہوں۔ وہ مجھے فون نہ کرتے تو .....'' کلکٹر صاحب کہتے کہتے رک گئے۔ چند لمحے وہ اسے بغور دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"سچ بتاؤ ...! اگر میں نے مداخلت نہ کی ہوتی تو تم کیا کرتے ...؟"

"میرے کچھ کرنے نہ کرنے کا انحصار تو میرے خلاف محکمے کی کارروائی پر ہوتا جناب ...!"

"وہ تمہارے خلاف کارروائی کرتے تو تم کیا کرتے ...؟"

"میں استعفیٰ دے دیتا۔"

"مجھے بھی یہی یقین تھا۔" کلکٹر صاحب نے کہا۔ پھر پوچھا۔

"اور تم اس میں خوش رہتے ...؟"

"جی ہاں جناب ...! دراصل میں اماں کو اس حالت میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو لاہور سے ہی استعفیٰ ارسال کر دیتا۔ لیکن مسعود صاحب کی وجہ سے ایسا نہیں کیا۔"

"وہ بھی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ اور میں بھی تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ خیر ... یہ بتاؤ ...! اب تمہاری اماں کا کیا حال ہے ...؟"

"بہتر ہیں۔ لیکن پوری سرح سنبھلنے میں بہت وقت لگے گا۔"

"میرے پاس تمہارے لئے ایک آفر ہے۔" کلکٹر صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہر ہفتے تم لاہور چلے جایا کرو اور منگل کو آفس آ جایا کرو۔ میری طرف سے پیر کی چھٹی۔ اس طرح تمہیں اپنی اماں سے دور ہونے کا احساس نہیں ہوگا۔ وہ بھی خوش رہیں گی۔ میرا خیال ہے کہ پلین سے آنا جانا تم افورڈ کر سکتے ہو۔"

"یہ تو مسئلہ نہیں ... لیکن ہر پیر کو چھٹی ...؟"

"ویسے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں کہ تم رعایت لینے والے نہیں۔ اس لئے تم مجھے ایک درخواست لکھ دو۔ میں اس کی منظوری دے دوں گا۔ تم پر کوئی بوجھ بھی نہیں ہوگا۔"

"بہت شکریہ جناب ...!"

"بس تو پہلی فرصت میں یہ درخواست مجھے بھجوا دو۔"

عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

تب سے اب تک وہ تین بار لاہور جا چکا تھا۔ وہ شکر گزار تھا کہ کلکٹر صاحب نے اتنی بڑی رعایت اسے دی۔ یہ حقیقت تھی کہ اس طرح سے اسے بھی اور اماں کو بھی، ایک دوسرے سے دور ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

پچھلی بار جو تبادلہ ہوا تو وہ یعقوب کو یہیں چھوڑ گیا تھا۔ فائدہ تو ساتھ لے جانے میں ہی تھا۔ لیکن یعقوب کی بیوی اور اس کے بچوں کی وجہ سے اسے یہ اچھا نہیں لگا۔ مگر اب وہ فیصلہ اس کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا تھا۔ گھر صاف ستھری حالت میں موجود تھا۔

عبدالحق نے اسے دیکھا تو بولا۔

"تم موٹے ہو گئے ہو مسٹر جیکب ...!"

"کرنے کو کچھ ڈیوٹی نہیں سر ...! بس بیٹھتا ہوں، کھاتا ہوں اور آرام کرتا ہوں۔ فیٹ تو ہونا ہی تھا۔"

"تو خالی بیٹھنے کے بجائے کوئی کام دھندا شروع کر دیتے۔"

"کیسے کر سکتا ہوں سر ...!" اس کے جواب نے عبدالحق کو حیران کر دیا۔

"کیوں بھئی ...!"

"آپ کا سرونٹ ہوں، سیلری آپ سے لیتا ہوں، تو کوئی دوسرا کام کیسے کر سکتا ہوں ...؟"

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ اس نے یعقوب کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا تھا۔ لیکن اس ایماندار جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا۔

"بالکل درست سوچا آپ نے مسٹر جیکب ...!" اس نے کہا۔

"لیکن یہ بتائیں کہ یہ بات آپ نے سیکھی کہاں سے ...؟"

"ہر اچھی بات کی طرح انگریز سے ہی سیکھی ہے یور ہائی نس ...!"

نہ جانے کیوں اس بار عبدالحق کو غصہ آ گیا۔

"بہت بری بات ہے یعقوب ...! یہ بات تو ہمیں ہمارا دین سکھاتا ہے۔ تمہاری بدنصیبی کہ تمہیں یہ بات انگریزوں سے سیکھنا نصیب ہوا۔"

یعقوب کچھ سہم گیا۔ عبدالحق نے پہلے کبھی اس سے ایسے لہجے میں بات

نہیں کی تھی۔

''سوری سر.....! میں نے آپ کو اینگری کر دیا۔'' اس نے کہا۔

''لیکن سر.....! آپ اپنے کلرکوں کو دیکھیں۔ سرکار سے سیلری لیتے ہیں تو پھر شام کو پارٹی والوں کے دفتر جا کر منتھلی کیوں لیتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ ان کا کام جلدی کر دیتے ہیں۔ وہ تو ایک وقت میں تھرڈ فورتھ نوکریاں کرتے ہیں۔ انہیں دین یہ اچھی بات کیوں نہیں سکھاتا.....؟''

عبدالحق جانتا تھا کہ پارٹی والوں سے مراد کلیئرنگ ایجنٹ ہیں، اور کچھ کلیئرنگ ایجنسیاں ہر کام پر رشوت دینے کے بجائے ماہانہ رشوت مقرر کر دیتے ہیں، جو منتھلی کہلاتی ہے۔

''یہ دین کا نہیں، ان کا اپنا قصور ہے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''اور یہ بھی سن لیں کہ یہ سب کچھ بھی انہیں آپ کا انگریز ہی سکھا کر گیا ہے۔''

''کیسے سر.....!''

''جب کسی سرزمین پر مختلف طبقوں کے لئے مختلف قانون نافذ ہوتے ہیں، یا کسی طبقے کو قانون سے بالاتر قرار دے دیا جاتا ہے تو وہاں لوگ اپنے فائدے کے لئے خلاف قانون رعایت دینے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور رشوت فروغ پاتی ہے۔ مجھے یاد ہے، جب تم شروع میں میرے پاس آئے، اور پہلی بار پولیس والے نے چالان کے لئے گاڑی روکی تو تم کس طرح بھڑک گئے تھے۔ تمہارے خیال میں چالان تو بہت دور کی بات، اسے ہماری گاڑی کو روکنے کا حق بھی نہیں تھا۔ کیا یہ بے اصولی اور بے ایمانی نہیں؟ اور یہ تم نے سیکھی کہاں سے؟ اپنے اس انگریز سے، جس پر عام لوگوں کا قانون لاگو نہیں تو یہ ڈھل مل قانون چھوڑ کر گیا ہے، جس سے برائی پر مائل لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔'' عبدالحق نے ایک گہری سانس لی، پھر سلسلہ کلام جوڑا۔

''اور میں نے تمہاری اس اچھائی پر تمہیں داد دی، جو بدقسمتی سے تم نے انگریزوں سے سیکھی۔ اب میں اس برائی پر تمہیں داد دیتا ہوں، جو تم نے انگریز سے

نہیں سیکھی۔ تم کسی انگریز کے سامنے اتنی جرح کر سکتے تھے؟''

یعقوب کا چہرہ سپید پڑ گیا۔

''اب آپ مجھے نکال دیں گے.....؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔

عبدالحق کا غصہ ہوا ہو گیا۔ وہ مسکرایا۔

''میں انگریز ہوتا تو تمہیں شوٹ بھی کر سکتا تھا۔'' اس نے نرم لہجے میں کہا۔

''لیکن میں مسلمان ہوں۔ تم میرے ملازم ضرور ہو۔ لیکن مجھے غلطی کرتے دیکھو تو مجھے ٹوکنے کا حق رکھتے ہو۔ یہ ہمارا دین سکھاتا ہے۔ ہمارے دین کے ایسے بڑے لوگ تھے، جو حاکمِ وقت تھے، مگر ان سے ایک عام آدمی بھرے مجمع میں یہ پوچھ لیتا تھا کہ آپ نے یہ کرتا کیسے بنا لیا، اتنا کپڑا تو نہیں ملا تھا آپ کو..... تو انہوں نے برا مانے بغیر عاجزی کے ساتھ اس کی وضاحت کی، ایک عام آدمی کے سامنے صفائی پیش کی۔ اب اس سے ہم کچھ نہ سیکھیں تو یہ ہمارا قصور ہے یا انگریزوں کا کمال۔''

یعقوب دم بخود تھا۔ چند لمحے تو خاموشی رہی۔ پھر اس نے حیرت سے کہا۔

''سر جی.....! واقعی ایسے لوگ تھے ہمارے ہاں.....؟'' پھر اس کے لہجے میں ندامت در آئی۔

''یہ تو سچ ہے سر جی.....! ہم کالے لوگ تو انگریز کو غلط بات پر بھی نہیں ٹوک سکتے تھے۔ پر یہ بات اب تک میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی؟''

''بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ نہیں سمجھ پائے، تمہارا کیا قصور ہے.....؟'' عبدالحق نے کہا۔

''یہ وہ لوگ ہیں، جو انگریزوں سے مرعوب ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنہیں اپنے دین کی کچھ خبر نہیں۔ انہیں نہیں معلوم کہ وہ اللہ کے احکامات پر عمل کریں تو دنیا میں ان سے اچھا کوئی نہیں ہو سکتا۔''

''سر جی.....! آپ نے پہلے کیوں نہیں ٹوکا مجھے.....؟'' یعقوب کی آواز

رندھ گئی۔

''میں تو اب بھی شرمندہ ہوں تمہیں ٹوک کر۔ میں تو تم سے معذرت کر رہا ہوں کہ میں نے تم سے اتنے سخت لہجے میں بات کیوں کی .....؟''

یعقوب نے ایک دم جھک کر عبدالحق کے پاؤں پکڑ لئے۔

''ایسے نہ کہیں صاب جی .....! آج تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اب تک اندھیرے میں رہا ہوں۔''

''یہ اللہ کی مہربانی ہے تم پر .....!''

''پر صاب جی .....! آپ نے پہلے کیوں نہیں سمجھایا مجھے .....؟''

''میں سمجھاتا تو تمہاری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔'' عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

''دیکھو نا .....! تم میرے ملازمہ ہو۔ اور آدھی زندگی تم نے انگریزوں کی ملازمت کی ہے۔ ان سے تم نے یہ سیکھا کہ جو وہ کہیں، مان لو، خواہ غلط ہو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ تم مجھ سے بحث نہ کرتے۔ لیکن میری بات کو دل سے قبول بھی نہ کرتے۔ تو فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوتا تمہیں۔''

''تو سر جی .....! اب مجھے بتائیں، دین کیا ہے .....؟''

''اللہ کو ماننا، اس کے ہر حکم پر عمل کرنا، اور اسے جاننا۔''

''ماں نے بچپن میں کلمہ سکھایا تھا سر جی .....! مجھے تو بس وہی آتا ہے۔''

''وہی تو بنیاد ہے۔'' عبدالحق نے کہا۔

''لیکن پڑھنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یوں تو طوطا بھی کلمہ رٹ لیتا ہے۔ مطلب بھی معلوم ہے اس کا .....؟''

''نہیں سر جی .....!'' یعقوب نے شرمندگی سے کہا اور سر جھکا لیا۔

''اچھا .....! تو کلمہ سناؤ مجھے۔''

یعقوب نے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت سنا دیا۔

''یہ جو دوسرا کلمہ سنایا ہے نا تم نے، یہ کلمہ شہادت ہے، اور شہادت کا مطلب ہے، گواہی .....''

یعقوب بہت غور سے اس کی بات سن رہا تھا۔

''اب سوچو .....! گواہی دیکھے اور جانے بغیر تو نہیں دی جا سکتی۔ آدمی کو معلوم تو ہو کہ وہ کس بات کی گواہی دے رہا ہے؟ جھوٹی گواہی تو دنیا میں بھی جرم ہے اور اللہ کے ہاں بھی۔''

یعقوب کے جسم میں واضح طور پر تھرتھراہٹ نظر آئی۔

''تو غور سے سنو .....! اب میں تمہیں کلمہ شہادت کا مطلب بتا رہا ہوں۔ اس کا مطلب ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ واحد ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

یعقوب کے ہونٹ ہل رہے تھے، جیسے وہ عبدالحق کے الفاظ دہرا رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''اب سر جی .....! مجھے نہیں پتا کہ اللہ نے کیا کیا حکم دیا ہے تو میں مانوں گا کیسے .....؟''

''اس کے لئے اللہ نے کتاب نازل فرمائی۔ قرآن پڑھو گے تو سب معلوم ہو جائے گا۔ قرآن پڑھا ہے تم نے .....؟''

''میں نے بتایا نا سر جی .....! کہ کلمے کے سوا کچھ بھی نہیں آتا مجھے۔''

یعقوب نے بے بسی سے کہا۔ پھر بڑی عاجزی سے بولا۔

''آپ مجھے قرآن پڑھا دیں گے سر جی .....!''

''اس سے کیسے انکار کر سکتا ہوں میں .....؟ تم نے کہا تو یہ فرض ہو گیا مجھ پر۔ کل صبح سے انشاء اللہ اس پر عمل کریں گے۔''

''ٹھیک ہے سر جی .....!''

''تو اب میرے کھانے کی فکر کرو مسٹر جیکب .....!''

''نہیں سر .....! اب مجھے ایسے نہ پکاریں۔ میرے ماں باپ کا دیا ہوا اچھا نام انگریزوں نے بگاڑا، اور میں نے ان کو خوش کرنے کے لئے اسے قبول کر لیا۔ وہ میری جہالت تھی سر .....! اب میں یعقوب ہوں۔''

عبدالحق کو حیرت ہوئی۔ یعقوب برسوں سے اس کے ساتھ تھا، اور یہ بگاڑ اس سے بھی بہت پہلے کا تھا۔ ایک لمحے میں ..... صرف ایک لمحے میں وہ سب کچھ کیسے بدل گیا ..... ؟ یہ کیسے ممکن ہوا..... ؟ شاید صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے پر..... !

پھر اس نے سر جھٹکا۔ سب بہانے ہیں۔ اصل بات تو اللہ کی طرف سے ملنے والی ہدایت کی ہے۔ وہ جب، جسے چاہے، ہدایت دے دے۔ وہ ہدایت نہ دے تو آدمی سمجھانے پر بھی ضد پکڑ لے، اور گمراہ ہو جائے۔ اسی خوف سے تو اس نے آج تک یعقوب کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس کی کراچی آمد سے عارف بھی بہت خوش تھا۔ اس نے عبدالحق سے گھر کے سب لوگوں کی خیریت دریافت کی۔

''اماں کو یرقان ہو گیا ہے۔ طبیعت تو اب بہت بہتر ہے۔ لیکن کمزور بہت ہو گئی ہیں۔'' عبدالحق نے بتایا۔

''ارجمند کیسی ہے.....؟'' عارف نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یہ سوچ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ اب وہ میری بھابی بن گئی ہے۔''

''ٹھیک ہی ہو گی۔'' عبدالحق کے لہجے میں پژمردگی تھی۔

''فون پر بات ہوئی تھی اس سے۔''

''فون پر.....؟'' عارف بری طرح چونکا۔

''کیوں بھئی ..... ! تم لاہور رہ کر آئے ہو اتنے دن۔''

پچھلی بار عبدالحق نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن اب بات منہ سے نکل گئی تھی، اور جھوٹ وہ بولتا نہیں تھا۔

''دراصل وہ ایبٹ آباد میں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''وہ کیوں بھئی.....! خیریت تو ہے.....؟''

اب اسے پوری بات بتانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

عارف نے درمیان میں اسے نہیں ٹوکا، لیکن اس کے چہرے پر گمبھیرتا چھا گئی تھی۔ عبدالحق کی بات مکمل ہونے کے بعد اس نے کہا۔

''میں ایسا کوئی حق تو نہیں رکھتا۔ لیکن میں نے ہمیشہ تمہیں چھوٹے بھائی کا درجہ دیا ہے۔ اجازت دو تو کچھ کہوں .....؟''

''کیسی بات کرتے ہیں عارف بھائی..... ! میں بھی آپ کو بڑا بھائی ہی سمجھتا ہوں۔''

''تو پھر مجھے سمجھاؤ..... ! یہ ایبٹ آباد کی منطق میرے حلق سے تو نہیں اتری۔ تم ایسے ضعیف الاعتقاد تو نہیں ہو۔''

''میں تو صرف نور بانو کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ ورنہ میں منت کا نہیں، شکر کا قائل ہوں۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟ بھابی کی دل جوئی کے لئے کیا تمہیں دوسروں کے ساتھ اور اپنے ساتھ زیادتی کا حق مل گیا ہے۔''

عبدالحق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں سمجھا نہیں عارف بھائی.....!''

''دیکھو نا.....! بھابی نے ایک منت مانی، تم نے ان کی خاطر اسے مان لیا۔ چلو..... یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ تم نے بھابی کو ایبٹ آباد بھیج دیا۔ کوئی حرج نہیں۔ لیکن ارجمند کو ان کے ساتھ بھجوانے کیا تک تھی.....؟''

''اب نور بانو کو اکیلے تو نہیں بھیج سکتا تھا میں۔'' عبدالحق نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو، جیسے تم نے بھابی کی دوسراہٹ کے لئے ارجمند کو ساتھ کر دیا۔ لیکن میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بھابی کی فرمائش ہو گی۔ تمہیں یہ خیال ہرگز نہیں آیا ہو گا۔ تم نے تو بس بھابی کی بات مان لی۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔ لیکن اس میں حرج ہی کیا ہے.....؟''

''بچوں کی سی بات کرتے ہو۔'' عارف کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

''زندگی کو سمجھتے ہی نہیں ہو کیا.....؟''

''آپ سمجھائیں نا.....!''

''بھئی.....! تمہاری ارجمند سے شادی کو مشکل سے تین ہفتے ہوئے ہوں

گئے کہ تم کراچی واپس آ گئے، اور اب تم بتا رہے ہو کہ تمہارے یہاں آتے ہی بھابی ارجمند کو لے کر ایبٹ آباد چلی گئیں۔ اب تم ایبٹ آباد جا نہیں سکتے کہ بھابی کی منت کا سوال ہے۔ تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ ارجمند کے ساتھ زیادتی ہے، بلکہ تمہارے ساتھ بھی۔"

"زیادتی کی کیا بات ہے عارف بھائی......! مجھے بھی اعتراض نہیں تھا اور ارجمند بھی اپنی خوشی سے گئی ہے۔"

"ارجمند تو تمہاری اور بھابی کی خوشی کے لئے گئی ہے۔ تمہاری خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ تمہاری ذمہ داری ہے عبدالحق......! وہ تو بس تمہاری خوشی کا خیال رکھے گی، اپنا نہیں، اس کا خیال تو تمہیں ہی رکھنا ہوگا۔"

"میں کیا کر سکتا تھا عارف بھائی......! میں مجبور ہو گیا۔" عبدالحق نے بے بسی سے کہا۔

"تم اپنے حق سے دست بردار ہو سکتے ہو۔ لیکن بھابی کی خوش نودی کے لئے ارجمند کو اس کے حق سے محروم کرنے کا تمہیں حق نہیں۔ تمہیں احساس نہیں کہ تم نے ارجمند کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔"

عبدالحق کا چہرہ فق ہو گیا۔

"میں نے تو اس انداز میں سوچا ہی نہیں تھا۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عارف بھائی......!"

"اور غور تو کرو، چھ ماہ سے تم غیر فطری زندگی گزار رہے ہو۔"

"اس سے تو میں اختلاف کروں گا عارف بھائی......! یہ تو بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں آپ......!"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں خود ایسی زندگی گزار رہا ہوں، اس لئے یہ بات جانتا ہوں۔" عارف نے اسے ترحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دو بیویاں ہیں تمہاری......! اور تم پھر بھی محروم ہو۔"

"یہ تو ایثار ہے عارف بھائی......!"

"نہیں......! یہ ایثار نہیں۔ یہ بے سبب خود کو فتنے میں ڈالنا ہے۔" عارف

نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم انسان ہو، فرشتہ تو نہیں ہو۔ سچائی کے ساتھ کہو کہ یہ دوریاں تمہارے لئے اذیت کا سبب نہیں بنیں۔"

عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا۔

"اذیت کے بعد آزمائش اور پھر فتنے کا مرحلہ آتا ہے۔ تم جانتے ہو عبدالحق! کہ اس کے نتیجے میں میں گناہ کی دلدل میں جا پھنسا تھا۔ اللہ نادرہ کی مغفرت فرمائے کہ اس کی وجہ سے میں اس دلدل سے نکل آیا۔ اللہ کی رحمت ہوئی مجھ پر۔" عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"چلو...... اپنے لئے تم نے محرومی منتخب کر لی، تمہاری مرضی......! لیکن ارجمند تو نئی نویلی دلہن تھی۔ اسے محروم کرنے کا تمہیں کوئی حق نہیں تھا۔ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس کے لئے تمہیں اللہ کو جواب دینا ہوگا۔"

عبدالحق کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔

"اور ارجمند کا کون ہے اس دنیا میں......؟ تم لوگ تو بعد میں ملے ہو اسے۔ اس سے پہلے نادرہ کے علاوہ بس اچھو میاں تھے، اور میں تھا۔ اب اچھو میاں تو یہاں نہیں ہیں۔ لیکن میں تو ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے، وہ میرے لئے بہن بھی ہے اور بیٹی بھی۔ میں اسے اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ زیادتی کرو گے تو میں تم سے ضرور باز پرس کروں گا۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں عارف بھائی......! مجھے معاف کر دیں۔"

"تم بھی تو میرے لئے بھائی ہو۔" عارف نے محبت سے کہا۔

"تم عقل مند بھی ہو اور اللہ سے ڈرنے والے بھی۔ پھر بھی تم اس غیر فطری پن کو نہیں سمجھ سکے۔ دیکھو نا، فطری تو یہ ہوتا کہ تم ارجمند کو کراچی ساتھ لاتے۔ بھابی اپنی منت پوری کرنے کے لئے بے شک ایبٹ آباد چلی جاتیں۔ وہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ انہوں نے خود تو غلط کیا ہی، لیکن تمہیں بھی گمراہ کر دیا۔ اور میرا خیال ہے کہ انہوں نے دانستہ ایسا کیا۔"

عبدالحق نے سر اٹھا کر حیرت سے عارف کو دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں میں

شکایت سی مچلی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''اس بات کا بہت قوی امکان ہے عارف بھائی......! کہ یہ آپ کی بدگمانی ہو۔ اور بدگمانی ہے،تو بہت بڑی ہے۔''

''تم برا نہ ماننے کا، میری بات پر غور کرنے کا وعدہ کرو تو کچھ کہوں...؟''

عبدالحق ہچکچایا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ بات بہت ناپسندیدگی ہوگی۔ اسے سننے سے بہتر ہے کہ بات یہیں روک دی جائے۔لیکن اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ عارف کی کہی ہوئی ہر بات اب تک درست ہے۔ اسے احساس ہوگیا تھا کہ اس نے ارجمند کے ساتھ بہت سنگین زیادتی کی ہے۔ وہ واقعی اس کے لئے اللہ کو جواب دہ ہے۔ اندر ہی اندر اس پر لرزہ طاری تھا۔

سو اس نے بہ تکلیف وہ فیصلہ کیا کہ سب کچھ سن لینا ہی بہتر ہے۔ اس سے کچھ راہنمائی ہی ملے گی۔

''کہیں عارف بھائی...! برا ماننے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میں ہر بات پر غور کرتا ہوں۔''

عارف نے ایک گہری سانس لی۔اور چند لمحے سوچتا رہا۔ جیسے کسی پیچیدہ بات کو ذہن میں مرتب کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا۔

''تم سادہ آدمی ہو عبدالحق......! محبت کرنے والے اور اچھا گمان رکھنے والے ہو۔مگر میں نے زندگی کے اور عورتوں کے اتنے روپ دیکھے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں بھابی نور بانو کے بارے میں جو کچھ کہوں گا، اس کا مقصد تمہارے اور ان کے درمیان تفرقہ ڈالنا نہیں ہے۔ میں تمہاری راہنمائی کے لئے یہ سب کہہ رہا ہوں۔ دو بیویوں کے درمیان انصاف کرنا آسان نہیں، اور اللہ معاف کرنے والا ہے۔لیکن بے انصافی سرزد ہوگئی تو سمجھ کر بڑا نقصان ہے۔ اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ ارجمند کے ساتھ بے انصافی ہوگی تو وہ شکایت بھی نہیں کرے گی۔ اور جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں، بھابی نور بانو تمہارے لئے اس سلسلے میں قدم قدم پر مشکل کھڑی کرتی رہیں گی۔''

عبدالحق کو یہ سننا بہت برا لگا۔لیکن اسیر محبت ہونے کے باوجود بات پر غور کر کے، تجزیہ کر کے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اس کی فطرت میں تھا۔ چنانچہ اس نے بہت حلیمی سے کہا۔

''اس آخری بات کی وضاحت کریں گے آپ...؟''

''ضرور......! عارف نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔

''عورت کو اللہ نے بڑی حیثیت اور مرتبہ عطا فرمایا ہے۔لیکن وہ بھی انسان ہیں۔ کچھ منفی چیزیں بھی ان کے مزاج میں ہوتی ہیں۔ سب عورتیں تو ایسی نہیں ہوتیں۔لیکن کچھ عورتیں مکار بھی ہوتی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو دیکھ کر یہ بات سمجھی ہے۔ وہ اپنی مرضی چلاتی ہے۔لیکن ایسے کہ کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ وہ جو ارادہ کر لے، اس پر بغیر کہے مجھ سے ہی عمل کراتی ہے۔ میں یہ بات جانتے ہوئے بھی اس کی مرضی پر چلتا ہوں۔ کیونکہ میرے سامنے کوئی اور راستہ نہیں ہوتا۔ وہ میری فطرت، میرے مزاج کو سمجھتی ہے، اور اس سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اس کا کھلونا ہوں،لیکن میں کچھ کرنہیں سکتا۔''

''لیکن نور بانو ایسی نہیں ہے عارف بھائی...!''

''یہ سچ ہے کہ میں انہیں نہیں جانتا۔ میں نے انہیں دیکھا بھی نہیں۔لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا، اس کی روشنی میں تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے تمہیں بھی استعمال کیا اور ارجمند کو بھی۔''

''کیسے......؟''

''دیکھو نا......! یہ بہت بڑی خوش خبری ہے کہ وہ ماں بننے والی ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے تم سے دور رہنے کی منت مانی، یہ بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔لیکن وہ ارجمند کو اپنے ساتھ لے گئیں، یہ بات عجیب سی ہے۔ انہیں تو ارجمند کو تمہارے ساتھ بھیج دینا چاہئے تھا، تاکہ تمہیں گھر کا آرام میسر رہے۔ تمہیں احساسِ تنہائی نہ ہو۔''

''آپ کے خیال میں نور بانو نے ایسا کیوں کیا...؟''

''اس پر تو تمہیں غور کرنا چاہئے۔''

"مجھے تو یہ بات اہم نہیں لگی۔ آپ مجھے بتائیے کہ آپ کیا سمجھتے ہیں؟ پھر میں اس پر غور کروں گا۔"

"میں تو حیران ہوں کہ تمہیں یہ بات غیر اہم لگی۔ بہرحال میرے خیال میں تو بات بالکل واضح ہے۔ بھابی نے یہ خطرہ مول نہیں لیا کہ وہ نو ماہ تم سے دور رہیں، اور ارجمند تمہارے ساتھ رہے۔ اس ڈر سے کہ تمہارا جھکاؤ اس کی طرف زیادہ نہ ہو جائے۔ اس خوف سے کہ کہیں تم ان سے دور نہ ہو جاؤ۔"

"مجھے اس سے اختلاف ہے عارف بھائی......! نور بانو جانتی ہے کہ میں اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔"

"اس یقین کے باوجود شک کرنا اور شوہر کو کھونے سے ڈرنا عورت کی فطرت ہوتی ہے۔"

"عارف بھائی...! میں تو دوسری شادی کبھی نہیں کرتا۔ نور بانو نے مجبور کر دیا، اور کچھ مجھے اماں کا بھی خیال تھا۔ مگر آپ خود سوچیں، یہی سب کچھ کرنا ہوتا تو نور بانو ارجمند سے خود میری شادی کیوں کراتی......؟ اور وہ نہ کراتی تو یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔"

"تم سادہ آدمی ہو۔" عارف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خود کو بھابی کی جگہ رکھ کر سوچو تو بات سمجھ میں آنے میں ذرا دیر بھی نہیں لگے گی۔"

عبدالحق نے چند لمحے غور کرنے کے بعد بے بسی سے کہا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا عارف بھائی......!"

"اور تم سے بہتر اس بات کو کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ تم بھابی کو جانتے ہو۔ میں نہیں جانتا۔" لیکن کوشش کر سکتا ہوں۔ مگر تمہاری مدد کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"میں حاضر ہوں......!"

"میرے سوالوں کے بے لاگ جواب دینے ہوں گے۔"

"آپ جانتے ہیں......"

"جانتا ہوں کہ جھوٹ تم نہیں بولتے۔" عارف نے اس کی بات کاٹ دی۔

"لیکن محبت میں آدمی کے لئے غیر جانبداری بہت مشکل ہو جاتی ہے۔"

"الحمدللہ......! مجھ پر اللہ کا کرم ہے۔ اس سے ڈرتا ہوں نا...... تو ہمیشہ حق بات کہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انسان ہوں، غلطی تو ہو جاتا ہے۔ لیکن دانستہ بے انصافی نہیں کر سکتا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ......! بھابی کی فطرت میں حسد ہے...... خاص طور پر تمہارے معاملے میں......؟"

"جی ہاں......! بہت زیادہ ہے۔" عبدالحق نے بے جھجک کہا۔

"قابضانہ فطرت بھی ہے......؟ تمہیں کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتی ہوں گی......؟"

عبدالحق کی آنکھوں میں شیر خوار ساجد کی صورت پھر گئی۔

"جی ہاں......! وہ ایسی ہی ہے۔"

"تو پھر وہ تمہاری دوسری شادی کیسے گوارہ کر سکتی تھیں......؟ اس پر یہ کہ انہوں نے خود تمہاری دوسری شادی کرائی۔ چلو...... کرا بھی دی تو کسی معمولی سی لڑکی سے کراتیں، جو ان سے کم تر ہوتی۔ مگر انہوں نے تو ارجمند سے تمہاری شادی کرائی، جو غیر معمولی طور پر حسین ہے۔"

"یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔"

"ایک بات اور بتاؤ......! تم اپنی اماں کے تو بہت فرمانبردار ہو گے......؟"

"الحمدللہ......! وہ تو میں ہوں۔"

"اور اماں کو پوتے کی آرزو بھی ہو گی......؟"

"بہت زیادہ ہے۔"

"تو انہوں نے کبھی تم سے دوسری شادی کے لئے نہیں کہا......؟"

"اصرار نہیں کیا کبھی، حکم نہیں دیا۔" عبدالحق نے کہا۔

"دراصل وہ نور بانو سے بہت محبت کرتی ہے۔ بیٹی کی طرح چاہتی ہے

اسے۔"

"اگر وہ حکم دیتیں تو تم انکار کر سکتے تھے ....؟"

"یہ کیسے ممکن ہے عارف بھائی .....!"

"اور یہ بات بھابی کو بھی معلوم ہے .....؟"

"ہاں .....! ایک بار بات ہوئی تھی اس سے۔" عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ان دنوں اماں پیروں فقیروں اور درگاہوں کے چکر کاٹ رہی تھیں پوتے کے لئے۔ نور بانو اس بات سے بہت چڑتی تھی۔ دو ایک بار ان سے الجھی بھی، مجھ سے بھی شکایت کی تو میں نے یہ بات کہہ دی کہ اماں کی طلب تو فطری ہے۔ اور وہ مجھے دوسری شادی کا حکم دیں تو میں چاہتے ہوئے بھی ان کا حکم نہیں ٹال سکتا۔ تو اس سے بہتر ہے کہ ان کا لایا ہوا پڑھا ہوا پانی پی لیا کرو۔"

"پھر کیا ہوا .....؟"

"پھر میرا ٹرانسفر ہوگیا۔ ہم کراچی آ گئے، اور نور بانو کو پیروں فقیروں کی عنایات سے نجات مل گئی۔"

"حیرت ہے .....! ایک طرف تو اولاد کی طلب ہونے کے باوجود بھابی کو پیروں فقیروں سے چڑ تھی۔ اور دوسری طرف انہوں نے اولاد کے لئے اتنی سخت اور احمقانہ منت مان لی۔" عارف نے خودکلامی کے انداز میں کہا۔

"اور میں حیران ہوں عبدالحق .....! کہ اتنا کچھ جاننے کے بعد بھی تم یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ بھابی نے ارجمند سے تمہاری شادی کیوں کرائی .....؟"

"آپ سمجھا دیں نا.....!"

"ہاں .....! اب میں سمجھا سکتا ہوں۔" عارف معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"تمہاری شادی کو پندرہ سال ہوگئے۔ اماں پوتے کی آرزو میں بوڑھی ہوگئیں۔ بھابی یہاں کراچی میں محفوظ تھیں۔ لیکن بیماری نے انہیں لاہور جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ اب اماں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہوگا۔ وہ تمہاری دوسری شادی کرا دیں گی، اور یقیناً تمہارے لئے بہت خوب صورت اور اچھی لڑکی

تلاش کریں گی۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یوں معاملات ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اس سے بہتر ہے کہ معاملات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے جائیں، اور خود ہی ہنسی خوشی، اصرار کر کے تمہاری دوسری شادی کرا دی جائے۔ اب اگر وہ کسی عام سی لڑکی سے تمہاری شادی کراتیں تو اماں کو اعتراض ہوتا۔ بھابی کے سامنے ارجمند کی صورت میں بہت اچھا آپشن موجود تھا۔ وہ خوب صورت بھی ہے، خوب سیرت بھی اور کم عمر بھی۔ اس سے اسے کیا فائدہ .....؟"

"میں جواب دے رہا ہوں۔ تم خود غور کرو تو جواب تمہیں بھی مل جائے گا۔ دیکھو، کہیں باہر تمہاری دوسری شادی ہوتی تو بھابی کا اس پر کوئی زور نہ ہوتا۔ اس سے مقابلہ رہتا ان کا۔ اور وہ تیز وطرار ہوتی تو ان کے لئے خطرہ بن جاتی۔ ارجمند کی بات اور تھی۔ وہ ان کی فرمانبردار تھی، اور اب بھی ہے۔ اس سے انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اور یہ بات ثابت بھی ہوگئی۔ ارجمند کی جگہ کوئی اور ہوتی تو وہ بھابی کے ساتھ ایبٹ آباد چلی جاتی بھلا.....؟ کبھی نہیں جاتی۔ وہ تو اس موقع کو غنیمت جان کر تمہیں جکڑ لیتی۔ اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو بھابی نے تم پر بھی اور اماں پر بھی اپنی کشادہ دلی اور ایثار ثابت کر دیا۔ کہو، اب سمجھ میں آئی بات .....!"

"مگر یہ تو آپ کا گمان ہے عارف بھائی .....!" عبدالحق نے احتجاج کیا۔

"نہیں .....! تمام معلومات، صورتِ حال اور پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ تم تو خود تجزیہ کرنے والے ہو عبدالحق.....! خود غور کر کے دیکھو۔"

عبدالحق کو ماننا پڑا کہ عارف کی بات سچی ہے۔

"میرا خیال ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عارف بھائی.....!"

"صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا عبدالحق.....!" عارف نے کہا۔

"تمہاری ذمہ داری اس وجہ سے اور بڑھ گئی ہے کہ ارجمند شکایت کرنے والی نہیں ہے۔ وہ منہ سے کچھ مانگے گی بھی نہیں۔ تمہیں خود ہی اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ تمہیں اس کو ہر زیادتی سے بچانا ہوگا۔ تمہیں بھابی کی طرف سے، اور ان کی چالوں کی طرف سے محتاط رہنا ہوگا۔ یہ نہ کیا تو بڑے نقصان میں رہو گے تم.....!

اللہ کے سامنے جواب دینا ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا، عارف بھائی ....! اور پوری طرح سمجھ گیا۔'' عبدالحق نے کہا۔

''اب اس وقت تو کچھ کرنے کا فائدہ نہیں۔ ویسے بھی تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ البتہ مستقبل میں میں خیال رکھوں گا۔''

''یہ بات تمہاری ٹھیک ہے۔ بھابی کو یہ احساس نہ ہونے دینا، ورنہ وہ ارجمند کی دشمن بن جائیں گی۔'' عارف نے کہا۔ پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''اور عبدالحق ....! ایک بات بتا دوں، ارجمند ایک غیر معمولی لڑکی ہے.... خاص طور پر تمہارے حوالے سے۔''

''وہ کیسے عارف بھائی....!''

''اس نے کبھی تمہیں جتایا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے....؟''

عبدالحق کا چہرہ تمتما اٹھا، جیسے وہ اس تذکرے پر شرمندہ ہوا ہو۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں عارف بھائی....! البتہ جب نادرہ نے اسے میرے سپرد کیا تو اس نے یہ بات مجھے بتائی ضرور تھی، اور وہ اتنی کم عمر تھی کہ میں نے اسے اہمیت نہیں دی۔ لیکن اس سے بھی پہلے نادرہ نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ اس وقت میں نے ارجمند کو دیکھا ہی نہیں تھا، اس لئے میں پریشان ہوگیا۔ نور بانو کے مزاج سے میں واقف تھا۔ مجھے لگا کہ یہ میرے لئے سنگین مسائل کھڑے کرسکتا ہے۔ میں نے یہ بات نادرہ سے کہی بھی۔ لیکن اس نے کہا کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' عبدالحق کھو سا گیا۔

''اور ایسا کبھی ہوا بھی نہیں۔''

''نہیں....! کبھی نہیں....! نور بانو تو ارجمند کو دیکھتے ہی اس پر فدا ہوگئی۔ اس میں اسے اپنی چھوٹی بہن نظر آتی تھی۔ اور میں بڑی سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ نور بانو نے اس کا ہمیشہ ایسے ہی خیال بھی رکھا، جیسے وہ اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں ارجمند کو پڑھاؤں۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ پڑھائی کے

دوران ہم ہمیشہ تنہا رہے۔ نور بانو نے کبھی وہاں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وہ تو بہت شکی ہے۔''

''لیکن ارجمند نے اس تنہائی میں تم سے کبھی اپنے دل کی بات نہیں کی ہوگی۔''

''جی عارف بھائی ....! کبھی نہیں ....!''

''جانتے ہو، کیوں ....؟''

عبدالحق نے نفی میں سر ہلایا۔

''یہی تو غیر معمولی پن ہے اس کا۔'' عارف نے کہا۔

''تم نے کہا کہ اس کی کم عمری کی وجہ سے تم نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ جبکہ اسے تم سے محبت اس عمر میں ہوئی تھی، جس میں بچوں کے پاس محبت کا تصور بھی نہیں ہوگا۔''

''جی ....! نادرہ نے مجھے بتایا تھا۔''

''ارجمند اس محبت کے ساتھ بڑی ہوئی، یا یوں کہہ لو کہ وہ محبت اس کے ساتھ بڑی ہوئی۔ اب اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ وہ محبت اللہ کی دی ہوئی تھی۔ نادرہ نے مجھے اس کے بارے میں بتایا۔ ارجمند کہتی تھی کہ اللہ میاں اس سے بات کرتے ہیں۔ نادرہ خوف زدہ تھی کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ لیکن جب ارجمند نے کچھ ایسی باتیں بتائیں، جو اسے کسی طرح معلوم ہو ہی نہیں سکتی تھیں تو نادرہ اس کا احترام کرنے لگی۔ پھر جب ارجمند کو تمہیں سونپنے کا مرحلہ آیا تو نادرہ نے ارجمند کو بہت سمجھایا، اسے بتایا کہ تمہاری بیوی بہت شکی ہے۔ تو ارجمند نے اس سے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ اللہ میاں نے اسے بتا دیا ہے کہ اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا۔ جب اللہ کا حکم ہوگا تو تم اسے خود بخود مل جاؤ گے .... بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ کئے۔ یہ وجہ تھی کہ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ وہ اپنے یقین کے سائے میں سکون سے بیٹھی رہی۔

اب تم خود سوچو کہ یہ غیر معمولی بات ہے یا نہیں....؟ محبت میں تو بڑے بڑے بردبار لوگ بے صبرے ہو جاتے ہیں، وہ تو کم عمر لڑکی تھی، اور کم عمری کی محبت

تو پہاڑی دریا کی طرح منہ زور ہوتی ہے۔ تم کراچی آ گئے۔ برسوں اس سے دور رہے۔ اس نے کبھی تمہیں خط بھی نہیں لکھا۔ فون پر بھی بس رسمی گفتگو ہی کی۔ کیسا صبر تھا اس بچی میں ...؟

اور غیر معمولی بات دیکھو کہ اس کا یقین سچا ثابت ہوا۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا، کسی سے کچھ نہیں مانگا سوائے اللہ کے۔ اور جو اس نے چاہا، وہ اسے ملا اور کس شان سے ملا۔ تم جانتے تھے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ لیکن تم ہرگز اس سے شادی نہ کرتے۔ لیکن بھابی نے تمہیں مجبور کر دیا۔ اور سوچو .....! بھابی نے ارجمند سے کیسے خوشامد کی ہوگی ...؟ اس سے کہا ہوگا کہ وہ تم سے شادی کے لئے ہاں کرے گی تو یہ اس کا ان پر احسان ہوگا۔ کتنے وقار کے ساتھ اس نے تمہیں پالیا۔ کیونکہ اس نے بڑے صبر کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کیا تھا۔ محبت میں کسی نوعمر لڑکی سے ایسی امید رکھی جا سکتی ہے ...؟

اور اب اتنی مضبوطی کے ساتھ تمہیں پانے کے باوجود اس کے انکسار کا یہ عالم ہے کہ بھابی کے کہنے پر وہ ان کے ساتھ اتنے طویل عرصے کے لئے ایبٹ آباد چلی گئی۔ حالانکہ اپنے احسان کے حوالے سے وہ ان پر زور بھی رکھتی تھی، اور انکار کرنے کا حق بھی تھا اسے۔ اس نے اس سلسلے میں تم سے بھی کچھ نہیں کہا۔ اور مجھے یقین ہے کہ اسے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں ہوگی۔ وہ ایسی ہی ہے، سب کچھ اللہ پر چھوڑ دینے والی۔ اور عبدالحق .....! ایک بات کہوں، میں تو مذہبی آدمی بھی نہیں ہوں۔ عام سا گناہ گار آدمی ہوں۔ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ ایسی لڑکی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کا خیال اللہ رکھے گا، اور کوئی اس کی حق تلفی کرے گا تو وہ اللہ کو خفا کرے گا۔ اسی لئے میں نے تم سے تمہارے ذاتی معاملے میں تم سے اتنی بات کی ہے۔ میں تمہیں خسارے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ تم میرے بھائی ہو، اور تم تو دیندار بھی ہو۔"

عبدالحق سر جھکائے خاموشی سے یہ سب کچھ سنتا رہا تھا۔ عارف کی بات ختم ہوئی تو اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر اس نے جھک کر عارف کا ہاتھ تھاما، اسے ہونٹوں سے اور پھر اپنی نم آنکھوں سے

لگایا۔

"جزاک اللہ .....! عارف بھائی .....! اس وقت آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ آپ نے بھائی ہونے کا حق ادا کر دیا۔ مجھے جو کچھ سمجھنا چاہئے تھا، اور میں نہیں سمجھ سکا تھا، آپ نے بہت اچھی طرح مجھے سمجھا دیا۔ بے شک .....! ارجمند میرے لئے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں نے غفلت کی، اب نہیں کروں گا۔ میں سمجھ گیا کہ مجھے ہر طرح سے ارجمند کا خیال رکھنا ہوگا، ورنہ میں بڑے خسارے میں پڑ جاؤں گا۔ اب انشاء اللہ کوتاہی نہیں ہوگی عارف بھائی .....!"

عارف نے بڑی محبت سے اسے دیکھا۔

"مجھے ارجمند کی طرح تم بھی نادرہ کے ذریعے ہی ملے ہو۔ مجھے ارجمند ہی کی طرح عزیز ہو تم .....!"

"اب تک جو ہوا سو ہوا ..... آئندہ میں بہت محتاط رہوں گا۔"

بات ختم ہوگئی۔ لیکن عبدالحق کو احساس تھا کہ عارف نے بہت بڑی بات اس پر کھول دی ہے۔

عارف کے سامنے تو وہ اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے خاموش رہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ نور بانو کی فطرت کیسی ہے۔ محبت تو آدمی دل سے کرتا ہے۔ لیکن عبدالحق محبت میں اندھا ہو جانے والا نہیں تھا۔ وہ خوبیوں، خامیوں اور کمزوریوں پر نظر رکھنے والا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو اس کی خامیوں اور کمزوریوں سمیت قبول کرنے کا قائل تھا۔ اس نے اس سلسلے میں پہلے بھی بہت کچھ سوچا تھا۔ محبت تو اس کا خاص موضوع تھا..... اس وقت سے، جب اسے محبت ہوئی بھی نہیں تھی۔" اور بعد میں تو اس نے اس پر بہت زیادہ سوچا تھا۔

اسے یاد تھا، نور بانو سے شادی سے پہلے حمیدہ نے اسے سمجھایا تھا۔ حمیدہ نور بانو کو بہت چاہتی تھی، بیٹیوں کی طرح، اور شادی کی تجویز بھی اسی نے پیش کی تھی۔ لیکن شادی سے پہلے دو باتیں ایسی ہوئیں کہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ یہ رشتہ مناسب بھی ہے یا نہیں، اور یہ کہ یہ شادی چل بھی سکے گی یا نہیں۔ سب سے

پہلے تو نور بانو نے ننھے ساجد کے معاملے میں جس تنگ نظری، بلکہ حسد کا مظاہرہ کیا، اس نے حمیدہ کو چونکا دیا۔ پھر جب اعتکاف کے بعد نور بانو کے اصرار پر اس نے داڑھی رکھنے کا ارادہ مؤخر کیا تو وہ بھی حمیدہ کو بہت برا لگا۔ ان دونوں موقعوں پر خود عبدالحق کو بھی شرمندگی ہوئی۔ تب حمیدہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ شادی عمر بھر کی بات ہے، وہ خوب سوچ لے۔

اور اس نے خوب سوچ سمجھ کر ہی شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ حمیدہ نے اسے احساس دلایا تھا کہ نور بانو کوئی حسین لڑکی نہیں ہے۔ مگر اس نے بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا کہ وہ اسے دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی لگتی ہے۔ اور یہ بات آج تک سچی ثابت ہوئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند بہت حسین ہے۔ لیکن اسے نور بانو اس سے زیادہ خوب صورت لگتی تھی۔

تو عبدالحق جانتا تھا کہ نور بانو حاسد اور تنگ نظر ہے۔ اس کی فطرت قابضانہ ہے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ نور بانو کو ان کمزوریوں کا احساس دلائے، تاکہ وہ انہیں دور کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ لیکن حمیدہ کے معاملے میں عبدالحق نے اسے یہ احساس دلا دیا کہ وہ ماں ہے، اور اس کے معاملے میں وہ کوئی لحاظ، کوئی مروت نہیں کرے گا۔ اس نے نور بانو کو جتا دیا کہ حمیدہ کا حکم وہ کبھی نہیں ٹال سکے گا۔ اور اس میں اس نے بڑی سختی دکھائی۔

لیکن بدقسمتی سے نور بانو کے معاملے میں وہ ایسا نہیں کر سکا۔ اس نے اس بات کی اہمیت سمجھی ہی نہیں۔

محبت اپنی جگہ، لیکن وہ حقیقت پسند تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ارجمند ہر طرح سے نور بانو سے برتر ہے۔ درحقیقت ان کے درمیان موازنہ کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ارجمند اس سے کتنی محبت کرتی ہے، اور اس محبت میں کتنی گہرائی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی محبت بے طلب تھی۔ وہ محبت کے جواب میں کچھ مانگتی بھی نہیں تھی۔ اور وہ محبت صرف دنیاوی نہیں تھی، وہ اللہ کے تعلق کے ساتھ تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ایسی محبت کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ مگر اس کا کیا کرتا کہ وہ پہلے ہی سے نور بانو کو اسیر تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ اس

محبت کی ناقدری کرے، ارجمند کے ساتھ بے انصافی ..... بلکہ زیادتی کرے۔ زیادتی ہونے دے، یہ بھی زیادتی ہی ہے۔

اس نے عارف کے سامنے یہ بات قبول تو نہیں کی۔ لیکن دل میں مان لیا کہ نور بانو نے مکاری سے کام لیا ہے۔ اس نے دانستہ اسے ارجمند سے دور کیا ہے۔ اور یہ سچ تھا کہ وہ ارجمند سے سگی بہن جیسی محبت کرتی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کرتی۔ عارف نے نور بانو کے سلسلے میں جو یہ توجیہہ کی تھی کہ اس نے ارجمند سے کیوں اس کی شادی کرائی، تو عبدالحق اسے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

اس روز پہلی بار اسے نور بانو پر غصہ آیا۔ وہ محبت کیا، جو آدمی کو اللہ سے غافل کر دے، اسے اللہ کا مجرم بنا دے۔ وہ یہ یاد کرنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس محبت نے ابتداء میں تو اسے نماز اور قرآن سے بھی دور کر دیا تھا۔ مگر اسے یہ یاد تھا کہ ارجمند کی آمد نے دوبارہ اسے اللہ کی راہ پر لگایا تھا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ بڑے خسارے سے بچنے کے لئے اسے بہت محتاط رہنا ہوگا۔

✿ ✿ ✿

شدید بیماری بھی حمیدہ کی اس خواہش کو کمزور نہیں کر سکی تھی کہ عبدالحق کے ہاں اولاد ہو تو اس کی نگاہوں کے سامنے ہو۔ یہ تو اس کا بہت بڑا ارمان تھا۔ اس سے وہ دست بردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے حساب لگایا۔ ابھی دو ماہ باقی تھے۔ یہ بھی اچھی بات تھی کہ صفیہ بیگم اس کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ وہ اب بھی ان کے ساتھ ایبٹ آباد جا سکتی تھی۔ اکیلے پن کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

حق نگر سے آتے ہی وہ بیمار پڑ گئی تھی۔ اب اس بات کو ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ ابتداء میں تو وہ اتنی کمزور تھی کہ ہلنا بھی اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ لیکن اب آہستہ آہستہ کمزوری دور ہو رہی تھی۔ حکیم صاحب کا تو کہنا تھا کہ کم از کم چار ماہ اسے آرام کرنا چاہئے۔ لیکن طبیبوں کا کیا ہے، وہ تو بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں۔

اسپتال کے ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ چھ ماہ تک وہ بستر سے اترنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ بلکہ اس کے چہرے کے تاثر سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں اس کے لئے فاتحہ پڑھ رہا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ اب وہ ڈاکٹر اسے دیکھے تو شاید مایوس ہو کر اس کے اندازے کے برعکس وہ صرف ڈیڑھ مہینے میں اس حد تک سنبھل گئی ہے کہ خود سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔

اس میں عبدالحق کا بھی بڑا دخل تھا۔ دفتر جانے کے ایک ہفتہ بعد ہی وہ خلافِ توقع آ گیا تھا۔ وہ تو اسے دیکھ کر کھل گئی تھی۔

''میں تو سمجھی تھی کہ اب تیرا آنا مشکل ہے پتر.....!'' اس نے کہا تھا۔

''میرا تبادلہ پھر کراچی ہو گیا ہے اماں.....!''

''لے.....اسلام آباد تو پھر قریب تھا۔ کراچی تو بہت دور ہے۔'' وہ بولی۔

''فاصلوں سے کچھ نہیں ہوتا اماں.....! اللہ کی عطا کی ہوئی آسانی سب سے بڑی نعمت ہے۔'' عبدالحق نے کہا تھا۔

''میری کچھ شرطیں مان لو گی تو میں ہر ہفتے یہاں آؤں گا اور اتوار تک تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''ماں سے شرطیں لگاتا ہے۔'' اس نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجبوری ہے اماں.....! اب دیکھو نا.....اتنی دور سے ہر ہفتے آنا اور ایک دن بعد واپس جانا کوئی آسان تو نہیں.....!''

حمیدہ نے سوچا، بات تو سچی ہے۔ اس نے کہا۔

''بول! کیا شرط ہے تیری.....؟ اس کے لئے تو میں ہر شرط مان لوں گی۔''

''حکیم صاحب کی ہر بات ماننی ہوگی۔ پرہیز کرنا ہوگا۔ مکمل آرام کرنا ہوگا۔''

''یہ سب کچھ تو میں کرتی ہوں۔ پر اب میری طبیعت بہتر ہے۔ اور حکیم جی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔''

''حکیم وہ ہیں اماں.....! تم نہیں ہو۔''

''ٹھیک ہے.....! پھر تو ہر ہفتے آئے گا نا.....!''

''جھوٹا وعدہ میں نہیں کرتا اماں.....! یہ یہاں خالہ کو جج بنا کر چھوڑ جاؤں گا۔'' عبدالحق نے صفیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آؤں گا تو ان سے پوچھوں گا کہ تم نے کوئی گڑبڑ تو نہیں کی۔ کی ہوگی تو فوراً واپس چلا جاؤں گا۔ اور اگلے ہفتے بھی.....''

''تو ہر ہفتے آئے، اس کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں پتر.....!''

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

اور عبدالحق نے اپنا وعدہ نبھایا۔ وہ ہفتے کی سہ پہر آ جاتا تھا، اور اتوار کی رات واپس جاتا۔ بلکہ کبھی تو پیر کی صبح واپس جاتا۔

''تو کتنا تھک جاتا ہوگا پتر.....!'' دوسری بار وہ آیا تو حمیدہ نے اس سے کہا۔

''اتنا لمبا سفر ہے.....!''

عبدالحق ہنسنے لگا۔

''ہوائی جہاز میں نہ تو سفر لمبا ہوتا ہے اماں.....! اور نہ ہی تھکن ہوتی ہے۔ بس تین گھنٹے لگتے ہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟''

''اُڑ کر جاتے ہیں نا اماں.....!''

حمیدہ کو یقین نہیں آیا۔

''تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ تو تمہیں بھی اپنے ساتھ اُڑا کر لے جاؤں گا اماں.....! پھر خود دیکھ لینا۔''

اور عبدالحق جب بھی آتا، صفیہ کے لئے خاص طور پر کچھ نہ کچھ لے کر آتا۔ حمیدہ کو اس سے یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ صفیہ دل میں تو خوش ہوتیں، لیکن زبان سے کہتیں۔

''تم اتنا تکلف کیوں کرتے ہو بیٹے.....!''

"واہ ....! بیٹا بھی کہتی ہیں اور محبت کو تکلف بھی کہتی ہیں۔" عبدالحق نے کہا۔

"جیسے اماں ہیں، ویسے ہی آپ ہیں میرے لئے۔"

صفیہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

یہ دیکھ کر عبدالحق نے بات کو مزاحیہ رخ دے دیا۔

"اور یہ تو آپ کی فیس ہے خالہ.....! آپ اماں کی جاسوسی کرتی ہیں نا میرے لئے ....!"

اور آنکھوں میں آنسو ہونے کے باوجود صفیہ مسکرا دیں۔

عبدالحق کے باقاعدگی سے آنے سے حمیدہ کو بہت فائدہ ہوا۔ تقویت تو اپنی جگہ تھی۔ وہ آتا تو اس کا خاص طور پر خیال رکھتا۔ اس کے سارے کام خود کرتا، دوا پلاتا۔ پھر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا۔ تمام وقت وہ اس کے ساتھ ہی گزارتا شاید اسی لئے وہ اتنی تیزی سے سنبھلی تھی۔ وہ آتا تو جیسے اس کی طاقت بڑھ جاتی۔ دن گن گن کر وہ ہفتے کا انتظار کرتی۔

اب ذرا طبیعت سنبھلی تو حمیدہ کو پھر ایبٹ آباد یاد آ گیا۔

"اب تو مجھے لگتا ہے آپا.....! کہ میں سفر کر سکتی ہوں۔" اس روز اس نے صفیہ سے کہا۔

"یہ تو حکیم صاحب سے پوچھنا ہوگا۔" صفیہ نے کہا۔

"اپنی طاقت کا مجھے پتا ہوگا یا حکیم صاحب کو.....؟" حمیدہ نے چڑ کر کہا۔

"ضرورت سے جاتی ہو تو رابعہ سہارا دیتی ہے تمہیں۔ باتیں ایبٹ آباد جانے کی کر رہی ہو۔"

"یہ تو عبدالحق کی زبردستی ہے۔ اللہ رابعہ کو خوش رکھے۔ مگر مجھے تو اپنا آپ بوجھ لگنے لگا ہے اس پر۔"

"خدا کا شکر ادا کرو باجی ....!" صفیہ نے کہا۔

"اتنے دن اٹھنے کے قابل نہیں تھیں تو بستر پر ہی سب کچھ کرتی تھیں نا مجبوری میں۔ اور رابعہ تو بڑی جاں نثار ہے۔ اللہ بہت اجر دے گا اسے۔"

"تو آج میں بغیر سہارے کے خود ہی جا کر دیکھتی ہوں۔ سچ کہتی ہوں، مجھے نہیں لگتا کہ اب مجھے سہارے کی ضرورت ہے۔"

"نہیں باجی ....! یہ سب تم عبدالحق کے سامنے ہی کرنا۔ ورنہ وہ پوچھے گا تو جھوٹ تو نہیں بولوں گی میں۔ اور پھر وہ ہر ہفتے جانا چھوڑ دے گا۔"

حمیدہ کو یہ بات ماننی پڑی۔ وہ عبدالحق کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

عبدالحق آیا تو اس نے یہ بات اس سے کی۔ عبدالحق نے صاف انکار کر دیا۔

"پہلے میں حکیم صاحب سے پوچھوں گا۔" اس نے کہا۔

حمیدہ کو جلال آ گیا۔

"ماں ہوں تیری ....! کیا تیرے حکم پر چلوں گی ....؟"

"نہیں اماں ....! کیوں گناہ گار کرتی ہو مجھے .... مگر ابھی اتنی طاقت نہیں ہے تم میں۔ دیکھنے سے نظر آتا ہے۔"

"یہ تو ایبٹ آباد جانے کے چکر میں ہیں۔" صفیہ نے بھید کھول دیا۔

عبدالحق پریشان ہو گیا۔

"ایبٹ آباد کو بھول جاؤ اماں ....! بہت لمبا سفر ہے۔"

حمیدہ مسکرائی۔

"تو کیا ہوا.....؟ ہم اُڑ کر چلے جائیں گے .... ہوائی جہاز میں۔"

"وہاں ہوائی جہاز نہیں جا سکتا اماں .....!"

"بے وقوف بنا رہا ہے مجھے.....!" حمیدہ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

"نہیں اماں ....! یہ سچ ہے۔ مری یاد ہے نا اماں.....؟"

حمیدہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یہ ایبٹ آباد بھی ویسا ہی پہاڑی مقام ہے۔ وہاں جہاز سے نہیں جایا جا سکتا۔"

"ٹھیک ہے.....! پر میں اٹھ کر یہ تو دیکھ لوں کہ میں سہارے کے بغیر چل بھی سکتی ہوں یا نہیں.....!"

عبدالحق مجبور ہوگیا۔

''ٹھیک ہے اماں.....! کوشش کر لو..... اس وقت تو میں بھی موجود ہوں نا.....!''

اس روز حمیدہ پہلی بار خود اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب تک وہ سہارے سے اٹھتی رہی تھی۔ اب اپنی ٹانگوں پر زور دیا تو ایک لمحے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگوں میں ابھی دم نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے جیسے تیسے ایک قدم اٹھا لیا۔ مگر دوسرا قدم اٹھاتے ہی اسے چکر آ گئے اور وہ بری طرح ڈگمگا گئی۔ عبدالحق چوکنا تھا۔ اس نے تیزی سے اسے سنبھالا اور گود میں اٹھا کر اسے بستر پر لٹا دیا۔

''دیکھا اماں.....! حکیم صاحب غلط تو نہیں کہتے۔'' عبدالحق نے کہا۔

حمیدہ سے بولا نہیں گیا۔ اس کی سانس بے ترتیب ہوگئی تھی۔

اس کے چہرے پر یاس دیکھ کر عبدالحق تڑپ گیا۔

''وقت لگے گا اماں.....! پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' اس نے انہیں دلاسہ دیا۔

''طاقت آئے گی تو پہلے تھوڑا تھوڑا کر کے چلو گی۔ حکیم صاحب کا اندازہ درست ہے اماں.....!''

''ٹھیک ہے.....!'' حمیدہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''تو ایک مہربانی کر دے۔ نور بانو کو یہاں لے آ.....!''

''اب یہ اس کے لئے بھی ممکن نہیں رہا اماں.....!'' عبدالحق نے کہا۔

''پر تو نے اسے جانے ہی کیوں دیا پتر.....؟'' حمیدہ کے لہجے میں شکایت تھی۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔

''بس.....! غلطی ہوگئی اماں.....!''

حمیدہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اللہ کی مرضی.....!

❁ ❁ ❁

نور بانو ارجمند کی باتوں پر غور کرتی رہی تھی۔ سچ یہ ہے کہ ارجمند نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اپنی تمام غلطیاں اسے نظر آ گئی تھیں۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ اس نے بڑے ظلم کئے ہیں۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑا اس نے۔ ان سب لوگوں کو اس نے تکلیف پہنچائی، جو اس سے محبت کرتے تھے۔ حمیدہ، عبدالحق، ارجمند..... اور ساجد۔

سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اپنی جان پر بڑا ظلم کیا تھا۔ دوسروں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اسی کا نتیجہ تھا۔ وہ نماز کی پابند تھی، باقاعدگی سے قرآن پڑھنے والی تھی، اور مکمل نہ سہی، اس نے حدیث کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر عبدالحق پر قابض ہونے کے، اور اپنے حسد اور احساسِ کم تری کے چکر میں اس نے سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔

غضب خدا کا، میں نے تو اللہ کو بھی چھوڑ دیا۔ سوچتے ہوئے وہ بلند آواز میں بڑبڑائی۔ پھر اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ لیکن کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

اسے سب کچھ یاد آیا۔ نہ صرف یاد آیا، بلکہ اسے دکھائی دیا۔ وہ گزرے ہوئے لمحے کو دیکھ سکتی تھی۔ اللہ نے کتنے کرم کئے اس پر۔ کیسے کیسے نوازا اسے۔ دہلی میں اسے موت سے بھی بچایا اور بے عزتی سے بھی۔ بے یار و مددگار ہونے کے باوجود اسے پناہ دی، عزت دی، مقام دیا۔ وہ ہندو سمجھ کر عبدالحق کو حقیر سمجھتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ اللہ نے عبدالحق کو کتنی بلندی عطا فرمائی۔ اللہ نے ہی اس کی دلی خواہش پوری کرنے کا اہتمام فرمایا۔ ورنہ عبدالحق کے ساتھ اس کا کیا جوڑ تھا.....؟ نہ ظاہری طور پر، نہ باطنی طور پر۔ مگر عبدالحق کے دل میں اللہ نے اس کی محبت ڈال دی تھی۔ اللہ نے انہیں ملا دیا۔

اللہ نے تو اپنی رحمت سے عبدالحق اسے پکا پکا دے دیا تھا۔ مگر خود اس کے اندر بڑی کھوٹ تھی۔ احساسِ کمتری کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اس کی وجہ سے کیسی کیسی خرابیاں پیدا ہوئیں اس میں۔ حسد، بدگمانی، احسان فراموشی، تنگ نظری، سب اس احساسِ کمتری کے ہی تحفے تھے۔ مگر اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ بنیادی خرابی اس کا ناشکرا پن تھا۔ وہ شکرگزار ہوتی تو کوئی فساد نہ ہوتا۔ احساسِ کمتری بھی نہ ہوتا، بلکہ

خود اعتمادی ملتی اسے۔ کیا اسے نہیں معلوم تھا کہ سب کچھ اللہ ہی دیتا ہے، اور وہ جب چاہتا ہے، جو چیز چاہے، واپس لے لیتا ہے۔ بندہ اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تو آدمی ڈرے تو بس اللہ سے ڈرے، اور کچھ چاہے تو بس اللہ سے مانگے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب اللہ سے، قرآن سے، نماز سے دور ہوئی۔ اور اسے یاد آ گیا۔ یاد آیا تو اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔

وہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ تھا، اور اس کے فوراً بعد اس کی عبدالحق سے شادی ہونا تھی۔ وہیں سے اس کی تباہی کا آغاز ہوا تھا۔ شیرخوار ساجد کو اس نے اپنا رقیب بنا لیا تھا۔ اور اس جہالت میں اس نے غضب کر دیا۔ طاق راتوں میں اس نے اپنے لئے دعا کی...... اس بات سے بے خبر کہ وہ بددعا ہے۔ اس نے اپنے لئے اولاد سے محرومی کی دعا کی، اسے یہ بھی خیال نہیں آیا کہ یہ محرومی عبدالحق کی بھی ہوگی، اور کم از کم اس کی محرومی کے لئے دعا کرنے کا تو اسے کوئی حق نہیں۔

یہ سوچتے ہوئے وہ پھر کانپ گئی۔ یہ تو بہت بڑا جرم تھا۔ اس پر اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پہلے عبدالحق سے معافی مانگنی ہوگی۔ اور یہ سننے کے بعد معاف کرنا تو دور کی بات، شاید عبدالحق کبھی اس کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔

اس وقت اس نے سوچا کیا تھا؟ یہ کہ اس کے اور عبدالحق کے درمیان کوئی کبھی حائل نہ ہو۔ اس نے نہیں سمجھا کہ اولاد میاں بیوی کے درمیان حائل نہیں، شامل ہوتی ہے۔ وہ تو ان کے تعلق کو، رشتے کو، ان کی محبت کو مضبوط کرتی ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں سمجھی کہ اولاد کے بغیر عورت اس درخت کی طرح ہوتی ہے، جو پھل سے بھی محروم ہو اور پھول سے بھی، اور اس کی چھاؤں بھی نہ ہو۔ اولاد تو عورت کی تکمیل کرتی ہے۔ بانجھ عورت تو عورت ہی نہیں ہوتی۔ اور وہ ایسی بدنصیب عورت تھی، جس نے رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں اپنے لئے بانجھ پن کی دعا کی تھی۔

اور وہ دعا قبول ہوگئی......!

اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس نے عبدالحق پر قابض ہونے، اسے صرف اپنا بنائے رکھنے کے لئے اپنی جہالت میں جو دعا کی تھی، وہ تو درحقیقت اسے کھونے کی

دعا تھی۔ ایک نومسلم کے لئے جو بڑی محبت اور سچائی سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لایا ہو، اپنی اولاد کی ... بلکہ اولادِ نرینہ کی کتنی اہمیت ہوتی ہوگی، کیونکہ اسے تو اپنی نسل بہت عزیز ہوتی ہوگی۔ عبدالحق کی جگہ کوئی اور ہوتا تو نہایت درجے کی محبت کے باوجود زیادہ سے زیادہ دو تین سال انتظار کرتا، اور پھر دوسری شادی کر لیتا۔ اور اس بیوی سے اولاد ملتی تو وہ بیوی اسے عزیز تر ہو جاتی، اور اس کی اپنی حیثیت گھر کے آنگن میں لگے بے برگ و بار شجر کی سی ہو کر رہ جاتی، جو موجود ہوتا ہے، لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ اور ایسا اس کی اپنی دعا کی قبولیت کی وجہ سے ہوتا۔

اب اس کی سمجھ میں آیا۔ شادی کی رات عبدالحق نے اس سے شکر کے نفل پڑھنے کو کہا تھا، اور اس نے گریز کیا تھا۔ یہ شاید اس کی بددعا کی وجہ سے تھا۔ اور شکر ادا نہ کر کے وہ اور نحوت میں گرفتار ہوگئی۔ شکر ادا کرتی تو اسے خوشی اور خود اعتمادی ملتی، احساسِ کمتری دور ہو جاتا۔ لیکن اس نحوست نے اسے نیک اعمال سے دور کر دیا، اس کا احساسِ کمتری الگ بڑھ گیا۔ عبدالحق کو جکڑ کر رکھنے کا شوق ایک منحوس مرض کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے لئے اس نے جسم کا سہارا لیا۔ دیر سے سونا دیر سے اٹھنا معمول بن گیا۔ پاکی کا احساس ختم ہوگیا اور وہ ناپاکی میں مبتلا ہوگئی...... یعنی نحوست در نحوست۔

اس کا جسم پھر بری طرح لرزا۔ اس کے اعمال کی پاداش میں کیا اس پر لعنت کر دی گئی۔ ورنہ وہ تو نماز کی پابند تھی۔ قرآن باقاعدگی سے پڑھتی تھی۔ پھر وہ کیسے ایک دم محروم ہوگئی۔

تمہاری اوقات ہی کیا ہے......؟ اس کے اندر سے کسی نے للکارا۔ شیطان تو معلم الملکوت تھا۔ اللہ کے ایک حکم سے منہ موڑا تو ابد تک کے لئے راندۂ درگاہ ہوگیا۔

اس سب کے باوجود اللہ نے اس پر کتنی رحمت فرمائی۔ اس کا پردہ رکھا۔ عبدالحق کی محبت کم نہیں ہونے دی۔ بلکہ اس کی محبت کی گہرائی تو ایسی ہے کہ ارجمند جیسی حسین اور خوبیوں سے مالا مال لڑکی کو بھی اس نے اس کے مقابلے میں اہمیت

نہیں دی۔

پھر اس نے ارجمند کے بارے میں سوچا۔ ایک بات سچی تھی کہ وہ ارجمند کو اپنی سگی بہن کی طرح چاہتی تھی۔ لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس نے ارجمند کو بڑی بے دردی سے اپنی مطلب برآری کے لئے استعمال کیا تھا۔ ارجمند نے اسے کے کہنے پر عبدالحق سے شادی کی۔ اسے ایک ایسی سوکن کے عذاب سے بچایا، جس پر اس کا کوئی اختیار نہ ہوتا۔ یہی نہیں، وہ اس کے لئے وہ ایثار کر رہی تھی، جو کوئی کسی کے لئے نہیں کرتا۔ وہ اپنا بچہ اسے دے رہی تھی۔ وہ اسے ماں بنا رہی تھی، وہ نعمت اسے دے رہی تھی، جس سے محرومی کے لئے خود اس نے رمضان کی مبارک راتوں میں دعا کی تھی۔ ارجمند اس کے لئے سراپا ایثار تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے بھی خودغرض ہی رہی۔ اس کی تنگ نظری اور حسد میں کوئی کمی نہیں آئی۔ عبدالحق پر اپنا مکمل تصرف رکھنے کے اس کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اس نے ارجمند کو عبدالحق سے ملنے دیا تو صرف اپنی غرض کے لئے۔ اور جب غرض پوری ہوگئی تو اسے ارجمند کا فون پر عبدالحق سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں رہا۔

برسوں کا سویا ہوا ضمیر جاگ گیا تھا، اور اسے آئینہ دکھانے پر تلا ہوا تھا۔

ارجمند کو سگی بہن کی طرح چاہنے کے باوجود اس نے کیسا کھیل کھیلا؟ اور اس کھیل میں آگے کا نقشہ کیا تھا؟

اس نے گھبرا کر آئینے سے نظریں چرانے کی کوشش کی، لیکن آنکھیں بھی ضمیر کا ساتھ دے رہی تھیں۔

وہ عبدالحق کو کسی کے ساتھ بھی بانٹنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اس نے جان لیا کہ یہ ناگزیر ہے۔ اور بانٹنے سے زیادہ اسے اس بات کی فکر ہوئی کہ وہ تو اپنی دعا کی قبولیت کے بعد اب ماں بن ہی نہیں سکتی۔ اور آنے والی ضرور ماں بنے گی۔ اور وہ حقیر ہو جائے گی۔ کسی کی نظروں میں بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ دنیا میں ارجمند کے سوا کوئی ایسا نہیں ہو سکتا تھا، جو اس کی یہ بات مان لے، اپنا بچہ اسے دے دے کہ سب یہی سمجھیں کہ نور بانو ماں بنی ہے۔ اور اس میں جہاں اس کا فائدہ تھا، وہاں ارجمند کا سراسر نقصان تھا۔ عبدالحق کو تو ویسے ہی ارجمند سے محبت نہیں

تھی۔ اس کے ماں بننے کے بعد تو وہ ارجمند سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتا۔ اور اگر اللہ کے سامنے جواب دہی سے بچنے کے لئے وہ انصاف کی کوشش کرتا تو وہ اس کوشش کو ناکام بنا دیتی۔ یعنی ارجمند کا مستقبل وہ ہوتا، جو عبدالحق کی کہیں اور شادی ہونے کے نتیجے میں اس کا ہونا تھا۔ وہ شوہر سے بھی محروم رہتی۔

نور بانو کی روح پر جیسے کوڑا سا لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

نہیں .....! میں ایسی تو نہیں ہوں۔ ارجمند کے احسان کے بدلے میں میں اسے محرومی اور دکھ تو کبھی نہ دیتی۔

تم جانتی ہو کہ تم کیا ہو۔ ضمیر نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ اب تم خود سے بھی جھوٹ بول رہی ہو۔ تم بے رحم شاطر ہو۔ بازی جیتنا ہی تمہارا اصل مقصد ہے۔

''نہیں، یہ سچ نہیں .....! نور بانو نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے۔ وہ یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن ضمیر کی آواز کانوں میں نہیں، اس کے وجود میں گونج رہی تھی۔

یہ سچ ہے، اور تم جانتی ہو۔ تمہارا عمل اس کا ثبوت ہے۔ ضمیر نے کہا۔ ابھی ارجمند سے تمہاری غرض پوری نہیں ہوئی ہے۔ ابھی ارجمند پوزیشن کے اعتبار سے تم پر بھاری ہے۔ مگر تم تو اب بھی اس کا لحاظ نہیں کرتیں۔ وہ ایک منٹ عبدالحق سے بات کرے تو یہ بھی تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب خود بتاؤ.....! اس کا بچہ ملنے کے بعد تم اس کے ساتھ کیا کرو گی.....؟

وہ سچ کی جیت کا لمحہ تھا، وہ اعتراف کا لمحہ تھا۔ اب آنکھیں اور کان بند کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ خود سے منہ نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نہ جانے کتنی دیر تک وہ روتی رہی۔ لیکن دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ اس کے لئے ماننا ضروری تھا، اور اس نے مان لیا۔ ٹھیک ہے.....! میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بہت بری ہوں، اتنی بری کہ شاید کوئی اتنا برا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں خودغرض ہوں، تنگ نظر ہوں، حاسد ہوں، ظالم ہوں۔ اس نے دل میں کہا۔ پتا نہیں . . !

کیسے میں ایسی ہوگئی، لیکن اللہ تو بہت بخشنے والا ہے، وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔ وہ رحیم و کریم ہے۔ گناہ گاروں کی توبہ اسے بہت پسند ہے۔

لیکن تم تو برسوں سے اسے بھی چھوڑے بیٹھی ہو۔ ضمیر نے اعتراض کیا۔

میں رجوع کروں گی تو وہ اس پر بھی مجھے معاف کر دے گا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔

بے شک......! لیکن رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ پچھلی غلاظتیں بھی تو دھونی ہوں گی۔ تمام معاملات کو صاف کرنا ہوگا۔

اس پر وہ گھبرا گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ اس میں تو بڑی پیچیدگیاں ہیں۔

سب تمہارا ہی کیا دھرا تو ہے۔ ضمیر نے ملامت کی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ جھوٹ جو بظاہر بہت چھوٹی سی، معمولی سی بات لگتا ہے، اسے اللہ نے گناہ کبیرہ کیوں قرار دیا؟ تم نے ایک جھوٹ بولا، اور تمہاری پوری زندگی جھوٹ بن گئی۔ چلو، تم تو اس کی مستحق ہو۔ لیکن ارجمند بے چاری کا کیا قصور؟ تم نے اس کی زندگی کو بھی جھوٹ بنا کر رکھ دیا۔ تمہیں تو اس کا حساب بھی دینا ہوگا۔

نور بانو تھرا گئی۔

دیکھا......! بگاڑ کتنا آسان ہے، اور اصلاح کتنی مشکل......!

وہ بڑے فیصلوں کے لمحے تھے۔ نور بانو نے عہد کر لیا کہ اب وہ ارجمند کے ساتھ نہ کوئی زیادتی کرے گی، نہ ہونے دے گی۔ وہ ہنسی خوشی اسے عبدالحق سے ملائے گی۔ اسے اس کے حق سے بھی زیادہ دے گی۔ اس سے اتنی محبت کرے گی کہ پچھلی تمام زیادتیوں کی تلافی کر دے گی۔

اور......؟ ضمیر نے زہر خند کیا۔

اور میں نماز قائم کروں گی، اور قرآن سے دوبارہ جڑوں گی۔ اس کی ہی وجہ سے تو عبدالحق صاحب کو مجھ سے محبت ہوئی تھی۔

اور......؟

اور میں توبہ کروں گی...... سچی توبہ......! اور زندگی بھر مسلسل استغفار کروں

گی۔ اللہ کی رحمت اور مغفرت سے امید ہے کہ وہ مجھے بخش دے گا۔

سچی توبہ تو عملی ہوتی ہے۔ عمل کے بغیر نہیں۔

تو میں تلافی کروں گی نا......!

اور یہ جو جھوٹ کی اتنی بڑی عمارت کھڑی کر دی ہے تم نے...... اسے کون گرائے گا......؟ تم نہیں گراؤ گی اسے......؟

نور بانو چکرا گئی۔ یہ تو بہت بڑا فضیحتہ ہے۔ یہ کیسے ٹھیک ہو سکتا ہے......؟

ابھی تو ممکن نہیں۔ ابھی سب کچھ کھول دوں، سچ بول دوں تو کیسی جگ ہنسائی ہوگی۔ اور عبدالحق صاحب کو تو شاید میں کھو ہی بیٹھوں۔ انہیں جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔ اس سے ارجمند کو تو بہت فائدہ ہوگا۔ اس کا ایثار تو مثالی قرار پائے گا۔ وہ سب کی نظروں میں اچھی ہے، اور بلند ہو جائے گی۔ مگر مجھے تو سب لعنت ملامت کریں گے، زبان سے نہیں کریں گے تو آنکھیں بولیں گی۔ پھر تو ہر طرف ارجمند ہی ارجمند ہوگی۔

آ گئیں نا اپنی اوقات پر......! ضمیر نے ملامت کی۔ پھر شروع ہو گیا حسد......! ابھی تو ارجمند کے لئے بڑے بڑے دعوے کر رہی تھیں۔

نور بانو نے بے ساختہ اپنے کان پکڑے اور دونوں رخساروں پر طمانچے مارے۔ توبہ میرے اللہ...... ! اب نہیں کروں گی۔

تو جھوٹ کی یہ ناؤ چلتی رہے گی...... اور یہ چلتی رہے گی تو توبہ کیسے قبول ہوگی......؟"

نور بانو سوچتی رہی...... گہری سوچ۔ اتنا بڑا جھوٹ......! ایک دم سے تو پردہ نہیں ہٹایا جا سکتا۔ ساری دیواریں، پورا ملبہ مجھ پر آ گرے گا دھڑام سے۔ اس میں دب کر جیتے جی مر جاؤں گی میں۔

تو پھر......؟

ہاں......! ایک صورت ہے۔ ابھی تو اس جھوٹ کو چلنے دیا جائے۔ بعد میں مناسب موقع دیکھ کر میں عبدالحق صاحب کو سچ بتا دوں گی، اس طرح کہ مجھ سے ان کا دل برا بھی نہ ہو۔

صرف عبدالحق کو......؟

اماں کو بھی بتا دوں گی۔ نوربانو نے تمام حوصلہ خرچ کرتے ہوئے سوچا۔ اور کسی کو بتانا ایسا ضروری نہیں۔

اور اس سے پہلے ہی تم مر گئیں تو......؟

نوربانو ہکا بکا رہ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟

کیوں......؟ اللہ نے کوئی وعدہ کر رکھا ہے تم سے......؟ تمہیں بتا دیا ہے کہ کب مرنا ہے تمہیں......؟ زندگی کا تو ایک پل کا بھی بھروسہ نہیں۔

تب تو یہ سب لاحاصل ہو جائے گا۔ نوربانو مایوس ہوگئی۔ جی میں تو آیا کہ ابھی عبدالحق کو فون کر کے اسے حقیقت بتا دے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس نے سوچا، یہ کام تو بعد میں ہی کیا جا سکتا ہے۔

تاہم اس نے تلافی کی طرف قدم بڑھا دیا۔

اس نے وضو کیا۔ نماز کے لئے کھڑے ہونے سے پہلے اس نے ارجمند سے کہا۔

''اتنے دن ہوگئے، ان کا فون نہیں آیا۔ تم انہیں فون کیوں نہیں کرتیں......؟''

''آپ کر لیں نا آپی......!''

''میں تو نماز پڑھنے جا رہی ہوں۔ پھر قرآن پڑھوں گی۔ تم فون کرو انہیں، اور اچھی طرح بات کرو ان سے۔ دیر تک بات کرو، خوب ساری باتیں کرو۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ نئی نویلی دلہن کو فکر ہی نہیں ہے ہماری۔''

ارجمند نے حیرت سے اسے دیکھا۔ نماز، قرآن اور یہ فون کی فرمائش......! دنیا ہی بدل گئی ہے کیا......؟

''بس تم فون کرو انہیں جلدی سے...... اور ہاں......! میرا سلام کہہ دینا انہیں۔'' یہ کہہ کر نوربانو دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ارجمند نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوربانو کے شب و روز بدل گئے۔ نماز، قرآن توبہ اور استغفار۔ مگر اس

کے دل میں موت کا خوف بیٹھ گیا تھا۔ زندگی کا تو واقعی کوئی بھروسہ نہیں۔ اور وہ تو ویسے ہی ایک موذی درد کا شکار ہے۔ اسے یہ خیال بھی ہوا کہ اسے آپریشن سے بچنا ہوگا۔ نہ جانے کیوں، اسے لگتا تھا کہ آپریشن کا انجام اس کی موت ہی ہوگا۔

درد ہر تیسرے چوتھے دن ہوتا تھا، مگر شدید نہیں۔ اور دوا سے آرام آ جاتا تھا۔ لیکن نوربانو اس بات سے ڈرتی تھی کہ دوا سے درد کم نہ ہوا تو اسپتال جانا پڑے گا۔ اور وہاں ڈاکٹر آپریشن پر تلا بیٹھا ہے۔

اس نے ایک دن رشیدہ سے کہا۔

''یہاں پرائیویٹ ڈاکٹر بھی تو ہوں گے......؟''

''بہت ہیں......! بڑے بڑے ڈاکٹر ہیں۔''

''ضرورت کے وقت گھر پر بھی آتے ہیں مریض کو دیکھنے......؟''

''جی ہاں......! بس فیس زیادہ لیتے ہیں۔''

''اس کی کوئی بات نہیں......! دیکھ رشیدہ......! میں اب اسپتال نہیں جانا چاہتی۔ ضرورت پڑنے پر ڈاکٹر یہاں آ جاتے تو بہتر ہے۔''

''میں اس مرض کے خاص ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کرتی ہوں۔'' رشیدہ نے کہا۔

''پھر ایک بار آپ اپنے ایکس رے اور رپورٹیں لے کر اس کے مطب چلئے گا۔ اس کے بعد ضرورت پڑنے پر اسے گھر بلا لیں گے۔''

''خدانخواستہ تو کہہ دیا کر......!'' نوربانو نے اسے جھڑک دیا۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق عارف کی باتوں پر بعد میں بھی غور کرتا رہا۔ لیکن ان سوچوں کے دوران بھی وہ بنیادی طور پر نوربانو سے محبت کرنے والا شوہر ہی رہتا تھا۔ البتہ ارجمند کے معاملے میں وہ اللہ کے سامنے جواب دہی سے بھی خوف زدہ تھا۔

غور کرنے کے لئے وہ خود کو ماضی میں لے گیا۔ نوربانو نے لاہور پہنچتے ہی اماں سے اس کی اور ارجمند کی شادی کی بات کی تھی، اور اس کے بعد اس سے اس شادی کی فرمائش کی تھی۔ پھر شادی کے ہر مرحلے میں وہ پیش پیش رہی تھی۔ اس

کے خلوص سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اس معاملے میں بھی اس کی محبت اور خلوص کے معترف تھے۔ وہ تو مثال بن گئی تھی۔

عبدالحق کو اپنی سہاگ رات یاد تھی۔ جو کچھ چاہتا تھا اور نور بانو نے نہیں کیا تھا، ارجمند نے اپنی سہاگ رات میں اس سے بڑھ کر کیا۔ اس کا اسے فجر سے پہلے غسل کے لئے اصرار کے ساتھ جگانا یاد تھا۔ اس کے سخت لہجے کے باوجود اس نے اسے جگایا تھا، اور کہا تھا کہ نہیں جاگا تو وہ نماز کے خسارے میں پڑ جائے گا، اور یہ اسے گوارہ نہیں۔

اور اگلی رات نور بانو کی تھی۔ اس صبح جو نور بانو نے کہا، وہ بھی اسے یاد تھا۔ وہ صبح غسل کے لئے اٹھا، اور نماز کے لئے گیا۔ نور بانو کی نیند اچٹی ہوگی۔ اس نے اسے موجود نہ پایا تو شک میں مبتلا ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اور ارجمند ساتھ ہوں گے۔ وہ ان دونوں کو ڈھونڈتی پھری۔ گیسٹ روم کے بارے میں اسے یقین ہوگیا کہ وہاں اسے وہ دونوں یکجا نظر آئیں گے۔ لیکن وہاں اسے ارجمند نماز پڑھتی ملی، اور پھر وہ خود بھی مسجد سے واپس آ گیا۔ نور بانو کیسی کھسیائی تھی۔

یہ نور بانو کی فطرت تھی۔ شادی اس نے خود کرائی تھی۔ ارجمند کو وہ بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔ لیکن اس کے معاملے میں نور بانو کے حسد سے ارجمند بھی محفوظ نہیں تھی۔ یعنی عارف بھائی نے غلط نہیں کہا تھا۔ ارجمند کو اپنے ساتھ ایبٹ آباد نور بانو دانستہ لے کر گئی تھی۔ مقصد ان دونوں کو ملنے سے روکنا تھا۔

مگر پھر عبدالحق کو ایک ایسی بات یاد آئی، جو نور بانو کے حق میں جاتی تھی۔

ارجمند سے اس کی شادی کے بمشکل دو ہفتے بعد ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ وہ سب لوگ گاؤں گئے تھے۔ وہاں اماں نے تو رکنے کا فیصلہ کر لیا کہ صفیہ خالہ کو عدت کے دوران وہ اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں۔ نور بانو نے بھی ایک ہفتے وہاں رکنے کا فیصلہ کیا...... زرینہ کی خاطر۔ عبدالحق نے کہا کہ پھر وہ اور ارجمند بھی رک جاتے ہیں۔ مگر نور بانو نے منع کر دیا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ ارجمند کے ساتھ زیادتی ہوگی، جو نئی نویلی دلہن ہے۔ اس لئے وہ ارجمند کو لے کر لاہور چلا جائے۔ وہ ایک ہفتے بعد آئے گی۔

یہ تو نور بانو کے خلوص کا ثبوت ہے۔ عبدالحق نے سوچا۔ ارجمند سے وہ سچ مچ بہت محبت کرتی ہے۔

ایک ہفتے کے لئے تو دل بڑا کر لیا۔ اس کے اندر تردیدی سوچ ابھری۔ اور ارجمند پر نو مہینے کی محرومی تھوپ دی۔

اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اور اس دوری کے دوران بھی کچھ باتیں تھیں، جو ذہن میں کھٹکتی تھیں۔ فون پر جب بھی گفتگو ہوئی تھی تو نور بانو سے طویل ہی ہوئی تھی۔ لیکن ارجمند سے بات کم ہی ہوتی تھی۔ کبھی اس نے پوچھا بھی تو نور بانو نے یا تو یہ بتایا کہ وہ مصروف ہے، یا وہ بازار گئی ہوئی ہے۔ اور کبھی ارجمند سے بات ہوئی تو بہت مختصر۔ اسے یاد نہیں آتا تھا کہ کبھی ارجمند سے ایک منٹ بھی اس کی بات ہوئی ہو۔ دو ایک بار فون ریسیو ہی ارجمند نے کیا، لیکن مختصر سی بات کر کے نور بانو کی طرف بڑھا دیا۔ یعنی نور بانو وہیں موجود تھی۔ ارجمند نے اس کے انداز میں ناپسندیدگی دیکھی ہوگی، اور ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا ہوگا۔

اور آخری بار تو فون ہی ارجمند نے کیا تھا۔ مگر مختصر سی بات کر کے ریسیور نور بانو کو دے دیا تھا۔

بس ایک بار ارجمند نے اس سے تفصیلی بات کی تھی۔ صرف ایک بار...... اور اس موقع پر نور بانو گھر میں موجود نہیں تھی۔ ارجمند نے کہا تھا کہ وہ چیک اپ کے لئے اسپتال گئی ہوئی ہے۔ وہ واحد موقع تھا، جب ارجمند نے اس سے کھل کر بات کی تھی، اور طویل بات کی تھی۔

یہ بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ نور بانو ہی فون پر گفتگو میں بھی رکاوٹ تھی۔

عبدالحق کو نور بانو پر شدید غصہ آیا۔ اس نے خود ارجمند سے اس کی شادی کرائی، اسے آزمائش میں پھنسایا، اور خود ہی اس کے لئے مشکل کھڑی کر رہی ہے۔ جواب دہی تو اسے کرنی ہوگی اللہ کے سامنے۔

غصہ اتنا بڑھا کہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب نور بانو کو فون نہیں کرے گا۔

اتنا وقت گزر چکا تھا، اور اب اتنے تھوڑے دن رہ گئے تھے، ورنہ وہ جا کر ارجمند کو اپنے ساتھ لے آتا۔ اب ایسے عرصے میں نور بانو کو کوئی ٹھیس پہنچانا عقل مندی نہ ہوتی۔

ایک بات اس نے ضرور سوچی ..... کہ کچھ بھی ہو، اللہ نے نور بانو کو اس کے ایثار کے صلے میں بہت نوازا۔ کیسی عجیب، کہانیوں سی بات ہے کہ نور بانو نے اولاد کی خاطر، اسے خوش کرنے کے لئے ارجمند سے اس کی شادی کرائی، اور صرف پندرہ دن بعد اللہ نے اسے ہی اولاد کی خوشخبری عطا کر دی۔

وہ واقعی فون نہ کرتا۔ مگر ایبٹ آباد سے ہی فون آ گیا۔ اور وہ بھی ارجمند کا۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ کو بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ اس درجہ کمزور ہو چکی ہے کہ گھر میں بھی بغیر کسی سہارے کے نہیں چل سکتی۔ جبکہ وہ ایبٹ آباد جانا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر ایبٹ آباد پہنچ جاتی۔

کیسا ارمان تھا اسے عبدالحق کی اولاد کا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر لمحے نور بانو کو اپنے سامنے رکھتی۔ ایک لمحے کے لئے بھی اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ لیکن قسمت کو کیا کیجئے۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوا، اور اسے حق نگر جانا پڑا۔ اس دوران نور بانو ایبٹ آباد چلی گئی۔ اب صفیہ آپا کی عدت پوری ہونے کے بعد وہ ایبٹ آباد جانے کے ارادے سے لاہور واپس آئی تو بیمار پڑ گئی۔

یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ اللہ کو یہ منظور ہی نہیں کہ یہ سب کچھ میرے سامنے ہو۔ کون جانے، میں عبدالحق کے بچے کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں .....

اس نے اس خیال کو تیزی سے اپنے ذہن سے جھٹکا۔ بابا نے کہا تھا کہ وہ دیکھے گی.....عبدالحق کے بچے کو گود میں کھلائے گی۔

بابا کا خیال آیا تو ایک اور سوچ ابھری.....

جب نور بانو نے اصرار کر کے ارجمند سے عبدالحق کی شادی کرائی تو اس کا

خواب پورا کیا۔ تب اس نے سوچا کہ ارجمند سے عبدالحق کو اولاد ملے گی، اور بہت اچھی اور نیک اولاد ملے گی۔ لیکن پندرہ دن کے بعد خوش خبری آئی تو نور بانو کی طرف سے۔ نہ جانے کیوں؟ حمیدہ کو اس پر یقین نہیں آیا۔ اور مایوسی الگ ہوئی۔ مگر اس مایوسی پر اس نے توبہ کی اللہ سے کہ وہ کفرانِ نعمت کی مرتکب ہو رہی ہے۔ بچہ نور بانو سے ہو یا ارجمند سے، ہوگا تو عبدالحق کا ہی۔ اور مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ بے اولاد تو انشاء اللہ ارجمند بھی نہیں رہے گی۔

یہ سب اپنی جگہ، لیکن کہیں اپنے اندر گہرائی میں اسے احساس تھا کہ اس معاملے میں کہیں کوئی گڑ بڑ ہے..... بہت بڑی گڑ بڑ۔ لیکن وہ اسے سمجھ نہیں سکتی تھی۔

پھر وہ مٹھائی لے کر بابا کے پاس گئی تو وہاں بابا کی گفتگو نے اس کے اس بے نام اور موہوم احساس کی تائید کر دی۔ بابا اشاروں میں گفتگو کرتے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ کھیل کھیلنے والوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کی ناؤ پار لگ جائے گی۔ لیکن اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ انہوں نے کہا، تجھے کیا ضرورت ہے سمجھنے کی؟ اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، اور پردہ بھی رکھ رہا ہے۔ لیکن جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔ تو پریشان نہ ہو، آم کھا، پیڑ گننے کی کیا ضرورت ہے؟ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔

بابا کی بات میں جو اشارہ تھا، وہ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خیال تھا کہ نور بانو نے جھوٹ بولا ہے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ لیکن کیوں بولا؟ اور وہ اتنے بڑے جھوٹ کو کیسے نبھا سکے گی؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ معاملہ تو چاند کی طرح کا ہوتا ہے۔ چاند چڑھتا ہے تو ساری دنیا دیکھتی ہے۔ بلکہ یہ تو وہ چاند ہوتا ہے، جسے کالی گھٹا بھی نہیں چھپا سکتی۔

اسے یقین تھا کہ عبدالحق کے ہاں اللہ کے فضل و کرم سے بیٹا ہوگا۔ بابا نے یہی کہا تھا۔ بلکہ اس نے تو کہا تھا کہ اسے دو پوتے ملیں گے، لیکن دس برس کے وقفے سے۔ اب یہ اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ ارجمند کو اللہ دس سال کے بعد اولاد دے گا؟

پھر اس نے سوچا کہ نور بانو اس معاملے میں کوئی چالاکی نہیں کر سکتی۔ وہ

اس کی نظروں کے سامنے ہی تو ہوگی۔ مگر پھر ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر آ گئی۔ وہ سب حق نگر گئے، اور وہاں اس نے صفیہ آپا کے ساتھ عدت تک رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ قدرتی بات تھی۔ بعد میں اسے خیال آیا کہ اس نے نوربانو کو اپنی نگاہوں سے دور رہنے کا موقع دے دیا۔ پھر اس نے سوچا، کوئی بات نہیں، چار ساڑھے چار مہینے کی تو بات ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے؟

مگر جب اسے عبدالحق سے پتا چلا کہ نوربانو ایبٹ آباد چلی گئی ہے، اور بچے کی ولادت وہیں ہوگی، تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ کون سی تُک ہے؟ اس نے سوچا۔ بات صاف تھی۔ نوربانو نے اس کے دور ہونے کا فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ ہوتی تو اسے کسی قیمت پر گھر سے دور نہیں جانے دیتی۔ پر عبدالحق سے تو وہ کچھ بھی منوا سکتی تھی۔ اور اس نے رسماً بھی اس سے اجازت نہیں لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اجازت اسے نہیں ملے گی، اور اسے رکنا پڑ جائے گا۔ وہ نہیں جا سکے گی۔ ظاہر ہے، وہ منع کر دیتی تو عبدالحق اس کے حکم کے سامنے چوں بھی نہ کرتا، اور نوربانو بے بس ہو جاتی۔

اور سب سے زیادہ شبہ پیدا کرنے والی بات یہ تھی کہ نوربانو اپنے ساتھ ارجمند کو بھی لے گئی تھی۔ یہ تو بہت بری بات ہے۔ اس نے سوچا تھا۔ نوربانو نے عبدالحق کو اکیلا چھوڑ دیا۔ دو بیویوں کے ہوتے ہوئے آدمی اکیلا رہے؟ یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں آیا کہ نوربانو نے اسے فون کیوں نہیں کیا ...؟ ایبٹ آباد جانے پر تو شاید وہ صبر کر لیتی۔ لیکن عبدالحق پر یہ ظلم تو وہ کسی قیمت پر نہ ہونے دیتی۔ نوربانو کے لئے ارجمند اور عبدالحق پر اپنی بات تھوپنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

پھر کراچی سے عبدالحق کا فون آیا تو وہ اور پریشان ہوگئی۔ کراچی پہنچتے ہی عبدالحق کی طبیعت خراب ہوئی۔ آپریشن کی نوبت آ گئی۔ کم از کم اس موقع پر ارجمند کو تو اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔

اس پریشانی میں وہ عبدالحق سے نوربانو اور ارجمند کے ایبٹ آباد جانے کے بارے میں کچھ پوچھ نہیں سکی۔ اگلی بار اس نے پوچھا تو ملنے والا جواب کم از کم اس کے لئے تو تسلی بخش نہیں تھا۔ اور ارجمند کو ساتھ لے جانے کی وجہ یہ کہ نوربانو

اسے بہنوں کی طرح چاہتی ہے، اس سے دور نہیں رہ سکتی۔

عبدالحق نے اس سے معافی مانگی۔ کچھ کہنے کا فائدہ نہیں تھا۔ تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ حمیدہ نے زیادہ بات نہیں کی کہ عبدالحق اور شرمندہ ہوگا۔ پھر بابا کی بات بھی اسے یاد آئی کہ خاموشی سے تماشا دیکھنا، دخل نہ دینا۔

اسے یقین ہوگیا کہ نوربانو کوئی بہت بڑا کھیل کھیل رہی ہے۔ اس کی نگاہوں سے دور بھاگنا اس کا ثبوت تھا۔ مگر کیا نوربانو کو اس کا ڈر نہیں کہ لاہور واپسی کے بعد وہ ایبٹ آباد کا رخ ضرور کرے گی۔ تب وہ کیسے اسے روکے گی؟ یا خود بھاگ کر کہاں جائے گی؟

مگر لاہور واپس آنے کے بعد اس نے ایبٹ آباد جانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہ اتنی بری طرح بیمار پڑ گئی۔ اب کمزوری کا یہ عالم ہے کہ گھر میں چلنا پھرنا ممکن نہیں۔ ایبٹ آباد جانے کا کیا سوال ہے؟

بابا نے کہا تھا، اللہ کی مرضی ہے تو وہ ان کی مدد بھی کر رہا ہے، پردہ بھی رکھ رہا ہے۔

واقعی ...! اس نے دل میں سوچا۔ اب میں ایبٹ آباد نہیں جا سکتی۔ یہاں رہنے پر مجبور ہوں تو یہ نوربانو کے لئے آسانی ہی تو ہے۔ اس کا پردہ چاک نہیں ہو رہا ہے۔

نہ جانے کیوں، اسے یقین ہوگیا تھا کہ درحقیقت ارجمند ماں بننے والی ہے، اور نوربانو اس کا بچہ ہتھیا لے گی۔ اسی لئے تو وہ اسے لے کر دور چلی گئی ہے کہ کسی کو پتا ہی نہ چلے۔

اس خیال کو اس بات سے اور تقویت ہوتی تھی کہ وہ صرف نوریز اور ارجمند کو ساتھ لے کر گئی۔ نوریز کو تو باہر رہنا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ چلتا۔ اب پہلا پہلا بچہ ہے۔ کسی عورت کو تو ساتھ رکھنا تھا۔ وہ رابعہ کو بھی ساتھ لے جاتی۔ لیکن اس صورت میں بات کھل نہ جاتی۔

یہی بات ہے۔ یہی معاملہ ہے۔

حمیدہ کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے نسیمہ کو بلایا۔

"دیکھو ... میں تو چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں ... تو بابا کے پاس چلی جا......!"

"ٹھیک ہے اماں ...! کہنا کیا ہے ...؟"

حمیدہ نے بہت محتاط انداز میں اپنا مدعا بیان کیا کہ بات نسیمہ پر نہ کھلے۔ گھر کی بات نوکروں تک تو نہیں پہنچنی چاہئے۔

لیکن نسیمہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا نسیمہ ...! خیر تو ہے......؟"

"اماں ...! بابا کا تو وصال ہوگیا۔"

پہلے تو بات حمیدہ کی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ پھر سمجھ میں آئی تو اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کب ؟"

"دو مہینے ہوگئے اماں ...!"

تب حمیدہ کو یاد آیا۔ پچھلی ملاقات میں بابا نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اگلی بار یہاں نہ آنا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اب وہ اس سے کبھی نہیں ملیں گے۔

حمیدہ وحشت زدہ ہوگئی۔ اب تو کوئی راہنمائی کرنے والا بھی نہیں رہا۔

اب وہ کیا کرے؟ کچھ نہیں کیا تو نور بانو کامیاب ہو جائے گی۔ اور کہیں اس معاملے میں خدانخواستہ ارجمند کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

اس ہفتے عبدالحق آیا تو اس نے عبدالحق سے بات کی۔

"مجھے یہ بتا پتر ...! کہ نور بانو اور ارجمند کا کیا حال ہے ...؟ میں ان کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں اماں ...!" عبدالحق نے اسے دلاسہ دیا۔

"دونوں الحمدللہ خیریت سے ہیں۔"

"دیکھنے میں کیسی لگتی ہے نور بانو ...؟" حمیدہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔

عبدالحق ہکا بکا رہ گیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا اماں ...!"

"کہتے ہیں، عورت ماں بننے والی ہو تو اس پر نور اتر آتا ہے۔"

"ایبٹ آباد جانے کے بعد میں نے اسے دیکھا ہی کب ہے اماں ...!"

حمیدہ کے انداز کی تصدیق ہوگئی۔ اسے یقین تھا کہ عبدالحق ایبٹ آباد نہیں جاتا ہے۔ اگر جاتا ہوتا تو پردہ نہ اٹھ جاتا۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے پتر ...! عورت کو اس حال میں شوہر کا ساتھ چاہئے ہوتا ہے۔"

"پچھلے عرصے میں اتنی مصروفیت رہی ہے اماں......! دوبارہ تبادلہ ہوگیا۔ جنگ ہوگئی۔ مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

"پر مجھ سے ملنے تو تو حق نگر بھی آگیا تھا جنگ کے دنوں میں۔ پھر طبیعت خراب ہوئی تو کئی دن میرے پاس رہا۔ اور اب بھی ہفتے میں ایک بار مجھ سے ملنے آتا ہے۔ وہ تیری بیویاں ہیں۔" حمیدہ نے "بیویاں" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ان کا بھی حق ہے تجھ پر......!"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں......! پر ..."

حمیدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"بس اگلی بار تو میرے پاس آنے کے بجائے ایبٹ آباد جانا۔ اور انہیں دیکھ کر آنا۔ مجھے بتانا کہ وہ دونوں کیسی ہیں؟ مجھے بہت فکر ہے ان کی۔ اب میں خود تو جا نہیں سکتی۔"

"لیکن اماں......! مجھے کلکٹر صاحب نے ہر ہفتے کی یہ رعایت صرف تمہارے لئے دی ہے۔"

"اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ تو ان سے کہے کہ اپنی بیوی کے پاس جارہا ہے، تو وہ منع تو نہیں کریں گے نا......؟"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں......! لیکن ..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں......! یہ میرا حکم ہے۔"

"میں نہیں جا سکتا اماں ......!"

"تو میرا حکم نہیں مانے گا.....؟"

"مجبوری ہے اماں.....!"

"مجبوری ہے تو مجھے بھی بتا.....!"

عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا۔ پھر اس نے حمیدہ کو نوربانو کی منت کے بارے میں بتا دیا۔

حمیدہ حیرت سے منہ کھولے سنتی رہی۔ پھر غصے سے بولی۔

"اور تو نے مان لی یہ جاہلانہ بات.....؟"

"اور کیا کرتا اماں.....! منت اس نے مجھ سے پوچھ کر تو نہیں مانی تھی۔"

حمیدہ اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ بات منت کی نہیں، مکاری کے کھیل کی ہے۔ مگر ایک بات اس کو سوجھ گئی۔

"چل..... یہی سہی۔ پر ارجمند کے لئے تو پابندی نہیں ہے تجھ پر..... تو اس سے مل کر آ..... اور اس کے بارے میں مجھے بتا۔" یہ کہہ کر وہ خوش ہوئی کہ کھیل اگر وہی ہے، جو وہ سمجھ رہی ہے تو ارجمند کو دیکھ کر ہی کھل جائے گا۔

"یہ خطرہ میں مول نہیں لے سکتا اماں.....!" عبدالحق کے جواب نے اسے مایوس کر دیا۔

"وہاں جاؤں.....! اور نوربانو سے نہ ملوں، یہ کیسے ممکن ہے.....؟"

"بچہ تو نہیں ہے تو.....! اور تجھے نوربانو کی منت کا پاس بھی ہے۔"

"اور نوربانو ہی ضبط نہ کر پائی تو....."

"ایسا نہیں ہوگا۔ بس تو اگلی بار یہاں آنے کے بجائے ایبٹ آباد جانا۔"

"لیکن اماں.....!"

"یہ میرا حکم ہے پتر عبدالحق.....!" حمیدہ نے سخت لہجے میں کہا۔ پھر وہ مطمئن ہوگئی، کیونکہ عبدالحق نے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔

لیکن جمعرات کو عبدالحق کا فون آیا۔ اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ٹخنے کی ہڈی پر ہلکی ضرب لگی تھی۔ لیکن ڈاکٹر نے اسے چھ ہفتے کے لئے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ اب تو وہ اس سے ملنے بھی نہیں آ سکتا تھا۔

حمیدہ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جب اللہ کسی کا پردہ رکھ رہا ہو تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ بابا نے بھی کہا تھا..... کچھ مت کرنا۔ تماشا دیکھتی رہنا۔

اس کے دل میں مایوسی تھی۔ مگر پھر اچانک اسے یاد آیا۔ بابا نے آخر میں یہ بھی تو کہا تھا کہ جھوٹ سچ سے کبھی جیت نہیں سکتا۔

❋ ❋ ❋

نوربانو میں اتنی واضح تبدیلی آئی تھی کہ اسے سب نے ہی محسوس کر لیا تھا۔ نماز وہ باقاعدگی سے پڑھنے لگی تھی، بلکہ کوشش کرتی تھی کہ وقت پر ہی نماز ادا کرے۔ پھر قرآن کی تلاوت اور تسبیح پڑھنا معمول بن گیا تھا۔

ارجمند اس تبدیلی پر بہت خوش تھی۔ اس نے تو کبھی نوربانو کو ایسا دیکھا ہی نہیں تھا۔ ہاں.....! وہ اس کے لئے دعا بہت کرتی تھی۔ منہ سے کہنا تو اسے اچھا نہ لگتا۔ چھوٹا منہ اور بڑی بات والا معاملہ تھا۔

رشیدہ نے اس تبدیلی پر دل میں یہ تبصرہ کیا کہ ظالموں کو بھی خدا یاد آنے لگا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ بیگم صاحب اپنی بیماری سے بری طرح خوف زدہ ہوگئی ہیں۔ آپریشن سے گھبراتی ہیں، اس لئے خدا کو پکار رہی ہیں۔

مگر ارجمند نے اس تبدیلی کو بھی محسوس کر لیا، جو نوربانو کے باطن میں رونما ہوئی تھی۔ شاید یہ اس کی گفتگو کا نتیجہ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ نوربانو کو اپنی تمام کوتاہیوں، تمام برائیوں کا احساس ہوگیا ہے۔

اس روز نوربانو نے نماز کے لئے جاتے ہوئے اس سے عبدالحق کو فون کرنے کو کہا تو ارجمند حیران رہ گئی۔ نوربانو نے جتا دیا تھا کہ وہ فون اسی کو کرنا ہے، خود وہ بات نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ نماز کے بعد اسے قرآن بھی پڑھنا ہے۔

ارجمند جانتی تھی کہ اس کا عبدالحق سے فون پر بات کرنا نوربانو کو پسند نہیں۔ اسی لئے اس نے کبھی خود سے عبدالحق کو فون نہیں کیا تھا۔ اور عبدالحق کا فون آتا تو بھی وہ مختصر بات کر کے نوربانو کی طرف بڑھا دیتی۔

لیکن اب نوربانو اسے عبدالحق کو فون کرنے کی کھلی اجازت دے رہی تھی۔

ارجمند انسان تھی، فرشتہ نہیں اور وہ عبدالحق سے محبت کرتی تھی، اور بیوی ہونے کے ناطے اس کا عبدالحق پر حق بھی تھا۔ اور وہ ناسمجھ بھی نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ نوربانو نے اپنی غرض سے اس کی اور عبدالحق کی شادی کرائی ہے۔ وہ غرض کتنی بڑی اور کتنی مشکل تھی، یہ ابتداء میں تو وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔ لیکن اب اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ شاید کوئی بھی نوربانو کی وہ غرض پوری نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ نوربانو جو اسے فون پر بھی عبدالحق سے بات نہیں کرنے دینا چاہتی، تو آگے جا کر وہ عبدالحق سے اس کا ملنا کیسے گوارہ کرے گی؟ اور وہ اتنی تیز اور اور عبدالحق پر ایسے حاوی ہے کہ اس سے کچھ بھی کروا دے۔ بچہ ملنے کے بعد تو اسے اس کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ اور عبدالحق کو تو ویسے بھی اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ سو کچھ عجیب نہیں کہ بعد میں وہ کوئی متروک مکان بن کر رہ جائے۔

یہ سب کچھ سوچنا تو فطری تھا۔ لیکن وہ ان سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیتی۔ وہ اسے اپنی بدگمانی قرار دے کر شرمندہ ہوتی۔ مگر جب سوچیں پیچھا نہ چھوڑتیں تو اس کے پاس اس کا دوسرا علاج بھی تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے نوربانو کی خودغرضانہ پیش کش کو صدقِ دل سے اللہ کی بہت بڑی نعمت سمجھ کر قبول کیا تھا۔ شکایت کا کیا سوال، کہ وہ تو اس کے لئے مقامِ شکر تھا۔ وہ اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتی، اور وہ اس پر نوربانو کی بھی شکرگزار تھی۔ اس نے عبدالحق کو پانے کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ تو یہ جانتی تھی کہ جب وقت آئے گا تو اللہ میاں ہی اسے عبدالحق سے ملوائیں گے۔ کس طرح؟ اس سے اسے کوئی غرض نہیں تھی۔

اور جب وہ ملے تو اس نے سمجھ لیا کہ اللہ نے ایسا ہی چاہا ہے۔ اور جو اس نے چاہا ہے، اس پر گلہ کیسا؟ اس پر تو بس شکر ادا کرنا ہے۔ اور یہ بھی اسے یقین تھا کہ اللہ جب چاہے گا، یہ خوشی واپس لے لے گا۔ اور اسے اس صورت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔

ایسے میں نوربانو سے شکایت کی گنجائش ہی کہاں تھی۔

اب، جب نوربانو کا رویہ بدلا تو یہ اس کے لئے خلافِ توقع اور بہت خوش

کن تھا۔ یہ اللہ کی طرف سے بہت بڑا افضل تھا۔ اس کی شکرگزاری اور بڑھ گئی۔

اس نے عبدالحق کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف سے اس کی آواز پہچان کر یعقوب نے فخریہ لہجے میں کہا۔

''صاب تو انجرڈ ہو گئے ہیں چھوٹی میم صاب.....!''

وہ متوحش ہو گئی۔

''کیا ہوا.....؟ خیر تو ہے.....؟''

''ایسکی ڈینٹ ہو گیا تھا.....''

''مسٹر جیکب.....! ریسیور میری طرف بڑھائیے۔'' اسے عبدالحق کی آواز سنائی دی۔

''نو سر.....! مجھے جیکب نہیں، یعقوب بلائیں۔'' یعقوب نے احتجاج کیا۔

''تو پھر آپ بھی انگریزی کی ٹانگ توڑنا چھوڑ دیں۔''

''انہیں ریسیور دو نا یعقوب.....!'' ارجمند نے پریشان ہو کر کہا۔

''دیتا ہوں.....!''

''خیریت تو ہے.....؟'' ارجمند نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''حادثہ ہو گیا تھا۔ ٹخنے پر معمولی سی چوٹ آئی ہے۔ لیکن ڈاکٹر نے چھ ہفتے کے بیڈ ریسٹ کی پخ لگا دی ہے۔''

''ہوا کیسے.....؟''

''میں تو یہی کہوں گا کہ تمہاری وجہ سے ہوا۔'' عبدالحق کے لہجے میں شوخی تھی۔

''کیا مطلب.....؟''

''تم سے ملنے کے لئے ایبٹ آباد آنے کا ارادہ کیا تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔''

''مجھ سے ملنے کے لئے.....!'' ارجمند کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ظاہر ہے.....! نوربانو سے تو میں ملنے سے رہا۔ تم ہی سے ملنے کے لئے آ سکتا ہوں۔''

ارجمند کو نہیں معلوم تھا کہ آپی نے عبدالحق کو یہاں آنے سے کیسے روک

رکھا ہے۔ اس نے تو سب کچھ ان پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور یہ بات ثابت بھی ہوگئی تھی کہ آپی جس سے جو چاہیں، کرا سکتی ہیں۔

اس وقت نہ جانے کیسے اس پر تجسس غالب آ گیا۔ اس نے پوچھا۔

"آپ آپی سے کیوں نہیں مل سکتے .....؟"

"تمہیں نہیں معلوم .....؟"

"جی نہیں .....!"

"اس نے ایک جاہلانہ منت مان لی تھی کہ بچے کی ولادت تک میں اور وہ نہیں ملیں گے۔" عبدالحق کے لہجے میں جھنجلاہٹ آ گئی۔

ارجمند حیران رہ گئی۔ واقعی، آپی کا کوئی جواب نہیں۔ کیا ترکیب ہے؟ لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ آغا جی کا ایکسیڈنٹ نہ ہوا ہوتا تو آپی کیا کر لیتیں .....؟ آغا جی اسے دیکھتے تو پول نہ کھل جاتی۔

اس لمحے ایک اور بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اللہ میاں ساتھ دے رہے ہیں، پردہ رکھ رہے ہیں، ورنہ دھری رہ جاتی آپی کی عقل مندی۔ دادی اماں آنے والی تھیں تو وہ بیمار ہوگئیں۔ اب آغا جی آنے والے تھے تو حادثے نے انہیں روک دیا۔ سچ ہے، اللہ کے حکم سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

"کہاں کھو گئیں تم .....؟" عبدالحق کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کچھ سوچ رہی تھی۔"

"کیا سوچ رہی تھیں .....؟"

"یہ کہ آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا، اور آپ نے فون کر کے ہمیں بتانے کی بھی زحمت نہیں کی .....؟"

"دراصل میں بہت زیادہ ناراض تھا، اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اب فون نہیں کروں گا۔"

ارجمند حیران رہ گئی۔

"ناراض تھے آپ .....؟ کوئی غلطی ہوگئی مجھ سے .....؟"

"نہیں .....! تم سے نہیں، تم ناراض ہونے کا موقع ہی کہاں دیتی ہو .....؟

میں نور بانو سے ناراض تھا۔"

"تو میں کیوں لپیٹ میں آئی .....؟ آپ مجھے تو فون کر سکتے تھے۔"

"تم سے فون پر کب بات ہوتی ہے .....؟" عبدالحق کے لہجے میں شکایت تھی۔

"بات ہو تو مشکل سے آدھے منٹ کے بعد تم ریسیور نور بانو کو تھما دیتی ہو۔"

"آپ نے کبھی اصرار ہی نہیں کیا کہ آپ اور بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"تمہارا اپنا دل نہیں چاہا کبھی .....؟"

یہ نازک مرحلہ تھا۔ ارجمند نے بہت محتاط انداز میں جواب دیا۔

"میں دل کی باتیں کم ہی مانتی ہوں آغا جی .....! اور اپنی عادتیں خراب بھی نہیں کرنا چاہتی۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر بات کا رخ بدلا۔

"یہ بہت تشویش ناک بات ہے کہ آپ آپی سے ناراض ہیں۔ اب یہ آپ دونوں کی آپس کی بات ہے۔ مجھے پوچھنے کا حق نہیں۔"

"حالانکہ ناراضی کا سبب ہی تم ہو۔"

اس پر تو ارجمند بھونچکی رہ گئی۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکی۔

"کیا ہوا .....؟ تم فون پر موجود تو ہو نا .....؟"

"جی ..... جی ہاں .....! اصل میں مجھے شاک لگا ہے یہ سن کر۔ ایسی کون سی بات ہے کہ میری وجہ سے آپ آپی سے ناراض ہوگئے .....؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"میں تم سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا ..... تفصیل سے، لیکن جانتا تھا کہ نور بانو موقع ہی نہیں دے گی۔"

"آپی کے بارے میں یہ گمان کیسے کر لیا آپ نے .....؟" ارجمند نے خفگی سے کہا۔

"میں اسے جانتا ہوں اچھی طرح۔ وہ ایسی حاسد ہے کہ کسی کو بھی نہیں بخشتی۔ اپنا ساجد ہے نا .....! یہ مشکل سے چند ماہ کا تھا، اس سے بھی حسد کرتی تھی

نور بانو۔ میں تم سے بات کر رہا ہوتا ہوں، اور تم اچانک نور بانو کو ریسیور دے دیتی ہو، تو کیا میں اس کی وجہ نہیں سمجھ سکتا؟ اس کا منہ بن جاتا ہوگا، اور تم اس سے محبت بہت کرتی ہو۔"

"اور آپ بدگمان بہت کرتے ہیں، جو کہ بہت بری بات ہے۔ آپ نے غلط سوچا۔"

"تو پھر اصل وجہ تم بتا دو.....!"

اتنی دیر میں ارجمند سوچ بھی چکی تھی۔

"کچھ لوگ فون پر لمبی بات نہیں کر سکتے۔ اپنے گھر میں اور بھی لوگ ہیں ایسے۔"

"زبیر بھائی اور بھابی.....!"

"میں بھی انہی میں سے ہوں۔"

"اوہ.....!" عبدالحق کا لہجہ قدرے پرسکون ہوگیا۔

"اب تو آپ آپی سے ناراض نہیں ہے نا.....؟"

"میں اب بھی ناراض ہوں اس سے۔"

"کیوں.....؟"

"ایک تو میں تمہارے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔"

"آپ کے خیال میں میں جھوٹ بول رہی ہوں.....؟" ارجمند نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

اس کے لہجے کے یقین نے ارجمند کو ہلا ڈالا۔ اس کا چہرہ خفت سے تمتما اٹھا۔ جھوٹ تو اس نے بولا تھا، لیکن میاں بیوی کے درمیان ناراضی ختم کرانے کے لئے۔ لیکن جو وہ ایک عملی جھوٹ میں شامل تھی، وہ تو بہت بڑا تھا.....زندگی سے بھی بڑا۔ وہ نور بانو کی خوشی کے لئے ایثار کر رہی تھی، لیکن تھا تو وہ بھی جھوٹ ہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اللہ کے ہاں اس کا اجر ملے گا کہ اس پر سزا ملے گی۔ اس نے سوچا، عبدالحق کو اس پر اتنا یقین ہے، اگر وہ آجاتا اور اسے دیکھ لیتا تو وہ اس کی

نظروں میں کتنی حقیر ہو جاتی۔ شاید عبدالحق بھی اس کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتا۔

"لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ تم چاہتیں تو بھی نور بانو تمہیں موقع نہیں دیتی۔" عبدالحق نے بات پوری کی۔

"یہ تو زیادتی ہے آغا جی.....! یہ تو محض گمان ہے آپ کا۔"

"بات تو اور بھی ہے، اور وہ محض بدگمانی نہیں ہے۔" عبدالحق نے کہا۔

"وہ تمہیں اپنے ساتھ یہاں لے کر آئی، جبکہ اس کا جواز نہیں تھا کوئی۔ وہ اپنی منت پوری کرتی۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔"

"مجھے اس میں کوئی زیادتی نہیں نظر آتی۔ میں اپنی خوشی سے یہاں آئی ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ کام آپ کی اجازت سے ہی ہوا ہے۔ اس پر آپ خفا کیسے ہو سکتے ہیں.....؟"

عبدالحق چند لمحے خاموش رہا۔ قصور وار تو وہ تھا۔ اور اب تو یہ بات ارجمند نے بھی کہہ دی تھی۔ اگرچہ اس کا انداز الزام لگانے والا نہیں تھا۔ پھر اس نے کہا۔

"یہی تو بات ہے۔ نور بانو نے کہا، اور میں نے اس کی محبت میں مان لیا۔ لیکن یہ میں نے تمہارے ساتھ بے انصافی کی۔ تم میری بیوی ہو۔ تمہیں میرے ساتھ رہنے کا حق تھا۔ اب اس پر اللہ کے سامنے جواب دہ میں ہوں، نور بانو تو نہیں۔"

"غلطی آپ اپنی مان رہے ہیں اور خفا آپی سے ہو رہے ہیں۔ عجیب سی بات ہے نا.....!"

"تمہیں یہ بات عجیب لگتی ہے تو شاید تم محبت کو سمجھتی نہیں ہو۔ میں نور بانو سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا، اور وہ یہ بات جانتی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

"خیال نہیں، یہ حقیقت ہے۔" ارجمند اس کی بات کاٹ دی۔

"تو ایسے میں کیا میں نور بانو کی ذمہ داری نہیں۔" عبدالحق نے تیز لہجے میں کہا۔

"اسے مجھ سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے، جس پر مجھے اللہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے، اس کی محبت نے مجھے کوئی کمزوری دی ہے تو اسے اس کے سلسلے میں مجھے آزمائش سے بچانا چاہئے، نہ کہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اب دیکھو نا.....! میں دوسری شادی سے اسی لئے تو گھبراتا تھا کہ انصاف کرنا بہت مشکل ہے۔ اس نے ضد کر کے مجھے مجبور کیا، اور پھر خود ہی مجھ سے بے انصافی کرائی۔"

"آپ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہیں۔" ارجمند نے بے پرواہی سے کہا۔

"چلو..... ٹھیک ہے.....! میں جانتا ہوں کہ تم جھوٹ نہیں بولتیں۔ تو میں تم سے ایک بات پوچھتا ہوں، اس کا جواب دو۔ بولو، دو گی.....؟"

"جی ضرور.....!"

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا.....؟"

"جو بات آپ یقینی طور پر جانتے ہیں، اسے بار بار پوچھنا تو مناسب نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں شرمندہ ہوتی ہوں۔"

"مجبوراً پوچھا ہے۔ اب ذرا خود کو نوربانو کی جگہ اور نوربانو کو اپنی جگہ رکھ کر سوچو، اور مجھے بتاؤ کہ کیا تم مجھ سے وہ سب کچھ کروا سکتی تھیں، جو نوربانو نے کروایا۔"

ارجمند خاموش رہ گئی۔ اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا اس کے پاس۔ اور جو جواب تھا، وہ نوربانو کے خلاف جاتا تھا۔

"نہیں دینا چاہتیں نا اس کا جواب.....!"

"پتا نہیں.....! آپ کیا کروانے کی بات کر رہے ہیں.....؟" ارجمند نے بات گھمانے کی کوشش کی۔

"تم نوربانو کی جگہ ہوتیں تو کیا اس سے میری شادی کرانے کے لئے اصرار کرتیں.....؟"

"یقیناً کرتی.....!" ارجمند کے لئے یہ جواب نہایت آسان تھا۔

"پھر تم منت مانتیں، اور اسے اپنے ساتھ ایبٹ آباد بھی لے جاتیں۔

اور وہ بھی مجھ سے اجازت لے کر۔"

ارجمند خاموش رہی۔

"جواب دو نا.....! مجھے معلوم ہے کہ کہو گی تم سچ ہی۔"

"نہیں.....! میں ایسا نہیں کرتی۔"

"صرف اس لئے نا کہ تم مجھے خسارے میں نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ تم نے مجھے پہلی رات ہی بتا دیا تھا۔ تم مجھے کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھ کر خاموش بھی نہیں رہ سکتیں، جس کی مجھے اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے۔ لیکن نوربانو کو اس کی پرواہ نہیں۔ اس نے تو دانستہ مجھے خسارے میں ڈال دیا۔ تو میں اس سے ناراض بھی نہ ہوں.....؟"

"اللہ نہ کرے کہ آپ کو کبھی خسارہ ہو..... اور وہ بھی میری وجہ سے۔ انشاء اللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیسے.....؟"

"شاید آپ بھول گئے۔ جب ہماری شادی کی بات چلی تھی، اور آپ مجھ سے پوچھنے، بلکہ مجھے سمجھانے کے لئے آئے تھے کہ میں خسارے کا سودا کر رہی ہوں۔ کیونکہ آپ صرف آپی سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے آپ کی محبت نہیں مل سکے گی۔"

"شرمندہ کر رہی ہو مجھے.....!"

"ہرگز نہیں.....! یہ بھی میرے جیتے جی انشاء اللہ کبھی نہیں ہوگا۔ میں صرف آپ کو ایک بات یاد دلا رہی ہوں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں آپ سے کبھی کچھ طلب نہیں کروں گی۔ اور میں نے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کے ساتھ رہتے ہوئے آپ کی کسی بات پر کبھی دکھ نہیں کروں گی۔ اور دکھ ہوا تو بھی میں ابھی سے اللہ کے سامنے آپ کو اس سے بری قرار دیتی ہوں۔ میں پھر دہراؤں آغا جی.....! اللہ مجھے اس سے محفوظ رکھے کہ میں زندگی کی سب سے بڑی نعمت پر شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی شکایت کروں۔ یہ میں صرف اس لئے دہرا رہی ہوں آغا جی.....! کہ میں نے اللہ کو گواہ بنا کر آپ کو اپنے معاملے میں ہر

جواب دہی سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس لئے آپ کو آپی سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں۔''

دوسری طرف خاصی دیر خاموشی رہی۔ پھر عبدالحق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''جزاک اللہ ... ! ارجی..... ! اللہ نے تمہیں بڑائی دی ہے، اور مجھے تمہارے روپ میں بہت بڑی نعمت، جس کی میں کبھی قدر نہیں کر پایا۔''

''بس.....! میری تعریف نہ کریں بلاوجہ.....''

''لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم نے خود اللہ کے سامنے اپنی جواب دہی کی فکر نہیں کی۔''

ارجمند دہل گئی۔

''کیا کہہ رہے ہیں آغا جی.....!''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

''کس معاملے میں.....؟''

''یہاں..... ایبٹ آباد آنے کے معاملے میں۔'' عبدالحق نے کہا۔

''تم نے مجھے اجازت لینے کی زحمت بھی نہیں کی۔''

''لیکن آپ نے اجازت دی تو تھی۔ آپی نے کہا تھا.....''

''اللہ کی طرف سے تم پر میری اطاعت فرض ہے، نوربانو کی نہیں۔ تم اگر مجھ سے پوچھتیں تو شاید مجھے خیال آجاتا کہ یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہے۔ میں تم پر اپنے حق سے دست بردار ہونے کا حق رکھتا ہوں، لیکن تمہارا حق سلب کرنے کا تو مجھے اختیار نہیں تھا۔'' عبدالحق کے لہجے میں تاسف تھا۔

''یہ تو ٹھیک کہا آپ نے ...! مجھ سے واقعی بڑی بھول ہوئی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔''

''ایسے نہ کہو... ! معاف تو تمہیں کرنا ہوگا مجھے۔''

''بس ..... ! اس بات کو چھوڑیں۔ آپی سے اپنی ناراضی ختم کر دیں۔''

''کر دوں گا۔ لیکن اب ہمیشہ چوکنا رہوں گا اس کی طرف سے۔''

ارجمند نے اس لمحے سوچا کہ اگر اس نے نوربانو کے ساتھ ایبٹ آباد آنے کے سلسلے میں عبدالحق سے اجازت طلب کی ہوتی، اور عبدالحق کو اس حق تلفی کا خیال آجاتا اور وہ اسے روک دیتا تو کیا ہوتا.....؟

ایک لمحے کو وہ خوش ہوگئی۔ یوں وہ اور نوربانو اس جھوٹ سے بچ جاتے..... اس بہت بڑے عملی جھوٹ سے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آیا کہ نوربانو اس سے خفا ہو جاتی۔ اور یہی نہیں، خود وہ بھی نوربانو سے وعدہ خلافی کی مرتکب ہوتی۔ کیونکہ ناسمجھی میں ہی سہی، لیکن اس نے نوربانو سے وعدہ کیا تھا کہ اپنا بچہ اسے دے گی۔

''کیا ہوا.....؟ بری لگی میری یہ بات.....؟'' عبدالحق نے اسے چونکا دیا۔

''اتنی محبت کرتی ہو نوربانو سے.....!''

''جو جانتے ہیں، وہ پوچھتے کیوں ہیں ؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''مجھ سے بھی زیادہ.....!''

''یہ بھی آپ جانتے ہیں۔ خود سے ہی پوچھ لیں.....!'' ارجمند کچھ خفا سی ہوگئی۔

''چلو.....نہیں پوچھتا۔ پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں .....!''

''اور اب اپنی بدگمانی پر بھی غور کر لیں۔ یہ اتنی طویل گفتگو جو ہمارے درمیان ہوئی ہے، اس کا سبب آپی ہیں۔ وضو کر کے نماز کے لئے جاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا تھا آپ کو فون کرنے کو، اتنے دن سے آپ کا فون نہیں آیا تھا۔''

عبدالحق کے لئے تو وہ دہری خوش خبری تھی۔ ایک طرف نوربانو کا دل کشادہ ہوا تھا دوسری طرف وہ نماز پڑھ رہی تھی۔

''تو اب تک تو وہ نماز پڑھ چکی ہوگی۔ میری بات کرا دو اس سے۔'' اس نے کہا۔

''جی نہیں .....! میں نہیں کراؤں گی بات.....!'' ارجمند نے شوخ لہجے میں کہا۔

"میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"

عبدالحق ہنسنے لگا۔

"تمہارے منہ سے کتنی اوپری اور غیر حقیقی لگ رہی ہے یہ بات......! بات کراؤنا نور بانو سے۔"

"سوری آغا جی...! ممکن نہیں ہے۔" ارجمند سنجیدہ ہوگئی۔

"آپی کہہ کر گئی ہیں کہ نماز کے بعد وہ قرآن پڑھیں گی۔ اس لئے آج آپ سے ان کی بات نہیں ہو سکے گی۔ اور ابھی تک تو انہوں نے نماز بھی نہیں پڑھی ہوگی۔"

عبدالحق کو لگا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے...!"

"جی آغا جی......! الحمد للہ......!"

"چلو......اسے میرا سلام کہہ دینا۔ میں پھر کسی دن فون کروں گا۔"

"آپ اپنا خیال رکھئے گا......!"

"وہ تو مجھے آتا ہی نہیں......!"

"میں آپ کے لئے بہت دعا کرتی ہوں۔ اب اور زیادہ کروں گی۔"

"جزاک اللہ ارجی......!" عبدالحق کے لہجے میں محبت تھی۔

"اللہ حافظ......!"

"فی امان اللہ آغا جی......!" ارجمند نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کسی سے یہ بات کہہ نہیں سکتی تھی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ درد اب ہر روز ہوتا تھا۔ دوا سے وقتی طور پر آرام آجاتا تھا۔ مگر دوا کی دوسری خوراک کا وقت آنے سے پہلے ہی پھر جاگ اٹھتا تھا۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا تھا کہ وقت سے پہلے دوا ہرگز نہ لی جائے۔ سو اسے وہ وقت گزارنا ہوتا تھا۔ ہر لمحہ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اندر سے کٹ رہی ہے۔

ستم یہ تھا کہ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر دوا کھانے کے بعد آرام کے وہ دورانیے سکڑنے لگے۔ درد ناقابل برداشت ہوتا تو وہ وقت سے پہلے ہی دوا لے لیتی۔ اور جب بہت مجبور ہو جاتی تو ڈاکٹر باسط کو بلانا پڑ جاتا۔ ویسے اس سے وہ بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر باسط کے چہرے پر ہر بار پہلے سے گہری تشویش ہوتی اور اس سے آپریشن کے لئے کہتے ہوئے ہر بار ان کے لہجے میں پہلے سے زیادہ اصرار ہوتا۔

"آپ اپنے ساتھ بہت بڑا ظلم کر رہی ہیں مسز عبدالحق......!" وہ کہتے۔

"آپ صورت حال کی سنگینی کو نہیں سمجھ رہی ہیں۔ معاملہ بہت بڑھ چکا ہے۔ آپ کو فوری طور پر آپریشن کرا لینا چاہئے۔"

"درد اتنا زیادہ بھی نہیں۔"

"اہمیت درد کی نہیں، اصل بیماری کی ہے۔ درد تو محض اطلاعی گھنٹی کی ہے۔"

ڈاکٹر باسط نے دوا تبدیل کی، پھر اس کی مقدار بڑھا دی۔

نور بانو اب ذہنی طور پر آپریشن کے لئے تیار تھی۔ صورت حال کی سنگینی کا اسے بھی احساس ہوگیا تھا۔ مگر ارجمند کی فراغت سے پہلے یہ آپریشن اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ ڈر تھا کہ پول کھل جائے گا۔ جھوٹ پکڑا جائے گا۔ اس نے بہت سوچا تھا کہ خود ہی اس جھوٹ کو کھول دے۔ لیکن دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ اس میں نقصان ہی نقصان تھا۔ یہ خدشہ الگ کہ وہ کہیں عبدالحق کو ہی نہ کھو بیٹھے۔

وہ باقاعدگی سے استغفار کرتی، ہر نماز کے بعد گڑگڑا کر توبہ کرتی۔ دل سے عملی توبہ کے لئے اصرار ابھرتا تو وہ منہ پھیر لیتی۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ ہاں، بعد میں وہ سچ کھول دے گی۔

وہ اللہ سے دعا کرتی کہ ارجمند کی فراغت تک اس کی بیماری کو روکے رکھے۔ پھر وہ آپریشن بھی کرا لے گی، اور عبدالحق آئے گا تو اسے حقیقت بھی بتا دے گی۔

لیکن درد کے دورانیے بڑھ رہے تھے، اور آرام کے دورانیے سکڑ رہے تھے۔

وہ اب ایک ایک دن گن رہی تھی۔ تقریباً ہر روز ہی وہ رشیدہ سے اس بارے میں بات کرتی۔

''اب کتنے دن رہ گئے ہیں ....؟''

رشیدہ کی زبان پر جواب تیار ہوتا تھا۔

''کچھ جلدی نہیں ہو سکتا۔''

''اس پر کس کا اختیار ہے بیگم صاحب .... ! سوائے اللہ کے۔''

''اور دیر بھی تو ہو سکتی ہے ....؟'' وہ گھبرا کر پوچھتی۔

''دو چار دن ادھر ادھر تو ہو ہی جاتے ہیں بیگم صاحب .... !''

ڈاکٹر باسط آخری بار آئے تو جاتے ہوئے بے حد خفا تھے۔

''اب خدانخواستہ طبیعت خراب ہو تو مجھے نہیں بلوائیے گا۔'' انہوں نے کہا۔

''ناراض نہ ہوں ڈاکٹر صاحب .... ! بس چند دن ....''

''میں ناراض نہیں ہوں۔'' ڈاکٹر نے بے رخی سے کہا۔

''تو پھر یہ کیوں کہا آپ نے ....؟''

''میرے آنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا آپ کو۔ اب آپریشن کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

''بس چند دن کی بات ہے ڈاکٹر صاحب .... !''

''یہ تو آپ کئی ہفتوں سے کہہ رہی ہیں۔ بہرحال آپ جانیں۔ میں اب آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔''

اور اب واقعی دن تھوڑے ہی رہ گئے تھے۔ عبدالحق کی طرف سے وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ حادثے کے نتیجے میں وہ چھ ہفتوں کے لئے معذور ہوا تھا۔ یہ عرصہ تقریباً اتنا ہی تھا۔ گویا عبدالحق کو خوش خبری پہنچے گی تو وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو چکا ہوگا۔

اس روز اس نے رشیدہ سے پوچھا۔

''اب کتنے دن رہ گئے ہیں ....؟''

''اللہ کی رحمت ہوئی تو بس سات دن .... !''

نور بانو خوش ہو گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔

جس روز اس نے ڈیوٹی جوائن کی، ذرا دیر بعد ہی کلکٹر صاحب کا بلاوا آ گیا۔

وہ ان سے ملنے چلا گیا۔

''آؤ بیٹھو عبدالحق .... ! اب کیسے ہو ....؟'' کلکٹر صاحب نے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے جناب .... !''

''اب تکلیف تو نہیں ہے نا ....؟''

''جی نہیں .... ! الحمد للہ .... !''

''تم بہت خوش نصیب ہو عبدالحق .... !''

عبدالحق نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''بہت بڑا اعزاز ملا ہے تمہیں .... !'' کلکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''سعودی حکومت نے تمہارے محکمے سے چار افراد کے نام مانگے ہیں۔ اور یہ تمام لوگ اس سال سعودی حکومت کے سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے حج کی سعادت حاصل کریں گے۔ یہ وہاں شاہی مہمان کی حیثیت سے قیام کریں گے۔''

عبدالحق خوش ہو گیا۔

''سبحان اللہ .... ! الحمد للہ .... ! بے شک یہ اللہ کا فضل عظیم ہے۔''

کلکٹر صاحب نے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی۔

''تم نے جو سعودی شہزادے کے ساتھ تعاون کیا تھا، یہ اس کا صلہ ہے۔ اور کتنا اچھا صلہ ہے۔ اب ان چار میں ایک تو تم ہی ہو۔ دیگر تین تمہیں منتخب کرنے ہیں، پھر یہ فارم بھر کر بھجوانے ہیں۔'' وہ کہتے کہتے رکے۔

''اگر تم اسے دخل در معقولات نہ سمجھو تو میرا ایک مشورہ ہے۔''

"کیسی بات کرتے ہیں جناب .....! آپ کا مشورہ تو میرے لئے مشعل راہ ہوگا۔ حکم کیجئے.....!"

"ایسے لوگ منتخب کرنا، جو صاحب استطاعت نہ ہوں، جو اپنے طور پر حج کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ اس کا تمہیں بڑا اجر ملے گا۔"

"جزاک اللہ جناب .....!" عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

"کتنا اچھا اور درست مشورہ دیا ہے آپ نے۔ اور اب میں سب سے پہلے اسلام آباد فون کر شہزادے کا شکریہ ادا کروں گا۔"

"وہ اب یہاں نہیں ہیں۔ وطن واپس جا چکے ہیں۔"

عبدالحق حیران رہ گیا۔

"اتنی جلدی .....!"

"ہاں..... ! انہیں سعودی کابینہ میں وزارتِ داخلہ کا قلم دان سونپا گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے جناب .....!" عبدالحق اٹھ کھڑا ہوا۔

"تمام فارم پر کر کے، تصویروں کے ساتھ جلد از جلد مجھے بھجوا دو۔ تین دن بعد یہ فائل سفارت خانے بھجوانی ہے۔"

"بہت بہتر جناب.....!"

عبدالحق واپس آیا تو اس کے جسم میں ہیجان سا بپا تھا۔ کتنی بڑی آرزو پوری ہو رہی تھی اس کی، اور کیسے اعزاز کے ساتھ۔ وہ اور بیت اللہ شریف، اور روضہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم .....! کہاں میں، کہاں یہ مقام.....؟ اللہ..... !

وہ سرشار ہو گیا۔ جاگتے میں جیسے خواب دیکھنے لگا۔

پہلی بار اسے احساس ہوا کہ جس حیثیت میں اسے اس مقدس سرزمین پر قدم رکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، وہ بہت بڑی ہے۔ اس کے بہت فائدے ہیں۔ اس میں اس کے ہر خواب کو تعبیر مل جائے گی۔

برسوں سے وہ سوچتا تھا کہ اسے یہ سعادت ملی تو وہ ہر اس جگہ جائے گا،

جہاں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدم رکھے۔ وہ اس پاک ریت کے ہر ذرّے کو چومے گا، آنکھوں سے لگائے گا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدم پڑے ہوں گے۔ اور وہ ادب کا ہر تقاضا پورا کرے گا۔ وہ وہاں پاؤں رکھنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ وہ وہاں ہتھیلیوں اور گھٹنوں کے بل چلے گا۔ صدیوں سے پھیلی ہوئی وہ ریت، جس کا ہر ذرہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ کفِ پا کی پاک اور مقدس امانت لئے ہوئے ہے۔ وہ اپنا وجود وہیں قربان کر دے گا۔ وہ وہاں سے واپس ہی نہیں آئے گا۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ اگر اسے جانے کی سعادت نصیب ہوئی تو وہ وہاں بس مناسک حج ادا کر سکے گا۔ اس کے علاوہ چند خاص مقامات کی زیارت کر سکے گا، اور بس..... اس سے زیادہ تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔

اور وہ ایسا پیاسا تھا، جو قطرے سے تو کیا دریا سے، سمندر سے بھی نہ بہلے۔ وہ تو ساتوں سمندر پی جانا چاہتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ چند قطروں سے زیادہ کی اس کی اوقات نہیں۔

مگر وہ دینے والا کیسا کریم تھا۔ اس نے اوقات کے مطابق تو کبھی کسی کو دیا ہی نہیں۔ وہ تو ہر ایک کو بغیر مانگے ہی اوقات سے سوا دیتا ہے۔ کوئی ایک جام کا طلب گار ہو، اور اس کی رحمت جوش میں ہو تو مے خانے کا مے خانہ دے دے۔ ایک وہی تو ہے، جس سے اپنی اوقات سے بہت..... بہت..... بہت زیادہ بڑھ کر مانگا جا سکتا ہے، اور مل بھی جاتا ہے۔

اور اسے مل گیا تھا۔

اپنے دفتر کی تنہائی میں بیٹھے عبدالحق کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ جس اعزاز کے ساتھ اسے اذنِ باریابی عطا کیا گیا تھا، اس میں سب کچھ ممکن تھا۔ اس کے ہر خواب کو تعبیر مل جاتی تھی۔ وہ ہر جگہ جا سکتا تھا..... سرکاری مہمان، شاہی مہمان، بادشاہوں کے بادشاہ کا مہمان!

دیر تک وہ سن بیٹھا رہا۔ فائل اس کے سامنے رکھی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نہ بجتی تو شاید وہ اس کیفیت سے نکل ہی نہ پاتا۔

فون پر بات کرنے کے بعد اس نے فائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فائل کھولی تو اسے پہلی بار احساس ہوا کہ یہ صرف خواب کی تعبیر کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ اس پر بہت بھاری ذمہ داری بھی ہے ..... بھاری ذمہ داری ... !

اسے تین افراد کا انتخاب بھی کرنا ہے، ایسے افراد کا جو اس اعزاز کے مستحق ہوں۔

اس نے اپنے پی اے کو طلب کیا۔

''یس سر ... !''

''اکاؤنٹس میں کام کرنے والے تمام اسٹاف کی پرسنل فائلیں درکار ہیں مجھے۔''

''بہت بہتر سر ... !''

''یہ ارجنٹ ہے ... !''

''یس سر ... !''

پی اے چلا گیا۔

ایک گھنٹے بعد تمام فائلیں اس کی میز پر تھیں۔

وہ ہر کام بھول کر ان کی چھان بین میں مصروف ہوگیا۔ اپنے تقریباً تمام اسٹاف کو وہ جانتا تھا۔ فائلوں کا اہتمام اس لئے کیا کہ ذہن سے کوئی نام محو نہ ہو جائے، اس سے بے انصافی سرزد نہ ہو جائے۔

جو کھلے راشی تھے، انہیں تو اس نے فوراً ہی ایک طرف کر دیا۔ پھر کچھ لوگ مشتبہ تھے، انہیں بھی اس نے اپنی فہرست سے خارج کر دیا۔ یہ امر بھی اسے بہت حوصلہ افزا معلوم ہوا کہ ایک 113 میں سے 11 افراد ایسے ہیں، جن کے بارے میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ رشوت نہیں لیتے۔

اب مرحلہ سخت تھا۔ ان گیارہ افراد میں سے اسے تین کو منتخب کرنا تھا۔ یہ خیال رکھنا بھی ضروری تھا کہ فیصلہ وہ اپنی پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ کرے۔ ان میں سے ہر شخص کو ڈراپ کرنا اس کے لئے بہت بڑی ذمہ داری تھی۔

شام تک اس نے اس کے سوا کوئی کام نہیں کیا۔ اس حد تک وہ کامیاب

ہوگیا کہ فہرست میں صرف چار نام رہ گئے۔ لیکن اب اس کے سامنے جو مرحلہ تھا، وہ بہت دشوار تھا۔ یہ چار افراد ایسے تھے کہ ان میں سے کسی کا نام قلم زد کرنے میں اسے زیادتی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس فہرست میں سے کسی کو نکالنا کیسے ممکن ہے؟

یہ فیصلہ آج ہی ہو جانا چاہئے۔ اس نے سوچا۔ اگلے دن فارم بھروا لئے جائیں، اور اس سے اگلے دن فائل مکمل کر کے کلکٹر صاحب کو دے دی جائے۔ لیکن ایک نام کو قلم زد کرنے کے اس مرحلے سے کیسے گزرا جائے۔ بہت بڑی ذمہ داری ہے یہ، بہت بڑا بوجھ ہے۔

❁ ❁ ❁

حمیدہ کی کمزوری بڑی حد تک رفع ہو چکی تھی۔ اب وہ سہارے کے بغیر باتھ روم چلی جاتی تھی۔ البتہ واپس آتے آتے وہ ہانپ جاتی تھی، اور خاصی دیر تک اسے آرام کرنا پڑتا تھا۔

اس عرصے میں وہ عبدالحق کو بہت یاد کرتی رہی تھی۔ بہت کمی محسوس ہوتی تھی اس کی۔ کبھی اسے خیال آتا کہ یہ سب اس کی اپنی وجہ سے ہے، اس کا اپنا کیا دھرا ہے۔ اس نے عبدالحق کو ایبٹ آباد جانے کا حکم دیا۔ عبدالحق اس کا حکم ٹال نہیں سکتا تھا، اور اللہ کی یہ مرضی نہیں تھی، سو عبدالحق کو حادثہ پیش آ گیا۔ یوں وہ اس کے حکم کی تعمیل سے بچ گیا۔ اور اسے اس کی سزا ایسے ملی کہ ہر ہفتے عبدالحق کے آنے سے جو خوشی اور راحت اسے ملتی تھی، وہ اس سے محروم ہوگئی۔

اسے پھر بابا کی یاد آ گئی۔ جب تک اللہ پردہ رکھ رہا ہے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اس نے تو کوشش کر کے نتیجہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اب تو یہی امید تھی کہ جھوٹ کو ہار جانا ہے۔ فتح سچ کی ہی ہوگی۔ اور یہ امید نہیں تھی، یقین تھا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ خوش خبری کا وقت تو تقریباً آ پہنچا ہے۔ اس کے وجود میں خوشی ہیجان بن کر دوڑنے لگی۔ ارے واقعی .....! مجھے تو یہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تو کسی بھی دن......

اس نے رابعہ کو پکارا، اور پکارتی ہی چلی گئی۔

رابعہ دوسرے کمرے میں تھی۔ وہ یہ پکار سن کر گھبرا گئی۔ اماں نے کبھی ایسے پکارا نہیں تھا۔ وہ تو ایک آواز دے کر چپ ہو جاتی تھیں۔ پھر ضرورت پڑے تو دوسری آواز......

وہ گھبرا کر اس کے کمرے میں آئی۔

''کیا بات ہے اماں......! خیر تو ہے......؟''

''ہاں......! خیر ہی خیر ہے۔ مجھے عبدالحق سے بات کرنی ہے......ابھی، اسی وقت......!''

''مجھے تو آتا نہیں اماں......! آپ کو تو پتا ہی ہے۔ میں ابھی ساجد کو بھیجتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔

حمیدہ تو ایسی بے صبری ہو رہی تھی کہ ایک پل بھی گھنٹہ بھر کا لگ رہا تھا۔

وہ بستر پر لیٹی پہلو بدلتی رہی۔

کوئی پانچ منٹ بعد ساجد کمرے میں آیا تو وہ ہلکان ہو چکی تھی۔

''کہاں رہ گیا تھا رے تو......؟'' وہ اس پر برس پڑی۔

''پڑھ رہا تھا دادی......!''

''جلدی سے نمبر ملا اپنے چاچا کا......!''

ساجد نے نمبر ملایا۔ تین چار گھنٹیوں کے بعد فون عبدالحق نے ہی اٹھایا۔

ساجد نے اسے سلام کیا۔

''کیسے ہو ساجد......؟'' عبدالحق نے سلام کا جواب دینے کے بعد کہا۔

''پڑھائی کیسی چل رہی ہے......؟''

''امتحان کی تیاری ہو رہی ہے چاچا......!''

''میری بات کرانا......تو تو خود ہی شروع ہوگیا۔'' حمیدہ نے اسے ڈانٹا۔

''دادی سے بات کریں چاچا......!'' ساجد نے جلدی سے کہا اور ریسیور حمیدہ کی طرف بڑھا دیا۔

ریسیور ہاتھ میں آتے ہی حمیدہ پرسکون ہوگئی۔ سارا اضطراب ختم ہوگیا۔

''تو اب کیسا ہے پتر......!'' اس نے پوچھا۔ اسے اچانک اس کا حادثہ یاد آ گیا تھا۔

''تکلیف تو نہیں ہے زیادہ......؟''

''نہیں اماں......! اللہ کا شکر ہے۔ اب میں چل پھر سکتا ہوں۔ آج تو میں دفتر بھی گیا تھا۔''

حمیدہ اسے فوری طور پر ایبٹ آباد جانے کا حکم دینا چاہتی تھی، مگر فوراً ہی اسے پچھلے حکم کے نتائج کا خیال آ گیا۔ اس نے اس حکم کو اپنی نوک زبان پر روک لیا۔

''اور تم کیسی ہو اماں......؟''

''اب تو بہت بہتر ہوں۔ چل پھر بھی لیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے......!''

''الحمدللہ......!''

''میں تیری بہت کمی محسوس کرتی ہوں پتر......! بہت یاد کرتی ہوں تجھے۔ عادت ہوگئی تھی نا تیرے آنے کی۔''

''اس ہفتے انشاءاللہ آؤں گا تمہارے پاس......!''

اسے تو اندازہ بھی نہیں کہ میرے پاس آنے کے بجائے اسے ایبٹ آباد جانا ہوگا، عجیب بے وقوف لڑکا ہے۔ حمیدہ نے جھنجلا کر سوچا۔ پھر بولی۔

''تو ایبٹ آباد فون کر کے خیریت تو معلوم کر لے پتر......!''

''ٹھیک ہے اماں......! ابھی کرلوں گا فون......!''

''میرے حساب سے تو اب تجھے خوش خبری ہی ملے گی۔''

''انشاءاللہ اماں......! بس دعا کرو، سب کچھ خیر و عافیت سے ہو۔''

''اس دعا کے سوا اور کرتی کیا ہوں میں......؟'' حمیدہ نے کہا۔

''بس دو ہی تمنائیں ہیں میری۔ ایک تیرے پتر کو گود میں لے لوں اور اس کے بعد تیرے ساتھ حج پر چلی جاؤں۔ ایک تو ہی تو ہے، جس کے ساتھ میں جا سکتی ہوں۔''

''انشاءاللہ......! تمہاری ہر خواہش پوری ہوگی اماں......! اللہ تمہیں بہت

لمبی عمر دے گا، اور تم انشاء اللہ خواہشیں کرتی رہو گی، اور اللہ پوری کرتا رہے گا۔"

"خوش رہ پتر ...! تو فون ضرور کر لینا۔ پھر مجھے بھی بتا دینا۔"

"ضرور اماں ...! خدا حافظ ...!"

"خدا حافظ پتر ...!" حمیدہ نے ریسیور ساجد کی طرف بڑھا دیا۔ ساجد نے ریسیور کان سے لگا لیا۔ رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور کمرے سے نکل گیا۔

حمیدہ بستر پر دراز ہو گئی۔ اس کے دل میں اور ہونٹوں پر دعائیں تھیں۔

❁ ❁ ❁

نور بانو کا دل اب گھبرا رہا تھا۔ درد اب ایک طرح سے معمول بنتا جا رہا تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دینے لگا تھا۔ برداشت اب جیسے اس کے جسم کو چاٹ رہی تھی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔

اس رات اس نے رشیدہ سے بات کی۔

"تمہارا اندازہ تو درست ثابت نہیں ہوا۔" اس کا انداز الزام دینے والا تھا۔

"اندازہ تو اندازہ ہی ہوتا ہے بیگم صاحب ...! ہوتا سب کچھ اللہ کے مقرر کئے ہوئے وقت پر ہے۔"

"مگر تم نے کہا تھا کہ تم بڑی تجربہ کار ہو۔"

"دو چار دن ادھر یا ادھر ہو جانا معمولی بات ہے بیگم صاحب ...!" رشیدہ نے عاجزی سے کہا۔

"میری جان پر بنی ہوئی ہے۔" نور بانو نے چڑچڑے پن سے کہا۔ پھر بولی۔

"ارجمند کیا کر رہی ہے ...؟"

"سو رہی ہیں۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ نور بانو کو یقین تھا کہ یہ عبدالحق کا فون ہے۔ اس نے رشیدہ سے کہا۔

"تم ارجمند کے پاس جاؤ۔ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں ہٹنا اس کے پاس سے۔ کون جانے، آج ہی ..." اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

"جی بیگم صاحب ...!" رشیدہ نے کہا اور کمرے سے نکل گئی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ ارجمند کے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ نور بانو دوسرے کمرے میں منتقل ہو گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد نور بانو نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عبدالحق ہی تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے نور ...!" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جی ... میں ٹھیک ہوں۔"

"میں تو خوش خبری کا انتظار کر رہا تھا۔ اب تک تو آ جانی چاہئے تھی۔"

نور بانو کے لئے عبدالحق سے یہ بات سننا باعث تشویش تھا۔ اس نے اس کی بات کو غیر موثر بنانے کے لئے جارحانہ انداز میں کہا۔

"ارے ...! یہ آپ عورتوں کا حساب کب سے رکھنے لگے ...؟ یہ تجربہ کہاں سے مل گیا آپ کو ...؟"

عبدالحق شاید کچھ کھسیا گیا۔

"نہیں بھئی ...! میں کیا جانوں یہ سب ...؟"

"تو پھر ...؟" نور بانو کی تشویش اور بڑھ گئی۔

"ابھی اماں سے فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھیں ..."

"اماں کو کیا پتا ...؟ پھر ان کی طبیعت خراب ہے۔ ابھی تو کچھ دن ہیں۔" نور بانو نے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے صحیح بات بتا دی تو عجیب نہیں کہ عبدالحق سب کچھ بھول کر دوڑا چلا آئے۔ عین وقت پر گڑبڑ ہو جائے۔

"ویسے سب کچھ ٹھیک ہے نا ...! مجھے تمہاری طرف سے بڑی فکر ہے۔"

عبدالحق کے لہجے میں اسے پریشانی محسوس ہوئی۔

"یہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ آپ اس طرف سے ..." اچانک درد کی ایک تند لہر اٹھی۔ اس کی آواز بدل گئی۔

"بے فکر رہیں۔" اس نے بات پوری کی۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔"

"یہ تمہاری آواز کیا ہوگیا......؟" عبدالحق سچ مچ پریشان ہوگیے۔

"مجھے تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔"

"کچھ بھی نہیں، وہم ہے آپ کا۔" نوربانو نے اسے تسلی دی۔ ... اب موج درموج ہوگیا تھا۔ وہ آواز پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آپ کا کیا حال ہے......؟ ہڈی جڑ گئی آپ کی......؟" اس نے بات کا رخ بدلا۔

"میں ٹھیک ہوں...... اللہ کا شکر ہے......! آج سے دفتر جانا شروع کیا ہے میں نے۔"

تو یہاں بھی آسکتے ہیں۔ نوربانو نے دل میں سوچا۔ درد اب شدت پکڑ رہا تھا۔

"اب میں خود ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گی۔" اس نے دانتوں سے نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ اب فون مت کیجئے گا......!"

"مجھے تمہاری آواز نارمل نہیں لگ رہی ہے۔ لرز رہی ہے تمہاری آواز۔ طبیعت خراب ہو رہی ہے نا تمہاری......؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسے میں بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ اب میں بات نہیں کرسکتی۔"

"اچھا......! ارجمند سے بات کرا دو۔" عبدالحق کے لہجے میں پریشانی تھی۔

"وہ سوگئی ہے۔"

"اتنی جلدی......! تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے، اور وہ سو رہی ہے۔" عبدالحق نے غصے سے کہا۔

"میں ٹھیک ہوں۔ طبیعت اس کی خراب ہے۔" اب درد کی وجہ سے بات

کرنا نوربانو کے لئے دوبھر ہو رہا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ ایک لفظ کہے بغیر ریسیور رکھ دیتی۔ لیکن یوں عبدالحق کی پریشانی بڑھ جاتی، اور اس کے یہاں چلے آنے کا خطرہ بڑھ جاتا۔ اس امکان کے مقابلے میں تو مرجانا اس کے نزدیک زیادہ بہتر تھا۔

"اسے کیا ہوا......؟"

"پیٹ میں بہت شدید درد اٹھا تھا اس کے۔ نڈھال ہوگئی تھی۔" نوربانو نے اپنی کیفیت بیان کر دی۔

"آرام آیا تو سوگئی۔"

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں......؟"

"آپ تو بس پریشان ہونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔" نوربانو نے چڑ کر کہا۔

"اچھا......! اب میں فون رکھ رہی ہوں، خدا حافظ......!"

ریسیور رکھ کر اس نے گہری سانس لی۔ اسے احساس نہیں تھا کہ درد کی برداشت کرنے کی کوشش میں اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو اس بری طرح چبایا ہے کہ وہ لہولہان ہوگیا ہے۔

اس بار درد کی ایسی لہر اٹھی کہ ضبط ممکن ہی نہیں رہا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اب ضبط کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے حلق سے ایسی خوف ناک چیخ نکلی، جس نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر وہ صوفے پر ڈھے گئی۔

❁ ❁ ❁

عبدالحق نوربانو کی گفتگو سے غیر مطمئن تھا، لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ دل تو اس کا یہی چاہا تھا کہ ابھی اٹھے اور ایبٹ آباد کے لئے روانہ ہو جائے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ گیا کہ جہاں اتنے مہینے گزار لئے، ایک ہفتہ اور سہی۔

دل بہرحال پریشان ہوگیا تھا۔ نوربانو کا معاملہ تو سمجھ میں آنے والا تھا، اس کی کیفیت تو فطری تھی۔ لیکن ارجمند کی طرف سے وہ زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔ اس کے پیٹ میں درد! اس کے معاملے میں ضمیر پہلے ہی سے بوجھل تھا کہ اس کے

ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس نے معاف کرنے کا کہہ دیا ..... اللہ کو گواہ بنا کر، تو یہ اس کا ظرف ۔ مگر اسے تو اس کا احساس کرنا ہوگا۔

بہر حال یہ تو ہوا نا کہ اس نے اماں کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اب وہ دعا ہی کر سکتا ہے۔

دل کی پریشانی کا اس کے پاس ایک ہی علاج تھا، اور وہ ہمیشہ کارگر ہوتا تھا۔ وہ اٹھا، اس نے وضو کیا اور قرآن پڑھنے بیٹھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ دنیا و مافیا سے بے خبر ہو گیا۔

قرآن پڑھنے کے بعد اس نے نوربانو اور ارجمند کے لئے صحت اور عافیت کی دعا کی۔ پھر وہ اٹھا تو پرسکون تھا۔ دل کو قرار آ گیا تھا۔

اس کی نظر فائل پر پڑی، جو وہ دفتر سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ بڑی ذمہ داری اور انصاف کے ساتھ اسے ایک بہت بڑے فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ کئے بغیر اسے نیند نہیں آ سکتی تھی۔

اس نے فائل کھولی۔ اوپر ہی وہ کاغذ رکھا تھا، جس پر اس نے چار نام لکھے تھے اور اوپر تین کا ہندسہ بنایا تھا۔

وہ ذہن کو اس مسئلے پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی نظر فائل میں لگے لیٹر پر پڑی۔ وہاں اسے چار کا ہندسہ نظر آیا۔ تو پھر میں نے یہ تین کا ہندسہ کیوں بنایا .....؟ اس نے سوچا۔ سعودی عرب سے تو چار افراد کا بلاوا آیا ہے۔ اور یہ جو نام میں نے منتخب کر کے اس کاغذ پر لکھے ہیں، یہ بھی چار ہی ہیں۔

چند لمحے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ پھر اسے اچانک خیال آیا.....

ارے .....! میں بھی تو ہوں۔

اب ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ تو اصل صورتِ حال یہ ہے کہ چار افراد کو مدعو کیا گیا ہے، اور امیدوار پانچ ہیں۔ تو پہلے اس معاملے کو درست کر لیا جائے۔

اس نے چار ناموں کے آگے اپنا نام بھی لکھ دیا، اور اوپر لکھے تین کے ہندسے کو کاٹ کر چار کا ہندسہ لکھ دیا۔

اب ان پانچ میں سے چار افراد کو سعودی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے حج پر جانا ہے۔ یہ بڑی سعادت ہے۔ اور ان میں سے ایک کا نام قلم زد ہونا ہے، اور اس کا مطلب ایک عظیم سعادت سے محرومی ہے۔

اتنی بڑی محرومی .....!

اور فیصلہ اسے کرنا ہے .....!

ابھی تک اس بات کی معنویت اس کے شعور تک نہیں پہنچی تھی۔ لیکن اپنے ہاتھ سے لکھا اپنا نام دیکھ کر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔

میں نے یہاں اپنا نام کیوں لکھا ہے .....؟ اس کے اندر احتجاج ابھرا۔ میں تو اس عنایت کا مرکز اور سبب ہوں۔

خبردار .....! یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ اس کے دل نے اسے ڈپٹا۔ تمہاری حیثیت اس معاملے میں منصف کی ہے۔ کسی کو اتنی بڑی سعادت سے محروم کر دینا کوئی آسان اور معمولی بات نہیں۔ اور یہ طنطنہ، یہ غرور کیسا .....؟ کیا تمہیں اللہ نے بتایا کہ اس عنایت کا مرکز اور سبب تم ہی ہو۔

وہ دل کا آدمی تھا، دل کی ایک ڈانٹ نے اسے دہلا دیا۔

کیا تم یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم ان چاروں سے بہتر ہو .....؟ دل نے چیلنج کیا۔ انصاف بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ منصف کا ایک غلط فیصلہ اسے جہنم رسید کرا سکتا ہے۔

اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ اس نے عاجزی سے سر جھکا لیا۔ پھر میں کیا کروں؟ میں خود کو اس ذمہ داری کا اہل نہیں سمجھتا۔ میں یہ فیصلہ کلکٹر صاحب پر نہ چھوڑ دوں۔

ہاں! کیوں نہیں .....؟ دل نے طنز کیا۔ جانتے ہو کہ وہ سب سے پہلے تمہیں ہی منتخب کریں گے، تمہیں سعادت بھی مل جائے گی، اور ذمہ داری کلکٹر صاحب پر ہوگی۔ بھول رہے ہو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔ اس کے ساتھ چالاکی ممکن نہیں۔

میں نے تو ایسا نہیں سوچا۔ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

اپنے باطن کے نہاں خانوں کو کون جانتا ہے......؟ ہاں......! جس نے پیدا کیا، اسے سب معلوم ہے۔ وہی تو سب جانتا ہے۔

اب کے وہ ڈھیر ہو گیا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں اپنا نام قلم زد کر دیتا ہوں۔

نہیں ! تولے بغیر یہ بھی مناسب نہیں۔ میزان پر رکھو سب کو۔ دل نے حکم لگایا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔ وہ بڑبڑایا۔

پل صراط پر چلنے سے زیادہ مشکل تو نہیں۔

اس نے حواس مجتمع کئے اور دل کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ راہنمائی کس سمت سے ہوگی۔ اس نے ابتداء سے یاد کرنے کی کوشش کی۔ شاید کہیں سے اشارہ مل جائے۔

کلکٹر صاحب نے فائل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا...... اب ان چار میں ایک تو تم ہی ہو۔

دل نے سچ کہا تھا، اس نے سوچا۔ کلکٹر صاحب پر چھوڑ دوں تو وہ سب سے پہلے مجھے ہی منتخب کریں گے، چاہے میں سب سے کم مستحق ہوں۔

پھر اسے یاد آیا کلکٹر صاحب نے اسے ایک مشورہ بھی دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا، ایسے لوگ منتخب کرنا، جو صاحب استطاعت نہ ہوں، اپنے طور پر حج کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔ اس کا تمہیں بڑا اجر ملے گا۔

اور اسے وہ مشورہ بہت اچھا لگا تھا۔ اس نے اس پر عمل بھی کیا تھا۔ رشوت لینے والے صاحب استطاعت تھے۔ انہیں اس نے امیدواروں کی فہرست سے باہر نکال دیا تھا۔ جو لوگ بچے، وہ تھے جو اکل حلال کے قائل تھے۔ اور وہ صرف گیارہ افراد تھے۔

ان گیارہ افراد میں بھی دو ایسے تھے، جو صاحب استطاعت تھے۔ زمین دار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ زرعی زمینیں تھیں ان کے پاس۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں ملازمت کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس نے امیدواروں کی فہرست میں سے ان کے نام بھی کاٹ دیئے۔

باقی بچے نو افراد میں تین ایسے تھے، جو باعمل نہیں تھے۔ مطلب یہ کہ وہ نماز سے پوری طرح دور تھے۔ اس نے ان کے نام بھی کاٹ دیئے۔

پھر اس کے بعد دو افراد ایسے تھے، جو صرف جمعہ کی نماز پڑھتے تھے۔ اور آخر میں جو چار افراد بچے، ان کے بارے میں وہ جانتا تھا کہ پنج وقتہ نمازی ہیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے ان میں سے تین کو منتخب کرنا تھا۔

اب اسے خیال آیا کہ کلکٹر صاحب سے چوک ہو گئی۔ انہوں نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ وہ خودبخود منتخب ہو گیا ہے۔ لیکن نہیں، یہ چوک تو خود اس سے ہوئی۔

تو اصل صورت حال یہ تھی کہ 114 افراد میں سے 5 کو منتخب کرنا تھا۔ ان میں 102 رشوت لینے والے تھے۔ باقی بارہ بچے۔ ان میں سے دو صاحب استطاعت......

اسے اچانک جھٹکا سا لگا۔ وہ خود بھی تو صاحب استطاعت ہے۔ اس فہرست میں اس کے نام کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں۔ نماز کے مرحلے تک تو بات پہنچ ہی نہیں رہی تھی۔ اس فہرست میں صاحب استطاعت افراد دو نہیں، تین تھے۔

اس نے اپنا نام کاٹ دیا۔

اب بچے نو...... ان میں پنج وقتہ نمازی صرف چار تھے۔ اور چار ہی افراد کو حج پر جانا تھا۔ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

اس نے چاروں نام نیچے لکھ دیئے۔

مگر اگلے ہی لمحے جیسے وہ اندر سے ڈھیر ہو گیا۔ ذہن میں خیال ابھر رہے تھے۔ یہ اتنی بڑی سعادت...... کیا یہ مجھے نہیں مل سکے گی......؟ کیا میں حج پر نہیں جا سکوں گا......؟

انصاف کی بات تو یہ ہے کہ میں اس سعادت کا حقدار نہیں ہوں۔ اس نے فیصلہ کیا۔ اور یہ فیصلہ بھی مجھے ہی کرنا تھا، اور انصاف سے کرنا تھا۔ تو انصاف یہی ہے۔

اس لمحے اسے اپنی دولت بہت بری لگی۔ بلکہ اسے اس سے نفرت کا احساس ہوا۔ یہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے حج کرنے کی سعادت بہت بڑی تھی۔ یہ اس کے لئے تھی۔ لیکن اس کی دولت نے اسے اس سعادت سے محروم کر دیا تھا۔

وہ شاک میں تھا۔ وہ افسوس میں گھرا ہوا تھا۔ بس ایک ہی خیال اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا کیا میں حج نہیں کر سکوں گا ؟

پھر اچانک اس کے اندر روشنی سی پھوٹی۔ کیوں نہیں ؟ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ صاحب استطاعت ہو تو حج بھی کر سکتے ہو۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تمہارے لئے کیا مشکل ہے۔ البتہ ان چاروں میں سے جو محروم ہوگا، وہ شاید کبھی حج نہیں کر سکے گا۔

وہ کچھ مطمئن ہوگیا۔ البتہ ہلکی سی خلش اب بھی تھی۔

پھر اچانک اسے حمیدہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا، ایک تو ہی تو ہے پتر ! جس کے ساتھ میں حج پر جا سکتی ہوں۔

اس نے سوچا، اشارہ تو پہلے ہی مل گیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ راہنمائی تو کر دی گئی تھی۔ واقعی...... ! اسے تو اماں کے بغیر حج پر جانے کا سوچنا ہی نہیں چاہئے۔ بس ٹھیک ہے۔ وہ اماں، بلکہ نور بانو اور ارجمند کو بھی ساتھ لے کر حج پر جائے گا۔

اس کا دل ہلکا ہوگیا۔ اس نے وہ چاروں نام فائنل کر دیئے۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ تو جاگ ہی رہی تھی، نور بانو کی لرزہ خیز چیخ نے سوتی ہوئی ارجمند کو بھی جگا دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ مگر اگلے ہی لمحے کرب میں ڈوبی ہوئی نور بانو کی دوسری چیخ ابھری تو وہ تڑپ گئی۔

''یہ...... یہ کیا ہوا......؟ یہ تو آپی کی چیخ ہے، دیکھو تو ......'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

رشیدہ جو اس وقت تک سن سی بیٹھی تھی، اچانک حرکت میں آ گئی۔ اس نے ارجمند کو روک دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں ......؟ میں نے آپ کو بتایا نا کہ جھٹکے سے اٹھنا یا بیٹھنا آپ کے لئے اچھا نہیں ہے۔ پہلا پہلا معاملہ ہے......''

''مگر آپی ......''

''آپ فکر نہ کریں، میں دیکھتی ہوں۔'' رشیدہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی لمحے نور بانو کی تیسری چیخ سنائی دی۔ رشیدہ تقریباً بھاگتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

ارجمند کا بس چلتا تو وہ اُڑ کر دوسرے کمرے میں پہنچ جاتی، جہاں نور بانو درد سے تڑپ رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ رشیدہ کی نصیحت بے معنی ہے، نہ غیر اہم۔ وہ آہستہ آہستہ بستر سے اٹھی۔ اسے نور بانو کی فکر بھی تھی، اور یہ خیال بھی کہ اس کے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

وہ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ اسی لمحے ایک طرف تو اسے اپنے جسم کا تمام خون اچھل کر سر کی طرف جھپٹتا محسوس ہوا، اور دوسری طرف پیٹ میں جیسے کسی نے ٹھوکر ماری۔ وہ اپنے قدموں پر کھڑی نہ رہ سکی، اور فرش پر گر گئی۔

اسے اپنے سر میں اندھیرا سا پھیلتا محسوس ہوا، پھر وہ اندھیرا اس کی آنکھوں میں اترنے لگا۔ وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھی۔ مگر اس کے ذہن میں ایک واضح خیال تھا ...... آپی تکلیف میں ہیں، اور مجھے ان تک پہنچنا ہے۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ وہ فرش پر گھسٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہوگئی۔ لیکن وہ رکی نہیں۔ اسی دوران نور بانو کی چیخیں تواتر سے سنائی دیتی رہیں۔

اب وہ راہ داری میں تھی۔ دوسرا دروازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ رکی اور دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ سانس پھول گئی تھی۔ وہ سانس درست کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

اس کا بایاں ہاتھ فرش پر اس طرف رکھا تھا، جس طرف سے وہ گھسٹتی ہوئی آئی تھی۔ اس ہاتھ پر اسے چپ چپے سے لمس کا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر

آنکھوں کے سامنے لا کر دیکھا۔ وہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔

یہ خون کہاں سے آگیا......؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔

راہ داری میں روشنی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور دہل گئی۔ جہاں سے وہ گھسٹ کر آ رہی تھی، وہاں سے یہاں تک خون کی چوڑی سی لکیر تھی۔

اسے چکر سے آ گئے۔ دل ڈوبنے لگا۔ لیکن یہ خیال بہت مستحکم تھا کہ آپی کی طبیعت بہت خراب ہے اور اسے ان تک پہنچنا ہے۔ وہ دیوار سے ٹکے ٹکے دوسرے دروازے کی طرف کھسکنے لگی۔ قوت ارادی کے سوا اس وقت اس کے پاس کوئی طاقت نہیں تھی۔

دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر قوتِ ارادی بھی جواب دے گئی۔

اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پکارا۔

"آپی......! آپی......!" پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ نور بانو کے کمرے میں پہنچی تو اسے صوفے پر تڑپتا پایا۔ آبیہ اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی، اور نور بانو کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

نور بانو ایک بار پھر درد کی شدت سے چلائی۔ لیکن رشیدہ کو دیکھ کر کچھ پرسکون ہوگئی۔

"میری...... دو...... دوا......" اس نے ٹوٹتے بکھرتے لہجے میں رشیدہ سے کہا۔

رشیدہ نے آبیہ سے کہا۔

"جلدی سے پانی لے کر آ......!" پھر وہ بیڈ کے سرہانے رکھی دوا کی طرف لپکی۔ وہاں سے دوا لے کر وہ نور بانو کی طرف آئی۔ اتنی دیر میں آبیہ پانی لے آئی تھی۔

رشیدہ نے گولی نکال کر نور بانو کے منہ میں رکھی، پھر پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

نور بانو نے پانی کی مدد سے گولی حلق سے اتار لی۔

رشیدہ اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

"ابھی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ پریشان نہ ہوں۔"

نور بانو کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ دوا لینے کے دو منٹ کے اندر اندر درد کم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس بار ایسا نہیں ہوا۔ درد کی لہر اٹھی تو وہ پھر چلائی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا پیٹ دبا لیا تھا۔

"کچھ آرام آیا......؟" رشیدہ نے پوچھا۔

"ذرا بھی نہیں......! ڈاکٹر باسط کو بلاؤ فوراً......!"

"وہ تو کہہ کر گئے تھے کہ اب نہیں بلانا۔ ہرگز نہیں آؤں گا۔"

"اچھا......! مجھے ایک اور گولی دو......!" نور بانو نے کہا، اور پھر اس کی چیخ نکل گئی۔

"ابھی تو لی ہے آپ نے گولی......!"

"کچھ نہیں ہوا اس سے...... دوسری دو......!"

"ڈاکٹر صاحب نے بہت سختی سے منع کیا تھا۔"

"بحث مت کر رشیدہ......!"

رشیدہ نے دوسری گولی دی اور آبیہ کو پانی دینے کا اشارہ کرتے ہوئے فون کی طرف جھپٹی۔

نور بانو نے دوسری گولی حلق سے اتاری۔ دو منٹ کے بعد درد میں کچھ کمی کا احساس ہوا۔ اس کے باوجود درد خوف زدہ کر دینے کی حد تک شدید تھا۔ وہ دل میں دعا کرتی رہی کہ ڈاکٹر باسط آنے پر رضامند ہو جائیں۔

رشیدہ فون پر بات کر کے اس کے پاس آئی تو مایوسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"کیا ہوا......؟ آ رہے ہیں وہ......؟" نور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

حالانکہ جواب رشیدہ کے چہرے پر لکھا تھا۔

"نہیں بیگم صاحبہ......! وہ کہتے ہیں کہ آپ کو فوری طور پر اسپتال جانا

ہوگا۔ ورنہ خدانخواستہ...‘‘ رشیدہ کہتے کہتے رک گئی۔

نور بانو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

اسی لمحے باہر سے گھٹی گھٹی چیخ سنائی دی۔

’’آپی...! آپی...!‘‘

’’ارے...! یہ تو ارجی کی آواز ہے۔‘‘ نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

’’تم تو کہہ رہی تھیں کہ وہ سو رہی ہے۔‘‘

’’جی... لیکن آپ کی چیخ سن کر وہ اٹھ گئی تھیں۔‘‘

’’جلدی سے دیکھو...! آواز تو قریب سے آئی ہے۔‘‘ نور بانو نے کہا، اور صوفے پر ڈھے گئی۔

رشیدہ دروازے کی طرف لپکی۔ دروازے سے نکلتے ہی اسے کچھ فاصلے پر ارجمند گری ہوئی نظر آئی۔ اس کے کمرے کے دروازے سے خون کی لکیر بہت واضح تھی۔ ایک نظر میں اس نے سب دیکھ لیا۔ اس کے ذہن میں ایک ہی لفظ گونجا... ایمرجنسی... لیکن سچ یہ ہے کہ اپنی تجربہ کاری کے باوجود اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ یہاں ایک نہیں، دہری ایمرجنسی تھی۔ ارجمند کے بارے میں تو اسے پورا یقین تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور نور بانو کے بارے میں ڈاکٹر باسط نے یہی بات کہی تھی۔ گویا وہ دونوں ہی خطرے میں تھیں۔

اس نے جھک کر دیکھا۔ ارجمند بے ہوش تھی، اور خون جاری تھا۔

رشیدہ اپنے کام میں ماہر تھی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب یہ کیس گھر پر نہیں نمٹایا جا سکتا۔ ارجمند کو اسپتال لے جانا ہوگا۔ اور وہ بھی فوری طور پر۔ ہر لمحہ قیمتی ہے۔ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا ہے۔

اس نے دروازے کی طرف رخ کر کے آبیہ کو پکارا۔ آبیہ آئی تو اس نے کہا۔

’’جا کر نوریز کو بول کہ گاڑی نکالے۔ بی بی صاب کی طبیعت بہت خراب

ہے۔ اسپتال جانا ہے۔‘‘

آبیہ اس کی ہدایت کی تعمیل کے لئے دوڑی۔

اسی لمحے نور بانو لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئی۔ فون دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

’’یہ... یہ کیا ہوا رشیدہ...؟‘‘

’’معاملہ بہت بگڑ گیا ہے بیگم صاب...! انہیں فوری طور پر اسپتال لے جانا پڑے گا۔‘‘

نور بانو درد کی شدت سے دہری ہوگئی۔ ارجمند کو اس حال میں دیکھ کر جو گھبراہٹ ہوئی تھی، شاید اس نے درد کے احساس کو اور بڑھا دیا تھا۔

’’تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم بڑی ماہر دائی ہو۔‘‘ اس نے ٹوٹتی آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

’’جب خون جاری ہو جائے تو کیس دائی کا نہیں رہتا بیگم صاب...! انہیں خون کی ضرورت ہوگی، جو یہاں نہیں دیا جا سکتا۔‘‘

’’ایسا ہوا کیوں...؟‘‘

’’خون کا دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے بیگم صاب...! یہ اور بچہ دونوں خطرے میں ہیں۔‘‘

’’اور مجھے لگتا ہے کہ میرا اسپتال جانا بھی ضروری ہے۔‘‘

’’جی... ڈاکٹر صاحب نے یہی کہا تھا۔ مگر بی بی صاب کے لئے تو ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔‘‘

’’تو پھر...؟‘‘

اتنی دیر میں آبیہ آگئی۔ ’’گاڑی تیار ہے اماں...!‘‘

’’مگر ارجمند کا رجسٹریشن تو ہے نہیں اسپتال میں۔‘‘

’’وہ میں سنبھال لوں گی بیگم صاب...!‘‘

’’کیسے...؟‘‘ اب نور بانو کے لئے بولنا دشوار ہو رہا تھا۔

’’میں کہہ دوں گی کہ یہ دو دن پہلے ہی مانسہرے سے آئی تھیں کہ یہاں طبیعت بگڑ گئی۔‘‘ رشیدہ نے کہا اور آبیہ کی طرف مڑی۔

"چل آبیہ......! بی بی صاب کو اٹھا کر گاڑی میں پہنچاتا ہے۔"

"اور میرا کیا ہوگا......؟" نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

"یہ تو ہے بیگم صاحبہ......! کیا کریں......؟" رشیدہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند لمحے وہ سوچتی رہی، پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"آپ دونوں کو ایک ساتھ تو لے جا نہیں سکتے۔ اور بی بی صاحبہ کے ساتھ میرا جانا ضروری ہے۔" اس کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

نور بانو کو ایسے میں بھی رازداری کا خیال آ گیا۔

"ارجمند کو نوریز کے ساتھ تو ویسے بھی نہیں جانا چاہئے۔"

"آپ سمجھ نہیں رہی ہیں بیگم صاحبہ......!" رشیدہ کا لہجہ تیز اور سخت ہو گیا۔

"ایک منٹ کی دیر بھی بی بی صاحبہ اور بچے، دونوں کے لئے خطرناک ہو جائے گی۔ بلکہ اب بھی خدانخواستہ......"

نور بانو نے سوچا، ان دونوں کو کچھ ہو گیا تو رازداری تو ویسے ہی ختم ہو جائے گی۔

"تو پھر کیا کرنا ہے......؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

رشیدہ اس دوران فیصلہ کر چکی تھی۔

"میں نوریز کے ساتھ بی بی صاحبہ کو لے کر جاتی ہوں۔ اور آبیہ......" وہ آبیہ کی طرف مڑی۔

"بی بی صاحبہ کو گاڑی میں پہنچانے کے بعد تو گاڑی کرنا اور بیگم صاحبہ کو سی ایم ایچ لے جانا۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

آبیہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔

"اسے کیا معلوم اسپتال کا......؟" نور بانو نے گھبرا کر کہا۔

"سب معلوم ہے۔ ویسے بھی جانا تو ایمرجنسی میں ہی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"

کوئی چارہ نہیں تھا۔ نور بانو وہیں دیوار سے ٹک کر بیٹھ گئی۔ درد اسے اپنے پیٹ میں بہت تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

رشیدہ موٹی چادر لے کر آئی۔ اس نے آبیہ کے ساتھ مل کر ارجمند کو چادر میں لپیٹا۔ پھر وہ اسے اٹھا کر باہر لے گئیں، جہاں نوریز نے گاڑی دروازے کے ساتھ لا کر کھڑی کر دی تھی۔

انہوں نے بے ہوش ارجمند کو پچھلی نشست پر لٹایا۔ خود رشیدہ بھی ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ارجمند کا سر اس نے اپنی گود میں رکھ لیا۔

"میری بات سمجھ گئی ہے نا آبیہ......!" رشیدہ نے بیٹی سے کہا۔

"اور ہاں......! بیگم صاحب سے کہنا کہ اپنی فائل اور تمام چیزیں ضرور لے لیں۔ بس تو انہیں لے کر اسپتال پہنچ۔ میں وہاں موجود ملوں گی۔"

آبیہ پلٹ کر گھر میں گئی۔ نوریز یہ گفتگو سن کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے......؟ بی بی صاحب کو کیا ہوا......؟ اور کیا بیگم صاحبہ کی طبیعت بھی خراب ہے......؟"

"تم گاڑی چلاؤ......! وقت بہت قیمتی ہے۔" رشیدہ نے چڑ کر کہا۔

نوریز نے گاڑی باہر نکال لی۔

رشیدہ دل ہی دل میں ارجمند کے لئے دعا کرتی رہی۔ جریانِ خون اتنا تیز تھا کہ خون کوئی چادر سے بھی رسنے لگا تھا۔ یہ مقامِ شکر تھا کہ اسپتال تک ڈرائیو پانچ منٹ کی بھی نہیں تھی۔

اسپتال پہنچ کر رشیدہ نیچے اتری اور اس نے اسٹریچر کے لئے اشارہ کیا۔

نوریز بھی اتر آیا تھا۔ لیکن رشیدہ نے اسے روک دیا۔

"یہ میں سنبھال لوں گی۔" اس نے کہا۔

"تم یہاں بیگم صاحبہ کا انتظار کرو۔ آبیہ بچی ہے۔ وہ آ جائیں تو انہیں ایمرجنسی میں لے جانا۔"

نوریز اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

رشیدہ اسٹریچر کے ساتھ اسپتال کی طرف لپکی۔

"زچہ وارڈ میں لے چلو......!" اس نے اسٹریچر دھکیلنے والے سے کہا۔

گاڑی کے پاس کھڑے نوریز نے گاڑی کی پچھلی نشست کو دیکھا تو وہاں

خون نظر آیا۔ وہ دہل گئی۔ یااللہ.....! خیر کرنا۔ یہ کیا ہوگا بی بی صاحبہ کو اور بیگم صاحبہ بھی.....! کیا ہو رہا ہے یہ سب.....؟

اس نے ڈیش بورڈ میں سے کپڑا نکالا اور پچھلی سیٹ صاف کرنے لگا۔

❀ ❀ ❀

نور بانو مشکل سے پانچ منٹ اکیلی رہی ہوگی۔ لیکن اسے وہ بہت طویل عرصہ لگا۔ اور اسے ڈر لگا کر پردیس میں، اتنے بڑے گھر میں وہ اکیلی ہے۔ لیکن پھر درد نے ہر خوف کو مٹا ڈالا۔

کوشش کے باوجود وہ اس درد سے نظریں نہیں چرا سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے اندر..... اپنے وجود میں دیکھ سکتی ہے۔ وہ درد نہیں، آگ کا ایک دہکتا ہوا گولا تھا..... بہت بڑا گولا، اور وہ دل کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ٹیس تو اس کے لئے بہت چھوٹا لفظ تھا۔ اور درد سے قطع نظر سب سے زیادہ ڈراؤنی بات یہ یقین تھا کہ وہ گولا درحقیقت ایک بہتا بڑا پٹاخہ ہے، جو کسی بھی لمحے پھٹ سکتا ہے۔ اور وہ پھٹے گا تو اس کے پورے جسم کے اندر آگ لگ جائے گی، جو بجھائی بھی نہیں جا سکے گی۔

وہ جھٹکنے کی کوشش کے باوجود ان خوف ناک سوچوں کو ذہن سے نہیں جھٹک سکی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ہر لمحے اندر موجود وہ پٹاخہ، وہ آگ کا گولا بڑھتا، پھیلتا جا رہا ہے..... کسی غبارے کی طرح۔ اور غبارے ہی کی طرح پھٹ بھی جائے گا۔

اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ وہ اپنے اندر جھانکتی رہی۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز نے اسے چونکایا۔ پھر آبیہ آ گئی۔

"چلئے بیگم صاحب.....!" اس نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔

ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا۔ لیکن اسے دروازے تک جانا تھا۔ پھر یہ بھی سوچنا تھا کہ کیا کچھ کرنا ضروری ہے۔ اس پر اسے خیال آیا کہ گھر میں موجود رقم لینا ضروری ہے۔ ارجمند اس سے پہلے ہی اسپتال لے جائی جا چکی تھی، اور وہ بے ہوش بھی تھی۔ نہ جانے وہاں کیا ضرورت پڑے..... اسے بھی اور ارجمند کو بھی۔

اس نے آبیہ کو الماری میں رکھی رقم کے بارے میں بتایا۔ آبیہ نے رقم

نکالی۔

"میرے بیگ میں رکھ دو.....!" اس نے کہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ پہلی بار ایسا ہوگا کہ گھر میں کوئی بھی نہیں ہوگا۔ یعنی تالا لگانا ہوگا۔ لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ تالا چابی کہاں ہوگا؟ اور یہ آبیہ کو بھی معلوم نہیں تھا۔

آخر انہوں نے گھر کو ایسے ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ تالا ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا ان کے پاس۔

جیسے تیسے بڑی مشکل سے وہ گاڑی تک پہنچی۔ آبیہ نے سہارا دے کر اسے گاڑی میں بٹھایا۔ وہ درد سے بے حال ہو رہی تھی۔

"کتنی دیر لگے گی اسپتال پہنچنے میں.....؟" وہ بڑبڑائی۔

"پانچ منٹ بھی نہیں لگیں گے جی.....!" ڈرائیور نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

جھٹکا لگا، جو نور بانو کے لئے بڑا اذیت ناک تھا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"ذرا آہستہ چلاؤ.....!" آبیہ نے ڈرائیور سے کہا۔

"جی اچھا.....!"

نور بانو کے لئے سانس لینا بھی دشوار ہوا جا رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے بیٹھی تھی۔ ہر طرف، ہر چیز اسے سرخ رنگ میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

سڑک بھی پختہ اور ہموار تھی، اور ڈرائیور گاڑی بھی کم رفتار سے چلا رہا تھا۔ پھر بھی نور بانو کو جھٹکوں کا احساس ہو رہا تھا۔ پیٹ کے اندر موجود سرخ غبارہ پھر پھیلتا جا رہا تھا۔

پھر اچانک دھاکا سا ہوا، اور وہ غبارہ..... لیکن نہیں، وہ غبارہ نہیں، بہت بڑا پٹاخہ ہی تھا..... اور وہ پھٹ گیا۔ ایسا لگا کہ اس کے وجود میں آگ دہک اٹھی ہے، اور پھیلتی جا رہی ہے۔

وہ ایک طرف ڈھے گئی۔ اس کی چیخیں مسلسل تھیں۔ لیکن اس کے ہوش و

حواس بتدریج اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے، اور اسی حساب سے اس کی آواز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

❁ ❁ ❁

آبیہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ فوراً ہی وہ اسپتال پہنچ گئے۔

وہاں اسے اپنی گاڑی، اور گاڑی کے پاس کھڑا نوریز نظر آ گیا۔ وہ اسپتال کے گیٹ پر نظر جمائے ہر اندر آنے والی گاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

آبیہ نے ڈرائیور کو گاڑی اسی طرف لینے کو کہا۔ گاڑی رکی تو وہ اتری۔

''بیگم صاحب کی حالت بہت خراب ہے۔'' اس نے نوریز سے کہا۔

نوریز جلدی سے اسٹریچر لانے کے لئے دوڑ گیا۔

اٹینڈنٹ نے نوربانو کو اسٹریچر پر منتقل کیا۔ آبیہ نے نوربانو کا بیگ سنبھالا اور اسے کھولنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو؟ بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ نا.....!'' نوریز نے جھنجلا کر کہا۔

''گاڑی والے کو کرایہ دینا ہے۔''

''تم چلو..... میں کرایہ دے کر آتا ہوں۔'' نوریز نے کہا۔

آبیہ تیز قدموں سے اسٹریچر کے پیچھے چل دی۔

❁ ❁ ❁

رشیدہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اللہ نے ہر مرحلہ آسان کر دیا۔ ڈاکٹر نے کوئی بحث نہیں کی، اور ارجمند کے معائنے میں مصروف ہوگئی۔

''بلڈنگ کب شروع ہوئی.....؟'' اس نے پوچھا۔

''دس منٹ ہوئے ہوں گے۔'' رشیدہ نے بتایا۔

ڈاکٹر نے غور سے ارجمند کے چہرے کو دیکھا۔

''یہ ان کا پہلا بچہ ہے نا.....؟''

''جی.....!''

''بہت ہیوی بلڈنگ ہے۔'' ڈاکٹر بڑبڑائی۔ اس نے ارجمند کو آکسیجن لگوائی، اور اس کے بعد ڈراپ۔

''یہ بہت کمزور ہوگئی ہیں اس وقت تو بچہ اور یہ دونوں ہی خطرے میں ہیں۔''

رشیدہ سر ہلا کر رہ گئی۔

ڈاکٹر ارجمند کو آبزرو کر رہی تھی۔

''کوئی صدمہ پہنچا تھا انہیں.....؟''

''ان کی بہن کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اور یہ ان سے بہت محبت کرتی ہیں۔''

''تمہارا ان سے کیا تعلق ہے.....؟'' ڈاکٹر نے رشیدہ کو غور سے دیکھا۔

''جی..... ! میں نوکر ہوں ان کی۔''

''کوئی ذمہ دار آدمی ہے ان کے ساتھ.....؟''

''جی نہیں..... ! ان کے شوہر کراچی میں ہیں۔ ہم تو یہاں ان کی بہن کو دیکھنے آئے تھے۔''

''اس حال میں.....؟'' ڈاکٹر نے بھنویں اچکائیں۔

''کہاں سے آئے تھے.....؟''

''مانسہرہ سے.....!''

''یہ اس علاقے کی تو نہیں لگتیں.....؟''

''ان کی اپنی کوٹھی ہے وہاں.....!''

''تو یہاں بہن کے گھر میں بھی تو لوگ ہوں گے۔''

''وہ اکیلی رہتی ہیں۔'' رشیدہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی تھی۔

''ان کی کمزوری کی وجہ سے مجھے لگتا ہے کہ آپریشن کے بغیر ڈلیوری نہیں ہوگی۔'' ڈاکٹر نے وضاحت کی۔

''اور آپریشن میں بہرحال خطرہ ہوتا ہے۔ کسی رشتہ دار کو پیپر سائن کرنا

پڑے گا۔"

"میں کر دوں گی۔"

"یہ ممکن نہیں۔ شوہر ہو، باپ یا بھائی...!"

رشیدہ کو نوریز کا خیال آ گیا۔

"جی... ٹھیک ہے...! ویسے آپریشن میں کتنا خطرہ ہوگا...؟"

"جان کا خطرہ ہو تو پیپر سائن کرایا جاتا ہے۔ ویسے تو ہم زچہ اور بچہ، دونوں کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن خطرے کی صورت میں ہماری پہلی ترجیح ان کا بچانا ہوگا۔"

"آپریشن کب ہوگا...؟"

"پہلے ہمیں بلڈنگ کو کنٹرول کرنا ہے۔ پھر انہیں خون دینا ہوگا۔"

"میں ذرا ان کی بہن کو دیکھ لوں۔" رشیدہ ڈاکٹر سے اجازت لے کر باہر نکل آئی۔

❁ ❁ ❁

ایمرجنسی میں اسے نوریز اور آبیہ نظر آئے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ آبیہ نے اسے دیکھا تو تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا...؟ بیگم صاحب کہاں ہیں...؟" رشیدہ نے اس سے پوچھا۔

"ان کا آپریشن ہو رہا ہے اماں...!" ڈاکٹر بول رہا تھا کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔"

رشیدہ کی نظر آبیہ کے ہاتھ میں موجود بیگ پر پڑی۔

"یہ بیگم صاحبہ کا..."

آبیہ نے بیگ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"چلتے وقت انہوں نے الماری سے پیسے نکلوا کر اس میں رکھوائے تھے۔"

رشیدہ نے بیگ کھول کر دیکھا تو سکون کی سانس لی۔ سو کے نوٹوں کی اچھی خاصی موٹی گڈی تھی۔ اس کا اندازہ تھا کہ تیس سے کچھ زیادہ ہی نوٹ ہوں گے اس میں۔

ویسے پیسوں کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں تھی۔ اب تک تنخواہ جو وہ جمع کرتی رہی تھی، وہ بھی کم نہیں تھی۔ اور خرچہ تو کوئی تھا نہیں۔ ابھی آتے ہوئے وہ اپنے ساتھ احتیاطاً وہ رقم بھی لے آئی تھی۔

وہ نوریز کی طرف بڑھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ہلا ہوا ہے۔

"انہوں نے مجھ سے دستخط کرائے ہیں ایک کاغذ پر۔"

اس نے کہا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"وہ کہہ رہے تھے، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"تم نے کیا کہہ کر دستخط کئے...؟"

"میں نے کہا کہ یہاں تو میں ہی سب کچھ ہوں۔ کوئی اور نہیں ہے۔"

نوریز نے جواب دیا۔ پھر پوچھا۔

"چھوٹی بی بی کا کیا حال ہے...؟"

"اب بہتر ہے...! لیکن آپریشن ہوگا ان کا بھی۔ اور تمہیں ان کے لئے بھی دستخط کرنے ہوں گے۔ پر ایسے نہیں چلے گا۔ کہنا کہ تم بھائی ہو چھوٹی بی بی کے۔"

"ٹھیک ہے جی...! کہہ دوں گا۔ پر مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"مرد ہو کر ڈرتے ہو...؟"

"اس کا مردانگی سے کیا تعلق...؟" نوریز نے چڑ کر کہا۔

"یہاں مالکوں میں سے کسی کو ہونا چاہئے تھا۔ مجھے تو یہ بہت بڑی ذمہ داری لگ رہی ہے۔"

"یہ ٹھیک کہا تم نے۔ پر اب کیا کریں...؟ کچھ ہو نہیں سکتا۔"

"میرے پاس کسی کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔" نوریز بڑبڑایا۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"اچھا تم یہیں رکو... آبیہ کو میں اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔" رشیدہ بولی۔

''کیوں..... ؟'' نوریز نے گھبرا کر کہا۔

''اسے دکھا دوں گی بی بی صاحبہ کا وارڈ۔ یہ دونوں جگہ کی خبر رکھ سکے گی۔''

رشیدہ نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا، پھر اسے دلاسہ دیا۔

''گھبراؤ مت.....! سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''تم اس کو وہاں چھوڑ دو چھوٹی بی بی کے پاس۔'' نوریز نے آبیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں آجاؤ......!''

رشیدہ نے چند لمحے سوچا، پھر بولی۔

''وہاں میرا ہونا زیادہ ضروری ہے۔''

''بیگم صاحبہ کی حالت اچھی نہیں ہے۔''

''تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔''

''ہوا کیا ہے چھوٹی بی بی کو.....؟ اب خون تو رک گیا ہے نا.....؟'' نوریز نے اچانک پوچھا۔

رشیدہ نے چونک کر غور سے اسے دیکھا۔ خون اس نے بھی دیکھ لیا.....؟

''وہ اب ٹھیک ہیں، تم فکر نہ کرو۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر تم آبیہ کو ان کے پاس کیوں نہیں چھوڑتیں......؟''

''اب اتنی ٹھیک بھی نہیں ہیں وہ......!''

نوریز چپ ہو گیا۔

رشیدہ آبیہ کو اپنے ساتھ لے کر چل دی۔ اب اسے ارجمند کے لئے پرائیویٹ روم کا بندوبست کرنا تھا۔

❁ ❁ ❁

وہ سبھی کے لئے قیامت کی رات تھی۔

ارجمند کو پرائیویٹ روم میں منتقل کر دیا گیا تھا، اور اب اسے خون دیا جا رہا تھا۔ رشیدہ کو پریشانی یہ تھی کہ اب تک ارجمند کو ہوش نہیں آیا تھا۔ بہر حال یہ بات تسلی بخش تھی کہ جریانِ خون رک گیا تھا۔

رشیدہ نے ڈاکٹر سے اس سلسلے میں بات کی۔

''بلڈ پریشر بہت بڑھا ہوا ہے، اور قابو میں نہیں آ رہا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

رشیدہ خاموش رہی۔ کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

''جس صدمے سے شروعات ہوئی ہیں، ان کا دماغ ابھی تک اس صدمے کے زیر اثر ہے۔''

''تو آپریشن......؟''

''اتنے بڑھے ہوئے بلڈ پریشر میں تو ممکن نہیں۔ پہلا مسئلہ بلڈ پریشر ہے۔ تم بس دعا کرو بی بی.....!''

رشیدہ کا تو رواں رواں دعا کر رہا تھا..... ارجمند کے لئے بھی، اور نور بانو کے لئے بھی۔

آبیہ بہر حال بچی تھی، وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ رشیدہ وقتاً فوقتاً جاتی اور گھبرائے ہوئے نوریز کو دلاسہ دے آتی۔

رات بہت آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

نوریز بہت پریشان اور متوحش تھا۔ یہاں کی پریشانی ہی کچھ کم نہیں تھی۔ اس پر ستم، اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ صاحب کو کیسے اطلاع دے۔ اگر یہاں خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو وہ صاحب کو کیا منہ دکھائے گا؟

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنا اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور کیا ہو گیا؟ یہ تو اسے معلوم تھا کہ بیگم صاحبہ ماں بننے والی ہیں۔ مگر اب ان کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی کہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے! اور ڈاکٹر نے اس سے ذمہ داری کے کاغذ پر دستخط کرا لئے تھے۔ تو اب خدانخواستہ ان کو کچھ ہو گیا تو یہ اس کی ذمہ داری ہوگی۔ اتنی بڑی ذمہ داری!

وہ دل ہی دل میں بڑی شدت سے بیگم صاحبہ کی زندگی کے لئے دعا کر رہا تھا۔ لیکن وہ یکسو نہیں تھا۔ دھیان دوسری طرف بھی چلا جاتا تھا۔

دوسری طرف .....!

اس نے یاد کیا، اور دہل کر رہ گیا۔

دوسری طرف چھوٹی بی بی تھیں۔ انہیں اچانک کیا ہوگیا؟ اتنا خون بہہ گیا ان کا کہ موٹی چادر میں لپٹے ہونے کے باوجود گاڑی کی سیٹ خراب ہوگئی۔ ہوا کیا انہیں؟ اور رشیدہ بیگم صاحبہ کی اتنی خراب حالت ہونے کے باوجود چھوٹی بی بی کو اہمیت دے رہی ہے، جبکہ وہ جانتا ہے کہ وہ وفادار بیگم صاحبہ کی ہے، کیونکہ بیگم صاحبہ نے ہی اسے پسند کر کے ملازمت دی۔ تو اس کا مطلب تو یہی ہے کہ ان کی حالت بیگم صاحبہ سے بھی زیادہ خراب ہے۔

اتنا پریشان وہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ بیگم صاحبہ سے اس کا تعلق وفاداری کا تھا، اور حوالہ صاحب کا بھی تھا۔ وفاداری اس کے لئے بہت اہم تھی۔ بیگم صاحبہ نے ہمیشہ اسے محض نوکر ہی سمجھا تھا، اور وہ نوکر تھا بھی۔ وفاداری کے تحت اس کا ان کے لئے پریشان ہونا فطری تھا۔ لیکن چھوٹی بی بی سے تو اسے دلی انسیت تھی۔ وہ بڑی نرم دل تھیں۔ اس سے بہت اچھی طرح بات کرتی تھیں۔ اس کا خیال رکھتی تھیں۔ ان کے لئے تو وہ جان بھی دے سکتا تھا۔

وہ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دعا کرنا چاہتا تھا، لیکن دل پر ایسی گھبراہٹ تھی کہ اس سے دعا بھی نہیں کی جا رہی تھی۔ یہاں کی صورتِ حال کی پریشانی اپنی جگہ، مگر اس سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ صاحب کو کس طرح اطلاع دے.....؟

سچ تو یہ ہے کہ نہ یہ پریشانی اس کی تھی، اور نہ وہ اسے اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ لیکن اسے ٹالنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایک لمحے کو..... بس ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ کاش وہ یہاں نہ ہوتا..... کم از کم اس صورتِ حال میں تو ہرگز بھی نہ ہوتا۔

لیکن اگلے ہی لمحے وہ اپنی اس سوچ پر شرمندہ ہوگیا۔ اس نے سوچا، وہ نہیں ہوتا تو اس کی جگہ کوئی اور ہوتا، اور وہ جو بھی ہوتا، ہوش و حواس میں رہ کر خوش دلی اور محبت سے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ اتنے پیارے، اتنی محبت والے،

اتنی عزت کرنے والے لوگ تو نصیب سے ملتے ہیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو نوکر کو نوکر نہیں سمجھتے تھے، گھر کے فرد کا درجہ دیتے تھے۔ یہ آزمائش تو بہت چھوٹی چیز ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے تو جان بھی دی جا سکتی ہے۔

اس خیال نے اسے کچھ مضبوطی دے دی۔ وہ پُرسکون تو نہیں ہوا۔ لیکن اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوگئی۔

وہ بند دروازے کو دیکھتا رہا، جس کے پیچھے بیگم صاحبہ کا آپریشن ہو رہا تھا۔

❁ ❁ ❁

رات بہت سست روی سے صبح کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آیہ کرسی پر بیٹھی بدستور سو رہی تھی۔ رشیدہ ایک کرسی پر بیٹھی ارجمند کے چہرے کو تک رہی تھی، جو بے ہوش تھی۔

اس وقت رشیدہ کی بڑی عجیب کیفیت تھی۔ وہ ارجمند کے لئے سراپا دعا تھی۔ اور وہ اپنے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پچھلے تھوڑے سے دنوں میں وہ کتنا بدل گئی تھی، اور اسے بدلنے والی ارجمند تھی، وہ ارجمند جو اس سے بہت سختی سے بات کرتی تھی، جو سچ بولنے کی قائل تھی، جو سچ سے، اور بڑے سے بڑا راز فاش ہونے سے بالکل نہیں ڈرتی تھی۔ لیکن اندر سے وہ بہت نرم تھی۔ وہ اللہ سے ڈرتی تھی۔ احسان کئے بغیر، بڑی عاجزی سے اتنا بڑا ایثار کرتی تھی، جس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ سکے۔ وہ بے غرض دینے والی تھی۔

اور اس ارجمند نے اسے کیسا بدل ڈالا تھا!

رشیدہ خود سے ناواقف نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ نہایت خودغرض اور مطلبی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کوئی بری بات تھی بھی نہیں۔ اس نے دنیا کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ کوئی بھی بغیر کسی غرض کے کسی کی ضرورت پوری نہیں کرتا، بلکہ بدلے میں اس سے زیادہ ہی لیتا ہے۔ اس کی ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے ایک پیسے والے نے اس کی زمین ہتھیا لی تھی۔ وہ اسے واپس لینی تھی، اور اس کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔

لیکن وہ مایوس تھی۔ اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ وہ کبھی اپنا قرض اتارنے اور زمین چھڑانے کے لئے مطلوبہ رقم جمع کر سکے گی۔ ہزارہ میں کام ہی کہاں تھا؟ ایک موہوم سی امید پر وہ ایبٹ آباد چلی آئی۔ یہاں سیزن کے چار مہینوں میں اچھا کام مل جاتا تھا۔ مگر باقی کے خشک مہینوں میں جمع پونجی خرچ ہو جاتی تھی۔ اور اگلے سیزن میں وہ پھر خالی ہاتھ ہوتی تھی۔

خوش قسمتی سے وہ نور بانو کو پسند آ گئی۔ یہ یقینی ہو گیا کہ صرف اس کام میں اسے اتنا مل جائے گا کہ زمین چھڑانے کے بعد بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم بچ رہے گی۔ زمین اس کی تھی بھی بہت اچھی۔

کام کیا، وہ تو غرض کا سودا تھا۔ اور رشیدہ پہلے ہی دیکھ چکی تھی کہ مول تو غرض کا ہی ملتا ہے۔ سودے بازی کے بغیر، دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا میں کبھی کچھ نہیں ملتا۔

وہ تیز وطرار بھی تھی اور چالاک بھی۔ نور بانو اور ارجمند کے معاملے کو اس نے ابتداء ہی میں بھانپ لیا۔ یہاں جو سودا ہو رہا تھا، وہ تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس کے اپنے اتنے بچے تھے۔ ایک اور بھی ہونے والا ہوتا تو بھی ضرورت مند ہونے کے باوجود وہ کسی قیمت پر اسے کسی اور کو نہ دیتی۔ اس کے نزدیک تو وہ اَن ہونی تھی۔ لیکن اس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ دنیا میں سب کچھ بکتا ہے۔ ہر چیز کا سودا ہوتا ہے۔

پہلے تاثر میں ارجمند اسے خود سے بھی پست لگی۔ کوئی بھلا اپنے پہلے بچے کو بھی بیچتا ہے۔ اور وہ بھی ماں...... اس نے یہ بھی سوچا کہ جو کچھ اسے مل رہا ہے، ارجمند کو یقیناً اس سے بہت زیادہ مل رہا ہوگا۔ اور شاید اس کی وجہ ارجمند کی کم عمری بھی تھی۔ وہ پہلے بچے کی اہمیت سمجھتی ہی نہیں ہوگی۔ ماں بننے کے مرحلے سے پہلے کبھی گزری جو نہیں تھی۔ پھر اس کے سامنے نور بانو تھی، جو اپنا مقصد ہر حال میں حاصل کرنا جانتی تھی۔ رشیدہ نے ایسی شاطر عورت زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جو کھیل وہ کھیل رہی تھی، چالاک رشیدہ بھی اسے کھیلنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی رکاوٹوں کے باوجود اس نے جس طرح بازی جمائی تھی، وہ بے مثال تھی۔ اس کی

تفصیل تو رشیدہ کو ساتھ رہ کر بعد میں معلوم ہوئی، اور وہ دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گئی۔ وہ اکیلے شوہر کا معاملہ نہیں تھا، حالانکہ اس صورت میں بھی یہ آسان نہیں تھا۔ شوہروں سے یہ باتیں کہاں چھپ سکتی ہیں۔ لیکن یہاں تو بھرا پرا گھر تھا، جسے نور بانو بے وقوف بنا رہی تھی۔

سو رشیدہ نور بانو سے بری طرح مرعوب ہو گئی۔ لیکن ارجمند اس کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے نزدیک وہ بھی اس کی طرح نور بانو کی ایک طرح سے ملازمت کر رہی تھی۔ بلکہ رشیدہ نے ایک طرح سے اسے خود سے بھی کم تر سمجھا۔ کیونکہ وہ اس کے راز کی امین تھی۔ وہ اس کا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ اس لئے اس کے خیال میں ارجمند کو اس سے دب کر رہنا تھا۔

اسی تاثر کے تحت ایک دن اس نے ارجمند سے تحکمانہ لہجے میں بات کر لی۔ اس وقت نور بانو اسپتال میں تھی۔ لیکن ارجمند نے جس درشتی سے اسے جھڑکا، اس نے رشیدہ کو اس کی اوقات یاد دلا دی۔ ارجمند نے اسے جتا دیا کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔ اور اسے اس کے کسی مشورے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس واقعے نے رشیدہ کو احساس دلا دیا کہ ارجمند نہ بے وقوف اور سادہ لوح ہے، نہ کمزور اور نہ ہی لالچی۔ وہ جانتی تھی کہ اس راز کے زیر پردہ نور بانو سے تو کچھ بھی منوا سکتی ہے۔ لیکن ارجمند دینے والی نہیں یعنی نور بانو کمزور ہے اور ارجمند مضبوط۔

لیکن ارجمند کی مضبوطی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

پھر ایک دن اتفاق سے اس نے کچھ فون پر کی جانے والی اور کچھ دونوں سوکنوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تو سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ چاہے نور بانو ارجمند کی سوکن ہو، لیکن ارجمند نور بانو کی سوکن ہرگز نہیں۔ وہ تو نور بانو کو سگی بہن سے بڑھ کر چاہتی ہے، اور اس کی خوشی کے لئے بغیر کسی لالچ اور غرض کے، اتنا بڑا ایثار کر رہی ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نور بانو نے خود اپنے شوہر سے ارجمند کی شادی کرائی ہے، اور اسی غرض کے تحت کرائی ہے کہ وہ

اسے اپنا بچہ اور ماں کا مرتبہ اور مقام دے گی۔

اس دن سے اس کی سوچ بدل گئی۔ ارجمند کا مرتبہ اس کی نظروں میں بلند ہوگیا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی غرض نور بانو سے وابستہ تھی، نور بانو اس کی نظروں میں گر گئی۔ وہ ایک شاطر، بے رحم اور سفاک عورت تھی، جو جھوٹی محبت کے زور پر ایک معصوم لڑکی سے وہ کچھ خرید رہی تھی، جو دنیا بھر کے تمام خزانوں کے عوض بھی نہیں مل سکتا۔

لیکن رشیدہ کو ارجمند پر ترس بھی آنے لگا۔ وہ بچی تھی...... اللہ والی تھی ...... مضبوط تھی ...... لیکن کم عمر اور ناتجربہ کار بھی تھی...... اپنی اچھائی میں اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس ایثار کے بعد اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ لیکن رشیدہ سمجھ سکتی تھی۔

اسے معلوم ہوگیا تھا کہ شوہر کو ارجمند میں کوئی دلچسپی نہیں ...... اور وہ نور بانو سے دیوانہ وار محبت کرتا ہے...... بچے سے محرومی پر یہ حال تھا کہ نور بانو کی ضد سے مجبور ہو کر اس نے ارجمند سے شادی کی تھی...... رشیدہ سمجھ سکتی تھی کہ دنیا کی نظروں میں نور بانو ماں بن گئی تو کیا ہوگا......؟ اس میں اسے ذرا بھی شک نہیں تھا کہ ارجمند بے حیثیت ہو کر رہ جائے گی...... بلکہ عجب نہیں کہ نور بانو اسے کانٹا سمجھ کر نکال پھینکے۔

کئی بار اس کا جی چاہا کہ بے خبر ارجمند کو اس سلسلے میں خبردار کرے۔ لیکن ایک بار ڈانٹ کھانے کے بعد اس نے اپنی اوقات سمجھ لی تھی۔ دوبارہ ڈانٹ کھانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اصولاً تو اسے پرواہ نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس کا اُلو تو سیدھا ہو رہا تھا۔ لیکن تبدیلی یہی تو آئی تھی۔ وہ ارجمند کے انجام کے بارے میں سوچ کر کڑھتی تھی، اور اسے نور بانو پر غصہ آتا تھا، جس سے اس کا مفاد وابستہ تھا۔ اس روز نور بانو سے ارجمند کی گفتگو سن کر اس نے اللہ کو سمجھا تھا۔ ورنہ پہلے وہ بس ایک نام تھا، جو عادتاً وہ لیتی تھی۔

اسے ارجمند سے محبت ہوگئی...... وہ زندگی میں اس کی پہلی بے غرض محبت

تھی...... وہ اس کے لئے کچھ کر نہیں سکتی تھی...... لیکن باقاعدگی سے اس کے لئے دعا ضرور کرنے لگی...... ورنہ دعا کا خیال تو اسے کبھی اپنے لئے بھی نہیں آیا تھا۔

وہ اتنی بدل گئی کہ یہ تک سوچنے لگی کہ کسی نہ کسی طرح وہ بے خبر شوہر پر یہ راز کھول دے گی۔ اسے بتا دے گی کہ درحقیقت ارجمند ماں بنی ہے، نور بانو نہیں۔ لیکن یہ کام اسے اپنا حق وصول کرنے کے بعد کرنا تھا۔ کیسے......؟ یہ وہ بعد میں سوچ لے گی۔

لیکن آج تو حد ہی ہوگئی۔

جب اس کے سامنے نور بانو کی حالت بگڑی تو اسے خوف آنے لگا۔ نور بانو کی صورت دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا کہ اس بار معاملہ سنگین ہے۔ پھر ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا، اگر نور بانو کو کچھ ہوگیا تو اسے انعام کون دے گا؟ ارجمند سے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اور ارجمند کو کیا پڑی تھی کہ وہ اسے کچھ دیتی؟ بلکہ نور بانو کو کچھ ہو جاتا تو وہ جھوٹ کا کھیل آپ ہی ختم ہو جاتا۔

اسے اب بھی یاد تھا کہ یہ خیال آتے ہی وہ پُرسکون ہوگئی تھی۔ اس نے سوچا تھا، یہ ہوگیا تو یہ اللہ کا انصاف ہوگا، اور اس کا نقصان اپنی جگہ، لیکن اسے خوشی ہوگی کہ جھوٹ ختم ہوگیا اور حق حقدار کو مل گیا۔

اس لمحے بھی اسے اپنی اس سوچ پر حیرت ہوئی تھی ...... ابھی وہ اتنی رقم جمع نہیں کر سکتی تھی کہ اپنی زمین واگزار کرا پاتی...... اور نور بانو کو کچھ ہو جاتا تو اس کا خواب خواب ہی رہ جاتا...... اس کی بہتری تو اسی میں تھی کہ معاملات خوش اسلوبی سے نمٹ جائیں اور نور بانو اسے انعام و اکرام کے ساتھ رخصت کر دے۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل میں کراہت سی ابھری...... نہیں چاہئے مجھے ایسا پیسہ...... اس نے دل میں سوچا...... جو ایک معصوم اور نیک لڑکی کی زندگی تباہ کرنے کے صلے میں مل رہا ہے...... اللہ چاہے گا تو کہیں سے بھی مجھے دے دے گا۔

پھر وہ باہر سے ارجمند کی چیخ سن کر لپکی۔ ارجمند کو اس نے جس حال میں دیکھا، اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اب یہ کیس گھر پر نہیں نمٹایا جا سکتا۔ بلکہ یہاں تو ارجمند کی زندگی ہی خطرے میں ہے۔ ایک لمحے کی تاخیر بھی مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

دونوں عورتوں کی زندگی خطرے میں تھی۔ مگر اس نے ارجمند کے تحفظ کو اولیت دی۔ گھر کی گاڑی میں وہ اسے ساتھ لے کر آئی اور نوربانو کو آبیہ پر چھوڑ آئی۔ یہی نہیں، وہ اپنی تمام جمع پونجی بھی بہت خلوص سے ساتھ لے آئی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ گھر میں کوئی رقم ہے یا نہیں۔ اور نوربانو کی حالت ایسی نہیں تھی کہ اس سے یہ بات پوچھی جاتی۔ اور وہ یہ جانتے ہوئے بھی وہ رقم خرچ کرنے کو تیار تھی کہ شاید یہ اسے واپس بھی نہ ملے۔ اپنا یہ عمل خود اس کے لئے بھی حیران کن تھا۔

لیکن سخت جان نوربانو نے اتنے برے حال میں بھی اس کا خیال رکھا تھا۔ وہ رقم اپنے بیگ میں لے کر آئی تھی۔

وہ اپنے خیالوں میں اتنی گم تھی کہ اسے ڈاکٹر کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ ارجمند کی کیفیت بدل رہی ہے۔ بے ہوش تو وہ اب بھی تھی۔ لیکن اس کا جسم مرتعش تھا۔

ڈاکٹر نے بلڈ پریشر چیک کیا اور نفی میں سر ہلایا۔

''کم تو ہوا ہے بلڈ پریشر...... لیکن اب بھی کنٹرول میں نہیں ہے۔''

اسی وقت ارجمند کے جسم میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی، جو جھٹکوں میں تبدیل ہوگئی۔ ڈاکٹر نے جلدی سے ڈرپ علیحدہ کر دی۔ پھر اس نے اسٹیتھسکوپ پیٹ پر لگایا، اور اچانک ہی پریشان ہوگئی۔

''بچہ خطرے میں ہے۔ اب مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں اسی حالت میں آپریشن کرنا ہوگا۔''

''لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ زچہ کو بچانے کو ترجیح دیں گی۔''

ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا۔ وہ باہر کی طرف لپکی۔ پھر ڈاکٹر نے جھنجلا کر رشیدہ کو دیکھا۔

''تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ بچے کے بچنے کا امکان تو اب بھی بہت کم ہے۔ لیکن بچہ مر گیا تو خود ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

بات رشیدہ کی سمجھ میں آ گئی۔

''تو پھر......؟''

''فوری آپریشن کرنا ہوگا...... تم ان کے بھائی کی بات کر رہی تھیں... انہیں بلاؤ......! اجازت نامے پر ان کے دستخط کے بغیر ہم آپریشن نہیں کریں گے۔''

متوحش رشیدہ نے آبیہ کو جھنجھوڑ کر جگایا اور خود دروازے کی طرف لپکی۔

❁ ❁ ❁

صبح بہت قریب تھی۔ لیکن اندر بیٹھ کر اس بات کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ البتہ دیوار پر لگا کلاک بتا رہا تھا کہ ساڑھے چار بجے ہیں۔

کہتے ہیں نیند تو کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے... نوریز کو بھی ایک جھپکی آ گئی۔ لیکن وہ بہت کچی نیند تھی۔ اسے جیسے گردوپیش کا ادراک بھی تھا۔ جس دروازے پر وہ آس بھری نظریں لگائے بیٹھا تھا، وہ دروازہ کھلا تو اس کی نیند اچٹ گئی۔

لیکن آنکھیں کھولنا اب بھی اس کے لئے آسان نہیں تھا۔ آپریشن تھیٹر کے کھلے دروازے سے اسے سفید کوٹ پہنے ایک ہیولا اپنی طرف بڑھتا نظر آیا۔

ڈاکٹر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

''مجھے افسوس ہے......!''

''کوئی بات نہیں صاحب......!'' اس نے بغیر سوچے سمجھے کہا۔

''میں سو تو نہیں رہا تھا۔ بس یوں ہی......''

ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ہم نے پوری کوشش کی۔ لیکن اللہ کی مرضی کے سامنے سب بے بس ہیں۔ ویسے بھی یہاں انہیں لاتے ہوئے دیر ہوگئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ معمولی سا امکان تھا ان کے بچنے کا۔ مگر ہمارا کام تو کوشش کرنا ہے۔''

نوریز کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کچھ احساس سا ہو رہا تھا۔ لیکن وہ اب بھی سمجھا نہیں تھا۔

''میں سمجھا نہیں صاحب......!''

''ہم انہیں نہیں بچا سکے۔''

نوریز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

❁ ❁ ❁

علیم الحق حقی کا شہرۂ آفاق ناول

"عشق کا شین"

(حصہ پنجم)

جلد آ رہا ہے

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 37211468 - 37314169